

عنایت اللہ کی ہنگامہ خیز اور سحر انگیز خودنوشت

منزل اور مسافر

حصہ اول

عنایت اللہ



گھٹا تو کھل کے برسی تھی مگر موسم نہ بدلا تھا
یہ ایسا راز تھا جس پر مری آنکھوں کا پردہ تھا

مرے دامن کے صحرا میں کئی جھیلوں کا قصہ تھا
جو بادل کی زبانی میں ہواؤں کو سناتا تھا

مسافر ہوں، منزل سے ابھی دُور ہوں۔
کوئی ایسا دُور بھی نہیں.... اگر قبر ہی انسان کی منزل ہے تو پھر کسی بھی دُن
کسی بھی وقت جا پہنچوں گا، بس کین دانشور کہتے ہیں کہ انسان کی منزل قبر نہیں ہوتی۔ قبر
میں تو انسان مگر اترتا ہے بلکہ اُتارا جاتا ہے۔
پھر انسان کی منزل کیا ہے؟

میری منزل کیا ہے؟.... کہاں ہے میری منزل؟
میری زندگی میں ایک دُور ایسا بھی آیا تھا کہ میں پورے یقین اور وثوق سے اپنے
آپ سے کہا کرتا تھا کہ میں منزل کو دھونڈتا پھر رہا ہوں اور منزل میسر پہنچے جیسا کہ
رہی ہے۔

میری ان باتوں سے آپ کو یہ شک نہیں ہونا چاہیے کہ میں شاید فلسفی ہوں یا
عالم دین ہوں یا کسی اور علم کا عالم ہوں.... نہ صاحب!.... میں نے صفحہ دس جماعتیں
پڑھی ہیں۔ میٹرک کا سرٹیفکیٹ اب بھی میسر پاس محفوظ ہے لیکن دس سال لگا کر جو پڑھا
تھا وہ میسر ذہن میں محفوظ نہیں۔ میں نے کتنا بول میں جو پڑھا تھا وہ میں کبھی کا بھول
چکا ہوں۔ میسر پاس جو علم ہے وہ میں نے انسانوں سے حاصل کیا ہے۔
یوں کہہ لیں کہ میں نے انسانوں کو پڑھا ہے۔

دنیا کھلی ہوئی ایک کتاب ہے۔ اس سے وہی انسان علم حاصل کر سکتا ہے
جو آنکھیں اور دل و دماغ کے درپے کھول کر رکھے۔

میں آپ کو اپنے سفر کی داستان سنانے چلا ہوں۔ یہ سفر میسر گھر سے شروع
ہوا اور گھر پر ہی اکہر ختم ہوا۔ میں ایک بات صاف طور پر کہہ دوں کہ میں اپنا نام ظاہر
نہیں کر دوں گا۔ کسی شہر، قصبے یا گاؤں کا نام صبح نہیں بھول گا۔ صرف اُن لوگوں
کے نام صبح بھول گا جن کے ساتھ مجھے ہندوستان میں واسطہ پڑا تھا۔ ہندوستان کے
اُن مقامات کے نام بھی صبح ہوں گے جہاں جہاں میں گیا اور کچھ وقت گزارا تھا۔

نہ اُس میں کوئی منطق تھی نہ اُس میں کوئی دھوکہ تھا
مری خاطر ہی نکلا تھا جو دانہ میں نے کھایا تھا

حصولِ رزق میں دن بھر زورِ فکر میں شب بھر
دُھواں بن کر میں اُڑتا تھا فغاں بن کر میں جلتا تھا

یہ داستان سناتے ہوئے کہیں کہیں مجھے اپنا کوئی نام لکھنا پڑے گا۔ وہاں میں مفسر خان لکھوں گا۔

میں اپنی زندگی کی اس داستان کے واقعات اپنے گھر والوں اور دوستوں کی محفلوں میں سناتا رہا ہوں۔ لکھنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا تھا۔ ارادہ تو دور کی بات ہے، کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ہوا یوں کہ محمد خاں مرحوم کی داستان ”رات کے راہی“ کی دونوں جلدیں اتفاق سے مجھے ملیں تو وہ میں نے ختم کر کے چھوڑیں اور میں ان کے ایڈریس کے لیے ہاتھ پاؤں ماننے لگا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ان کا ایڈریس کہیں سے بھی نہیں مل سکے گا لیکن اُس علاقے سے میں واقف تھا۔ ایک جگہ سے اُن کے گاؤں کا ایڈریس مل گیا اور ساتھ یہ خبر کہ انہیں فوت ہوئے چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ پھر بھی وہاں چلا گیا اور فاتحہ پڑھ کر آگیا۔

”چھر“ حکایت“ کے اسی ادارے کی چھاپی ہوئی دوسری کتاب ”دھندلی راہیں“ کی چاروں جلدیں ہاتھ لگیں۔ یہ سکندر مرحوم کی داستان ہے جو انہوں نے سنائی اور وقاص صاحب نے لکھی ہے۔ میں نے ان کا ایڈریس معلوم کر لیا اور اُن کے ہاں چلا گیا۔ وہ بہت ہی بوڑھے ہو چکے تھے۔

اپنا تعارف کرایا اور انہیں بہت ہی مختصر کر کے اپنی زندگی کی داستان سنائی۔ ”یہ داستان اپنے ساتھ قبر میں نہ لے جانا“ سکندر مرحوم نے کہا۔ ”یہ لکھو یا لکھو اور“ حکایت“ کے ایڈیٹر کو دے دو۔ وہ کتاب چھاپ دیں گے۔ ایسی سچی کہانیاں لوگوں تک پہنچی جائیں گی۔

ان کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ دو اڑھائی ماہ بعد اُن سے ملنے گیا تو یہ افسوسناک خبر ملی کہ سکندر صاحب ایک ہفتہ گزر ا فوٹ ہو گئے ہیں۔

میں نے محمد خاں مرحوم اور سکندر مرحوم اور ان کی کتابوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ جو مجھ پر پڑتی ہے وہ ان دونوں کی آپ بیتیوں سے ملتی جلتی ہے۔ میں بھی ان دونوں کی طرح گھر سے بے گھر ہوا تھا۔ برما اور انڈونیشیا تک گیا اور واپسی کا سفر ایسی صورت اختیار کر گیا کہ ”منزل منزل پھر اسافر“ والی بات ہو گی۔

اس تنہید کے بعد میں اپنی کہانی کی طرف آتا ہوں۔ یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ اسے آپ جتنی کہیں، سفر نامہ کہیں یا جو جی میں آئے کہہ لیں۔



میں ایک قصہ میں ایک پڑھ لکھے گھر لانے میں پیدا ہوا تھا۔ اُس زمانے میں جب مسلمان تعلیم کو حرام سمجھتے تھے، کسی مسلمان کا آٹھ یا دس جماعتیں پاس کر لینا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ میں بڑے شہروں کی نہیں، قصبوں اور دیہات کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارا گھر صاف ستھرا تھا۔ ہماری دال بہیں صاف ستھرے کپڑے پہنایا کرتی تھی میرا والد صاحب دیوبند میں ملازم تھے۔ بڑا امیر تھا۔ میں ملازم تھا۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ میں ایک بہن اور دو بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ سب مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ ہمارے گھر کی شائستگی، آداب و اخلاق اور شرافت مشہور تھی لیکن ذات پات کے لحاظ سے ہم تیسرے درجے کے لوگ تھے۔ وہ انگریزوں کا دور حکومت تھا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں سے جو زمین اور رواج اپنی معاشرت میں شامل کر لیے تھے۔ ان میں ذات پات کی قباحت بھی تھی۔ مسلمان چھوٹی بڑی ذاتوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ جس طرح ہندو برہمن دوسری ذاتوں کو آج بھی حقیر سمجھتے تھے اسی طرح مسلمانوں نے کچھ اونچی ذاتیں پیدا کر لی تھیں۔ ان ذاتوں کے لوگوں نے ہندو لوگوں کو اپنا غلام سمجھ لیا۔ ہندو مند سے مراد وہ لوگ ہیں جو کچھ اچھے نہیں ہیں۔ لوہار، ترکھان ہیں، راج مزدور ہیں۔ لوگوں کے بال کاٹتے اور کپڑے دھوتے ہیں، کپڑے پستے ہیں۔ جوتے بناتے اور مرت کرتے ہیں، لکڑی کا کام کرتے ہیں اور دیگر دستکاری کرتے ہیں۔

جاگیردار، بڑے زمیندار وغیرہ سب کے چوہدری اور حاکم بن گئے۔ کوئی چوہدری کہلاتا ہے۔ کوئی راجہ، کوئی ملک اور اسی طرح اونچی ذاتوں والوں نے ہندو مندوں کو حق اور زمین کننا شروع کر دیا۔ دیہات میں آج بھی چوہدری اور راجے وغیرہ چھوٹی ذاتوں کے لوگوں سے بیگار لیتے ہیں۔

یہ تو مجھے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہم مسلمان کس طرح ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ انگریزوں نے مسلمانوں میں ذات پات کو اور زیادہ پکا کر دیا تھا کیونکہ انگریز چاہتے تھے کہ مسلمان متحد نہ ہو سکیں اور چھوٹے بڑے میں تقسیم رہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں ذات پات کا تصور ہی موجود نہیں۔ اسلام میں تو خلیفہ بھی اپنے آپ کو عوام سے بالا اور برتر نہیں سمجھا کرتا تھا۔

میں جنگ عظیم سے دو اڑھائی سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے میٹرک پاس کر لی۔ اُس زمانے میں تعلیم صرف اس لیے حاصل کی جاتی تھی کہ نوکری کرنی ہے۔ اس کے لیے دس جماعتیں کافی سمجھی جاتی تھیں۔ مجھے بھی اب نوکری تلاش کرنی تھی۔ اُس زمانے

بزرگ لوگ اپنے آپ کو شریف کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ بزدل آدمی کو شریف کہتے ہیں۔

مجھ میں بزدلی والی شرافت نہیں تھی۔

میری دوستی ایسے لڑکوں کے ساتھ تھی جو زندہ دل اور شرارتی تھے اور وہ غیر معمولی طور پر دلیر اور نڈر تھے۔ یہی اوصاف مجھ میں بھی پیدا ہو گئے تھے۔



میں نے دس جماعتیں تو پاس کر لی تھیں لیکن پڑھنا میرے خاندان کی روایت تھی اس لیے میں نے یہ روایت پوری کر دی تھی حقیقت یہ تھی کہ تعلیم میرے مزاج کے خلاف تھی۔ والد صاحب اور بھائی جان چاہتے تھے کہ میں بی اے کر لوں۔ والدہ نے میرا بہت ساتھ دیا۔ والدہ میری ہر بات مانتی تھی اور بڑی بہن بھی مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ اُسے بھی گوارا نہ تھا کہ میرے اعصاب پر کوئی ناگوار بوجھ پڑے۔ تعلیم سے بڑھ کر اور ناگوار بوجھ کیا ہو سکتا تھا!

”چودہ پڑھ لے چاہے سولہ پاس کر لے“۔ والدہ میرے حق میں یہی دلیل دیا کرتی تھی۔ ”اُسے نوکری تو کلر کی کی ملے گی۔ میری نوکری دسویں پاس کو ملتی ہے۔۔۔“ بچے کے دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔

”ہاں بابا جان!“۔ میری بہن دلیل دیا کرتی تھی۔ ”اس کی صحت تو ٹھیک ہو لینے دیں۔ دیکھیں تو سہی، کیا ذرا سامنے لگا لا ہوا ہے، رنگ بے چارے کا پیلا پڑا ہوا ہے۔“

میری صحت آور گی میں ٹھیک رہتی تھی۔

دراصل گھر میں خوشحالی تھی۔ یہ ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی کہ میں بھی نوکری کروں میں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں نکلا اور نکھٹو نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زمینوں پر مکان شروع کر دیا اور زمینوں اور بٹائی والے مزارعوں کی باتیں اس طرح شروع کر دیں جیسے زمینیں خراب ہو رہی ہیں یہ پوری پیداوار نہیں دے رہیں اور بٹائی والے محنت بھی نہیں کر رہے اور دھوکہ بھی دے رہے ہیں۔

یہ نہ سمجھیں کہ ہم سینکڑوں یا بیسیوں ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ کل آٹھ ایکڑ زمین تھی۔ میں نے گندم کی فصل گھراتے ہی اُن مزارعوں کی چھٹی کرادی جو بڑے بے عرصے سے ہماری زمینیں سنبھالے ہوئے تھے۔ میں نے جوئے مزارع رکھے وہ میرے قبضے سے دوہیل دور ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ غربب کسان تھے جن کی سوتیلیں پیٹ پر

میں نوکری کسی قیمت والے کو ملتی تھی۔ مجھے اس کا کوئی غم نہیں تھا۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے سب کا لاڈ لانا تھا۔ انہیں ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پہلے بتایا کہ والد صاحب اور بڑا بھائی ملازمت کرتے تھے۔ ہماری تنخواہ سی زمین بھی تھی جو ہم نے بٹائی پر دے رکھی تھی۔ دانے خالص آجاتے تھے۔ اس زمانے میں ہنگامی نہیں تھی ہندی کے بھاؤ چڑھتے نہیں تھے۔ تنخواہ سی آمدنی میں باعزت گزارا ہو جاتا تھا اپنے علاقے کے متعلق یہ بتا دوں کہ بارانی علاقہ ہے اور یہ علاقہ میدانی نہیں۔ سطح مرتفع ہے۔ کھڈ نالے ہیں، گھاٹیاں اور ٹیلے ہیں اور چھوٹے بڑے برساتی نالوں کا تو حال بچھا ہوا ہے۔ اب اس علاقے میں سڑکیں بن گئی ہیں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں بہت پھیل گئے۔ آبادیاں زیادہ ہو گئی ہیں۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں، اس وقت ویرانے اور بنجر علاقے بہت تھے۔ ہم لوگ جو قبضے میں رہتے تھے، شہری اور تہذیب یافتہ کہلاتے تھے۔ دیہاتی علاقے میں بعض جگہیں مٹی کی پہاڑیوں میں گھری ہوئی ایسی تھیں کہ قبضے کے لڑکے وہاں ڈر جایا کرتے تھے۔

معلوم نہیں میری نفسیات کیا تھی کہ مجھے یہ ڈراؤنی جگہیں اچھی لگتی تھیں اور کبھی کبھی تو میں اکیلا ہی ادھر نکل جایا کرتا تھا۔ مجھے خطروں سے بیدار تھا اور میں ایدوچ کا دلدادہ تھا۔ ایسے درختوں پر چڑھنا جن پر چڑھنا جائے اور ان کی انتہائی بلندی پر پہنچنا میری ہابی ہوتا کرتی۔ سادوں کی بارشوں میں نالوں میں طغیانی آجاتی تو ہم تین لڑکے دو منزل مکان جتنے بلند کناروں سے ڈاٹیو لگایا کرتے تھے۔ مجھے تیراکی کا بہت شوق تھا۔ میں سیلابی نالوں میں تیرا کرتا تھا۔ کئی بار ایسے ہوا کہ نالے کے موڑ پر سیلاب نے مجھے چٹائی کنارے کے ساتھ بڑی زور سے پٹھا۔ ایسے لگا جیسے میری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں لیکن اتنی شدید چوٹوں سے بھی مجھے لطف آیا کرتا تھا۔

میں اپنی جو کہانی سناتے چلا ہوں، اس کے لیے ضروری ہے کہ میری نفسیات میری فطرت اور میری اس وقت کی عادات ذہن میں رکھ لیں۔

میں نے بتایا ہے کہ میں پروفیسر، شائستہ اور خوشحال گھرانے کا فرد تھا۔ جس کی شرافت مشہور تھی۔ مجھ میں وقت اور بھی تھا، تعلیم اور شائستگی بھی تھی اور میں شرافت کا بھی قائل تھا لیکن میں پارسا اور زاہد نہیں تھا۔ صاف بات یہ ہے کہ میں مومنوں والی شرافت کے خلاف تھا۔

اکثر لوگ بزدل ہوتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے اور ہاتھ پائی سے ڈرتے ہیں۔ ایسے

مرکوز رہتی تھیں۔

یہ ایک کتبہ تھا جس میں باپ تھا، ماں تھی، دو جوان بیٹے تھے۔ ایک بیٹے کی نوجوان دہن تھی۔ ان کے پاس دو بیل اور ایک گدھ تھی۔ اس کتبہ تک میری رسائی اس طرح ہو گئی کہ اس گاؤں میں میرے ایک دوست کی بہن بیاہی ہوئی تھی۔ ایک روز وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

میں نے اس گھر میں بیس ایکس سال عمر کی ایک لڑکی دیکھی جو بھینس کی کھڑی میں بھوسہ اور بنولے وغیرہ مار رہی تھی۔ اس لڑکی کو میں افسانے لکھنے والوں کی طرح بڑی ہی خوبصورت یا بلے حد میں تو نہیں کہوں گا لیکن وہ جس قدر خوبصورت تھی اس خوبصورتی میں کچھ عجیب سی کشش تھی۔ پھر برآمدن، گردن لمبوتری اور گول چکر پر ایسی لالی جیسے انگارے دکھ رہے ہوں۔ اسے دیکھا ہوا چہرہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

اُس نے ہماری طرف دیکھا۔ اُس وقت میری عمر اٹھارہ سال ہو گئی تھی۔ عقل ابھی خام تھی اور زندگی کا تجربہ کوئی تھا نہیں، پھر بھی اُس کی آنکھیں دیکھیں تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ لڑکی پیاسی ہے یا اس میں کوئی محرومی ہے یا اس کی آنکھیں کوئی گشتہ چیز ڈھونڈ رہی ہیں۔

وہ ہم سے بارہ چودہ قدم دور تھی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا ہنس آ گیا اور وہ اپنے کام میں لگ گئی۔ کھڑی سے ہٹی تو کوئی اور کام کرنے لگی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ میری طرف دیکھتی اور اس کا ہنس کھلتا ہی چلا جا رہا تھا۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اُسے صاف نیت سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرے دوست نے سرگوشی میں مجھے بتا دیا تھا کہ اُس کی بہن نے اس لڑکی کو گھر کے کام کاج کے لیے رکھا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد لڑکی چلی گئی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اُس نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میرا دوست ڈیلا پستلا اور گمرے سانولے رنگ کا نوجوان تھا۔ اُس کے مقابلے میں اُس نے میرے وجود اور چہرے مہرے میں کشش محسوس کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بھاگنے دوڑنے، تیرنے اور درختوں پر چڑھنے کا عادی تھا۔ میٹر کا امتحان دے کر میں نے اگلے روز ہی باڈی بلڈنگ کی ورزشیں شروع کر دی تھیں۔ بلکہ پھر نا

ڈنڈ اور پٹکیں اور پتھر اٹھانا (ویٹ لفٹنگ) روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ اتنی سخت ورزشوں اور اچھی خوراک کا اثر یہ ہوا کہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں میرا قد بڑھ گیا اور جسم بالکسروں جیسا ہو گیا۔ میں نے تسلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا اس لیے ذہن اور اعصاب سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ چکر پر رونق آ گئی۔ خدا تعالیٰ نے شکل و صورت اچھی عطا کی تھی۔ رنگ صاف تھا۔

اُس زمانے میں مردوں کی خوبصورتی چکر سے نہیں دیکھی جاتی تھی، جسم دیکھے جاتے تھے۔ لوگ گھٹے ہوئے جسم اور اونچے قدر کو پسند کرتے تھے۔ لباس کو اونچ نیچ کا معیار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کسی کی تعریف صرف اس لیے نہیں کی جاتی تھی کہ اُس نے کپڑے بڑے قیمتی پہنے ہوئے ہیں۔ لوگ دیکھتے تھے کہ کپڑوں کے اندر کیا ہے۔

میں کپڑوں کے اندر جو کچھ تھا وہ دوسروں کے لیے قابل قبول تھا۔ یہ دوسروں نے مجھے بتایا تھا۔ میں نے اپنی تعریف خود کبھی نہیں کی تھی نہ کبھی یوں کیا تھا کہ آئینے کے سامنے بیٹھا اپنے آپ کو دیکھتا رہتا۔



”یہ نوکرانی کبھی ہے؟“ میرے دوست نے اپنی بہن سے پوچھا۔

”ہم نے نوکرانی رکھ کر اس سے کیا کرنا ہے؟“ بہن نے جواب دیا۔ ”یہ بڑا ہی غریب گھرانہ ہے۔ اس کا خاوند تحصیل میں ہرکارہ ہے۔ خاوند کے باپ اور بھائی نے کسی کی زمین بٹائی پر لی ہوئی تھی۔ وہ زمین ان سے چھڑ والی گئی ہے۔ ان کا گزارہ بڑے بیٹے کی تنخواہ پر ہے۔ تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ یہ لڑکی ایک روز میرے پاس آئی اور اپنا رونا رونے لگی۔ میں نے اُسے کہا کہ میرا کام کر جایا کرو، آنا دانہ دے دیا کروں گی۔“ ”اگر یہ شہر آجائیں تو میں انہیں اپنی زمین دے دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر اُسے پر کوئی کچا کوٹھا بھی مل جائے گا۔“

لڑکی کے کمر کو بلایا۔ میں نے اُس سے بات کی تو وہ تیار ہو گیا۔ ہمارے قصبے میں ہی تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا جہاں اُس کا بیٹا ہرکارہ تھا۔ وہ لوگ ایک دو دنوں بعد اپنے مویشی اور گھر کا سامان لے کر آ گئے۔ ہمارے کھیت قصبے کے ساتھ ہی تھے۔ میں نے کچے سے ایک مکان کا انتظام کر لیا تھا۔ یہ کسی نے اپنے مویشیوں کے لیے بنوایا تھا۔ کچھ عرصے سے خالی پڑا تھا۔ یہ مکان آج ہوتا تو اس کا کمرہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار سے کم نہ ہوتا لیکن اُس زمانے میں اس کا کمرہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار تھا۔

انہوں نے ہمارے کھیتوں میں کام شروع کر دیا۔

میں نے آگے بڑھنے اور ملازمت سے بچنے کے لیے گھر میں یہ اعلان پہلے ہی کر رکھا تھا کہ میں زمین کی دیکھ بھال کیا کروں گا۔ مجھ میں ایک وصف قدرتی طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ میں ایسی خود اعتمادی سے اور ایسے پُر اثر طریقے سے بات کرتا تھا جس سے دوسرے متاثر ہو جاتے اور میری بات مان لیتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ گھر میں مجھے ہر کسی کا پیار ملا تھا اور میں کسی محرومی کا شکار نہیں تھا۔

اللہ نے دوسری نعمت یہ عطا کی کہ میری آواز میں سُور اور سُوز تھا۔ میں اتنا اچھا گاتا تھا کہ سننے والے سُور ہو جاتے تھے۔ جمعہ کے روز میں جامع مسجد میں تلاوت قرآن کرتا تو میں سننے والوں کو جھومتے دیکھا کرتا تھا۔ نین چار آدمیوں نے مجھے کہا تھا کہ حقہ یا سگریٹ پینے شروع نہ کر دینا ورنہ گلہ خراب ہو جائے گا اور آواز بھدی ہو جائے گی۔ کسی استاد کی شاگردی کر لو۔ گانے میں نام پیدا کر دو گے۔

میں نے حقہ نہیں پیا، کبھی سگریٹ کا کش نہیں لگایا اور کسی استاد کی شاگردی بھی نہیں کی۔ البتہ استادیاں بہت کیں۔ اللہ نے ایک وصف زندہ ولی کا بھی دیا تھا۔ اپنے آپ میں گھٹن کبھی بھی پیدا نہیں ہونے دی۔



میں نے مزارعوں کی بات کر رہا تھا۔ ان کی ہو کا نام کچھ اور ہے۔ میں اُس کا نام عائشہ بھول گیا۔ اُس کے خاوند کو میں نے دیکھا۔ پہلا خیال یہ آیا کہ یہ آدمی عائشہ کے قابل نہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ مرجھائی ہوئی سی کھال میں لپٹا ہوا تھا۔ چہرے کا رنگ گہرا سا لالہ تو تھا لیکن ایسا جیسے لاش کا رنگ ہوتا ہے۔ اُس کے ساتھ میں نے کچھ باتیں کیں تو معلوم ہوا کہ وہ احمق نہیں بلکہ ہتوفی ہے۔ بات کرنے سے پہلے بے مقصد ہنستا پھر بات کرتا تھا۔

میں حیران تھا کہ یہ تحصیل میں سوائے حقہ بھرنے یا دفتر کے اہلکاروں کو بانی بلانے کے کیا کرتا ہو گا۔ کچھ دنوں بعد بہت چلا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی ٹھیک ٹھاک پوری کرتا تھا۔ اُن پڑھ دیہاتی تحصیل کے دفتر میں اپنے کاموں کے سلسلے میں آتے تھے تو یہ شخص اُن کو راہنمائی کرتا اور اُن سے آندو آنے وصول کر لیا کرتا تھا۔ اس طرح وہ ایک سے ڈیڑھ روپیہ بومیہ بالائی آمدنی کا لیتا تھا۔ یہ اُس زمانے میں جب بکرے کا گوشت چار آنے سیر ملتا تھا، خاصی آمدن سمجھی جاتی تھی۔ اس شخص کی چال ڈھال بے خبروں جیسی تھی۔

میں پہلے روز ان کے گھر گیا۔ عائشہ گھر میں اکیلی تھی۔ اُس کا خاوند اپنے کام پر چلا گیا تھا۔ اُس کا سر اور دو رکھیتوں میں چلے گئے اور اُس کی ساس بھی ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر عائشہ کے چہرے پر چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں صحن میں چار پانی پر بیٹھنے لگا تو عائشہ نے روک دیا۔

”یہاں نہیں“۔ اُس نے روک دیا۔ ”اندر چلیں“۔

اُس نے باہر والے دروازے کی اندر سے زنجیر چڑھا دی اور مجھے بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ کمرے میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ یہ یقیناً اُس کے جینز کا تھا۔ اُس نے مجھے پلنگ پر بٹھایا اور خود فرش پر بیٹھ گئی۔ میں نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے پاس بٹھالیا۔

”آپ مالک ہیں نا؟“۔ اُس نے سادگی سے کہا۔ ”میں آپ کی برابری نہیں کر سکتی“۔

میں نے اُس کی کمر میں بازو ڈال کر اُسے بالکل ہی اپنے قریب کر لیا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ وہ اس سے بھی زیادہ قریب ہونا چاہتی تھی۔ میں نے ذرا گھبراہٹ کا اظہار کیا کہ کوئی آجائے گا۔

”اتنی جلدی کوئی نہیں آئے گا“۔ عائشہ نے کہا۔ ”آپ ذرا اور جلدی آ جایا کریں“۔ اُس نے ذرائع کر اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”آیا کریں گے نا؟“

اُس کے لب و لہجہ اور انداز میں تشنگی اور کوئی نہ کوئی محرومی صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے گھسا پٹا فلمی مکالمہ بولا۔ ”مجھے آپ نہ کہہ کر دو، تم کہہ کر دو۔“

اُس روز میں کوئی ایک گھنٹے بعد اُس کے گھر سے نکلا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں اندر سے بالکل ہی بدل گیا ہوں۔ مجھ پر نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔ عائشہ کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔



پھر میں اُس کے گھر جاتا رہا۔ وہاں سے میں کھیتوں کو چلا جاتا۔ میں نے دیکھا کہ یہ لوگ شریف اور محنتی تھے۔ پہلے بٹائی والے مزارعے چلتا کام کرتے تھے۔ انہوں نے دوسرے لوگوں کی بھی زمینیں بٹائی پر لے رکھی تھیں اس لیے وہ کسی ایک کے لیے محنت نہیں کرتے تھے۔

”نہیں عائشہ! میں نے کہا۔“ اس کے دماغ میں کوئی خرابی نہیں۔ بڑے
 چمے طریقے سے نوکری کر رہا ہے۔“
 عائشہ نے آہ بھری، دوپٹے سے آنسو پونچھے اور منہ سے کچھ بھی نہ بولی۔
 مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے کھیتیاں اس کی ملکیت ہیں اور میں اس کا مزارعہ
 ہوں۔ معلوم نہیں کیوں مجھ پر مروجیت طاری ہو گئی۔ خیال آیا کہ مجھے یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے
 ورنہ اس لڑکی پر میرا کوئی حق نہیں۔ میں جانے کے لیے اُٹھا۔

”بیٹھے رہو۔“ اُس نے میرا بازو پکڑ کر کہتے ہوئے کہا۔ ”کیا جلدی ہے؟“
میں اس طرح بیٹھ گیا جیسے اُس کے حکم کی تعمیل کی ہو۔ ایسا تجربہ مجھے پہلی بار
رہا تھا۔ میں اس لڑکی میں کوئی تبدیلی دیکھ رہا تھا جیسے میں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ ایک
بال یہ بھی آیا کہ اسے شاید مجھ سے بہتر کوئی آدمی مل گیا ہے۔ اُس نے جانی لی۔ نیند
سے اُس کی آنکھیں مٹخ ہو رہی تھیں۔ وہ رات سوئی نہیں تھی۔
”نیند آرہی ہے۔“ اُس نے کہا۔

”سو جاؤ“ — میں نے کہا۔
وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ ذہ نوجوان تھی۔ نیند پر غالب نہیں آسکتی تھی۔ لیٹتے ہی
دگئی۔ میں آہستہ سے اٹھا اور وہاں سے نکل آیا۔ میری ذہنی اور جذباتی حالت بگڑتی چلی
ا رہی تھی۔ بار بار یہی وہم سامنے آتا تھا کہ یہ لڑکی مجھ سے تنگ آگئی ہے اور اس نے
ی اور کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے ہیں۔
میں دو دن اس کے گھرنہ گیا۔



تیسرے دن علی الصبح عائشہ کا سر ہمارے گھر آیا۔ وہ بہت ہی گھبراہٹ اور ڈرا ہوا
 ما۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ رات عائشہ کو چانک کوئی دورہ پڑا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں
 رچاتے ہیں اور وہ چارپائی سے گرتی ہے اور اوپر کو اچھلتی ہے اسے قابو کرنے کے لیے
 سب زور لگاتے ہیں لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔
 میری امی نے مجھے اور میرے ابا جان سے کہا کہ ہم دونوں جا کر دیکھیں اور اگر
 اکثر کی ضرورت پڑے تو بلا لیں یا ہسپتال لے جائیں۔
 میں ابا جان کے ساتھ عائشہ کے گھر گیا۔ وہاں تو عجیب ہی منظر دیکھا۔ پہلے تو میں

میں ایک روز عائشہ کے گھر گیا۔ وہ حسب معمول اکیلی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُس روز اُس کی مزاجی حالت اگھڑی اگھڑی سی تھی۔ اُس نے روزمرہ کی طرح باہر کے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور مجھے اندر لے گئی۔ ہم پنگ پر بیٹھ گئے۔ مجھے اپنے پا دیکھ کر اُس پر دیوانگی طاری ہو جایا کرتی تھی لیکن اُس روز وہ کچھ افسردہ اور مایوس لگ رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ آج اُس کا موڈ کیوں بگڑا ہوا ہے!

یہ ذہن میں رکھیں کہ اُس زمانے میں موڈ کا لفظ انگریزی ڈکشنری میں نونشا ہوگا، لوگ ابھی اس سے واقف نہیں تھے۔ میں نے دس جماعتیں پڑھی تھیں لیکن یہ لفظ کبھی نہیں پڑھا۔ آج کل تو یہ حال ہے کہ کسی جاہل اور اُن پڑھ بھوی کو خافہ پھینٹی لگا دے تو وہ پڑوسنوں سے کہتی ہے۔۔۔ "آج میکہ گھر ولے اوتر۔۔۔" لکاموڈ ٹھیک نہیں!"

مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں نے عائشہ سے یوں پوچھا تھا — ”کیا بات ہے... آج تمہاری ناک کیوں چڑھ سی ہوئی ہے؟“
 ”میں رات سوئی نہیں“ — اُس نے کہا۔

”کیوں؟“
”کیا بتاؤں؟“ — اُس نے آہ لے کر کہا — ”تم سمجھتے ہو گے کہ اس لڑکی
چال چلن شادی سے پہلے کا خراب ہے۔ تم جو چاہو کہہ سکتے ہو۔ غلطی میری ہے۔ جمہور
میری ہے۔“
”یہ کس پکڑ میں پڑ گئی ہو عائشہ؟“ — میں نے کہا — ”میں نے تمہیں کوئی
طعنہ نہیں دیا۔“

”میں اس خاوند کے ہاتھوں بہت تنگ اور مجبور ہوں۔“ اُس نے کہا۔
 ”ایک تو میں عورت ذات، دوسرے غریب کی بیٹی۔ اگر کبھی بوڑھے ٹھیکڑے کے ساتھ بانا
 دیتے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی.... مہیے خاوند کو تم نہیں جانتے۔ اس کی شادی
 ہونی ہی نہیں چاہیے تھی۔ یہ شادی کے قابل ہے ہی نہیں۔ یہ اس قابل ہے کہ
 نوکری کرے اور مال باپ کی خدمت کرے۔ اگر اس کا رنگ تو بھلا کالا ہوتا تو
 بھی میں اسے خوشی سے قبول کر لیتی لیکن یہ بھس کا مریض ہے اور یہ اگر عورتِ شریف
 تو مرد بھی نہیں۔ رات کو میں یہی سوچتی رہی کہ اس کے ساتھ ساری عمر کیسے گزار دوں
 اس کے دماغ میں بھی کوئی خرابی ہے۔“

عائشہ کو پہچان ہی نہ سکا۔ اس نے اپنے بال نوچ نوچ کر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ اس طرح لال سرخ تھا جیسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ اس نے اپنی فیض بھی پھاڑی ہوئی تھی۔ اس کی ساس الگ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کا خاوند بھی وہیں تھا۔ خاوند کا نورنگ ہی اڑا ہوا تھا۔ عائشہ نے مجھے اور آبا جان کو دیکھا تو اس نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ میرا دل دہل گیا اور آبا جان بھی ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے ساتھ ہی عائشہ لیٹے لیٹے جا رہی تھی۔ اچھلی اور فرخس پر چاڑھی۔ آبا جان اور عائشہ کا سر اسے اٹھانے لگے تو اس نے اٹھ کر اپنے بازوؤں اور جسم کو اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ دونوں بوڑھے دیوار سے جا گئے۔ اس کا خاوند اور میں بڑی تیزی سے آگے بڑھے۔ خاوند نے اس کے بازو پکڑے، میں نے اسے گھر سے دبوچ لیا۔ عائشہ نے اپنے خاوند سے بازو چھڑا لیے۔ خاوند کمزور سا آدمی تھا، وہ ابھی کھڑا دیکھ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ عائشہ نے اس کے منہ پر اتنی زور سے پتھر مارا کہ خاوند چکر اکر پلنگ پر جا گرا۔

میں نے اسے گھر سے پکڑے ہوئے اٹھا کر پلنگ پر پھینکا۔ وہ پیٹھ کے بل پلنگ پر گر پڑی۔ میرے بال ذرا لمبے تھے۔ عائشہ نے میکہ بال مٹھی میں لے لیے اور مٹھی اتنی زور سے بند کی کہ مجھے بال سمجھنے سے شدید درد ہوا۔ اس نے میرے بالوں کو پکڑے ہوئے اپنے ہاتھ کو زور زور سے جھٹکے دیے۔ میکہ دانت درد سے بچنے لگے۔

"میں اس سے چلا جا"۔ عائشہ نے دانت پس کر کہا۔ "میں تجھے قتل کر دوں گا۔ میں اس کے خاوند کو بھی قتل کر دوں گا۔"

"میں جا رہا ہوں"۔ میں نے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو۔"

اس نے میکہ بال چھوڑ دیے۔ اس نے اس طرح بات کی تھی جیسے وہ عورت نہیں بلکہ مرد ہے۔ یہ صاف نشانی تھی کہ اس پر جن کا قبضہ ہو گیا ہے۔ وہ تو بے ماندگی کا دور تھا، آج تعلیم اور ترقی کے دور میں بھی لوگ عقیدے کی طرح ملتے ہیں کہ جو انسان اس طرح جنات کے قبضے میں آجائے، ظاہری طور پر تو وہ خود بولتا ہے لیکن وہ دراصل ہونا نہیں ہے، جو اس کی زبان سے بول رہا ہوتا ہے۔

جس پر جن کا قبضہ ہوتا ہے اسے جن دوسرا شخص سمجھا ہے۔ مثلاً جن کتا ہے کہ میں اسے مار ڈالوں گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ متاثرہ شخص یہ کہہ رہا ہے کہ میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گا۔

میرے والد صاحب اور باقی سب نے جب یہ سنا کہ یہ لڑکی اپنے آپ کو مرد سمجھ کر

بول رہی ہے تو سب سے پہلے میکہ آبا جان بولے کہ یہ تو جن ہے۔

"ہاں اُ"۔ عائشہ بولی۔ "میں جن ہوں۔ یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

عائشہ کے سر اور ساس نے قریب آکر ہاتھ جوڑے اور منت سماجت کرنے لگے۔ "ہم غریبوں سے آپ نے کیا لینا ہے شاہ جی اُ"۔ سر نے کہا۔ "ہم سے یا اس بیچاری سے کوئی غلطی قصور ہو گیا ہے تو معاف کر دیں۔ ہم غریبوں کو یہ سزا نہ دیں۔"

"میں نہیں جاؤں گا"۔ عائشہ نے کہا۔ "میں نہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس کے خاوند کو نہیں چھوڑوں گا۔"

اس کے ان الفاظ سے بلکہ جھکی نے ہم سب پر دہشت طاری کر دی۔ میں بھی جنات کے وجود کا قائل تھا۔ ہر کوئی مانتا تھا کہ جنات موجود ہیں۔ اور اگر کوئی انسان کسی جن کو پریشان یا تنگ کرے تو وہ جن اس کا یہی حال کرتا ہے جو میں عائشہ کا ہوتا دیکھ رہا تھا۔ چونکہ جنات کے متعلق یہ عقیدہ عام رہا ہے اور اب بھی عام ہے۔ اس لیے جن لکائے والے عامل اور شاہ جی وغیرہ بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے قبضے میں جنات ہیں اور کسی انسان پر کوئی جن قابض ہو جائے تو اسے وہ بھگا سکتے ہیں۔ لوگ ان کے عقیدت مند ہیں اور وہ ان کے دعویٰ کو برقی سمجھتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی نوجوان لڑکی کو یا کسی لڑکے کو ہسٹریا مارگری کا دورہ پڑے تو یہ عامل وغیرہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ جن کا قبضہ ہے۔ بیدھے سادھے مصیبت کے مارے لوگ ان کی باتوں کو مان کر نقصان اٹھا لیتے ہیں پھر بھی یہ نہیں کہتے کہ ۱۲۔ نے انہیں دھوکا دیا ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ عامل یا "شاہ جی" اس گھر میں ڈیرے ڈال دیتے ہیں جس گھر کے کسی فرد پر جن قابض ہوتا ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ جن تو نکل جاتا ہے لیکن عامل صاحب کچھ دن لگا کر ہی نکلتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض انسانوں پر جنات نہیں بلکہ شاہ جی قابض ہو جاتے ہیں۔



عائشہ کے متعلق ہم سب نے تصدیق کر دی کہ یہ جن کا قبضہ ہے۔ ایک شاہ جی ہمارے قصبے میں موجود تھے جن کا دعویٰ تھا کہ بڑے ہی شیطان جنات ان کے قبضے میں ہیں۔ میرے والد صاحب مجھے دوڑا یا کہ میں ان شاہ جی کے پاس جاؤں کہ انہیں اپنے ساتھ لے آؤں۔

میں دوڑا گیا۔ شاہ جی گھر میں مل گئے۔ ان کا ایک بیٹا میرا دوست تھا اس لیے

شاہ جی مجھے بڑی اچھی جانتے تھے اور مجھے اپنے بیٹوں جیسا سمجھتے تھے۔ مجھے گھرا ہوا دیکھ کر سمجھ گئے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے انہیں عائشہ کے متعلق بتایا اور ساتھ یہ کہا کہ وہ ہمارے مزار سے ہیں تو میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ شاہ جی کے چہرہ پر ناپسندیدگی کا تاثر آگیا۔ انہیں خیال آگیا ہوگا کہ غریب مزارعوں سے کیا ملے گا۔

”شاہ جی!“ میں نے کہا۔ ”بیچاری نوجوان اور بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کی شادی کو چھ مہینے بھی نہیں ہوئے۔“

یہ سنتے ہی شاہ جی کے چہرہ پر جو بے مزہ سا تاثر آیا تھا۔ وہ بدل گیا اور ان کے چہرے پر رونق آگئی۔

”وہ تو بیچارے غریب لوگ ہیں۔ میں نے کہا۔“ آپ کی خدمت تو ہم کریں گے۔“

”نہ بیٹا!“ شاہ جی نے کہا۔ ”یہ تو میرے گھر کا معاملہ ہے میں درویش آدمی کوئی خدمت نہیں کرانا چاہتا۔“

شاہ جی نے یہ بات تو کہہ دی لیکن میں نے دیکھا کہ خوبصورت اور نوجوان لڑکی اور خدمت کا سن کر ان کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ میری اس وقت عمر اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں لوگوں کے چہرے پر پڑھ سکتا لیکن شاہ جی کے چہرے پر ایسے نمایاں رنگ آئے تھے جو میں نے فردا پڑھ لیے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یقین تھا کہ شاہ جی جن کو بھگا بھگا دیں گے اور عائشہ کو نجات مل جائے گی۔

شاہ جی نے کچھ چیزیں چھوٹے سے تھیلے میں ڈالیں اور میرے ساتھ چل پڑے۔ عائشہ کے گھر پہنچے تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اب وہ اتنی زور زور سے چیخیں مارتی تھی کہ مجھے یہ کچا سا مکان کا پتا ہوا نظر آتا تھا۔ شاہ جی اس پلنگ پر بیٹھ گئے جن پر عائشہ لیٹی ہوئی تھی۔

”اچھا جی!“ شاہ جی نے عائشہ کے چہرے پر نظر میں جمانے ہوئے کہا۔

”نہ یہاں بھی پہنچ گئے ہو۔ میں نے تمہیں وہاں سے نکالا تھا۔ اور تم یہاں آگئے ہو؟“

عائشہ اٹھ بیٹھی۔

”یہاں سے نکلو گے یا نہیں؟“ شاہ جی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ عائشہ نے کہا جو دراصل جن کی آواز تھی۔ ”میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”اس بیچاری نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“ شاہ جی نے پوچھا۔

”میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“ جن نے کہا۔ ”اس لڑکی کو میں اس کے خاوند کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔ یہ میرے دل کو اتنی اچھی لگتی ہے کہ میں خود اس کے ساتھ شادی کر دوں گا۔“

”میں تمہیں یہاں سے نکال کر جاؤں گا۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”تمہارے پورے خاندان کو جلا کر رکھ کر دوں گا۔“

عائشہ نے بڑی زور سے چیخ ماری اور ہاتھ لبا کر کے شاہ جی کی دائیں پکڑ لی اور دائیں کو اوپر نیچے زور زور سے جھٹکے دیے۔ پھر دائیں چھوڑ کر شاہ جی کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ شاہ جی پلنگ سے گرے لیکن پاؤں فرش پر لگا کر سنبھل گئے۔

”اے پکڑو!“ شاہ جی نے حکم دیا۔

میں نے، عائشہ کے خاوند اور خاوند کے بھائی نے پلنگ پر چڑھ کر عائشہ کو جکڑ لیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ مجھ پر اتنا زیادہ خوف طاری تھا کہ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں لیکن میں اس لیے بھاگنے کا کوئی بہانہ نہیں سوچ رہا تھا کہ ان سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

شاہ جی نے اپنے تھیلے سے لوہان کی دو بتیاں نکالیں اور دونوں کے سروں کو جلا دیا۔ شے بجھ گئے تو بتیوں سے دھواں نکلنے لگا۔ یہ بتیاں ایک جوان آدمی کی شہادت کی انگلی تھیں مٹی اور اتنی ہی لمبی تھیں۔ شاہ جی نے ایک بتی عائشہ کی ناک کے ایک نتھنے میں داخل کر دی اور دوسری دوسرے نتھنے میں۔ یوں ہمیں کہ ایک ایک بتیاں ناک میں چلی گئی تھیں۔ عائشہ کا منہ سانس لینے کے لیے کھل گیا تھا اور دھواں اس کی آنکھوں کو لگ رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی شاہ جی نے عائشہ کے دونوں ہاتھ الٹی طرف سے ایک دوسرے سے ملا دیے اور اپنے ایک ہاتھ میں اس کے دونوں ہاتھ لے کر اتنی زور سے دبایا کہ عائشہ کی چیخیں نکل نکلیں۔

”میں دیکھتا ہوں تم کس طرح یہاں سے نہیں نکلتے!“ شاہ جی نے کہا۔

”آپ یہ سمجھ لیں کہ شاہ جی نے بالکل اس طرح عائشہ کو بلکہ جن کو مار چر کر مار چر کر مار دیا تھا جس طرح پولیس کسی ملزم یا مشتتبے سے اقبالی بیان لینے کے لیے اسے مار چر کرتی ہے۔ ہم تین آدمیوں نے عائشہ کو دو بوج رکھا تھا۔ اُسے ہم تڑپنے بھی نہیں دے



اگر میں ہر ایک تفصیل سنانے لگوں کہ عائشہ کے ساتھ کیا کیا سلوک ہوا تو میری یہ داستان جو میری عمر جتنی لمبی ہے، اور زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ یہ تو میری زندگی کا پہلا واقعہ ہے۔ میں نے تو آپ کو برما، انڈونیشیا اور وہاں سے سارے ہندوستان میں گھمانا پھرانے اور ایسے ایسے واقعات سنائے ہیں جو آپ کے رونگٹے کھڑے کر دیں گے میں عائشہ کا یہ واقعہ ذرا مختصر کر دیتا ہوں۔

سارا دن شاہ جی عائشہ کو مار چڑھتے رہے کبھی بتیاں اس کی ناک سے نکال لیتے اور اس کے ساتھ کچھ باتیں کر کے اور کچھ دھمکیاں دے کر پھر اس پر تشدد شروع کر دیتے۔ میرے دل کو بہت ہی تکلیف ہو رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ ایک تو جن ہے جس نے عائشہ کے وجود کو اپنے قفسے میں لے رکھا ہے اور دوسرے شاہ جی نے جو دراصل جن پر تشدد کر رہے ہیں لیکن یہ تشدد عائشہ کے جسم کو اذیت دے رہا تھا۔

میرے ابا جان دوپہر کو مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ وہ کہتے تھے کہ شاہ جی اس کو بھگا دیں گے۔ میری جذباتی کیفیت یہ تھی کہ عائشہ کے پاس جا پہنچوں اور اُسے اس اذیت سے نجات دلاؤں لیکن اُس کے پاس جانے کے خیال سے ہی دل خوف کی گرفت میں جکڑا جاتا تھا۔ پھر ایک اور خوف دل پر آ پڑا۔ جن نے کہا تھا کہ عائشہ اس کے دل کو بہت اچھی لگتی ہے۔ جن نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ عائشہ کو خاوند کے پاس نہیں رہنے دے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن عائشہ پر عاشق ہو گیا تھا۔ میں اس خوف میں مبتلا ہو گیا کہ جن میرا بھی دشمن ہو جائے گا کہ عائشہ کے ساتھ میرے بھی خفیہ تعلقات تھے۔

رات کو میری امی عائشہ کو دیکھنے گئی۔ واپس آ کر اُس نے کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر سنایا کہ عائشہ کی حالت کتنی بُری ہے۔ شاہ جی ابھی وہیں تھے اور جن ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم عائشہ کا زونڈی کی طرح ڈھنکا جا رہا تھا۔

اگلے روز میرے ابا جان وہاں گئے۔ میں اس ڈر سے نہ گیا کہ جن مجھے اپنا رقیب سمجھ کر میرا گلہ دباوے گا۔ ایک روز پہلے جن نے میرے بال پکڑ لیے تھے۔ اُس وقت تو میں سمجھا تھا کہ بال عائشہ نے پکڑے ہیں۔ اُس نے میسرے بال کھینچ کر کہا تھا یہاں سے نکل جا۔ پھر شاہ جی نے بتایا کہ یہ جن ہے تو مجھے احساس ہوا کہ میرے بال جن نے پکڑے تھے۔ اُس نے بال کھینچے تھے تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ میری کھوپڑی سے کمال اُکھڑ رہی

ہے۔ یہ گرفت جن کی ہو سکتی تھی۔ عائشہ میں اتنی طاقت تو نہیں تھی۔

دیہاتی علاقوں میں آج بھی لوگ مانتے ہیں کہ کوئی جن کسی لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے اور کوئی چڑیل اپنی پسند کے کسی آدمی کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ایسا جن انسان کے روپ میں آ جاتا ہے اور ایسی چڑیل بڑی خوبصورت عورت کا روپ دھار لیتی ہے۔ میری نوجوانی کے زمانے میں اس قسم کی کہانیاں مشہور تھیں کہ ایک آدمی مر گیا تو اُس کی بیوی اُس کی میت پر روتے روتے غائب ہو گئی۔ مرنے والے کے ایک دوست نے بتایا کہ یہ عورت نہیں بلکہ عورت کے روپ میں چڑیل تھی جو اتنے سال اُس آدمی کی بیوی بنی رہی تھی۔ وہ آدمی مر گیا اور چڑیل اپنے روپ میں غائب ہو گئی۔

آپ نے اپنے دوستوں یا رشتہ داروں میں سے کسی شادی شدہ آدمی کو یہ کہتا سنتے ہوں گے۔ ”میرے ماں باپ نے کیا چڑیل میرے پلے باندھ دی ہے۔“ اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس شخص کی بیوی واقعی چڑیل ہے جس نے عورت کا روپ دھار رکھا ہے۔ ایسے مظلوم خاوندوں کی بیویاں دراصل عورتیں ہوتی ہیں جو شادی کے بعد چڑیلوں کے روپ میں آ جاتی ہیں۔

ابا جان نے بتایا کہ شاہ جی ساری رات عائشہ کے گھر میں اسی طرح رہے کہ انہوں نے گھر کے کسی اور فرد کو اندر نہیں جانے دیا کہتے تھے کہ وہ جن کے ساتھ تنہائی میں شرطیں اور سولے کر رہے گئے۔ یہ بھی پرستہ چلا کہ جن پہلے سے زیادہ بگڑ گیا ہے۔

شام کو عائشہ کا خاوند آیا۔ اُس نے بتایا کہ شاہ جی یہ کہہ کر چلے گئے ہیں کہ یہ جن کا فر ہے اور شیطان کا خاص چیل ہے۔ اسے وہ اپنے گھر بیٹھ کر ایک بڑے ہی سخت عمل کے ذریعے جان سے مار دیں گے۔

دو دن شاہ جی عائشہ کے گھر نہ گئے۔ کسی نے ان لوگوں کو ایک اور شاہ جی کا پرستہ بتایا۔ یہ شاہ جی تین میل دور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ عائشہ کا سر اُسے ساتھ لے آیا۔ معلوم ہوا کہ جن نے اس کا بھی استقبال بڑی بدتمیزی سے کیا لیکن اس شاہ جی نے عائشہ پر تشدد نہیں کیا بلکہ جن کے ساتھ کے ساتھ بڑی شرافت سے مذاکرات کرتے رہے۔ اس شاہ جی کے کہنے پر جن نے روٹی کھائی اور پانی بھی پیا۔ میں چار دن جن نے کچھ نہیں کھایا تھا، یعنی اتنے دن عائشہ کا پیٹ خالی رہا تھا۔

یہ شاہ جی جن سے یہ پوچھ رہا تھا کہ یہ چاہتا کیا ہے اور کس شرط پر وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے گا۔

خاوند اسے طلاق دے دے۔ جن نے کہا۔

”عزیزوں کا گھر نہ آ جاؤ۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”یہ لڑکی بھی آ جڑھائے گی۔ اس کے اور اس کے خاوند کے مال باپ ان کے لیے نئے رشتے ڈھونڈتے پھرتے گئے، نئے سرے سے ان کو رقمیں خرچ کرنی پڑیں گی۔“

”لڑکی کے لیے فوراً رشتہ مل جائے گا۔“ جن نے کہا۔ ”اس کے خاوند کی مجھے پروا نہیں۔“

شاہ جی جن کی منت سماجت کرتے رہے لیکن جن نہیں مان رہا تھا۔

”میں ابھی تمہاری منت کر رہا ہوں۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”میرے ہاتھیں اتنا سخت عمل ہے کہ میں تمہارا بیٹہ غرق کر سکتا ہوں۔“

”میں اس کے خاوند کو جان سے مار ڈالوں گا۔“ جن نے کہا۔ ”میں تین دنوں کے لیے جا رہا ہوں۔ اگر ان تین دنوں میں اس لڑکی کو خاوند نے آزاد نہ کیا تو میں خاوند کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

جن چلا گیا لیکن عائشہ کی جسمانی حالت اتنی بری تھی کہ وہ بنگ سے اٹھ نہ سکی۔ ”تم اب اپنا بڑا بھلا سوچ لو۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”بڑا ظالم جن ہے۔ تمہیں اپنے بیٹے کی جان کی سلامتی چاہیے تو اس لڑکی کو طلاق دے دو۔۔۔ اور یہ خیال بھی رکھنا کہ کسی اور عامل کو نہ لے آنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس امید پر لگے رہو اور جن اپنا وار کمرہ جلتے ہیں تم سے کوئی نذرانہ، کوئی پیسہ دھیلانہیں لوں گا۔ میں تمہارا کام نہیں کر سکا۔ صرف اتنا کیا ہے کہ جن کا مقصد اور ارادہ معلوم کر لیا ہے۔“



یہ شاہ جی چلا گیا۔ عائشہ کا سر سرسٹاں اور خاوند ہمارے گھر آئے اور بتایا کہ جن یہ الٹی میٹم دے کر تین دنوں کے لیے چلا گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ نینوں ہمارے گھر آگئے ہیں اور یہ سنا کہ جن چلا گیا ہے تو میں گھر سے پچھلے سے کھسک گیا۔ میں عائشہ کو تنہائی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ نہ سوچا کہ اس کے خاوند کا بھائی گھر ہو گا۔

میں ڈرتے ڈرتے اس گھر میں داخل ہوا اور بنگ والے کمرے میں گیا عائشہ بنگ پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ پہلے تو یہ شک ہوا کہ یہ عائشہ نہیں۔ بال بھرے ہوئے، آنکھیں لال سرخ اور اندر کو دھنسی ہوئیں، اس کا اتنا زیادہ دلفریب رنگ لاش کی طرح پھیکا سفید ہو گیا تھا۔ وہ بی بی کی آخری سیج کی مرلیفہ لگتی تھی۔ اس کا دیوہار پانی پر بیٹھا تھا۔

”جا میرے بھائی!۔“ عائشہ نے مریل سی آواز میں دیور سے کہا۔ ”مولیشیل کو

پانی پلا لا۔ مجھے تو آج ذرا ہوش آئی ہے۔“

قریب ہی برساتی نالہ تھا۔ مولیشی وہاں سے پانی پیا کرتے تھے۔ میں کچھ گلا عائشہ دیور کو کھسکا رہی ہے۔۔۔ دیور بر خورداروں کی طرح اُٹھا، دونوں سیلوں اور گدھی کو کھول کر لے گیا۔

”منا ہے جن تین دنوں کے لیے چلا گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اچھے بھی منا ہے۔۔۔“

”تم نے جو سنا ہے سب جھوٹ ہے۔“ عائشہ نے کہا۔ ”صرف تم جو جے اپنا بھید دے رہی ہوں۔ تمہارے اور میرے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ میرے دل میں جو کچھ اور اس دل میں جو کچھ بھی تھا وہ تمہارے آگے دکھ دیا تھا۔“

”بات صاف صاف کرو اور جلدی کرو۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی آگیا تو بات سنو یہ رہ جائے گی۔“

”صاف صاف بات یہ ہے کہ مجھ پر کسی جن کا قبضہ نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے تنگ آ کر یہ ناٹک کھیلا ہے۔ ہمارے گاؤں سے چار کوس دور ایک گاؤں کی ایک لڑکی نے لیے ہی کیا تھا۔ اس کی ایک سیسل ہمارے گاؤں میں بیابا ہوئی آئی ہے۔ وہ میری سیسل بن گئی تھی۔ اس نے مجھے اس لڑکی کی بات اس طرح سنائی تھی کہ اپنی پسند کے ایک لڑکے کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی لیکن ماں باپ نے بات کسی اور کے ساتھ ہی کر دی۔۔۔۔“

”اس لڑکی کو ایک خزانہ عورت نے یہ سوانگ رجانے کا مشورہ دیا۔ لڑکی نے ایسا ڈھونگ بچایا کہ اس کے گھر والوں پر آفت آگری۔ امیر کبیر لوگ تھے۔ پیر الوہاں بن بلانے دوڑے آئے۔ سب نے کہا کہ بڑا زبردست جن ہے۔ تین چار دنوں بعد میں بول پڑا۔ اس نے کہا کہ اس لڑکے کے ساتھ اس کی شادی کی گئی تو لڑکے کا کلیجہ منہ کے راستے باہر نکال دوں گا۔ لڑکے والوں کو خبر ملی تو انہوں نے لڑکی کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا۔۔۔۔“

”تم جانتے ہو کہ جتوں سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جی موجود ہیں۔ میں اپنے خاوند سے اتنی تنگ آ گئی تھی کہ میں نے پہلے تو یہ سوچا تھا کہ اسے زہر دے دوں یا خود زہر کھا لوں۔ پھر میں نے مبر کر لیا اور دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ قسمت میں جو کچھ تھا

مل گیا ہے لیکن انسان کو یہ تو بہتہ ہی نہیں ہوتا کہ قسمت میں اور کیا کچھ لکھا ہے۔ ہم لوگ یہاں آگئے اور دم مل گئے۔ تمہیں دیکھ کر میرا دماغ کسی اور طرف چل پڑا۔
لیکن عائشہ! — میں نے کہا — میں اکیلا ہی تو قصور وار نہیں!

”میں تمہیں قصور وار نہیں کہہ رہی“ — عائشہ نے کہا — ”قصور میرا ہی سمجھ لو میرا بتا رہی ہوں کہ تم میرے پاس آگئے تو میرا صبر ختم ہو گیا۔ خاوند مجھے اور زیادہ بڑا لگنے لگا۔۔۔ ایک روز میرے دماغ میں یہ سوچ آئی کہ یہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور زندگی اس طرح تو نہیں گزرے گی۔ آخر تمہاری شادی ہو جائے گی اور تم کسی اور کے ہو جاؤ گے۔ یہ سوچ بھی آئی کہ میں اپنے جیسی کسی عورت کو دھوکا نہیں دوں گی اور کسی کا حق نہیں ماؤں گی۔ میرا تم پر کوئی حق نہیں۔ تم میرے خاوند نہیں بن سکتے، کچھ عرصہ میرے ساتھ پیار محبت کا کھیل کھیل سکتے ہو۔۔۔“

خدا کی قسم، دماغ میں کبھی گناہ کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میں ایک پوری رات جاگ کر سو جاتی رہی۔ یہ سوچ بھی آئی کہ تم زمین جاؤ اور والوں کے بیٹے ہو اور میں تمہارے مزارعوں کی ہو ہوں۔ میرا تمہارا ساتھ نبھ ہی نہیں سکتا۔ میں بہت پچھتائی اور اس سوچ میں آکر میرا دماغ ٹھہر گیا کہ کوئی دوسرا گناہ کروں جس سے اس بیکار خاوند سے نجات مل جائے اور پھر وہ آدمی مل جائے جسے میں اپنا خاوند کہہ سکوں۔ مجھے وہ لڑکی یاد آگئی اور میں نے یہ ڈھونڈ رکھا دیا۔

”یہ ڈھونڈ کام کر گیا ہے“ — میں نے کہا — ”کوئی ماں باپ اپنے جوان بیٹے کو مروا نہیں جانتے تمہیں طلاق مل جائے گی۔۔۔ میں شاہ جی پر حیران ہوں کہ انہوں نے ویسے ہی کہہ دیا کہ یہ جن ہے اور بیکار اور شیطانی ہے۔“

”شاہ جی کی بات سن لو“ — عائشہ نے کہا — ”وہ پوری رات ہمیں رہا اور سب کو باہر نکال کر دروازہ اندر سے بند کر دیا، پھر میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ تم اپنے سسرال سے کوئی بات منوانا چاہتی ہو تو مجھے بتا دو۔ میں انہیں ڈرا کر منوا لوں گا۔۔۔ میں نے اُس کی اس بات کی پرواہ نہ کی اور جنوں کی طرح بولتی رہی۔ آدھی رات کے بعد اس شاہ جی نے میرے جسم کے ساتھ کھینا شروع کر دیا۔ میں نے اُس کے منہ پر بڑا ہی زوردار تھپڑ مارا اور جن کی زبان میں کہا۔ ہاتھ نیچے رکھ بد محاش، یہ لڑکی میری ہے۔۔۔“

”میں اُس کی نیت جان گئی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ شاہ جی اور میری جی اندر سے

کیا ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے میری ماں مجھے اپنے پیر کے پاس مرید بنانے کے لیے لے گئی تھی۔ پیر نے کہا کہ اپنی بیٹی کو اکیلے میں میرے پاس بھیجنا۔ دوسرے دن ماں نے مجھے پیر کے پاس بھیج دیا۔ پیر مجھے الگ کمرے میں لے گیا۔ اُس نے شیطانی حرکتیں شروع کر دیں اور میں وہاں سے بھاگ آئی۔
”ایک اور شاہ جی آئے تھے!“ — میں نے کہا۔

”وہ شریف آدمی ہے“ — عائشہ نے کہا — ”اس نے بھی یہی کہا ہے کہ یہ جن ہے لیکن اُس کی نیت بری نہیں تھی۔۔۔ اب تم چلے جاؤ۔ یہ لوگ آنے والے ہوں گے۔“
”تم یہاں سے چلی گئیں تو میرا کیا بنے گا؟“ — میں نے جذباتی لہجے میں کہا — ”پھر تم مجھے کیسے اور کہاں ملو گی؟“

”مجھے طلاق مل گئی تو اپنے گاؤں چلی جاؤں گی“ — اُس نے کہا — ”میں تمہیں کہیں بھی نہیں ملوں گی نہ ملنے کی کوشش کروں گی نہ دل میں ملنے کی خواہش رکھوں گی۔ دوسری شادی کروں گی اور اپنے خاوند کی ہو کے رہوں گی۔“
میں وہاں سے اس طرح نکلا کہ میرا سر ٹھکا ہوا تھا اور مجھ پر ایسی کیفیت طاری تھی جس میں ندامت بھی تھی اور مرعوبیت بھی۔



عائشہ کا سسر اور ساس عائشہ کے گاؤں چلے گئے۔ اُس کے ماں باپ کو بتایا کہ ایک جن نے عائشہ کے لیے اور اُن کے لیے کیا صورت حال پیدا کر دی ہے۔ وہ دوڑے آئے۔ عائشہ نے انہیں دیکھتے ہی اپنے اوپر وہی کیفیت طاری کر لی جیسے اُس کے وجود میں جن حاضر ہو گیا ہو۔

”اے یہاں سے لے جاؤ“ — جن نے عائشہ کی زبان سے کہا — ”اے خاوند نے طلاق نہ دی تو خاوند کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اور لڑکی کو میں غائب کر دوں گا۔“

اُسی روز طلاق ہو گئی۔ جن رخصت ہو گیا اور عائشہ کو اُس کے ماں باپ گاؤں لے گئے۔ یہ میری زندگی کا پہلا اور بڑا ہی اذکھا تجربہ تھا۔ میرے لیے عائشہ کا کردار بڑا ہی عجیب تھا۔ میں اُسے سیدھی سادی دیہات سمجھتا تھا لیکن اُس نے جس کامیابی سے ایکٹنگ کی اور اُس نے میرے ساتھ جو باتیں کہیں میری جھٹی کروادی، ان باتوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔

میں نے سنا تھا کہ عورت ایک بھید ہے جسے آج تک کوئی نہیں پاسکا۔ یہ بھی

سنائیا کہ عورت نے بادشاہوں کے تختے اُٹلے ہیں اور یہ بھی سننا تھا کہ عورت بادشاہ کو بھکاری اور بھکاری کو بادشاہ بنا سکتی ہے۔
یہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

میں نے ایسے کچھ واقعات سنے تھے۔ میسر قصبے میں دو آدمی تھے جو اپنے فرا کی وارداتیں خود ہی سنایا کرتے تھے۔ ان میں ایک سکول ٹیچر تھا۔ وہ گرمیوں کی چٹھیوں میں درویشی کا بہروپ دھار کر دیہاتی علاقے میں چلا جاتا اور مینے ڈرا مینے میں اچھی خاصی رقم کمالاتا تھا۔ وہ اکثر اپنے دوستوں کو بڑے دلچسپ واقعات سنایا کرتا تھا۔

وہ جس علاقے میں جایا کرتا تھا، اس علاقے کے چند ایک جرائم پیشہ اور فراڈیے اُسے مختلف گھروں کے مسائل پہلے ہی بتا دیتے پھر ہر گاؤں میں خبر پھانپ دیتے کہ شاہ جو کہیں جا رہے تھے اور فلاں گاؤں والوں نے انہیں روک لیا ہے۔ دوسرے گاؤں کے حاجت مند لوگ دوڑ دوڑ کر شاہ جی کے پاس آتے، اپنی مشکلات اور مرادیں پیش کرتے اور شاہ جی کو من مانگے نذرانے دے کر چھوٹی امیدوں سے سرشار چلے جاتے تھے۔ دوسرے آدمی کا بھی یہی طریقہ واردات تھا۔ وہ بھی ایک دو مہینوں کے لیے دیہات سے نکل جاتا اور پہنچ والا بزرگ، اور غیب کا حال جاننے والا عامل، بن کر چرب زبانی کے جادو سے پسماندہ اور مجبور دیہاتیوں کو خوب ٹھکاتا اور اپنے خاندان کے لیے پورے سال کا خرچہ کمالاتا تھا۔

ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ سکول ٹیچر چالیس سال سے کم عمر کا تھا۔ اس کی داڑھی نہیں تھی۔ وہ نوسر بازی کے لیے جاتا تو پندرہ بیس دن پہلے شیو چھوڑ دیتا اور واپسی تک شیو نہیں بناتا تھا۔ دوسرے آدمی کی عمر پچاس سال سے کچھ اوپر تھی۔ اُس نے ایک بالشت لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی جس کے آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ اگر میں ان دونوں کے سنائے ہوئے نوسر بازی اور دیہاتیوں کی سادگی کے واقعات سنائے مگوں تو یہ ایک الگ کتاب بن جائے لیکن میں اس باب کو مختصر رکھوں گا کیونکہ میں آپ کو اپنے ساتھ بڑے بے سفر پرے جا رہا ہوں۔

چونکہ بات عائشہ کی ہو رہی ہے اس لیے یہ دو آدمی یاد آگئے تھے۔ مہانوں نے ایسے ہی واقعات سنائے تھے جیسا عائشہ کا میں نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔ انہوں نے جو واقعات سنائے تھے وہ عائشہ کی ایکٹنگ سے ذرا مختلف تھے۔ وہ اس طرح کہ ان دونوں نوسر بازی

ن کوئی ایک کسی گاؤں میں گیا ہوا ہے۔ اُسے بتایا جاتا ہے کہ ایک جوان لڑکی کو کوئی دورہ رہا ہوا ہے۔ شاہ جی کو لڑکی کے گھلے جایا جاتا ہے۔ وہ لڑکی کی حرکتیں دیکھتا اور اُس کی باتیں لہے۔ گھر کے تمام افراد کو باہر نکال کر دروازہ بند کر لیتا ہے۔ لڑکی سے پوچھتا ہے، کیا چاہتی ہو؟ سوچ سوچ بنا دو دروازے باپ کو بتا دوں گا کہ اس لڑکی کو کچھ بھی نہیں، یہ اپنی کوئی بات منوانے کے لیے ڈرامہ کر رہی ہے، اگر بتا دوں تو میں تمہاری خواہش اور مرضی پوری کروا دوں گا لیکن تمہیں میسر دو مطالبات پورے کرنے پڑیں گے۔

لڑکی بتا دیتی ہے کہ جس لڑکے کے ساتھ اُس کی شادی طے کی گئی ہے، اسے وہ بند نہیں کرتی اور وہ فلاں کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ شاہ جی، بند کرے میں لڑکی سے اپنے مطالبات پورے کروا کے اُسے کچھ اور ایکٹنگ سکھاتا ہے اور ایک دو دنوں میں لڑکی کے والدین، جن کا مطالبہ پورا کر دیتے ہیں۔

چھوٹی عمر والا نوسر باز ایک بار ایک گاؤں سے ایسی ہی ایک لڑکی کے کانوں سے دلنے کے جھکے اُتر کر اُگلے آیا تھا۔ یہ لڑکی نے اُسے بقائی بکوش و حواس خود دیے تھے۔ سر ہانڈے گھر والوں سے منوالیا تھا کہ جن اتنے غصے میں نکلا ہے کہ لڑکی کے جھکے اتار دے گی ہے۔

خدا شہر ہے کہ دیہاتی ہی نہیں، شہروں کے پڑھے لکھے لوگ بھی اس خرافات مانتے، دھوکہ کھاتے اور عاملوں کے ہاتھوں لوٹے جاتے ہیں۔

میں فلا سفر نہیں، عالم دین نہیں اور میں سوشیا لو جٹ بھی نہیں۔ میں نے وعظ نہیں رنی نہ لیکچر دینا ہے نہ ہندو نصیحت کرنی ہے میں واقعات سننا رہا ہوں، کچھ کر دار دکھا رہا ہوں۔ آپ اپنی رائے میں آزاد ہیں۔ جو نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں کر لیں۔ میں یہ کہوں گا کہ ہمارے معاشرے میں عامل، شاہ جی، پیر، جوتشی اور نجومی وغیرہ بہت ہی خطرناک مجرم ہیں۔ عائشہ ایک پراسرار تصور بن کر میسر دین میں رہ گئی اور میری زندگی سے اُس کا جوڑویش کے لیے نکل گیا۔



میری زندگی میں ایک اور لڑکی عائشہ سے پہلے داخل ہو چکی تھی۔ اُس کے ساتھ بڑے تعلقات عائشہ دلے نہیں تھے۔ وہ ایک بڑے زمیندار کی بیٹی تھی۔ اپنے علاقے اُس کی خاصی زمین تھی۔ پانچ چھ ایکڑ میں اس کا سبز یوں کا باغ تھا جس میں ناشپاتی

خوبانی اور آپ کے بھی درخت تھے۔ سبز پلوں کو پانی دینے کے لیے رہٹ تھا۔ اس زمیندار کی سنہری علاقے میں بھی انگریزوں کی دی ہوئی دو تین مریلے اراضی تھی۔

اسے میں راجہ کھول گا اور اس کی بیٹی کا جو کچھ بھی نام تھا وہ مجھ تک ہی رہے دیں، کہانی میں اُس کا نام واجدہ لکھول گا۔ راجے کے خاندان کی روایت یہ تھی کہ روپر پیسہ اور اناج گھر میں جتنا بھی آئے کم ہے، تعلیم کا ایک لفظ بھی گھر میں داخل نہ ہونے پائے۔ یہ لوگ جتنے اُن پڑھتے تھے، پکڑیوں کے شلے اتنے ہی اونچے رکھتے تھے۔ یہ اپنے آپ کو اونچی ذات کی وجہ سے چھوٹی ذاتوں کو بیچ سمجھتے تھے۔ ان کے اونچے پن میں جو بیچ بن تھا، یہ انہوں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

میں ذرا چھوٹی ذات کے خاندان کا فرد تھا۔ میں نے میٹرک پاس کر لی تو کبھی کبھار یہ راجہ صاحب مجھے اپنے گھر بلا لیا کرتے اور ساتھ حکم دیتے کہ قلم دوات اور کاغذ لیتے آنا۔ میں چلا جاتا۔

”اُسے آگیا تو؟“ راجہ ایسے لمحے میں کہتا جیسے آقا اپنے غلام کو حکم دیتا ہے۔
”قلم دوات اور کاغذ لایا؟“

”لایا راجہ جی!“
”خط لکھ لے گا؟“
”لکھ لوں گا۔“

دیکھتا ہوں تو کس طرح لکھتا ہے۔ راجہ طنز یہ لمحے میں کہتا۔ ”تو اتنا لائق کہاں سے آگیا.... لکھ!“

جناب راجہ صاحب خود چٹے اُن پڑھ، اردو بول بھی نہیں سکتے، مجھ سے خط لکھا رہے ہیں اور تھوڑے وقفے سے کہے جارہے ہیں۔ ”تو تو یار بڑا نالائق ہے۔“ اور کبھی کہتے۔ ”معلوم ہوتا ہے تو نے چھوٹے دے کر دس جماعتیں پاس کی ہیں۔“ مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہیں اُسے کہتا، راجہ جی، آپ تو کورے اُن پڑھ ہیں.... دراصل راجے کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اُن پڑھ ہے، یا یہ کہ وہ اُن پڑھ ہی ہے لیکن مجھ سے محبوب نہیں کہیں میں میٹرک پاس ہوں۔

پھر اس راجے کے گھر میں انقلاب آگیا۔ اُس کا بڑا بیٹا تیرہ چودہ سال کا ہو گیا تھا۔ دوسری جماعت سے بھاگ گیا اور اس نے پڑھنے سے ایسی تو بکی کہ پھر کبھی سکول نہ گیا۔ اُس کا چھوٹا بیٹا آٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ اُسے اُس نے سکول میں داخل کرایا ہی نہیں

تھا۔ سنا تھا راجے نے دو تین بار کہا تھا۔ ”تعلیم حاصل کر میں چھوٹی ذاتوں والے بہنوں نے تو کمزیاں کرنی ہیں۔ ہماری اولاد اُن پڑھ رہی تو بھی حکم ہی چلائے گی۔“

”راجے کے گھر میں نہ جانے کیسے یہ انقلاب آگیا کہ اس نے چھوٹے بیٹے کو سکول میں لے کر دیا۔ اُس وقت اُس کی بڑی بیٹی کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ باپ نے بیٹوں کو نہیں پڑھایا تھا، بیٹی کو پڑھانے کی تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن ایک روز راجے نے مجھے گھر بلا کر حیران کر دیا۔

”آج سے میں تمہیں ایک ڈیوٹی دے رہا ہوں۔“ راجے نے کہا۔ ”واجدہ کو پڑھانا ہے۔ یہ سکول میں تو داخل نہیں ہو سکتی، اسے تم گھر پڑھا دیا کرو۔ تمہیں جو وقت ملے، اُس وقت آجایا کرو اور دو تین گھنٹے لڑکی کو پڑھا دیا کرو۔ قاعدہ، تختی اور قلم دوات کا بندوبست میں کر دوں گا۔“

راجے نے یہ نہ کہا کہ وہ مجھے اس کام کی اجازت دے گا یا نہیں۔ اُس کا انداز بیٹے لوگوں والا تھا اور وہ مجھے حکم دے رہا تھا۔ میں نے گھر آکر اپنے والدین کو بتایا تو والد صاحب نے اجازت دے دی۔ انہوں نے کہا کہ یہ بڑے لوگ ہیں اور یہ بددماغ ہیں۔ ہم نے ان کے ساتھ رہنا ہے، تم ویسے بھی فارغ ہو، وہاں چلے جایا کرو۔“

مسلمانوں کی پسندیدگی اور بد نصیبی کا یہ حال تھا کہ وہ اُس دور میں بیٹوں کو بھی تعلیم سے دور رکھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہندو اور سکھ اپنی بیٹیوں کو بھی سکولوں میں پڑھاتے تھے۔ میں حیران تھا کہ راجہ ایسی بیٹی کو کیوں پڑھانا چاہتا تھا۔ میں راجے سے یہ وجہ معلوم نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اگلے روز واجدہ کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ان لوگوں کی بہت بڑی عیبی تھی۔ اس میں چھوٹا سا ایک کمرہ تھا جس میں ایک پینک اور دو کرسیاں تھیں۔ واجدہ کے باپ نے ہم دونوں کو اس کمرے میں بٹھا دیا۔

”دیکھ بچے!“ راجے نے کہا۔ ”تم نے اسے اس قابل بنا دینا ہے کہ یہ خط پتر لکھ لیا کرے۔“

”ہاں راجہ جی!“ میں نے کہا۔ ”میں اسے اس قابل بنا دوں گا۔“ راجہ جی ہمیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ واجدہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی نہ میں اُس کے لیے اجنبی تھا۔ اُس کا گھر ہمارے گھر سے دور نہیں تھا۔ اُن کی گلی تنگ تھی ہماری گلی بہت کشادہ تھی۔ اس لیے زیادہ تر بچے ہماری گلی میں آکر کھیل کر تے تھے۔ ان میں واجدہ

میں جوتی تھی۔ وہ تیرہ سو سال عریک ہماری گلی میں کھیلتی رہی تھی۔ اُن کے ہاں لڑکیوں کو پڑھنے میں بھلائے کا رواج نہیں تھا۔ ذرا اور بڑی ہو کر واجدہ نے گلی میں کھیلنا چھوڑ دیا تھا، پھر بھی وہ دوسرے دوسرے دن نظر آ جاتی اور ہم بٹنے منکر لے آئیں دوسرے سے شریعت دریافت کرتے تھے۔

اب واجدہ کی عمر سترہ سال سے کچھ اوپر ہو گئی تھی۔ وہ تو بچپن ہی سے خوبصورت تھی۔ لیکن سترہ سال کی عمر میں اُس کے حسن میں جو نکھار آیا، وہ دیکھنے اور محسوس کرنے والا تھا۔ کچھ اندکھ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اُس کے قد کا ٹھ میں اپنی سی ایک کشش تھی۔ رنگ گورا، چہرے کے نقش و لہریں اور گردن لمبوتری تھی۔

وہ گھر پر لڑکیوں کی طرح شرمیلی اور گھٹی گھٹی نہیں تھی۔ وہ چونکہ اوچی ذات کی لڑکی تھی اُس میں اپنے ماں باپ کی طرح تجتر اور غرور تھا۔ اُس میں بات کرنے کی جرأت تھی۔ احمد پورے اعتماد سے بات کرتی تھی۔ اگر میں کہوں کہ وہ شہزادی تھی تو اس میں مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ مجھے یہی ایک خطرہ نظر آ رہا تھا کہ وہ جھپر پر حکم چلائے گی اور مجھے چھوٹی ذات کا لڑکا سمجھ کر مجھے اپنا نوکر سمجھے گی۔

میں نے اُسے پڑھا شروع کر دیا۔ میرا یہ خطرہ اُس نے پہلے دن ہی رفع کر دیا کہ وہ مجھے اپنا نوکر سمجھے گی۔ اُس نے میسرے ساتھ بچپن والی بے تکلفی شروع کر دی۔

”میں پڑھنے کا خیال کیسے آگیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”میں نے پڑھنے کا خیال ہی کتنا شروع کر دیا تھا کہ میں پڑھوں گی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ابا اتنے ہی نہیں تھے۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ابا نے اب مجھے پڑھنے کی اجازت اس لیے دی ہے کہ مجھے جس گھر میں دے رہے ہیں اس گھر میں تھوڑی بہت تعلیم ہے اور جس کے ساتھ مجھے باندھا جائے گا وہ فوج میں نالک ہے۔ اُس نے نو چار تھیں پڑھتی تھیں۔ مناسب فوج میں اُس نے اتنے امتحان پاس کر لیے ہیں کہ اُسے بڑی جلدی اگلا عہد مل جائے گا۔ ابا کو اب خیال آیا ہے کہ مجھے کچھ پڑھ لکھ لینا چاہیے، نہیں تو میں سسرال سے طعنے لگا کر شہر میں رہتے ہیں، اللہ نے دیا بھی ہے اور بچوں کو اللہ سے بچ بھی نہیں بڑھائی۔“

”تم اتنی جلدی تو خط پتر لکھنے کے قابل نہیں ہو سکو گی۔“ میں نے کہا۔
”میری شادی اتنی جلدی تو نہیں ہو رہی۔“ واجدہ نے کہا۔ ”میں جب تک

پڑھنے لکھنے کے قابل نہیں ہو جاؤں گی شادی نہیں کروں گی۔“
میں نے اُس کی شادی کے متعلق اُس سے زیادہ بات نہ کی۔ میں اُس کے ساتھ زیادہ فزی نہیں ہونا چاہتا تھا، لیکن چند دنوں ہی میں وہ میسرے ساتھ بہت ہی فزی ہو گئی اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ میں اُس کے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ ذہن میں یہ رکھیں کہ یہ بے تکلفی عاشقہ والی نہیں تھی۔ واجدہ کی بے تکلفی میں وقار اور خود اعتمادی تھی۔

”تم اتنے بدحو اور بھلے مانس تو نہیں ہو۔“ ایک روز اُس نے مجھ سے کہا۔ ”لیکن میں تمہارے ساتھ ذرا کھل کے۔“ کہہتی ہوں تو تم کچھوٹے کی طرح سٹک جاتے ہو۔ کیا تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ میں تمہارے ساتھ اپنے دل کی اور اپنے دیکھ سکھ کی بات کروں؟“
”ہاں واجدہ!“ میں نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو، میں سٹک جاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اپنی جگہ اور اپنے اصلی ٹھکانے پر رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ٹھکانے کے مقابلے میں تم چھوٹے لوگ ہیں۔ تمہارے ابا مجھے اپنا نوکر سمجھتے ہیں۔“

”تم یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں؟“ اُس نے کہا۔ ”تمہارا تعلق میسرے ساتھ ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اُس نے ٹک ٹک کر کہا۔ ”تم مجھے بالکل ہی اپنے لگتے ہو۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اپنے دل کی ہر بات تمہارے ساتھ کرنی پائیے۔ اُس نے یہ بات ایسے جذباتی انداز میں کہی کہ میں پچھل کر اُس کے سامنے میں ڈھل گیا۔ لڑکی بہت ہی خوبصورت تھی اور میں اس حقیقت کو چھپا نہیں سکتا کہ مجھ پر اُس کی خوبصورتی کا سحر طاری تھا لیکن میری نیت میں ذرا سا بھی فتور نہیں تھا۔

جمل جوں دن گزرتے جا رہے تھے، واجدہ مجھے اپنے قریب کرتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی میسرے دل میں اُترتی جا رہی تھی۔

میں اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کر رہا تھا۔ واجدہ کے باپ نے کہا تھا کہ میں واجدہ کو اردو پڑھا لکھا دوں لیکن میں نے اُسے انگریزی پڑھانی بھی شروع کر دی۔ اُس وقت انگریزی باپنجویں جماعت سے شروع ہوتی تھی۔ میں نے واجدہ کو الف ب کے ساتھ اے، بی، سی بھی پڑھانی شروع کر دی۔ واجدہ کو پڑھنے کا شوق تھا اور اُس کا دماغ بھی اچھا تھا، وہ بڑی تیزی سے لکھنا پڑھنا سیکھ رہی تھی۔

پھر ایسے ہوا کہ ہم دونوں ایسی محبت کی زنجیر میں جکڑے گئے جس کا حصول کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں پہلے اُسے ڈیڑھ کبھی دو گھنٹے پڑھاتا تھا، اب تین گھنٹے پڑھانے

لگا۔ ہم ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ دنیا کی ہوش نہ رہی لیکن میں نے واجدہ کی پڑھائی میں کوتاہی نہ کی۔

”بیس چھپ چھپ کر کہیں اور ملنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہم ہر روز تین گھنٹوں کے لیے کمرے میں تنہا بیٹھ سکتے تھے۔ بیس روکنے اور لڑکنے والا کوئی نہ تھا۔ ہم کہیں اور ملنے کی ضرورت تب محسوس کرتے کہ ہماری بیٹیں خراب ہوتیں۔“

”واجدہ!“ ایک روز میں نے کہا۔ ”ہم دونوں بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں تھوڑے ہی عرصے پر تمہاری شادی ہو جائے گی۔ تم اپنے خاوند میں گم ہو جاؤ گی اور میں گڑھنے اور سڑنے کے لیے رہ جاؤں گا۔“

”میری شادی اتنی جلدی نہیں ہوگی۔“ واجدہ نے کہا۔ ”اور میری شادی اس شخص کے ساتھ نہیں ہوگی جس کے لیے مجھے تیار کیا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے مجھے پڑھایا جا رہا ہے۔“

”کیا تمہاری کوئی سُنے گا؟“ میں نے پوچھا۔ ”کوئی تمہاری مرضی پوچھے گا؟“ ”کوئی نہ سُنے!“ اُس نے کہا۔ ”کوئی نہ پوچھے۔ میں ایک بار ضد پسائی تو تم بھی دیکھ لینا۔“

”کیا تمہاری اپنی کوئی پسند، کوئی مرضی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں حیران ہوں کہ یہ سوال تم پوچھ رہے ہو!“ اُس نے کہا۔ ”کیا میں تمہیں چھوڑ کر کسی اور کی ہو سکتی ہوں؟“

مجھ پر تو جیسے کتہ طاری ہو گیا ہو۔ یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ وہ مجھے دیوانہ وار چاہتی تھی اور میں اُس کی محبت میں پاگل ہوا جا رہا تھا، لیکن یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں واجدہ کے ساتھ شادی کروں گا۔ ذاتوں کی اونچ نیچ ایک ایسی وجہ اور گہری علاج تھی جسے عبور کرنا کسی صورت میں ممکن نہیں تھا۔

”نہیں چھپ کیوں لگ گئی ہے؟“ واجدہ نے پوچھا۔ ”نہیں نہیں!“ میں نے اکٹڑی ہوئی آوازیں کہا۔ ”میں چھپ نہیں ہوں۔“

تمہاری باتیں سُن رہا ہوں وہ بھانپ گئی کہ میں گھبرا اور بوکھلا گیا ہوں۔ ”تم کچھ اور ہی سوچ رہے ہو“ اُس نے کہا۔ ”کس سوچ میں گم ہو گئے ہو؟“ میں نے اُسے ملنے کی بہت کوشش کی۔ باتوں کا رخ پھیرنا چاہا لیکن اُس روز وہ

فیصلہ کرنے پر آئی ہوئی تھی۔ ”میری بات کان کھول کر سُن لو“ اُس نے جذباتی انداز سے کہا۔ ”میری شادی تمہارے ساتھ ہوگی۔“

اُس کا انداز تو جذباتی تھا لیکن لہجہ ایسا دولٹک کر میں بول نہ سکا۔ اُس کا ایک بازو میری کمر میں اور میرا ایک ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اُس کے وجود میں تحلیل ہو گیا ہوں۔ میں بھی لوجوان تھا۔ مجھ پر بھی جذبات کا نشہ طاری ہو گیا۔ پھر وہی ہوا جو لوجوان کی نادان عمر میں محبت کرنے والے کیا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ عہد و پیمان، کبھی جدا نہ ہونے کی قسمیں، گھروں سے بھاگ کر کہیں چلے جانے کا عزم، ایک ساتھ جینے ایک ساتھ مرنے کے حلف!

میں کوئی ایسا گزرا اور بزدل تو نہیں تھا کہ پیٹھ دکھا آتا۔ ایک لڑکی ایسی غیر معمولی دلیری کا مظاہرہ کر رہی تھی تو میں نے دل میں عہد کر لیا کہ میں اس سے زیادہ دلیر بن کر دکھاؤں گا۔

آج اُس وقت کو یاد کرتا ہوں تو شرماسی الگ اور پچھتاوا الگ ہوتا ہے۔ کتے ہیں بڑھاپے میں انسان جوانی کی حسین یادوں کے سہارے بڑھاپے کی اذیت سے محفوظ رہتا ہے۔ دلفریب تصور بڑھاپے کا سرمایہ ہوتے ہیں، لیکن میرا معاملہ کچھ اور ہے۔ واجدہ اور اُس کے والہانہ پیار سے بڑھ کر اور حسین یاد کیا ہوگی مگر میری یاد جب ذہن میں انگڑائی لیتی ہے تو میرے بوڑھے نحیف وجود میں بھونچال آ جاتا ہے۔ یہ حسین یاد اُسی طرح بڑی ہی بھیاں تک یادوں میں دم توڑ جاتی ہے جس طرح رات کی تاریکیوں کو روشن کرنے والے چاند کو سیاہ کالی گھٹا نکل لیا کرتی ہے۔



ان ہی دنوں عائشہ میری زندگی میں داخل ہوئی۔

جی ہاں! آپ مجھ پر الزام عائد کریں گے کہ میں نے واجدہ کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ میں آپ سے اتنی سی عرض کروں گا کہ میری اُس وقت کی عمر دیکھیں۔ نوعمری کا زمانہ تھا۔ نا تجربہ کاری تھی۔ جذبات بے لگام ہو جاتے تھے۔ اس عمر میں ہر اُپدھر اچھا لگتا ہے۔ یہ بھی سوچنے کے میں بھلا مانس ہوتا، اصولوں کا پابند ہوتا تو اس سنسنی خیز کمائی کا کردار نہ بنتا جو میں سنانے لگا ہوں۔ کمائی ایک یا ایک سے زیادہ انسانوں کی حاکمیتوں یا خیریتوں سے بنا کرتی ہے۔

کہانی اُس وقت بنتی ہے جب کوئی آدمی فریب کاروں اور جھوٹ بولنے والوں کی فحش میں بیٹھ کر سچ بولنا شروع کر دیتا ہے۔

میں اپنے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کر رہا کہ میں یہ بتایا وہ تھا۔ البتہ یہ دعویٰ ضرور کروں گا کہ میں کہانی سنانے کے معاملے میں سو فیصد صداقت پسند ہوں۔ دروغ گوئی اور مبالغہ آرائی نہیں کروں گا۔

عائشہ کی ساری بات سنا چکا ہوں۔ اُس کے ساتھ میسر جو تعلقات بن گئے تھے وہ من و عن سنا دیے ہیں۔ اُس نے جس فریب کاری سے اپنے خاوند سے طلاق لی تھی، وہ بھی سنا دی ہے۔ اب یہ سنا باقی ہے کہ میں نے واجدہ کو بے خبر رکھا تھا کہ میں اپنے نئے مزارعوں کے گھر جایا کرتا ہوں۔ اُسے یہ سنا یا تھا کہ مزارعوں کی بہو پر جن آتا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ جن کیا کرتا ہے۔

میں اپنے آپ پر فخر کیا کرتا تھا کہ بیک وقت دونوں جوان لڑکیاں مجھ پر مرتی ہیں میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔

اس دوران جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ہمارے بزرگ جنگ کی خبریں سنایا کرتے تھے۔ میں نے ان خبروں میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ جنگ یورپ میں شروع ہوئی تھی۔ یورپ کے ساتھ کم از کم میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں واجدہ کو اردو اور انگریزی پڑھاتا رہا اور جرمنی نے فرانس پر قبضہ کر لیا۔ ایک روز پتہ چلا کہ واجدہ قرآن مجید پڑھنا بھی نہیں جانتی۔ میں نے اُسے پہلا پارہ پڑھانا شروع کر دیا۔

ایک روز میں نے واجدہ کو پڑھانے کے لیے قرآن مجید سامنے رکھا تو واجدہ نے میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر قرآن مجید پر رکھ دیا اور میسر ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "قسم کھاؤ کہ تم میسر ساتھ شادی کرو گے۔" اُس نے کہا۔ "میں گھر سے بھاگوں گی تو تم میرا ساتھ دو گے اور مجھے دھوکہ نہیں دو گے۔"

"ہوش کی بات کرو واجدہ!" میں نے اپنا ہاتھ پھینچتے ہوئے کہا۔ "نہ مجھے گناہگار کرو نہ خود گناہگار بنو۔ کیا تم قرآن مجید کی قسم کو کھیل تماشا سمجھتی ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا اور پیٹھ نہیں دکھاؤں گا۔" "میں بھی قسم کھاؤں گی؟"

"ہم دونوں مجبور ہیں واجدہ!" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے ہم قسم پوری نہ

کر سکیں۔ انسان فرشتہ نہیں نہ جن ہے کہ نامکن کو ممکن کر دکھائے.... میں یہ قسم کھا سکتا ہوں اور کھاتا ہوں کہ شادی سے پہلے تمہارے ساتھ پاکیزہ تعلقات رکھوں گا۔ پاک جنت کروں گا۔"

"نہ ہر دل ہو"۔ اُس نے کہا اور قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "جس شخص کے ساتھ میری شادی کی جا رہی ہے، میں اُسے قبول نہیں کروں گی۔ اگر مجھے بزدلی اُس کی بیوی بنا دیا گیا تو میں اُسے دل سے خاوند نہیں مانوں گی.... میں تمہارے سوا کسی اور کو خاوند تسلیم نہیں کروں گی۔"

میں اندر باہر سے کانپ گیا۔ مجھ پر ایسی گھبراہٹ طاری ہو گئی جیسے کسی بڑی ہی خوفناک چیز نے میسر دل کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیا ہو۔ واجدہ کی برادری کا ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جو اپنی ذات اور برادری کے دوسرے آدمیوں کی طرح شہلاد پنہا اور گردن اکڑا کر رکھتا اور دوسری ذاتوں کے لوگوں کے ساتھ اس طرح تکبر اور غرور سے بولا کرتا تھا جیسے وہ اس کے غلام ہوں۔

اُسے جوڑوں میں درد شروع ہوا جو علاج کے باوجود بڑھتا گیا اور تین مہینوں بعد اُس کا یہ حال ہو گیا کہ اُس کے ہاتھ ٹپک گئے۔ انگلیاں ہتھیلیوں کی طرف مڑ گئیں۔ ٹانگیں آدھی دوسری ہو گئیں۔ یہ ٹھنڈوں کی وجہ سے ہوئی تھیں۔ سبھی آج تک یاد ہے کہ میں نے اُسے اس پوزیشن میں سرکتے دیکھا جس طرح آدمی اکڑوں بیٹھتا ہے۔ اُس کا رنگ سیاہ اور عجیب طرح سے پھیلا ہو گیا تھا۔

اُس نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ "کبھی قرآن مجید کی قسم نہ کھانا.... یا اللہ مجھے بخش دے۔ میں نے قسم توڑ دی تھی۔"

یہ تو مشہور ہو گیا کہ اُس نے قرآن مجید کی قسم کھا کر توڑی لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ اُس نے کیا قسم کھائی تھی۔ اُس کی دعوت ختم ہو گئی اور ہم نے اُسے گلے میں غلیظ کیڑے کی طرح ریٹکتے دیکھا۔ ایک سال بعد وہ مر گیا۔

اب واجدہ نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تو میرا دل بیٹھنے لگا اور میں محسوس کرنے لگا جیسے مجھ پر غشی طاری ہو جائے گی۔

میراں میں ایک بات کوں گا۔ یہ تو ایک واقعہ ہے جس کا میں عینی شاہد ہوں۔ ایک شخص نے قرآن مجید کی قسم کھا کر توڑی اور وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو کر کبھی بڑی موت مرا۔ ایسے تین چار اور واقعات بھی منے تھے۔ یہ ایک عقیدہ تھا کہ جس نے قرآن مجید

وہ بعض کے لیے یہ دلچسپ خبریں ہیں۔
میں اپنے وقتوں کی بات کر رہا ہوں۔ واجدہ نے جذبات کے غلبے میں قرآن پر ہاتھ
رکھ کر ایسی قسم کھالی جسے وہ پورا نہیں کر سکتی تھی۔ میں اب یہی توقع رکھ سکتا تھا کہ واجدہ
یہ قسم پوری نہ کر سکی تو اسے دنیا میں سزا ملے گی اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔



ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا۔
یوں لگا جیسے وقت اڑتا ہوا آگے نکل گیا اور ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی ہو۔ میں
اور واجدہ ایک دوسرے میں لیے گم ہو گئے تھے کہ گروپش کا کچھ ہوش نہیں رہتا تھا۔
ہوش رہتا تھا تو صرف اتنا کہ میں نے واجدہ کو پڑھانا ہے۔ میں اُسے دلچسپی سے پڑھاتا
اور وہ شوق سے پڑھتی تھی۔ اس عرصے میں اُس نے اس حد تک اُردو لکھنی شروع کر دی
تھی کہ اچھا غما خط لکھ سکتی تھی۔
ہمیں اچانک پتہ چلا کہ ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔ میں نے لگا جیسے میں

بڑے ہی حسین خواب سے جگا دیا گیا ہو۔ یہ یوں ہوا تھا کہ ایک روز میں واجدہ کو پڑھانے
گیا تو واجدہ کو کسی اور ہی مزاجی کیفیت میں دیکھا۔ میں نے پوچھا۔
"میری بات پہن کر دی گئی ہے"۔ اُس نے کہا۔ "کل لڑکے کی ماں اور اُس
کا باپ آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ لڑکا کسی بھی وقت جنگ پر چلا جائے گا اس لیے شادی
جلدی ہو جانی چاہیے۔ اب وہ لوگ کسی بھی وقت دن مقرر کرنے کے لیے آئیں گے"
مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہو گا لیکن وہ دن اچانک آگیا اور بہت
جلدی آگیا۔

"میں نے گزشتہ رات ماں سے کہہ دیا ہے"۔ واجدہ کہہ رہی تھی۔ "میں نے کہا ہے
کہ میں اس شخص کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔ ماں نے مجھے یوں دیکھا جیسے اُسے یقین نہ
آیا ہو۔ میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ لڑکا کسی بھی وقت آگے بیچ دیا جائے گا اس لیے شادی
جلدی ہو جانی چاہیے۔ میں کہتی ہوں کہ میں اس عمر میں بیوہ نہیں ہونا چاہتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ
وہ جنگ میں جاتے ہی مارا جائے۔ میں جنگ ختم ہونے تک شادی نہیں کروں گی۔"
"یہ تم نے ٹھیک کہا"۔ میں نے کہا۔ "تمہاری امی کا اپنا بھی یہی خیال ہو گا۔"
"تو برو جی! واجدہ نے کہا۔" اُس نے اُلٹا مجھے ڈانٹ دیا۔ کہتے گئے کہ زبان
کو قابو میں رکھو۔ باپ نے سن لیا تو جان سے مار ڈالے گا۔"

اس کے بعد واجدہ مجھے تین روز خبریں سناتی رہی۔ وہ اپنی ماں سے یہ منوانے کی

کی قسم کھا کر توڑی وہ لوگوں کے سامنے بڑے ہی بھیاںک اور عبرت ناک انجام کو پہنچا۔
آج میں یہ سوچتا ہوں کہ پاکستان کی سیاست میں، حکومت اور معاشرے میں
جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ کیا لیڈر اور کیا عوام، اللہ، رسول اور قرآن مجید کی قسمیں
بلے دھڑک کھاتے اور اپنا آئو سیڈھا کرتے ہیں لیکن ان پر عذاب نازل نہیں ہوتا۔
عذاب اگر نازل ہوتا بھی ہے تو اُن پر ہوتا ہے جو ابھی تک سچ اور دیانتداری کو سینے
سے لگائے ہوئے ہیں۔

والشور کہتے ہیں کہ قوم پر عذاب گرنا شروع ہو گیا ہے۔ یہ عذاب کیا کم ہے کہ قوم
پر وہ حکمران مسلط ہوتے چلے آ رہے ہیں جو خود تو عیش و عشرت کرتے اور قوم کو فاقہ کش
بناتے چلے جا رہے ہیں۔

کیا یہ عذاب نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان میں بھائی نے بھائی کا خون بہایا اور ملک
آدھا رہ گیا!

اور کیا یہ عذاب نہیں کہ ملک کی آدھی آبادی دوسری آدھی کو ڈاکہ زنی، رہزنی
اور رشوت خوری کے ذریعے لوٹ رہی ہے؟ لوگ اس طرح قتل ہو رہے ہیں جیسے کھیاں
ماری جاتی ہیں۔ کسی عورت کو پکڑ لیا اور اُس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کر ڈالی۔
سمجھنے والوں کے لیے یہ عذاب الہی ہے اور جو نہیں سمجھتا چاہتے، اُن کے لیے یہ واقعت

کوشش کرتی رہی کہ ابھی شادی کا دن مقرر نہ کیا جائے لیکن ماں نہیں مان رہی تھی۔
 ”تم مرد ہو“ اُس نے مجھے کہا۔ ”ہمت کرو۔ میں اپنے ساتھ سارا زور بھی لے آؤں
 گی اور بہت سارے پیسے بھی پڑاؤں گی۔ تیاری کرو اور کہیں چلے چلتے ہیں۔“
 میں نے اُسے بتایا کہ اُس میں کیا کیا خطرے ہیں لیکن وہ خطرہ دل کی پرہیزگاری ہی نہیں
 کر رہی تھی۔ وہ محبت کے واسطے دیتی اور روتی تھی۔ میں نے مجبور ہو کر اُسے کہا کہ
 مجھے ایک دو دن سوچنے دو۔

اُسے میرے اُغلاؤں سے پتہ چل گیا ہوگا کہ میں اُسے ٹال رہا ہوں۔ اُس نے اپنی
 ماں کو اُس فیصلے سے آگاہ کر دیا کہ وہ اس ناہک کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ اُس نے
 یہ بھی کہہ دیا ہوگا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرے گی۔ اس کا اندازہ مجھے اگلے روز اُس
 کے گھر جا کر ہوا۔ میں اُسے پڑھانے گیا تو اُس کا باپ اپنے دروازے پر کھڑا تھا۔
 ”جھاگ جاؤ اُسے یہاں سے!“ واجدہ کے باپ نے مجھے کہا۔ ”پھر کبھی اس
 گھر میں قدم نہ رکھنا۔“

میں چپ چاپ لوٹ گیا۔
 پھر بہت جلد واجدہ کی شادی کا دن مقرر ہو گیا ہے۔ تو دس دنوں بعد بارات
 آئی تھی۔

کسی گھر کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ بہت جلد واجدہ کو باپ نے بہت مارا
 پیٹا ہے اور اُسے کمرے میں بند کر دیا ہے۔
 دو دن اور گزر گئے۔ میں کھیتوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ اپنے شہر کا ایک دس
 ہنبر باد معاش دو جوان سے آدمیوں کے ساتھ میرے پاس آ رہا تھا۔

”ہم تمہیں ایک بات کہنے آئے ہیں“ دس ہنبر بیٹے نے کہا۔ ”اگر تم نے
 اس پر عمل نہ کیا تو تم کو کمرے میں دے دیں گے اور تمہارے گھر ڈھکیٹی کی ایسی واردات ہو
 گی کہ تمنا ہو جائے گی۔“ میں نے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ اس شہر سے غائب ہو جاؤ“ دس ہنبر بیٹے نے کہا۔
 ”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”تمہیں میں نے کیا تکلیف دی ہے؟“
 ”پچھتاؤ گے۔“ اُس نے کہا۔ ”اور تمہارے پچھلے باقی عمر روتے رہیں گے۔“

میں اُس دس ہنبر بیٹے بد معاش کو جانتا تھا۔ اس کے ساتھ جو دو آدمی تھے،
 میسٹر کے لیے اجنبی تھے۔ دونوں کے چہرے کڑے اور خوفناک تھے۔ میں ان کا
 مابذ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی عقل تھی کہ میں اصل بات سمجھ گیا۔ واجدہ
 نے اپنے گھر کو دیا ہوگا کہ وہ میسٹر سوا اور کسی کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔
 جدہ کے باپ نے اس دس ہنبر بیٹے کی خدمات حاصل کی ہوں گی کہ مجھے ڈرا دھمکا کر
 میرے غائب کر دیا جائے۔

”میں کہاں غائب ہو جاؤں؟“ میں نے ڈرے ڈرے سے بلھے میں پوچھا۔
 ”اونے بیوقوف!“ دس ہنبر بیٹے نے کہا۔ ”فوج میں بھرتی ہو جا۔ شہر کے
 بے شمار لڑکے فوج میں چلے گئے ہیں۔ تم فارغ اور نکتے پھرتے رہتے ہو۔ تمہارا روزگار
 ختم ہو جائے گا اور ہمارا کام ہو جائے گا۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں کل ہی جا کر بھرتی ہو جاؤں گا لیکن یہ
 حائل کیا ہے؟“

”تم نے بہت اونچی جگہ ہاتھ ڈالا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”زندہ رہنا چاہتے ہو تو
 ہاں سے چلے جاؤ۔“

میں گھر آیا تو میسٹر والد صاحب بھی ڈرے ہوئے تھے۔ انہیں بھی یہی دھمکی مل چکی
 تھی۔ انہوں نے، امی اور بھائیوں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔
 برما کی فوج سے جنگ ہندوستان کی طرف آ رہی تھی۔ فوج میں بھرتی اتنی عام
 تھی کہ جمائی لحاظ سے ذرا کمزور جوان کو بھی بھرتی کر لیتے تھے۔
 میں اگلے ہی روز بھرتی ہونے کے لیے روانہ ہو گیا۔

عنایت اسی کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے آپ کو روح سمجھتا اور روح کی ہی
بوزینت میں لگا رہتا ہے۔
جسم کا یہ رشتہ مٹی سے ہے۔ مجھ جیسے چھوٹے ذہن کے لوگ اس نکتے کو

میں سمجھتے۔
یہی وجہ ہے کہ ولی اللہ صدیوں بعد پیدا ہوا کرتے ہیں۔ ولی وہی ہوتا ہے
اپنے آپ کو روح اور روح کو اللہ کی امانت سمجھتا ہے۔
باپ اپنے بچوں کو غلط کاموں سے روکتا توکتا ہے، پسند و نصیحت کرتا ہے،
نرس بچے اس وقت اپنے باپ کی بات سمجھتے ہیں جب وہ خود باپ بن کر اپنے
بچوں کو غلط کاموں سے روکتے ٹوکتے اور پسند و نصیحت کرتے ہیں۔
میں نے کسی کی نہیں سنی۔ آج سب کو اپنی سنار ہا ہوں۔
کوئی نہیں سنے گا!



میں کہہ رہا تھا کہ میں فوج میں بھرتی ہونے کے لیے چلا گیا۔ یہ تو سنا چکا ہوں
میرے بھرتی ہونے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ راجہ صاحب کے بدعاش نے
مجھے یہ جو کہا تھا کہ تم نے بڑی اونچی جگہ ہاتھ ڈالا ہے۔ ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس
ونچی جگہ کے خطرے مجھے بھاگنے پر مجبور کر رہے تھے۔

انگریزوں کو اپنی وہ بادشاہی جو آدھی دنیا میں پھیلی ہوئی تھی، ہٹ کر قی نظر آ رہی
تھی۔ ادھر جرمنی نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو یورپ سے بھاگ دیا تھا اور جرمن
کی افواج سنگاپور اور ملایا میں دندان قی پھری تھیں۔ ان کا رخ برما کی طرف تھا اور
برما سے آگے ہندوستان تھا۔ انگریزوں کی افواج جن میں برطانیہ، ہندوستان اور
آسٹریلیا کی فوجیں شامل تھیں۔ بڑی طرح پسپا ہو رہی تھیں۔

ان حالات میں انگریزوں نے فوج میں بھرتی کے معیار ختم کر دیے تھے اور
فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کچھ ایسی کوشش پیدا کر دی تھی کہ جوان آدمی حق درحق
بھرتی ہو رہے تھے۔ اور مختلف محاذوں پر زخمی اور ہلاک ہو رہے تھے۔ بھرتی کرنے
والے فوجی انفرانچنے عملے کے ساتھ قصوں اور دیہات کے سرکاری ریلٹ ہاؤسوں
(ڈاک بنگلوں) میں آتے اور جوانوں کو بھرتی کر کے لے جاتے۔
ہائے قصبے میں بھی ڈاک بنگلوں تھا۔ یہاں بھرتی کرنے والے آتے رہتے تھے۔

انسان دباختی کہئے، کم فہمی کہئے، حماقت کہئے کہ وہ اچھے اور
اسے بڑے کو، شیر اور شکر کو، نیک اور بد کو، جنا اور سزا کو اس
وقت سمجھتا ہے جب وہ بڑھاپے کی دلدل میں دھنس چکا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ
سولے پچھتانے کے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ عمر رفتہ واپس نہیں آیا کرتی کہ انسان
اپنی حماقتوں کی تلافی کر سکے اور گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔
بچپن کچھ سمجھتا نہیں۔

لڑکپن کچھ سمجھتا ہے لیکن کتنا ہے ابھی تو ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں، ساری
عمر بڑی ہے سمجھنا اور سمجھانے کے لیے!
جوانی عقل پر جذبات کو غالب کر دیتی ہے۔
اور عقل اس وقت آزاد ہوتی ہے جب جوانی پر بڑھاپا غالب آچکا ہوتا
ہے۔

پھر بد بخت انسان گرہ لگتا اور پچھتاہے کہ یہ نہ کرتا تو یوں ہوتا، ویسے نہ
کرتا تو ایسے نہ ہوتا۔
اسی اذیت میں عمر تمام ہو جاتی ہے۔

ایک بزرگ ملے تھے۔... افسوس یہ ہے بہت دیر سے ملے۔... انہوں
نے کہا تھا کہ انسان کی بد نصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف جسم سمجھتا ہے، گوشت
اور ہڈیوں کا چلتا پھرتا جسم، اور وہ اس کی زینت و زینت میں اور اسی کی ضروریات
پوری کرنے میں لگا رہتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے تو جسم کی لذت کے لیے، فریب کاری
کرتا ہے تو جسم کی آسائش کے لیے، چوری اور حرام خوردی کرتا ہے تو جانی خواہشات
کی تکمیل کے لیے!

بزرگ نے کہا تھا، انسان کامل وہ ہے جو اس حقیقت کو قبول کرتا ہے کہ اس
کی اصلیت جسم نہیں روح ہے۔ جسم کی ٹرینڈی یہ ہے کہ یہ جوان ہو کر بوڑھا ہوتا ہے،
اور روح کی عظمت یہ ہے کہ بوڑھی ہو کر جوان ہوتی ہے۔

اس شہر میں تم رہتے ہو یا میں۔ تم کہنے کی بد معاشی کرنے والے آدمی ہو۔ تم
 صے کے قدموں پیٹھ کر اس کا دیا کھاتے ہو۔ میں تمیں یہ بھی بتا دوں کہ راجہ جس بیٹی کی
 مجھے میاں سے نکلا رہا ہے وہ بیٹی اس کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے اور وہ
 اس کے لیے مصیبت بنی رہے گی اور تم میرے ساتھ ٹکڑے کر اپنے لیے مصیبت
 ی کر رہے ہو۔

میں بزدل نہیں تھا۔ میں اُسے جو کچھ بھی کہہ رہا تھا وہ خالی دھکیاں نہیں تھیں۔
 نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اس شخص سے انتقام لوں گا لیکن وہ بھی آخر شہر کا
 باش تھا اور لوگ اُسے ڈرتے تھے۔ وہ چاقو زنی کی تین چار وارداتیں کر چکا
 یہ تو ہونہیں سکتا تھا کہ وہ میری دھکیوں سے ڈر جاتا اور چُپ رہتا۔ اُس نے
 دھکیوں کا جواب دھکیوں ہی سے دیا لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ تھوڑا سا
 گھبراہٹ اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ جنگ کے زمانے میں انگریز فوجیوں کی بہت
 مرتے تھے اور ان کے گھر والوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھلا
 رجب سے کچھ دب گیا تھا۔ میں اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر وہاں سے آگیا۔

میں اگلی صبح اپنے ایک نوجوان دوست سے ملا۔ اس کا اصل نام ظاہر نہیں کروں گا۔
 اس کا نام صداقت نکھوں گا۔ صداقت مجھ سے سال ڈیڑھ سال چھوٹا تھا اور وہ واجد
 فریدی رشتہ داروں میں سے تھا۔ اُن کے گھر جاتا رہتا تھا۔ وہ میرا راز دار بھی تھا۔ میں
 ملا اور اُسے بتایا کہ بھرتی ہو کر جا رہا ہوں اور وہ مجھے واجدہ کے متعلق ہر خبر لکھتا ہے۔
 یقین تھا کہ میرا یہ دوست مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔

واجدہ کی شادی کا دن مقرر ہو چکا تھا۔ صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔

جس کے ساتھ واجدہ کی شادی ہو رہی تھی وہ واجدہ سے پانچ چھ سال بڑا تھا۔
 نے اسے دومرتبہ دیکھا تھا۔ اچھا خوبصورت جوان تھا۔ ہمارے قصبے سے پانچ چھ میل
 کے بڑے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ بھی میٹرک پاس تھا اسی لیے وہ سنگٹل کور
 ٹیکٹ تھا۔



میں اپنے شہر سے رخصت ہو کر ٹریننگ سنٹر میں لاہور چلا گیا اور میری ایک نئی
 اکاؤنٹ ہوا۔ لیول کچھ لیں کہ میرے ایک ایسے سفر کا آغاز ہوا جو سنسنی خیز کہانیوں کا
 بن گیا۔

میں نے ان کا انتظار نہ کیا اور ضلع کے شہر میں چلا گیا جو بہت بڑی چھاؤنی ہے
 میں نے بتایا ہے کہ انگریزوں نے فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کوشش پیدا کر رکھی
 اس کا مجھے فائدہ ہوا۔ اس سے پہلے فوج میں جو کلرک بھرتی کیے جاتے تھے وہ
 ہوتے تھے اور سپاہی کلرک کہلاتے تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں نے
 کوشش پیدا کر دی کہ کلرکوں کو حوالدار کی کاغذ دے کر بھرتی کیا جائے لگا۔
 بھی حوالدار کلرک لیا گیا اور مجھے کہا گیا کہ میں لاہور چھاؤنی میں متعلقہ سنٹر میں پہنچ جاؤں
 مجھے دو دنوں کی محنت دی گئی۔

میں اسی شام کو واپس آگیا اور گھر والوں کو بتایا کہ میں حوالدار کلرک بھر
 ہو گیا ہوں۔ گھر والوں کے تاثرات طے چلے تھے۔ ایک تو انہیں یہ خوشی تھی کہ
 روزگار لگ گیا ہے اس کے ساتھ ہی گھر والے رنجیدہ بھی ہوئے جس کی وجہ یہ
 میں کسی کے دھمکانے پر گھر سے جا رہا ہوں اور دوسری وجہ یہ کہ جنگ لگی ہوئی تھی
 میرے مارے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے سب کو تسلی دی کہ اس میں
 کوئی بہتری ہوگی جو کم کم میں ترقی کروں اور کوئی بڑا عہدہ لے کر گھر آؤں۔

مجھے اس بد معاشی پر بہت غصہ تھا جس نے مجھے دھکی دی تھی کہ میں اس
 سے چلا جاؤں ورنہ میں ساری عمر بچھتاؤں گا۔ اس شخص نے میرے باپ کو ایہ
 ہی دھکی دی تھی۔ میں شام کا کھانا کھا کر باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بد معاش
 کہاں ہو گا۔ شام کے بعد وہ کچھ دیر پاں سگریٹ کی ایک ڈکان پر گرگپ شپ لگا
 کے بیٹھا کھاتا تھا۔ میں اُسے وہاں جا ملا اور اُسے اگ لے گیا۔

”میں بھرتی ہو کر جا رہا ہوں“ میں نے کہا۔ ”اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ
 تمہاری دھکی سے ڈر کر یہاں سے بھاگ رہا ہوں تو یہ خیال دماغ سے نکال دو۔ اچھا
 راجہ صاحب کو بھی بتا دینا۔ میں اپنے مال باپ کی عزت کی خاطر جا رہا ہوں۔ تم چہ
 بد معاش کئی دیکھے ہیں“

اُس نے مسک کر کندھے پر ہاتھ رکھا اور طنزیہ سی ہنسی ہنس پڑا۔ میں نے اُس
 بازو پر اپنا ہاتھ مار کر اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔

”تم نے عقلمندی کی ہے کہ یہاں سے جا رہے ہو“ اُس نے کہا۔ ”اگر
 یہاں رہتے تو تمہیں پتہ چلتا کہ میں کیا کر سکتا ہوں“

”میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہا“ میں نے کہا۔ ”میں آؤں گا پھر دیکھ“

کی داستان بھی پڑھ لیں۔
میرے دوست صداقت کا خط آیا۔ اُس نے لکھا کہ واجدہ کی شادی ہوئی ہے اور اب وہ اپنے سسرال میں ہے۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ صداقت میرا زاد دار تھا۔ واجدہ بھی جانتی تھی۔ صداقت واجدہ کے گھر جاتا تھا تو اُس پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ صداقت کے خط کے ساتھ واجدہ کا مختصر خط بھی تھا۔ واجدہ نے یہ خط شادی سے دو دن پہلے لکھا اور صداقت کو دے دیا تھا۔ یہ خط آج بھی میسر پاس موجود اور محفوظ ہے۔ آدھی صدی سے کچھ برس اوپر کے اس خط کا کاغذ پیلا اور ٹیلا سا ہو گیا ہے۔ یہ خط کسی برگزیدہ پیر کے دیے ہوئے تعویذ کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ واجدہ نے میرے نام کے ساتھ والہانہ پیار کے دو الفاظ لکھ کر آگے لکھا:

”تم چلے گئے۔ یہ تم نے اچھا کیا۔ ان ظالموں کے ارادے بہت خطرناک تھے۔ میں کسی کو دھوکہ دینا اور جھوٹ بولنا کتا سمجھتی ہوں۔ میں نے مال اور اپنے باپ کو صاف لفظوں میں تمہارا نام بتا دیا اور کہا تھا کہ خدا نے میری قسمت اس لڑکے کے ساتھ جوڑ دی ہے اور میں خدا کے حکم کے خلاف نہیں چل سکتی۔ باپ نے میری بہت پٹائی کی اور ایک کمرے میں قید کر دیا۔ یہ خط چھپ کر بکھ رہی ہوں۔ ساری باتیں نہیں لکھ سکتی۔ باپ نے اور بڑے بھائی نے کہا کہ وہ تمہیں قتل کر دیں گے....“

”اب یہ سن لو کہ میری شادی ہو چکے گی لیکن میں اس شخص کو قبول نہیں کروں گی۔ میں نہہر کھا کر مر سکتی ہوں لیکن میں تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ میرے ساتھ شادی کرنے والا شخص بہت بچکانہ لگا۔ میری روح تمہیں قبول کر چکی ہے۔ میرا تمہارا رجوع کا ساتھ ہے۔ میں صرف تمہارے لیے زندہ رہوں گی اور ساری عمر تمہارا انتظار کروں گی۔“

واجدہ کا خط دیکھ کر مجھے یہ خوشی ہوئی کہ اُسے لکھنا پڑھنا میں نے سکھایا تھا اس کے باپ نے مجھے کہا تھا کہ اسے اتنا پڑھا لکھا دو کہ یہ خط پتر لکھنے کے قابل ہو جائے۔ میں نے اُسے اس قابل بنادیا تھا اور اُس نے پہلا خط مجھے لکھا تھا۔

صداقت دھوکہ دینے والا دوست نہیں تھا۔ واجدہ نے خط لکھ کر اُسے دے دیا اور اُس نے اپنے خط کے ساتھ مجھے بھیج دیا۔ اس خط نے مجھ پر جواثر کیا وہ میں لفظوں

میں اگر یہ بنانے لگوں میں نے ٹریننگ سنٹر کے شب و روز کو ذہنی طور پر طرح قبول کیا تو یہ الگ تھلک ایک اور ہی کہانی بن جائے گی۔ جس میں آپ کی کی شاید کوئی بات نہ ہو۔ محقق یوں ہے کہ مجھے ہزاروں رنگ و لٹوں میں دھکیل دیا یہ دیہاتی اور آن پڑھ تھے۔ ان میں اچھے خاندانوں کے جوان بھی تھے۔ وہ بھی اُن تھے یا کوئی تین چار عین پڑھا ہوا تھا۔ وہ دوسروں سے اس لیے مختلف لگتے۔ بات ذرا تیز سے کرتے تھے۔ باقی سب اُجڑا اور جانگلی تھے۔

غور کیجئے کہ میں شہر کا رہنے والا اور میٹرک پاس تھا جو اُس زمانے میں زیادہ تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ مجھ میں شائستگی اور تہذیب تھی۔ میں نے تھوڑے ہی دن محسوس کر لیا کہ میرا نہ شائستگی کی ضرورت ہے نہ تہذیب کی۔ اس فوجی دنیا میں لگے نہیں چلتے تھے۔

آپ تجربہ کر کے دیکھیں۔ آٹھ دس ایسے آدمی جو ہر وقت مادر زاد برہنہ رہتے اپنا پورا لباس پہنے ہوئے ان ٹانگوں کے ساتھ رہنے لگیں۔ دو تین دنوں بعد آپ محسوس کرنے لگیں گے جیسے آپ ننگے ہیں اور ان سب نے کپڑے پہنے ہوئے پیر آدھ دن اور گزرے گا تو آپ لباس کو بغیر ضروری بلکہ خلاف تہذیب سمجھ کر الگ پھینک دیے۔ یہ میسر کے ساتھ ٹریننگ سنٹر میں ہوا۔ میں آٹھ دس دن تو بہت پریشان رہا تو ٹریننگ اتنی سخت کہ گدھا بھی بھاگ جائے اور دوپہرے اُجڑا اور اُن پڑھ لوگوں کے ساتھ رہنا۔ آٹھ دس دنوں بعد میں نے اپنے آپ میں یہ تبدیلی دیکھی کہ میں نے ان پڑھ رنگ و لٹوں کی طرح باتیں شروع کر دیں اور میسر کے طور پر لیتے انہی جیسے ہو انسان کو خدا نے یہ وصف عطا کیا ہے کہ وہ ہر قسم کے حالات کے ساپا ڈھل جاتا ہے۔

میں یہ بھی بتا دوں کہ آپ کو حیران ہونا چاہیے کہ میں پڑھا لکھا جوان میں کیوں چلا گیا۔ اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں اُس علاقے۔ رکھتا ہوں جو فوج میں بھرتی ہونے کو بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں۔ یہ ہمارے علاقہ صدیوں پرانی روایت ہے۔

اس قسم کے سوال ذہن سے نکال دیں کہ یہ کیوں ہوا اور وہ کیسے ہوا ساتھ حالات نے جو کھیل کھیلایا اور میں نے حالات کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ہوں۔ آپ نے بڑے نیک حضرات کی بڑی لمبی لمبی کہانیاں پڑھی ہیں، اب ایک

میں بیان نہیں کر سکوں گا۔ مجھ پر پاگوں جیسی کیفیت طاری ہو گئی۔ کبھی خیال آتا کہ ابھی جاؤں اور واجدہ کو ساتھ لے آؤں۔ واجدہ کے باپ اور بڑے بھائی پر غصہ آیا تو غصے سے میرا وجود کا پٹنہ لگا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ جا کر دونوں کو قتل کر آؤں اور پھر موقع دیکھ کر واجدہ کے خاوند کو بھی قتل کر دوں۔

میری سوچیں اور میرے ارادے جذبات کے زیر اثر تھے۔ وہ عمر ہی ایسی تھی پیر پریشان اور بے چین ہوتا چلا گیا۔ شام کا وقت تھا۔ میں نہایا اپنے کپڑے پہنے اور پرہیز گراؤنڈ کی طرف نکل گیا۔ وہاں ایک جگہ درختوں کا گھٹنا جھنڈ اور نیچے ہری بھری گھاڑ تھی۔ میں وہاں جا بیٹھا اور تصوروں کی جذباتی دنیا میں چلا گیا۔

کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ میں تو خواب و خیال اور عشق و محبت کی دنیا میں جھٹک رہا تھا۔ میں نے ہلک کر پیچھے دیکھا۔ وہ میرا دوست حمید تھا۔
”تم تو لگتا ہے کسی کا تم کر رہے ہو“۔ حمید نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔
”کیا بات ہے؟ گھر سے کوئی ایسا ویسا خط ہے یا گھر کی عیش موج یاد آ رہی ہے؟“
میں نے سر جھکا لیا۔

”جانے دے خانی!“۔ حمید نے میری ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر میرا سر اوپر کر کے کہا۔
”جایا! تو تو شاید رونا بھی رہا ہے.... مجھے نہیں بتاؤ گے تو یہ نہ کہا کرو کہ ہم دوست ہیں۔ میں سبھوں کا کہ ہم ساتھی ہیں۔ ٹریننگ ختم ہوگی تو اپنی اپنی پلٹن میں چلے جائیں گے۔“

”نہیں حمید!“۔ میں نے کہا۔ ”میں نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا۔“
میں نے تمہیں اپنا یہ راز ابھی نہیں دیا تھا۔ اب سن لو۔

میں ٹریننگ سنٹر میں آیا تو دو ہی دنوں بعد حمید میرا دوست بن گیا تھا۔ میرے تحصیل کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا جو ہمارے قصبے سے سات ساتھیوں کے ساتھ تھا۔ میں نے پہلے سوچا ہی نہ تھا کہ اُس کے گاؤں کے ساتھ ایک رشتہ بنتا ہے۔ حمید بڑا پیارا دوست تھا۔ میری طرح وہ بھی اُدنی ذات کا آدمی نہیں تھا اور وہ کمی کمین ذات کا بھی نہیں تھا۔ اُس کے گاؤں سے دو اڑھائی میل دور ایک بڑے گاؤں میں مڈل سکول تھا۔ اس سکول میں اُس نے سات جماعتیں پڑھی تھیں۔ وہ باعزت خاندان کا فرد تھا۔ میرے ساتھ اُس کی دوستی ہوئی تو میں نے فوراً پہچان

لیا کہ مضبوط دل کردے والا جوان ہے۔ اس میں اصل خوبی تو یہ تھی کہ ہنس مکھ اور ہمدرد تھا۔

اُس نے مجھے اکیلے ادھر آتے اور بیٹھے دیکھا تو میرے پاس چلا آیا۔ اُس وقت میں خود ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ کوئی غمخوار مل جائے جو میرے دل کو سکون دے۔
”ہاں خانی!“۔ حمید نے کہا۔ ”بتاؤ کیا راز ہے؟“

میں نے اُسے راز بتا دیا۔ کوئی بات نہ چھپائی۔ مجھے جس طرح واجدہ کے بھائی نے شہر سے نکلوا یا تھا وہ بھی سنایا اور سب سن کر اُسے واجدہ کا خط دکھایا۔ خط پڑھ کر اس نے مجھے دیا اور اُس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ چند سیکنڈ تو وہ کچھ بولا ہی نہیں۔

”کیوں حمید!“۔ میں نے کہا۔ ”میں تو چُپ ہی لگ گئی ہے۔ تم مجھے بے نصیحت کر دو گے کہ بھول جاؤ واجدہ کو اُس کی شادی ہو گئی ہے۔ کوئی اور لڑکی دیکھ لو۔“
”نہ خانی!“۔ اُس نے کہا۔ ”میں تو تمہیں یہ کہنے لگا تھا کہ مرد بنو اور قسم کھاؤ۔ اس لڑکی کو حاصل کر کے رہنا ہے.... دیکھو یہ عورت ذات تمہاری محنت کی خاطر کیسی ربانی دے رہی ہے۔ اس نے جس دن اپنے خاوند کو کہہ دیا کہ میں نے تمہیں دل سے بول نہیں کیا؟ وہ اس لڑکی کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔ اپنے علاقے کے لوگوں کو تم لستے ہو۔ ذرا سی بات پر قتل اور خون خرابہ ہو جاتا ہے۔“

”ہاں حمید بے بار!“۔ میں نے کہا۔ ”یہ تو میں نے دیکھ لیا ہے کہ یہ لڑکی بنی جان کی بازی لگا چکی ہے۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں!.... میں نے تو یہ سوچا ہے کہ واجدہ کے خاوند کو اور باپ کو قتل کر دوں۔“

”قتل کرنا پڑے گا۔“۔ حمید نے کہا۔ ”لیکن اس طرح کہ کسی کو پتہ نہ چلے قاتل بن ہے۔ اس کام کے لیے حوصلہ اور صبر چاہیے۔ اندھا دھند کوئی کارروائی نہیں کرنی جو تم نے اپنے دل کو روگ لگا لیا ہے یہ چھوڑ دو۔ تھیلی پر سروس نہیں اُگا کر ترقی سن یہ خیال رکھنا کہ صبر صبر میں لڑکی کو ہی بھول جاؤ۔“

”میں نے سب سے پہلے تو ایک انتقام لینا ہے۔“۔ میں نے کہا۔ ”جس حاش نے مجھے دھمکی دی تھی اُسے نہیں چھوڑ دوں گا۔“

”اُسے قتل نہیں کرنا۔“۔ حمید نے کہا۔ ”اُسے اتنا مارنا بیٹنا ہے کہ مرے بس اور زخمی بھی نہ ہو اور احتیاط یہ کرنی ہے کہ کوئی گواہ نہ ہو.... پہلے یہ بتاؤ تم میں

اتنی ہمت ہے بھی یا نہیں؟
 ”یہ تم دیکھ لینا“۔ میں نے کہا۔ ”اپنی زبان سے تو میں یہی کہوں گا کہ میں
 بہت ہی دلیر اور شیر ہوں لیکن تم نہیں مانو گے۔ کہو گے کہ ایک بد معاش نے تمہیں دھکی
 دی کہ اس شہر سے نکل جاؤ اور تم بھاگ آئے۔“

”نہیں خانی!“۔ حمید نے کہا۔ ”میں نہیں ایسا طعنہ نہیں دوں گا۔ میں خود تمہاری
 طرح ہی اپنے گاؤں سے نکلا ہوں، بلکہ یہ سمجھو نکلا گیا ہوں۔ تم جس طرح کہتے ہو کہ تم
 اس بد معاش سے انتقام لو گے جس نے تمہیں دھکیاں دی تھیں اسی طرح میں نے بھی
 قسم کھا رکھی ہے کہ میں اُن لوگوں سے انتقام لوں گا جنہوں نے مجھے گاؤں سے نکلا دیا
 ہے۔ تمہیں تو واحدہ کے باپ نے ایک بد معاش سے دھکیاں دلوائی تھیں، مجھے مارا
 پیشا گیا تھا.... میں نے بھی انتقام لینا ہے خانی!“



اُس کی یہ بات سن کر میں اپنی بھول گیا۔ اُس سے پوچھا کہ وہ مجھے اپنا قصہ سنا
 پسند کرے گا؟

”کیوں نہیں خانی!“۔ اُس نے کہا۔ ”تم نے اپنا راز مجھے دے دیا ہے میں اپنا
 راز تم سے نہیں چھپاؤں گا۔ یاد رہے کہ کام آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہم دونوں مل کر
 اپنے دشمنوں سے انتقام لیں۔ میں نہیں بزدل تو نہیں سمجھتا۔“
 ”ہاتھ آئے حمید!“۔ میں نے ہاتھ اُس کی طرف بڑھا کر کہا۔

اُس نے میرا ہاتھ مصافحہ کی طرح اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبا دیا۔
 ”میں نے کبھی قسم نہیں کھائی حمید بھائی!“۔ میں نے اُس کے ہاتھ پر دوسرا
 ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”آج اللہ کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ ہر حال میں اور ہر
 مشکل میں تمہاری مدد کروں گا اور جان کی بازی بھی لگانی پڑی تو لگا دوں گا۔“
 ”اور میں بھی اللہ اور رسول کی قسم کھاتا ہوں“۔ حمید نے اپنا دوسرا ہاتھ میرے
 پر رکھ کر کہا۔ ”تمہیں اپنا سگا بھائی سمجھتا ہوں۔ جہاں کہو گے جس وقت کہو گے،
 جان دینے کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔ ہر مشکل میں مدد کروں گا۔ تمہارے دشمن کو
 اپنا دشمن سمجھوں گا۔“

یہاں میں اپنی کہانی روک کر ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اُس
 کی باتیں سننا رہا ہوں جس دور کا آج کل تصور بھی نہیں رہا۔ زمانہ اس طرح بدل

ہے جیسے زمین و آسمان اوپر نیچے ہو گئے ہوں۔ میں نے اور حمید نے ایک دوسرے
 دہلیہ بھائی بنا لیا تھا اور ہم نے ایک دوسرے پر جان قربان کرنے کی قسم کھائی
 فی۔ یہ کوئی عجیب یا جذباتی بات نہیں تھی بلکہ یہ اُس زمانے کا ایک رواج تھا کہ
 دو آدمی ایک دوسرے کو بھائی بنا لیتے تھے اور وہ ساری عمر عملی طور پر بھائی بن
 کر رہتے تھے۔

اس طرح منہ بولے بھائی بننے کا ایک طریقہ اور بھی اختیار کیا جاتا تھا جو یہ تھا
 د بھائی بننے والے دو آدمی اپنی پگڑیاں یا ٹوپیاں تبدیل کرتے تھے۔ یہ ایک باقاعدہ
 تقریب ہوتی تھی۔ چند ایک آدمیوں کو مدعو کیا جاتا، ان کی خاطر تواضع کا انتظام ہوتا
 اور پھر یہ دونوں آدمی اعلان کرتے تھے کہ وہ بھائی بن گئے ہیں۔ پھر دونوں اپنی اپنی
 پگڑیاں یا ٹوپیاں اتار کر ایک دوسرے کے سر پر رکھ دیتے تھے اور اس کے بعد اس
 تقریب میں جو بزرگ ہوتا تھا وہ ملنے خیر کرتا اور محفل برخواست ہوتی تھی۔

اکثر لوگ خصوصاً نوجوان، بغیر کسی تقریب، حلف یا قسم کے آپس میں بھائیوں مہیا
 پیار پیدا کر لیتے تھے اور ایک دوسرے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے سربز
 نہیں کرتے تھے۔ صرف مرد ہی نہیں بلکہ کوئی مرد اور عورت بھی منہ بولے بھائی بن
 جاتے تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ لگے بہن بھائیوں والا رویہ ہی رکھتے تھے۔
 آج کی جدید فیشن زدہ سوسائٹی کے لوگ یقین نہیں کریں گے کہ منہ بولے بہن بھائی اگر تمہاری
 میں اکٹھے بیٹھے ہوتے تو ان پر کوئی بھی آدمی شک نہیں کرتا تھا۔

آج کے مصنوعی، خود غرض، مفاد پرست اور مغرب کے کلچر کا لبادہ اوڑھے ہوئے
 معاشرے میں لگے بہن بھائی جیسے پاکیزہ رشتوں کو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ لوگوں پر
 دو بھوت سوار ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ زیادہ سے زیادہ دولت کماؤ اور دوسرا بھوت
 جنسیت کا ہے۔ کیا لڑکے اور کیا لڑکیاں، دوستی لگانے کو جائز فیشن سمجھتے ہیں۔ امریکہ
 اور یورپ کی جنسی آزادی جسے مغرب والے بڑے فخر سے سیکس لبرٹی کہتے ہیں، ہمارے
 ملک میں بھی رواج پا گئی ہے۔

یہ لغت وی سی آر کی ہے جس سے گھروں میں چھوٹے بڑے، لڑکیاں اور لڑکے
 عریاں اور فحش فلمیں دیکھتے ہیں۔ وی سی آر کے علاوہ اور بھی کئی عناصر ہیں جنہوں نے
 معاشرے کو شرم و حجاب اور خاندانی غیرت سے محروم کر دیا ہے۔ بے جانی ہمارے کلچر میں
 شامل ہو گئی ہے۔ میں آج اپنے قصبے کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے لڑکپن اور نوجوانی والا

قصبہ یاد آتا ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے قصبے میں اجنبی ہو گیا ہوں۔ ہر گھر کے دروازے پر ٹاٹ یا بوری کا پردہ لٹک رہا ہوتا تھا جو نشانی ہوتی تھی کہ یہ مسلمانوں کا گھر ہے اور اس گھر کی خواتین پردہ نشین ہیں۔

اب سب پردے اٹھ گئے ہیں۔ میرا قصبہ شہر بن گیا ہے۔ ہر گھر میں ٹی وی اور ہر دوسرے گھر میں وی سی آر ہے۔ ویڈیو فلموں کی دکانیں کھل گئیں ہیں۔ میں لڑکیوں کو ویڈیو لے جاتے دیکھتا ہوں۔ میری نوجوانی کے وقتوں کی پردہ نشین خواتین کی بیہوشیوں اور لڑکیوں کی دھڑکیوں کے سروں سے دوپٹے ہرک کر کنڑھوں اور سینوں پر آگئے ہیں۔ بال کٹ گئے ہیں۔ لباس ایسے کہ ان کے جسم بکس ہوتے ہوئے بھی مستور نہیں لگتے۔

یہ لباس اور یہ جسم ہر کسی کو دیدار کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک ملے یا ایک گاؤں کی لڑکی کو کوئی سیلی آنکھ سے دیکھتا تھا تو سارا غلہ یا گاؤں مشتمل ہو کر مرنے مارنے پر اُتر آتا تھا۔ اب کسی حقے یا گاؤں کی لڑکی باہر نکلتی ہے تو حقے یا گاؤں کے جوان اُسے دیکھنے کو باہر نکل آتے ہیں۔ ہر آنکھ میلی ہوتی ہے۔

نیزت دم توڑ گئی ہے۔ شاید آپ نہ مانتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض نوجوانوں پر جنسیت اس حد تک غالب آگئی ہے کہ ان میں سے بعض اپنی نوجوان بہنوں پر برہمنی نظر رکھتے ہیں۔ دوست اپنی بہنوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے اپنی بہنوں کا تعارف کراتے اور بہنوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ ان کے دوستوں کے ساتھ بے تکلف ہو جائیں۔

میں آپ کو کوئی نئی بات نہیں سنارہا۔ کوئی عجوبہ پیش نہیں کر رہا۔ اپنا معاشرہ آپ کے سامنے ہے یہ آزاد ہے۔ آپ کے گھر میں بھی داخل ہو چکی ہے، میرے گھر میں بھی داخل ہو گئی ہے۔

میں آج کی وہی باتیں سنارہا ہوں جو ایک شرناک حقیقت کی طرح آپ کے سامنے ہیں۔ البتہ میں اپنی نوجوانی کے دور کی جو باتیں سنارہا ہوں۔ یہ ان لوگوں کے لیے عجوبہ اور شاید ناقابل یقین ہوں گی جو دیر سے پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے آج کا دور دیکھا ہے۔



میں سنارہا تھا کہ میں اور حمید قسمیں کھا کر مچھائی بن گئے۔ میں نے اُسے کہا کہ اب وہ منائے کہ وہ گاؤں سے کس طرح نکلا یا نکالا گیا تھا۔

”تمہاری طرح میسرے ساتھ بھی ایک لڑکی کا چکر چل گیا تھا“۔ اُس نے کہا۔ ”وہ کسی ریلے یا چوہدری کی بیٹی نہیں بغیر سب سے کسانوں کی بیٹی ہے۔ ان کی اپنی زمین تھوڑی ہے۔ دوسروں کی زمینیں بٹائی پر کاشت کرتے ہیں اور ان کی دال روٹی پوری ہوتی ہے۔“

”ایک بات بتاؤ“۔ میں نے پوچھا۔ ”اس کے ساتھ تمہارا تعلق کیا ہے؟“ ”ہیرا نچے والا!“۔ اُس نے جواب دیا۔ ”کوئی سی قسم لے لو تعلق سولہ آنے ستھرا اور سچا ہے۔ حالانکہ اُسے طلاق ہوئی ہے۔ خاوند کے ساتھ چند مہینے رہی تھی۔“ ”اس کے ساتھ تمہاری بہن اُس کی شادی سے پہلے کی ہو گی!“ ”نہیں!“۔ اُس نے جواب دیا۔ ”طلاق کے بعد!“

”طلاق کیوں ہوئی؟“ ”خاوند بیکار تھا۔“ حمید نے کہا۔ ”بیمارہ سمجھ لو... تم جانتے ہو ہم لوگ اپنی لڑکی کو جس کے ساتھ باندھ دیتے ہیں اُسے ساری عمر اُسی کے ساتھ گزارنی پڑتی ہے خواہ وہ جہنم میں پڑی رہے۔ لڑکی چھپ چھپ کر رو سکتی ہے، یہ نہیں کہہ سکتی کہ اس خاوند کے ساتھ میرا گزارا مشکل ہے، میں طلاق لوں گی۔“ ”اس نے خاوند کو تنگ کیا ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”اور خاوند نے طلاق دے دی ہو گی۔“

”نہیں!“۔ حمید نے کہا۔ ”طلاق ایک جن نے دلوائی ہے۔ یہ بہن اس لڑکی پر قابض ہو گیا تھا۔ اس جن نے اس لڑکی کی ساس اور سرسے کہا کہ اس لڑکی کے ساتھ مجھے محبت ہے۔ اسے طلاق دو ورنہ تمہارے بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑ دوں گا۔ دو شاہ جی بلائے گئے۔ انہیں بھی جن نے یہی کہا۔ ان لوگوں نے اپنے بیٹے کی جان کی سلامتی کی خاطر لڑکی کو طلاق دے دی۔“

”میں زور سے ہنس پڑا۔“ ”کیوں!“۔ حمید نے پوچھا۔ ”تمہیں ہنسی کس بات پر آئی ہے؟“ ”ہنسی اس جن پر آئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم اسے سچ سمجھتے ہو گے۔ میں

نے ایک لڑکی کو یہی ڈرامہ کھیلتے دیکھا ہے۔
 "اُس نے بھی ڈرامہ ہی کھیلا تھا یا رہا؟" حمید نے کہا۔ "میں یہ تو نہیں
 کہہ رہا کہ اُس پر سچ مچ جن کا قبضہ ہو گیا تھا۔"

"جن نکالنے والے کسی شاہ یا عامل کو بلایا گیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"مجھے تو تم بات ہی نہیں کرنے دے رہے؟" حمید نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ
 تمہارے شہر کی واردات ہے۔ اُس وقت وہ تمہارے شہر میں تھی۔ اُس کے سسر نے
 وہاں کسی کی زمین بٹائی پر لی تھی۔ یہ جن والا واقعہ ہو گیا اور پھر طلاق ہو گئی تو اس کے
 سسر مال اتنے بدل ہوئے کہ زمین چھوڑ کر واپس گاؤں آ گئے۔ مجھے اپنا یہ ڈرامہ اسی
 لڑکی نے سنا یا تھا۔"

میں چونک پڑا۔ خیال آیا کہ حمید عائشہ کے میکے گاؤں کا رہنے والا ہے۔

"اس لڑکی کا خاوند تحصیل میں ملازم تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں؟" حمید نے کہا۔ "وہ تحصیل میں چپڑاسی یا ہرکارہ ہے۔" اُس
 نے عائشہ کے خاوند کا نام لیا۔

"پھر اس لڑکی کا نام عائشہ ہے؟" میں نے کہا۔ "ان لوگوں نے ہماری
 زمینیں بٹائی پر لی تھیں۔ یہ جن والا ڈرامہ میکے سامنے کھیلا گیا تھا۔"

"ہاں خانی؟" حمید نے کہا۔ "اُس کا نام عائشہ ہے۔... کیا تمہیں معلوم تھا
 کہ یہ لڑکی جن کا ڈھونگ رچا رہی ہے؟"

میں فوراً چوکس ہو گیا۔ اچھا تو کہ حمید نے پہلے بتا دیا تھا کہ عائشہ سے وہ
 ہیرا رانجے جیسی پاک محبت کرتا ہے۔ میں اُسے یہ بتا کر اُس کے دل کو دکھ نہیں
 دینا چاہتا تھا کہ جس کے ساتھ وہ پاک محبت کرتا ہے اُسے میں ناپاک کر چکا ہوں۔ میرے
 سامنے یہ مسئلہ بھی آگیا کہ میں نے قسم کھا کر حمید کو بھائی بنایا ہے۔ کیا میں اسے
 دھوکے میں رکھوں؟.... یہ سوچ بھی آئی کہ اسے اصل بات بتا دی تو نہ جلنے
 پر کیا کر بیٹھے۔

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا، کیا مجھے معلوم تھا کہ عائشہ جن کا ڈھونگ رچا رہی ہے؟
 میں نے بڑی تیزی سے سوچا اور دماغ میں جواب آگیا۔

"نہ حمید بھائی؟" میں نے کہا۔ "مجھے شک تھا۔ یہ ہمارے مزارع تھے۔
 اس لیے میں عائشہ کو اس حالت میں دیکھنے گیا تھا۔ میں نے اُس کے خاوند کو بھی دیکھا

تھا اور بہت ہی اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ عائشہ کے قابل تھا ہی نہیں۔ اس شخص
 کی بول چال اور انداز نہانہ سے ہیں۔ عائشہ تندرست اور توانا لڑکی ہے۔ خوبصورت
 ہے.... میں سمجھ گیا تھا کہ عائشہ اس خاوند سے آزاد ہونے کے لیے ڈھونگ رچا

رہی ہے۔"

"تم نے اُس کے ساتھ کبھی باتیں کی تھیں؟" حمید نے پوچھا۔

"نہ یا رہا؟" میں نے جھوٹ بولا۔ "اُس کے ساتھ بھلا میرا کیا تعلق تھا...."

تم اپنی سناؤ۔"

میں نے اپنی طرف سے اُس کی توجہ ہٹا دی۔ ویسے بھی اُس کے دماغ پر عائشہ
 سوار تھی۔



"میں اپنی کیا سناؤں خانی یا رہا؟" حمید نے کہا۔ "میں ایک چکر میں آگیا
 ہوں۔ میں بھاگتا نہیں چاہتا۔ مشکل یہ ہے کہ میں اکیلا ہوں۔ میں نے انتقام لینا ہے۔"

"اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھو۔" میں نے کہا۔ "کیا میں نے قسم نہیں کھائی کہ ہر
 حال میں اور ہر مشکل میں تمہارا ساتھ دوں گا؟ تم بات تو کرو۔"

"بات یہ ہے میرے بھائی؟" حمید نے کہا۔ "عائشہ کو میں اُس کی شادی
 سے پہلے بھی جانتا تھا اور یہ لڑکی مجھے اچھی لگتی ہے۔ ایک تو اس کی خوبصورتی دل کو
 کھینچتی ہے، دوسرے وہ ہنس مکھ ہے اور اصل خوبی یہ کہ اُس کا اخلاق اور چال
 چلن سولہ آنے صاف اور اچھا ہے۔ ہماری تھوڑی سی زمین ہے جو کئی سالوں سے
 بٹائی پر عائشہ کے باپ کے پاس ہے۔"

"پھر تو عائشہ کے ساتھ تمہاری اچھی بات چیت ہوگی۔" میں نے کہا۔

"نہیں خانی؟" اُس نے کہا۔ "میں یہ نہیں کہتا کہ میں شریف آدمی ہوں
 لیکن عائشہ کو میں نے بڑی نظر سے کبھی نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی ہمارے گھر آتی تھی۔ ایسے

پتہ چلتا تھا جیسے گھر میں رونق آگئی ہو۔ ہر بات ہنسی مذاق کے رنگ میں کرتی تھی اور
 مجھے اچھی لگتی تھی۔ میرے ساتھ بھی ہنسی مذاق کے رنگ میں ہی بات کرتی تھی۔ صاف
 پتہ چلتا تھا کہ تیت کی صاف لڑکی ہے...."

"پھر اُس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد تین چار بار میکے آئی۔ ہر بار ہمارے گھر
 آئی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی شوخی خالی ختم ہو گئی تھیں۔ ایک بار میں نے اُسے اپنی ہنس

کے پاس بیٹھے دیکھا۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے بے تکلفی سے پوچھا، بات ہے عائشہ؟ گھر میں خیریت تو ہے؟ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے لیکن اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور بولی، سب ٹھیک ہیں، ویسے ہی دل کچھ اُداس لگتا تھا.... وہ چلی گئی تو میری بہن نے بتایا کہ خاوند کی جان کو رو رہی تھی۔ اس کے بڑی زیادتی ہوئی ہے....

”یہ تو میں نے نہیں بتایا ہے اور تم نے خود بھی دیکھا ہے کہ اُس کے ساتھ کیا زیادہ ہوئی تھی کہ اسے سولہ سال کی عمر میں بیاہ دیا گیا۔ ابھی تو وہ پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ طلاق لے کر آگئی اور ساتھ ہی گاؤں میں یہ مشہور ہو گیا کہ عائشہ کو چنوں نے طلاق دلوائی ہے اور یہ کہ اس پر ایک چم عاشق ہو گیا ہے۔ گاؤں کی عورتیں عائشہ کے گھر پر لوٹ پڑیں۔ یہ تو ہر کوئی مانتا ہے کہ کوئی جن کسی خوبصورت عورت سے دل لگا لیتا ہے اور کوئی چمڑیل کسی آدمی پر عداوت ہو جاتی ہے۔“

”لوگوں کے لیے عائشہ عجوبہ بن گئی ہوگی“ — میں نے کہا — ”وہ حیرت سے اُسے دیکھتے ہوں گے۔“

”کچھ حیرت سے؟“ — حمید نے کہا — ”وہ باہر نکلتی تھی تو گاؤں کے مرد اُسے ڈک ڈک کر دیکھتے تھے۔ اُس کے ماں باپ بہت پریشان تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ عالاہل ابھی نوجوانی کی عمر میں تھی۔ اُس کی دوسری شادی فوراً ہو جانی چاہیے تھی لیکن اب اُسے کسی نے بھی قبول نہیں کرنا تھا کیونکہ سب اُس جن سے ڈرتے تھے جس نے عائشہ کو اپنی محبوبہ بنالیا تھا....“

”اُس پر اب جن تو نہیں آتا تھا لیکن اُس کے باپ نے سوچا کہ اسے کسی عامل اور پیر کے پاس لے جایا جائے اور کہا جائے کہ اس جن سے عائشہ کو آزاد کرایا جائے.... ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی بالکل چھوٹا سا ایک گاؤں ہے وہاں ایک شاہ رہتا ہے۔ وہ کوئی بڑا پیر تو نہیں لیکن ہمارا پورا گاؤں اُسے پیر مانتا ہے اور ارد گرد قریب کے گاؤں بھی اُس کے اثر کے نیچے ہیں۔ مشہور ہے کہ اُس کے قبضے میں جن ہیں اور اس علاقے کے تمام لوگ اُس کے مرید ہیں۔ میں بھی اُسے پہنچ والا بزرگ مانتا ہوں۔“

”بوترھا ہے؟“ — میں نے پوچھا۔

”نہیں یاد! —“ حمید نے جواب دیا — ”ہٹا کٹا، لال مرغ، جوان ہے۔ عمر

چالیس سال سے کم ہے۔ شاید چونتیس پینیس ہو لیکن بالکل جوان لگتا ہے۔ عائشہ کا باپ ایک روز عائشہ کو اُس کے پاس لے گیا اور اُسے بتایا کہ عائشہ کو ایک جن نے طلاق دلوائی ہے۔ اب اس پر جن تو نہیں آتا لیکن ڈر ہے کہ لڑکی کی شادی کر دی تو پھر جن اس پر سوار ہو جائے گا اور دوسرے خاوند کو ڈر کر طلاق دلوا دے گا....“

شاہ جی نے بہت کوشش کی کہ جن حاضر ہو لیکن جن حاضر نہ ہوا۔ شاہ جی نے کہا کہ یہ کسی اور ولایت کا جن ہے اور بہت ہی شیطان ہے۔ اسے حاضر کرنا ضروری ہے ورنہ لڑکی کی زندگی تباہ کر دے گا۔ شاہ جی نے کہا کہ وہ لڑکی کو ایک رات اپنے پاس رکھے گا اور جنوں کے سردار کو حاضر کرے کہ اس جن کا بندوبست کرے گا....“

”مجھے تو ان باتوں کا علم ہی نہیں تھا۔ میں دوسرے لوگوں کی طرح اس کو سچ سمجھ رہا تھا کہ عائشہ کو جن نے طلاق دلوائی ہے۔ مجھے اصل بات کا علم اس طرح ہوا کہ ایک روز میں قبرستان میں ایک خانقاہ پر سلام اور فاتحہ کے لیے گیا۔ میں ہر جہالت کی شام ہاں جایا کرتا تھا۔ اس خانقاہ کا راستہ مجھے ایک بزرگ نے دکھایا تھا۔ میں نے دو جہالتیں عائشہ کو خانقاہ میں دیا جانے کے لیے جانتے دیکھا۔ تیسری جہالت وہ خانقاہ میں دیا جلا رہی تھی اور میں خانقاہ میں داخل ہوا۔ اُس وقت خانقاہ کے اندر کوئی نہیں تھا۔“

حمید کے ساتھ عائشہ کی جو گفتگو ہوئی وہ حمید نے اس طرح سنائی۔

”میں تو اسے لیے یہاں لڑکی ہوئی ہوں“ — عائشہ نے حمید سے کہا — ”میری ایک بات سنو گے؟“

”یہیں سن لو“ — عائشہ نے کہا — ”یہاں کوئی شک نہیں کرے گا۔ میں نے بدکاری اور بدعاشی کی کوئی بات نہیں کہتی۔ یہاں بات کر دو گی تو ہو سکتا ہے یہ جو بزرگ اس خانقاہ میں دفن ہیں، ہماری مدد کریں۔ مجھے اس درگاہ پر بھروسہ اور یقین ہے۔ اگر کوئی آگیا تو باہر نکل چلیں گے۔“

”بات کر دو“ — حمید نے کہا۔

عائشہ نے اُسے بتایا کہ اُس کے ماں باپ اُسے شاہ جی کے پاس لے گئے تھے اور کہا تھا کہ جس جن نے اس کے سسرال کو دھکی دے کہ طلاق دلوائی تھی، وہ اس کی کہیں بھی شادی نہیں ہونے دے گا۔ اس جن سے نجات دلا دیں، اور یہ جن جو مسدود یا نذرانہ مانگے گا وہ دیں گے۔

س کے قریب بیٹھ گئی اور فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ حمید اٹھ کر باہر نکل گیا۔
سورنیں دیا جلا کر چلی گئیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ حمید قبرستان سے نکل کر
نفل کی ادھ میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد عائشہ باہر نکلی اور ادھر ادھر دیکھ کر حمید کے
پیچھے چلی گئی۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گئے۔

رات کو مجھے مجبور کر دیا گیا کہ میں شاہ جی کے گھر جاؤں۔ عائشہ نے حمید کو
سنایا۔ ”وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ اُس نے شراب کی بوتل نکالی۔ دو گلاسوں
میں تھوڑی تھوڑی شراب ڈالی، پھر گلاسوں میں سوڈے کی بوتل ڈالی۔ ایک گلاس میرے
آگے کر کے بولا، یہ پی جاؤ پھر دیکھنا جن کس طرح حاضر ہوتا ہے۔ میں اتنی سیدھی
اور بے عقل تو نہیں کہ شراب کی بوتل اور اس کی بدبو کو نہ پہچان سکتی ہیں نے شراب
پینے سے انکار کر دیا۔“

میں عائشہ کی اُس بات کو جو اُس نے حمید کو سنائی تھی، ذرا مختصر کر دیتا ہوں۔
شاہ جی نے اپنے آپ پر کشف کی کیفیت طاری کر کے عائشہ کو متاثر کرنے کی بہت کوشش
کی۔ اُسے جن سے ڈرایا اور کہا کہ جن تمہارے دجو میں موجود ہے اور اسے حاضر کرنا
مزدوری ہے۔

”میں یہ شراب تمہیں نہیں بلاتا رہا۔“ شاہ جی نے آخر یہ کہا۔ ”یہ میں اس
شیطان جن کو بلاتا ہوں۔ شراب جلے گی تمہارے منہ میں لیکن اس کا نشہ جن کو ہوگا۔
پھر یہ باہر نکل آئے گا اور میں تمہارے سامنے اسے زندہ جلاؤں گا۔“
عائشہ پھر بھی نہ مانی۔ شاہ جی نے اُس کا گلاس پی لیا۔ پھر وہ عائشہ کے ساتھ دہلی
کی کیفیت میں باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد نشہ اُسے بدمستی میں لے آیا اور اُس نے عائشہ سے
کہا کہ وہ پلنگ پر لیٹ جائے تاکہ جن کو حاضر کیا جائے۔
عائشہ نے انکار کر دیا۔

شاہ جی غصے میں آ گیا اور عائشہ کو دو تین گالیاں دے ڈالیں۔
شاہ جی کسی وجہ سے ذرا پیچھے ہٹا تو عائشہ وہاں سے اٹھ دوڑی۔ لوگوں کا یہ
برگزیدہ پیر شراب کے نشے میں ایسا دھت تھا کہ عائشہ کا تعاقب نہ کر سکا۔ تعاقب
کرنا بھی تو عائشہ اُس کے ہاتھ نہ آتی۔ جہاں ہی طور پر عائشہ پھرتی لی لڑکی تھی۔
دوسرے دن شاہ جی نے عائشہ کے باپ کو اور اُس کی ماں کو بھی اپنے آستانے
میں طلب کیا اور انہیں گالی گلوچ کی کہ ان کی بیٹی نے ان کی توہین کی ہے۔ پھر انہیں

”پتہ نہیں تم سمجھ سکو گے یا نہیں حمید!“ عائشہ نے کہا۔ ”میں سب
لوگوں کی طرح اس شاہ جی کو مانتی تھی کہ پہنچ والے بزرگ ہیں۔ ان کے ہاتھ میں اتنی
طاقت ہے کہ جن اور چڑھیلے بھی انہیں اپنا پیر اور مرشد مانتی ہیں لیکن حمید!
میں جاہل دیہات ضرور ہوں لیکن خدا نے عقل تو دی ہے۔ اس شاہ جی نے جن نظروں
سے مجھے دیکھا ان نظروں میں بزرگی نہیں تھی شیطان مجھے گھوڑ رہا تھا۔ میرے ماں
باپ کو باہر نکال کر شاہ جی نے مجھے اپنے پہلوؤں جیسے بازوؤں کی لیٹ میں لے کر
اپنے قریب کمر لیا۔ میری آنکھوں کو اپنی انگلیوں سے کھول کر آنکھوں میں اس طرح
دیکھنے لگا کہ اس کا منہ میسر منہ کے قریب آتا گیا اور اُس کا منہ میرے منہ کے
ساتھ لگ گیا۔۔۔۔

”میں نے اپنا منہ پیچھے کر لیا۔ شاہ جی نے کہا، اب پیچھے ہٹ کر کہاں جائے گا
مردود! ہم نے تجھے پہچان لیا ہے۔ ہماری مریدنی کی زندگی برباد کر کے تو جائے گا
کہاں؟ جلا کر راکھ کر دوں گا۔۔۔۔ اُس نے پھر مجھے اپنے قریب کیا تو میں سرک
کرت پیچھے ہو گئی۔ شاہ جی نے کہا، عائشہ بی بی! آج رات میں تجھے اپنے پاس رکھوں گا۔
یہ ایک شیطان جن ہے۔ کوئی کوئی جن ایسا نکل آتا ہے جو اپنے پیغمبر حضرت سلیمان
کو ماننے کی بجائے شیطان کا چیلہ بن جاتا ہے۔ ایسا جن بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔
یہ جن تمہیں کسی کی بیوی نہیں بننے دے گا۔ کچھ دنوں بعد یہ خود تمہارا خاوند بن جائے
گا اور تمہارے جسم کا وہی حال ہو جائے گا جو دیک لکڑی کا کر دیتی ہے۔۔۔۔

”اُس نے میسرے مال باپ کو اندر بلایا اور انہیں بھی بہت ڈرایا اور ایسی شنگی
اور بے شرمی کی باتیں کیں جو میں اپنی زبان پر نہیں لاسکتی۔ اُس نے میرے مال باپ
کو بہت ہی غصے اور عجب سے کہا کہ اپنی بیٹی کی خیر چاہتے ہو تو لڑکی کو آج رات
میرے پاس چھوڑ جانا۔ میں نے گھرا کر اپنے ماں باپ سے کہا کہ میں رات شاہ جی کے
گھر نہیں جاؤں گی۔ میسرے باپ نے میرے منہ پر چھڑ باد کر کہا، تو شاہ جی کی حکم عدولی
کرتی ہے؟ وہ اللہ والے ہیں اور تو نہ جانے کیا سوچ کر ان کے بے ادبی کر رہی ہے۔
انہوں نے اس جن کو پہچان لیا ہے اور آج رات وہ اسے حاضر کرے گا۔“

حمید حیران تھا کہ عائشہ اتنی پہنچ والے شاہ جی کا حکم نہیں مان رہی تھی اور اس
کے دل میں اس جن کا ذرا سا بھی ڈر اور خوف نہیں تھا۔ اتنے میں دو عورتیں خافہ
میں داخل ہوئیں۔ حمید نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا لیے اور عائشہ نے دیا جلا یا۔ پھر عائشہ

بتایا کہ ان کی بیٹی کے اندر سے جن نہ نکلا تو انہیں کسی قسم کا بھیانک نقصان ہوگا۔ یہ دونوں بے چارے وہاں سے خوفزدگی کی حالت میں کانپتے ہوئے گھر آئے۔ باپ نے پہلے عائشہ کو مارا پٹا تھا لیکن اب اس نے عائشہ کی میت کی ساجت کی کہ وہ شاہ جی کے پاس جا کر معافی مانگے اور ان کے قدموں میں سر رکھے۔

”مجھے جان سے مار ڈالو“ عائشہ نے کہا۔ ”میں وہاں نہیں جاؤں گی“

باپ اُسے مارنے بیٹھنے کے لیے اٹھا۔ ماں درمیان میں آگئی اور اُسے الگ لے گئی۔ ماں نے اُس سے پوچھا کہ وہ شاہ جی کے پاس کیوں نہیں جاتی۔ عائشہ نے ماں کو اصل بات بتادی۔ یہ بھی بتایا کہ شاہ جی اُسے زیرِ رستی شراب پلا رہا تھا لیکن اُس نے پینے سے انکار کر دیا۔ پھر عائشہ نے ماں کو وہ ساری حرکتیں بتائیں جو شاہ جی نے اُس کے ساتھ کی تھیں۔

”مجھے دوسرا خاوند نہ ملے“ عائشہ نے کہا۔ ”میں ساری عمر اکیلی گزار دوں گی لیکن اس شاہ جی کی بے لگا جی بیوی نہیں بنوں گی۔ یہ دھوکہ باز اور فریبی ہے اور میرا باپ بے غیرت ہے“

ماں کچھ دیر غامض رہی۔ کبھی عائشہ کی طرف دیکھتی اور کبھی سر جھکا لیتی۔

”کیا تم میرے اس باپ کو کچھ نہیں سمجھا سکتیں ماں؟“ عائشہ نے کہا اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔



”نہیں عاشی پُترا!“ ماں نے عائشہ سے کہا۔ ”میں تیرے باپ کو کچھ نہیں سمجھا سکتی۔ تو نے اپنے باپ کو بے غیرت کہا ہے۔ میں بھی اسے بے غیرت ہی سمجھتی ہوں لیکن اسے مزہ بہرے غیرت کہنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ کہوں تو یہ مجھے قتل کر دے۔ میں تجھے ایک بات بتاتی ہوں لیکن تو اسے سچ نہیں سمجھے گی۔ یہ ایک راز ہے جو میں صرف تجھے دے رہی ہوں۔“

بات ذرا جلدی کر و ماں!“ عائشہ نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تو اس جینے سے بیزار ہو گئی ہوں۔“

”بات یہ ہے کہ یہ شاہ جی تیرا بھائی ہے“ ماں نے کہا۔ ”تیری رگوں میں اسی باپ کا خون ہے۔“

عائشہ کی آنکھیں اتنی زیادہ کھل گئیں جیسے اُس کے ڈھیلے باہر آجائیں گے۔

”ہاں عاشی پُترا!“ ماں نے کہا۔ ”جبران مت ہو۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ ایک عورت کی کوکھ سے اُس کے بہر یا شاہ جی کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ یہ جو عورتیں پیروں اور عاملوں کے پاس اولاد کے لیے لے جاتی ہیں، انہیں اولاد پیر کے تعویذ نہیں دیتے اولاد دہیر دیا کرتا ہے۔۔۔۔۔ یہ ہمارے مردوں کی بے غیرتی ہے۔“

”تم اپنی بات کرو!“ عائشہ نے کہا۔

”میری شادی ہوئی تو دو سال بچہ نہ ہوا“ ماں نے کہا۔ ”میری ساس اور نندوں نے تو میرا جینا حرام کر دیا۔ اُس وقت اس شاہ جی کا باپ اسی شاہ جی کی طرح لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ تیرا باپ بھی میری جان کھانے لگا کہ بچہ پیدا کر دو ورنہ تمہیں باجھ اور بددعا دی ہوئی سمجھ کر طلاق دے دی جائے گی۔“

”ساس مجھے شاہ جی کے پاس لے گئی۔ میں اُس وقت تیری طرح نئی نئی جوان ہوئی تھی۔ خدانے شکل و صورت بھی ذرا ٹھیک ہی دی تھی۔ شاہ جی نے موجودہ شاہ جی کی طرح میری آنکھیں اپنی انگلیوں سے پوری طرح کھول کر دیکھا اور بولا، اداہ! یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ اُس نے میری ساس کو بہت ڈرایا کہ اُس لڑکی پر اتنا خطرناک سایہ ہے کہ اتارا نہ گیا تو اس کا خاوند حرام موت مرے گا پھر تمہارا پورا خاندان تباہ و برباد ہو جائے گا۔۔۔۔۔“

”میں تو بہت ہی ڈری اور میری ساس نے شاہ جی کے پاؤں پکڑ لیے اور رو رو کر فٹیں کیں کہ کچھ کریں۔ تیری طرح شاہ جی نے مجھے بھی اکیلے بلایا اور میرے ساتھ وہی حرکتیں اور وہی باتیں کیں جو اُس کے بیٹے نے تیرے ساتھ کی ہیں۔ جو بہت اور جرأت تجھ میں ہے وہ مجھ میں نہیں تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں خوش بھی ہوئی تھی کہ اتنے پہنچ والے شاہ جی مجھ پر اتنے مہربان ہیں۔۔۔۔۔“

”میں ان کے پاس اکیلی جاتی رہی اور پھر تو پیدا ہوئی اُس وقت یہ شاہ جی اٹھ دس سال کا تھا۔ اس کا باپ اس سے زیادہ خوبصورت اور قوی ہیکل تھا۔ اس کا رنگ پکے ہوئے سیب جیسا تھا۔ تجھے اسی سے گورا رنگ ملا ہے اور تجھے خوبصورت بھی اسی سے ملی ہے۔“

”تم نے اپنے اس بے غیرت خاوند کو بتایا نہیں کہ میں اس کی بیٹی نہیں؟“ عائشہ نے کہا۔ ”میں بتا دیتی ہوں۔“

”نہیں عاشی پُترا!“ ماں نے کہا۔ ”یہ نہیں مانے گا۔ ہم پر یہ الزام لگائے

عائشہ نے حمید کو اپنے جن کی اصل حقیقت ویلے ہی سنا دی جیسے اُس نے مجھے سنا ہی تھی۔

”خانی یار!“ حمید نے یہ بات سنا کر مجھ سے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے مان تو لیا لیکن کبھی کبھی میرا یقین ہل جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس لڑکی نے جھوٹ بولا تھا۔ دینا تو لڑکی ایسا سوانگ نہیں رہا سکتی۔“

”نہیں حمید!“ میں نے کہا۔ ”اُس نے یہ سوانگ رچایا تھا اور میں اس کا عین شاہد ہوں۔ یہ لوگ ہمارے مزارے تھے۔ اس لڑکی نے ہمیں بھی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔“

میں نے حمید کو بتایا کہ عائشہ نے کیسی کمال کی ایکٹنگ کی تھی اور اس نے جن نکالنے والے دو عاتلوں کو کس طرح بھگایا تھا۔

”یہ ہمارے مزارے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ہماری زمینیں سنبھالنے کے لیے اپنے گاؤں سے آئے تھے اس لیے یہ ہمارا فرض تھا کہ ایسے مشکل وقت میں ان کی مدد کریں۔ میں نے بہت بھاگ دوڑ کی تھی۔ جب عائشہ کو طلاق ہو گئی تو گاؤں جانے سے پہلے وہ مجھے اکیس مل گئی۔ اُس نے مجھے کہا کہ تم نے میرے لیے بہت بھاگ دوڑ کی ہے۔ اس لیے میں تمہیں دھوکہ دینا نہیں چاہتی۔ مجھ پر کوئی حق نہیں آیا تھا۔ میں نے ڈھونگ رچایا تھا۔ طلاق لینی تھی۔ وہ لی ہے۔ میں تمہیں اور تمہارے امی ابا کو ہمیشہ دعائیں دیتی رہوں گی کہ تم سب نے میری مشکل میں میرے لیے دن رات ایک کر دیا۔“

میں نے حمید کو یہ نہ بتایا کہ عائشہ کے ساتھ میرے درپردہ تعلقات کیا تھے۔

”اب آگے سناؤ کیا ہوا!“ میں نے حمید سے کہا۔



حمید نے مجھے اس سے آگے بات یوں سنائی کہ اُس نے عائشہ سے پوچھا کہ اُس نے یہ ساری باتیں اُسے کیوں سنائی ہیں۔

”تم چاہو بڑا جانو حمید!“ عائشہ نے اُسے کہا۔ ”میں نے تمہیں اپنا سمجھ کر اپنی یہ مشکل سنائی ہے۔ تم مجھ سے پوچھو کہ میں نے تمہیں اپنا کیوں سمجھا ہے تو میں اس کا جواب نہیں دے سکتی۔ تم زمینوں کے مالک ہو۔ میں مزارعوں کی بیٹی ہوں۔ اگر

گا کہ ہم شاہ جی کے بے ادبی کر رہی ہیں۔۔۔۔ میں نے تجھے راز کی یہ بات اس لیے سنائی ہے کہ تم عورتیں ہیں۔ ہم مال مویشی ہیں۔ گائے ہل کے آگے بھی جوتی جاتی ہے، اس سے دودھ بھی لیا جاتا ہے، اس سے بچھڑے بھی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اور جب یہ بیکار ہو جاتی ہے تو اسے ذبح کر کے کھاتے ہیں۔ ہم گائیں ہیں عائشی پُتر!۔۔۔ اور یہ مبت سوج کہ تو اس شاہ جی کے خلاف بول کر لوگوں سے منوالو گی کہ یہ شخص فریبی ہے۔ اسے پہنچ والا اور آسانی طاقت اور جنوں کا بادشاہ تیرے باپ جیسے بالوں اور خاوندوں نے بنایا ہے۔۔۔ وہ بڑا شاہ جی جانتی ہو کس طرح مرا تھا؟ تم ابھی چھوٹی تھیں!“

”جھے یاد ہے۔“ عائشہ نے کہا۔ ”اُس پر پہلی گری تھی۔“

”وہ اپنے مریدوں کے ایک گاؤں گیا ہوا تھا۔“ مان نے کہا۔ ”اپنے چیلوں کے ساتھ گھوڑی پر سوار واپس آ رہا تھا۔ راستے میں بارش شروع ہو گئی۔ شاہ جی بڑے کے ایک پرانے اور بہت بڑے درخت کے نیچے ٹک گیا۔ بجلی بار بار چمکتی اور کڑکتی تھی۔ بجلی بڑے کے درخت پر گری۔ ایک بہت بڑا ٹھن ٹوٹ گیا اور یہ شاہ جی کے سر پر گر کر گھوڑی مدک کر دوڑ پڑی اور شاہ جی کے نیچے سے نکل گئی۔ شاہ جی وہیں مر گیا۔۔۔ آج تک لوگ بڑے کے اس درخت کے نیچے دیتے جلاتے ہیں۔“



عائشہ نے یہ ساری داستان حمید کو سنائی۔

”یہ تو میں تم سے بعد میں پوچھوں گا کہ تم نے یہ رام کہانی مجھے کیوں سنائی۔“ حمید نے عائشہ سے کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ اس جن کا کیا کردار ہو گا جو شاہ جی کہتے ہیں کہ تمہارے اندر موجود ہے؟ شاہ جی کا حکم چنوں پر چلتا ہے۔ وہ اس جن کو ایسا حکم دیں گے کہ وہ تمہارا حلیہ بگاڑ دے گا اور تمہارے گھر کو تباہ کر دے گا۔“

عائشہ ہنس پڑی اور بڑی بے تکلفی سے حمید کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ حمید نے مجھے سنا یا کہ سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا گہرا ہو رہا تھا لیکن عائشہ کو ذرا ڈر نہ تھا کہ کوئی آجائے گا۔

”میرے اندر کوئی جن نہیں حمید!“ عائشہ نے کہا۔ ”میں نے خود جن کا کر خاوند سے طلاق لی تھی۔“

تم شیر اور دلیر مرد ہو تو میرے سر پر ہاتھ رکھو۔ اگر تمہارے دل میں یہ بات ہے کہ مالک اور مزارع میں ایسی محبت نہیں ہو سکتی جیسی میرے دل میں ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتی۔ میرا تم پر کوئی حق نہیں!

”ہیں عاشر!“ — حمید نے بے اختیار اپنا ایک بازو اس کے گلے میں ڈال کر اُسے ساتھ لگایا اور کہا — ”تم نے میری مردانگی کو لٹکا رہا ہے اور بات محبت کی کی ہے۔ میں یہ سچے نہیں ہوں گا اور تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”میں لوگوں کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اس شاہ جی کے قبضے میں کوئی جن نہیں۔“ عائشہ نے کہا — ”اور اس کے ہاتھ میں کوئی خدائی طاقت نہیں!“

”یہ قوت نہ ہو عاشر!“ — حمید نے کہا — ”تم نے میں نے یا کسی نے یہ بات منہ سے نکالی تو لوگ قتل کر دیں گے۔ خدا کے بعد لوگ شاہ جی کو مانتے ہیں۔“

”اور کچھ لوگ خدا کی جگہ شاہ جی کو مانتے ہیں۔“ عائشہ نے کہا — ”میں جاہل دیہات کی کچھ نہیں جانتی یہ تو عالموں کے سمجھنے سمجھانے کی باتیں ہیں۔ مجھے معلوم نہیں شاہ جی کا درجہ کیا ہے لیکن اس شاہ جی کو دیکھو۔ میسراندہ کوئی جن نہیں نہ مجھ پر کبھی کوئی جن آیا ہے۔ یہ تو میں نے جھوٹ بولا تھا کہ مجھ پر جن آتا ہے اور اس جن نے مجھ کو طلاق دلائی ہے۔ طلاق کے بعد مجھے میسر مال باپ اس شاہ جی کے پاس لے گئے تو میں ڈر گئی تھی کہ شاہ جی مجھے دیکھ کر کہہ دیں گے کہ یہ لڑکی جھوٹ بولتی ہے، اس پر کسی جن کا قبضہ نہیں لیکن شاہ جی نے میرے جھوٹ کو سچ کہہ دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ جن اس لڑکی کے وجود میں موجود ہے!“

”میں سمجھ گیا ہوں عاشر!“ — حمید نے کہا — ”یہ شاہ جی خود تمہارے وجود پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ تم جیسی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو وہ ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔“ ”یہ بھی دیکھو حمید!“ — عائشہ نے کہا — ”میں تمہیں اپنی ماں کی بات بتا چکی ہوں میں اس شاہ جی کی بہن ہوں۔ اگر میں اسے بتا دوں!“

”تو وہ نہیں مانے گا“ — حمید نے کہا۔

”پھر مجھے کچھ بتاؤ حمید!“ — عائشہ نے کہا — ”میں کیا کر دوں؟.... میں کسی کی داستا نہیں بننا چاہتی خواہ وہ کتنا ہی بڑا بہرہ کیوں نہ ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے ساتھ شادی کوئی نہیں کرے گا، کیونکہ ہر طرف مشہور ہو گیا ہے کہ مجھ پر بڑے خطرناک

جن کا قبضہ ہے۔ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی، کچھ کھا کر مر جاؤں!“ — یہ کہتے کہتے وہ اچانک جذباتی ہو گئی۔ اپنے بازو حمید کے گلے میں ڈال دیے اور بڑے ہی دالمانہ لہجے میں بولی — ”میں صرف تمہیں اپنا بھتیجی ہوں حمید! اگر تم مجھے اپنا نہ سمجھو تو صاف جواب دے دو۔ میں دل پر پتھر رکھ لوں گی اور تمہاری طرف کبھی دیکھوں گی بھی نہیں!“

حمید نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا پھر یوں ہوا جیسے یہ دو نہیں ایک جسم ہو۔



”خانی بھائی!“ — حمید نے یہ سارا واقعہ مجھے سناتے ہوئے کہا — ”میں جبران ہوں۔ ذرا تم بھی سوچو۔ اتنی خوبصورت لڑکی، تنہائی اور رات کی تاریکی لڑکی میسر بازوؤں میں، میں لڑکی کے بازوؤں میں مگر اللہ گواہ ہے کہ میرے دل میں کوئی شیطانی خیال نہیں تھا۔ ہم دیہاتی لوگ جانور ہوتے ہیں۔ عورت کو صرف جسم سمجھتے ہیں جس کے ساتھ کھیلنا جانا ہے اور اس کا یہی ایک استعمال جانتے ہیں لیکن لیکن جہاں لہو پر میں برف ہو گیا تھا اور میری روح جاگ پڑی تھی!“

”یہ باتیں سمجھنے کے لیے ہمارے پاس علم نہیں حمید بھائی!“ — میں نے کہا — ”یہ اللہ کے راز ہیں جو اللہ ہی جانتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اللہ اس کا ہے جو اس کے حکم پر چلتا ہے۔ اگر تم بدینت ہو جاتے تو وہیں پکڑے جاتے.... تم بات سناؤ پھر کیا ہوا!“

”پہلے میں تمہیں ایک اور بات سناناں“ — حمید نے کہا — ”یہ لڑکی اُس وقت سے مجھے اچھی لگنے لگی تھی جب وہ تیرہ چودہ سال کی ہوتی تھی۔ بڑی شوخ اور ہنسوتہ تھی اور میرے ساتھ تو اس کی بہت ہی بے تکلفی تھی۔ پھر یہ بڑی ہوتی گئی۔ پہلے تو ہم بچوں کی طرح کھیلتے رہے۔ یہ لوگ ہمارے مزارعے تھے۔ میں ان کے گھر چلا جاتا اور کبھی کھیتوں میں چلا جاتا لیکن سولہ سال کی عمر میں عائشہ بھرپور جوان ہو گئی۔ اس کا حسن ایسا نکھر ا کہ لوگ تو اسے رک رک کر دیکھتے ہی تھے، میرے اندر جذبات کے طوفان اٹھنے لگے۔ اب میں اس کے ساتھ کھیل نہیں سکتا تھا....“

”میں نے دل سے اس لڑکی کو نہانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ بدلے ہوئے روپ میں میرے دل میں موجود رہی۔ اس کی شوخیال اور اچھل کود پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ یہ ہمارے مزارعوں کی لڑکی ہے، اسے پیسوں کا لالچ دلوں

گاتو میری بڑی نیت کو قبول کر لے گی لیکن اس کے ساتھ بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ صرف ایک بار ایسے ہوا کہ میں نے اس کے ساتھ بے تکلفی کی باتیں کرتے ایسی بات کہہ دی جس سے بڑی نیت کا اظہار ہوتا تھا۔ فوراً ہی اس کا ہنسا مسکراتا چہرہ بدل گیا۔ اُس نے کہا، نہ حمید، تمہارے منہ سے ایسی بات اچھی نہیں لگتی....

”اس سنجیدگی کی حالت میں وہ مجھے اتنی اچھی اور اتنی معزز نہ لگی کہ اس کے متعلق میرے خیالات بدل گئے۔ وہ کسی بڑی ذات والے خاندان کی لڑکی لگتی تھی۔ میرے دل میں آئی کہ میں اپنے مال باپ سے کہوں کہ میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن خیال آگیا کہ یہ بڑے کم درجے کی لڑکی ہے۔ میرے مال باپ مجھے بچتے ماریں گے اور عائشہ کے باپ سے اپنی زمینیں واپس لے لیں گے....

”میں نے عائشہ سے دُور ہٹنے کی کوشش شروع کر دی لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں کھچا ہوا عائشہ کے گھر یا کھیتوں میں چلا جاتا اور جب عائشہ مجھے دیکھ کر مسکراتی تو مجھے نشہ سا ہو جاتا۔ تم یہ سمجھ لو خانی کہ میرے دل پر اس لڑکی کا قبضہ ہو گیا تھا پھر اچانک ہی اس کی شادی ہو گئی۔ اُس روز تو میرے آنسو نکل آئے تھے۔“

”یوں کہونا کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی تھی“ میں نے کہا۔

”ہاں خانی!“

”پھر زیادہ بیان نہ کرو“ میں نے کہا۔ ”میں محبت کے معاملات اور جذبات کو سمجھتا ہوں۔ میں نے واحدہ سے محبت کی ہے۔ یاد آتی ہے تو سمجھ نہیں آتی کیا کروں؟“

”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی“ حمید نے کہا۔ ”عائشہ ہمارے مزارعوں کی بیٹی ہے۔ اُس کی حیثیت نوکرائی کی ہے لیکن اتنی بے تکلفی کے باوجود میں اُس کے سامنے محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ اُس کی شادی ہو گئی اور پھر وہ طلاق لے کر آگئی۔ میں اُس کے گھر جاتا رہا، وہ میرے گھر آتی رہی، ہم پہلے کی طرح باتیں کرتے رہے لیکن میں اُسے دل کی بات نہ کر سکا۔ میں دل کا اتنا کمزور اور ڈرپوک نہیں تھا، دراصل اُس کے چسکر اور انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ مجھ پر اُس کا رعب طاری ہو جاتا تھا....

”اُس روز وہ خالقہ میں ملی تو اُس نے بڑی لمبی کہانی سنا ڈالی۔ میرے دل سے محبت کا طوفان اُٹھا اور میں نے اس کا اظہار کر دیا۔ میں اُس کے لیے ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اُس نے بتایا کہ شاہ جی نے اُس کے پیچھے ایک غنڈہ چھوڑ دیا تھا

جو اُسے اور اُس کے باپ کو دو بار بڑی سخت دھکیاں دے چکا ہے وہ کہتا ہے کہ عائشہ کو اغوا کر کے چکلے میں پہنچا دیا جائے گا۔“

”تم نے نبرد ار کو بتانا تھا“ میں نے کہا۔

”تم شکر کے رہنے والے ہو خانی!“ حمید نے کہا۔ ”گاؤں کی دنیا نرالی ہے۔ دیہاتی علاقے میں راجہ جی، پوہدری جی، پیر اور شاہ جی اور ان کے غنڈے حکومت کرتے ہیں بے عزت کی شنوائی نہیں ہوتی۔ نبرد ار اور ذیلدار وغیرہ بھی طاقتور کا ساتھ دیتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ غنڈہ جو عائشہ اور اس کے مال باپ کو ڈراتا رہتا ہے، شاہ جی کا آدمی ہے.... میں نے عائشہ سے کہا کہ اب وہ گھر چلی جائے، میں کل اس غنڈے بد معاش سے ملوں گا۔ عائشہ نے کہا کہ اس کے ساتھ بچ کر بات کرنا۔ میری خاطر اپنے آپ کو کسی مصیبت میں نہ ڈال لینا.... میں نے اُسے کہا کہ وہ اب چوکس رہا کرے اور میری فکر نہ کرے.... وہ چلی گئی۔“



حمید بڑا دلیر جوان تھا۔ اُس کے دو دوست اُسی جیسے دلیر اور قربانی دینے والے جوان تھے۔ ان میں سے ایک نبرد ار کا بیٹا تھا۔ حمید نے اگلے دن ان کے ساتھ بات کی۔ انہوں نے کہا کہ شاہ جی کے خلاف قورنہ کوئی بات ہو سکتی ہے نہ کوئی کاہدوائی۔ اگر شاہ جی کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو سارا گاؤں تمہارا دشمن ہو جائے گا۔ اس بد معاش کے ساتھ بات ہو سکتی ہے۔

”اور ہونی چاہیے“ حمید نے کہا۔ ”یہ بھی سُن لو کہ میں اس کے ساتھ زبانی بات نہیں کروں گا۔ میں نے اُس کی ایک دو ہڈیاں توڑنی ہیں۔“

”توڑ دو“ نبرد ار کے بیٹے نے کہا۔ ”لیکن مجھے فوراً بتا دینا۔ میں اپنے باپ کو بتاؤں گا۔“

”میرے والد اُس کے سمت خلاف ہیں۔ وہ اسے تمھارے بلوا کر مجھے لگوا دیں گے۔“

”وہ ہے کیا یار!“ دوسرے دوست نے کہا۔ ”ہڈیوں کا ڈھا پنجر ہے اور بد معاش بنا پھرنا ہے۔“

میراں میں غنڈوں اور بد معاشوں کے متعلق ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ان غنڈوں اور دس نمبر بے بد معاشوں سے لوگ اس وجہ سے نہیں ڈرتے کہ وہ قوی ہیکل اور رستم زماں ہوتے ہیں بلکہ اُن سے ڈرنے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان غنڈوں کی کوئی

عزت نہیں ہوتی اور زمان میں غیرت ہوتی ہے۔ کوئی شریف اور باعزت شہری کسی غنڈے سے منہ لگا بیٹھے تو غنڈہ اُسے سہرا م بے عزت کر دے گا۔ غنڈے کا کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ وہ تو بے عزت۔ دوسری وجہ یہ کہ غنڈوں کے پیچھے بڑے لوگوں یا پولیس کا ہاتھ ہوتا ہے۔

حمید نے اپنے گاؤں کے اس غنڈے کے متعلق بتایا کہ وہ دہلا پتلا تیس سال عمر کا آدمی تھا۔ دس ہنر یا بد معاش تھا۔ اُس کی طاقت یہ تھی کہ اُس کی پیٹھ پر شاہ جی کا ہاتھ تھا لیکن عائشہ کی محبت اور اُس کی باتوں نے حمید کو دستی بم بنادیا تھا۔ اسے اب ذرا سی ٹھوکر کی ضرورت تھی۔ پھر بھی اُس نے یہ ارادہ کیا کہ اس غنڈے کے ساتھ آرام سے بات کرے گا۔ اگر نہ مانا تو کچھ اور کرے گا۔

اُسی روز اتفاق سے یہ بد معاش حمید کے سامنے آگیا۔ حمید نے اُسے روک لیا۔

”اُن غریبوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو یا ر!“ — حمید نے اُسے کہا۔

”کون سے غریب؟“

”میں عائشہ اور اُس کے باپ کی بات کر رہا ہوں۔“ — ”نگر لینی ہے تو کسی حیثیت والے گھر سے لو۔“

”وہ تمہارے کیا گتے ہیں؟“

”میں یہ بھی بتا دوں گا۔“ — حمید نے کہا۔ ”تمہارے بھائی بھائی دینی تو نہیں۔ تم تو کرائے کی غنڈہ گردی کر رہے ہو۔“

”اور تم عائشہ کے لیے جھک مار رہے ہو۔“ — بد معاش نے کہا۔ ”ایسا سُر اُٹھلی میں نہ دے ہو قوف! عائشہ کو میں ایسا غائب کروں گا کہ تم ساری عمر اُسے ڈھونڈنے رہو گے۔“

یہاں سے بات بڑھ گئی۔ گالی گلوچ ہوئی۔ حمید نے بڑی تیزی سے بد معاش کے منہ پر دو تین گھونٹے مارے۔ غنڈے نے چاقو نکال لیا اور حمید کو مارا۔ حمید نے اُس کا چاقو والا بازو اپنے بازو پر روک لیا لیکن چاقو کی نوک حمید کے بازو پر لگ گئی۔ یہ نہایت معمولی زخم تھا۔ حمید نے بد معاش کے اس بازو کی کلائی پکڑ کر اتنی زور سے مروڑی کہ اُس کے ہاتھ سے چاقو گھر پڑا۔

حمید نے چاقو اُٹھانے کے لیے بد معاش کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ جھکا ہوا تھا۔ بد معاش نے اُس کی پیٹھ پر گھونٹے مارے اور پھر اُسے کمر سے پکڑ کر گرنے لگا۔ حمید نے

جھکے جھکے اُس کی ران میں چاقو جا کر ایک دو انچ اُس کے پٹھے میں اتر گیا ہو گا۔ گاؤں کے کچھ کچھ آدمی اور حمید کا بڑا بھائی آگئے۔ بد معاش بھاگ گیا۔

نمبردار بھی آگیا۔ ساتھ اُس کا بیٹا بھی تھا جو حمید کا دوست تھا۔ اُس نے باپ کے ایسے کان بھرے کہ نمبردار حمید کو اور تین چار معزز آدمیوں کو ساتھ لے کر تھلنے چلا گیا اور تھانیدار کو بتایا کہ فلاں دس نمبر بے نے حمید پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ اُس نے اس بد معاش کا چاقو تھانیدار کے آگے رکھ دیا اور حمید سے پوچھا کہ بات کیا ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک کاسٹیبل سے کہا کہ وہ اس دس نمبر کو تھانے لے آئے۔ حمید نے تھانیدار کو بتایا کہ یہ بد معاش ان کے مزاحوں کی بیٹی کو تنگ کر رہا تھا ہے اور اُس کے ماں باپ اور بھائی کو دھکیاں دیتا رہتا ہے۔ حمید نے کہا کہ میں نے اُسے کہا کہ ان غریبوں کا پیچھا چھوڑ دے۔ اُس نے چاقو نکال کر مجھے مارا۔ میں نے اُس سے ہاتھ۔ سہا تو جین کمر اُس کی ٹانگ میں مارا۔

حمید نے پوری لڑائی سنا لی۔ نمبردار نے الگ اس بد معاش کے خلاف تھانیدار کے کان بھرے۔ حمید نے تھانیدار کو یہ بھی بتا دیا کہ یہ بد معاش شاہ جی کا پالو غنڈہ ہے۔ اسراہ جی۔ لٹا چاہتے ہیں لیکن یہ لڑکی اُن کے ہاتھ نہیں آئی۔

”کیا تم اس کے خلاف ہرچہ کرنا چاہتے ہو؟“ — تھانیدار نے حمید سے پوچھا۔ ”نہیں جی!“ — حمید نے جواب دیا۔ ”یہ تو نمبردار صاحب مجھے تھانے لے آئے ہیں۔ میں نے تو آپ کے پاس آنا ہی نہیں تھا۔“

کچھ دیر بعد بد معاش آگیا۔ تھانیدار نے اُس سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ ایک ہیڈ کاسٹیبل کو بلا یا اور اُسے کہا کہ اس دس نمبر سے کو لے جاؤ اور اُس کا داغ درست کرو۔ ظاہر ہے کہ اُسے بُری طرح مارا پیشا گیا تھا۔



اس کے بعد اس غنڈے کو شاہ جی کے گھر جاتے کبھی نہ دیکھا گیا۔ شاہ جی اپنی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے انتقام لینا تھا لیکن وہ بہت ہی چالاک آدمی تھا۔ اُس نے اپنے کسی اور غنڈے کو حمید کے پیچھے ڈالنے کی بجائے ایک اور ہی طریقہ اختیار کیا۔

اس واقعہ کے دوسرے تیس دن حمید کو اُس کے گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا کہ شاہ جی اُس کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہتے تھے کہ حمید اصل مرد ہے جس

نے ایک دس نمبر یہ کو اپنے آگے جھکا لیا ہے۔ اس آدمی نے حمید کو اور بھی کچھ بتائیں۔ یہ سب حمید کی تعریف میں تھیں۔

”حمید یار!“ اسی شام ایک اور آدمی نے حمید سے کہا۔ ”شاہ جی تم پر بہت خوش ہیں۔ میں وہاں گیا تو وہ تمہاری بات کر رہے تھے۔“

اس طرح چار پانچ آدمیوں نے حمید کو بتایا کہ شاہ جی اس پر بہت خوش ہیں کہ اس نے ایک ایسے بد معاش کا سر بیچا کر دیا ہے جس سے سب ڈرتے تھے حمید اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ بد معاش تو شاہ جی کا اپنا آدمی تھا پھر شاہ جی اس کے خلاف کیوں ہو گئے ہیں؟ بہر حال حمید بھونک میں آ گیا۔ وہ غیر معمولی طور پر دلیر ہو سکتا تھا اور تھا بھی لیکن وہ شاہ جی جیسا چالاک اور عیار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شاہ جی کی باتوں میں آ گیا۔

ایک آدھ دن اور گزرا تو اسے ایک آدمی نے کہا کہ شاہ جی اسے بہت مادی کرتے ہیں کہتے ہیں کہ اس لڑکے کو شاہ جی دینا چاہتا ہوں۔

”کسی وقت نہیں“ اس آدمی نے کہا۔ ”ابھی چلے جاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم تو خوش قسمت ہو یار! شاہ جی تمہیں خود بلارہے ہیں۔“

حمید اسی وقت چلا گیا۔



شاہ جی اپنے خاص کمرے میں تھا۔ اسے حمید کے آنے کی اطلاع ملی تو حمید کو اس نے اُسی کمرے میں بلا لیا۔ حمید اُسے اُسی احترام سے ملا جس احترام سے ہیروں کو ملا جاتا ہے۔ اس نے شاہ جی کے گھٹنے چھوئے اور دونوں ہاتھ مانتے پھر رکھ کر سلام کیا۔

”واہ حمید واہ!“ شاہ جی نے کہا۔ ”احیل مرد ہو۔ تم نے ایک دس نمبر یہ کو لگام ڈالی اور تمہارا کو بھی رام کر لیا۔“

”آپ کی دعا ہے شاہ جی!“ حمید نے کہا۔

”جیسے تم جیسے شیر کی ضرورت ہے۔“ شاہ جی نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔ ”اؤ ساتھ والے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں کوئی نہ کوئی آ جاتا ہے۔ میں نے تم سے ایک خاص بات کرنی ہے۔“

شاہ جی نے ایک دروازہ کھولا اور حمید کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ دروازہ

بند کر دیا لیکن زنجیر نہ چڑھائی۔ یہ کمرہ زیادہ کشادہ تھا۔ اس میں صرف دو چار پائیاں پڑی تھیں۔ ایک چارپائی پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے جو حمید کے یہ اجنبی تھے۔ ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرے کی عمر اس سے ذرا کم تھی۔

”لو بھائیو!“ شاہ جی نے حمید کے پیچھے ہو کر کہا۔ ”تمہارا شکار جال میں آ گیا ہے۔ اس کو سنبھالو اور ایسی مریت کرو کہ ساری عمر یہاں آکر سجدے کرتا رہے۔ اذکر کی ماردو۔“

اس کا مطلب تھا کہ گھونسوں کی ماردو تاک کوئی زخم اور کوئی چوٹ نظر نہ آئے۔ شاہ جی نے پیچھے سے حمید کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ حمید کی پیٹھ شاہ جی کے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ شاہ جی قوی ہیکل تھا۔ وہ دونوں آدمی حمید کی طرف آئے۔ حمید سمجھ گیا کہ وہ اس کے پیٹ میں گھونٹے ماریں گے۔ جب وہ اس کے قریب آئے اور انہوں نے مکے تانے تو حمید پوری طاقت سے اُچھلا اور ایک فلائنگ بک ایک کے پیٹ میں اور دوسری دوسرے کے پیٹ میں ماری۔

وہ دونوں پیچھے کو گرے۔ چونکہ حمید شاہ جی کی گرفت میں تھا اور شاہ کے سینے سے اس کی پیٹھ لگی ہوئی تھی۔ حمید طاقتور جوان تھا۔ اس نے دونوں آدمیوں کو اُچھل کر بک ماری تو اس کے جسم کا پیچھے کا دھک شاہ جی کو اتنی زور سے لگا کہ وہ دیوار سے جا لگا۔ دیوار فٹ ڈیڑھ فٹ دُور تھی۔ شاہ جی کا سر بھی دیوار سے لگا۔ حمید کے گرد اس کے بازوؤں کی گرفت بے جان ہو گئی۔

حمید پھرتیلا جوان تھا۔ وہ فوراً شاہ جی کے بازوؤں سے نکل آیا، پیچھے کو گھوما، شاہ جی ٹانگیں پھیلائے دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ وہ ابھی سنبھلا نہیں تھا۔ اس کا سینہ اندر سے ہل گیا تھا۔ حمید نے اُچھل کر شاہ جی کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اوپر کو بک ماری۔ شاہ جی کے منہ سے کمرنگ آواز نکلی اور وہ وہیں دھرا ہو گیا۔

یہ سارا ایجنٹ تین چار سیکنڈ میں ہو گیا۔

شاہ جی تو دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ ہی گیا۔ اس کے دونوں آدمی سنبھل کر حمید کی طرف آئے۔ حمید ایک چارپائی کی دوسری طرف ہو گیا۔ دونوں چارپائی پر چڑھ کر اس تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن حمید نے چارپائی اپنی طرف کھینچی اور پھر بڑی ہی زور سے اُن کی طرف دھکیلی۔ چارپائی کا لمبا بازو اُن دونوں کے گھٹنوں پر لگا۔ ہڈی کی چوٹ بڑی سخت ہوتی ہے۔

دونوں آدمی چوٹ کھا کر پیچھے ہٹے۔ حمید نے اپنی طرف سے چاپائی اٹھائی اور ان دونوں پر پھینک دی۔ پیشتر اس کے کوہِ سبطتے، حمید کمرے سے نکل گیا اور شاہ جی کی حویلی سے بھی نکل گیا۔ پیچھے اُس کی لٹکار رہ گئی۔ "اپنے جنوں کو میسے پیچھے بھیج اوئے دھوکے شاہ!"



حمید بھردار کے ہاں گیا اور اُسے یہ واقعہ سنایا۔ بھردار کا بیٹا جو حمید کا دوست تھا، باپ کے پیچھے پڑ گیا کہ تھانے چلو ورنہ شاہ جی حمید کو مروادے گا۔ حمید خود بھی یہی چاہتا تھا۔ بھردار اُسے تھانے لے گیا۔ تھانہ کچھ دُور ایک بڑے گاؤں میں تھا۔ تھانیدار بڑا ہی سخت اور اپنے فرائض کو سمجھنے والا آدمی تھا۔ دو تین دن پہلے شاہ جی کا ایک غنڈہ حمید پر حملہ کر چکا تھا۔ اب یہ دوسرا واقعہ ہو گیا۔ تھانیدار نے لے ایس آئی سے کہا کہ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے اور اس شاہ اور ان دونوں آدمیوں کو تھانے لے آؤ۔

شاہ جی اور اُس کے آدمی ڈیڑھ گھنٹے بعد آ گئے۔

"ان دونوں کو حوالات میں بند کر دو"۔ تھانیدار نے حکم دیا۔ "اور شاہ صاحب

آپ میرے ساتھ بیٹھ جائیں"۔

شاہ جی کے دونوں آدمیوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

"شاہ صاحب!"۔ تھانیدار نے شاہ جی سے کہا۔ "آپ کے قبضے میں جن ہول گے، چڑیلیں ہوں گی اور بھوت بھی ہوں گے لیکن میں انگریز کے قانون کا پابند ہوں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ آپ نے اس لڑکے پر آج دوسرا وار کیا ہے۔ میں اسے قاتلہ جلد لکھ کر آپ کی عزت خاک میں ملا سکتا ہوں۔ آپ پانچ سال کے لیے اندر ہو جائیں گے آپ کی منڈی چل رہی ہے۔ اسے چلتا رہنے دیں"۔

شاہ جی نے ایک دودھ بولنے کی کوشش کی لیکن تھانیدار نے اُسے بولنے نہ دیا۔ "میں آپ پر مہربانی کر رہا ہوں"۔ تھانیدار کہہ رہا تھا۔ "آپ مجھے تحریر دیں کہ آئندہ اس قسم کی حرکت نہیں کریں گے اور ان مزارعوں اور ان کی بیٹی عائشہ کو تنگ نہیں کریں گے اور ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھیں گے"۔

تھانیدار نے شاہ جی سے یہ تحریر لکھوائی۔ اُس کے دستخط کر لئے۔ بھردار کا بحیثیت گواہ انگوٹھا لگوا دیا اور بھردار کے بیٹے کو بھی گواہ بنا کر اُس کے دستخط لیے اور شاہ جی

کو خوب ڈرایا دھمکایا۔ اُس کے جو دو آدمی حوالات میں بند تھے انہیں کانسٹیبلوں سے پھینٹی لگوائی اور انہیں چلتا گیا۔

"حمید!"۔ تھانیدار نے کہا۔ "تم فارغ اور نیکے گاؤں میں کیوں پھرتے رہتے ہو؟ تم لوگوں نے زمینیں بٹائی پر دے رکھی ہیں۔ بہتر ہے فوج میں بھرتی ہو جاؤ اور اپنی زندگی کا کوئی راستہ بناؤ۔ آج تو میں ہوں۔ میرا ایمان کچھ اور ہے۔ کل پہیسوں کوئی ہندو یا سکھ تھانیدار آگیا یا کوئی حرام خورد مسلمان میری جگہ آگیا تو یہ شاہ اُسے ہاتھ میں لے کر نہیں اُڑا دے گا اور تمہارے خاندان کے لیے نئی سے نئی مصیبت کھڑی کیجے رکھے گا۔ تم فوجی بن گئے تو ڈپٹی کمشنر کو صرف ایک درخواست دو گے کہ گاؤں میں غلال آدمی تمہارے والدین کو تنگ کرتا ہے تو اُس آدمی کی گرفتاری کا حکم نامہ جاری ہو جائے گا۔"

"اس طرح میں بھرتی ہو گیا"۔ حمید نے مجھے یہ داستان سنا کر کہا۔ "میں نے اس شاہ سے بہت بڑا انتقام لینا ہے"۔

"مزدور لینا ہے"۔ میں نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں"۔

ہم دونوں نے بڑا ہی خوفناک پروگرام بنالیا۔

منہ پر مارا۔ وہ تو ہکا بکا رہ گیا۔ یقین جلیٹے جب میں نے خط میں یہ پڑھا تو میں نے اسے سچ نہ مانا۔ ہمارے دیہاتی علاقے میں کوئی عورت، خصوصاً پہلے روزہ کی دُسن، اپنے خاوند کو چھڑ مار دے؟..... انہونی بات ہے۔ خاوند اس کا گلا گھونٹ دے۔ اگر گلا نہ گھونٹے تو یہ ضرور کمرے کمر اُسی وقت اُسے میکے روانہ کر دے۔

صداقت نے سمجھا کہ واجدہ نے آصف کے منہ پر چھڑ مار کر کہا کہ مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو جینتی چلائی باہر نکل جاؤں گی اور تمہارے اس سارے گاؤں کو جگا کر ایسا الزام غوپل گی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔

”میں تمہیں اس چھڑ کا جواب دل گا۔“ آصف نے کہا۔ ”لیکن سوچ کر ساری عمر یاد رکھو گی۔“

بہت دیر آصف خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے واجدہ کے ساتھ اس طرح باتیں شروع کر دیں جیسے ان دونوں نے ایک دوسرے کو چھڑ مارا ہی نہیں تھا۔

”میں مرد ہوں۔“ آصف نے واجدہ سے کہا۔ ”عورت دیر اور نڈر ہو سکتی ہے لیکن وہ مرد سے زیادہ طاقتور نہیں ہو سکتی۔ میں تمہاری ہڈیاں توڑ سکتا ہوں تمہیں مجبور کر سکتا ہوں کہ فوراً میری بیوی بن جاؤ لیکن جس مرد میں طاقت ہو اُسے زیب نہیں دیتا کہ وہ عورت پر اپنی طاقت آزمائے۔ میں اونچی ذات کا خاندانی آدمی ہوں اور تمہاری بھی یہی ذات ہے اور تم بھی خاندانی لڑکی ہو۔ میرا فرض بنتا ہے کہ ایک بار تمہیں اونچے نیچے سمجھا دوں۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ سمجھو یا نہ سمجھو.... میں تمہیں زبردستی بیاہ کر نہیں لایا۔“

”میں نے اپنے ماں باپ کو بتا دیا تھا۔“ واجدہ نے کہا۔ ”میں نے منہ کھدیا تھا کہ میں آصف کو قبول نہیں کروں گی۔“

”اس میں میرا کیا قصور؟“ آصف نے کہا۔ ”میں نے تمہیں اغوا تو نہیں کیا۔ تم کسی طرح مجھے بنا دیتیں تو میں اپنے ماں باپ کو تمہارا رشتہ لینے سے روک دیتا۔ تمہارے ساتھ تمہارے اپنے ماں باپ نے زبردستی کی ہے اور تم سزا مجھے دے رہی ہو۔ میرے ساتھ لڑائی جھگڑے سے تمہیں کیا ملے گا؟“

”تم نے مجھے چھڑ مارا تھا۔“ واجدہ نے کہا۔ ”میں نے تمہیں چھڑ اس لیے مارا ہے کہ دوبارہ مجھ پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ تم باتیں کرو۔ میں سنوں گی اور لڑائی جھگڑا نہیں کروں گی۔ میں نے ماں باپ سے تم مجھے اٹھا کر نہیں لائے۔“

اپنے
زندگی کی داستان سناتے سناتے خیال آتا ہے کہ میں کسے سنا رہا ہوں، پڑھنے والے یہ پڑھیں گے، ہی کیوں؟ میں کوئی بہت بڑا سیاسی لیڈر نہیں ہوں، بڑے بڑے علماء و دین میں سے نہیں ہوں لیکن ابن صحر صاحب اور ایڈووکیٹ صاحب کہتے ہیں بولتے جاؤ، سناتے جاؤ، پڑھنے والے دلچسپی سے پڑھیں گے۔

میں صرف یہ خدائی محسوس کر رہا ہوں کہ زمانہ بالکل ہی بدل گیا ہے۔ لوگ بدل گئے ہیں۔ لوگوں کی سوچیں اور ان کے کردار بدل گئے ہیں۔ میں کچھ ایسے کردار پیش کروں گا جو آج کے دور میں کسی افسانے کے کردار معلوم ہوں گے۔ وہ خلوص، پیارا اور جذباتی اشار کا زمانہ تھا۔ آج لوگوں میں تصنع اور شربازی آگئی ہے۔ شہروں کا معاملہ تو بالکل ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔

پھر بھی سنا رہا ہوں۔

کچھ دنوں بعد میسر دوست صداقت کا ایک اور خط آیا۔ مجھے معلوم تھا دوست نے کیا کیا ہوگا۔ خط میں پہلی خبر ہی یہی تھی کہ واجدہ کی شادی ہو گئی ہے۔ صداقت کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ واجدہ نے نکاح کے وقت ”قبول کیا“ کہا تھا یا نہیں یا اس نے قبولیت کے لیے سر ہلایا تھا یا نہیں، صداقت نے سمجھا تھا کہ اُس کی بہن نے اُسے بتایا تھا کہ لڑکیاں گھروں سے رخصت ہوتے روتی ہی ہیں لیکن واجدہ کا روٹا کسی سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو یوں روتی تھی جیسے اُس کا باپ مر گیا ہو۔

وہ جنگ کا زمانہ تھا۔ فوجیوں کو بہت کم چھٹی ملتی تھی۔ واجدہ کے خاوند آصف کو شادی کے لیے صرف دس دن چھٹی ملی تھی۔ صداقت کا اگلا خط بیس بائیس دنوں بعد آیا۔ اُس نے کہا کہ وہ واجدہ سے ملا تھا۔ واجدہ نے اُسے بتایا کہ پہلی رات اُس نے اپنے خاوند کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں نے نکاح کے وقت تمہیں قبول نہیں کیا تھا۔ اس لیے تم میسر خاوند نہیں بن سکتے نہ میں تمہیں اپنا خاوند مانتی ہوں۔

صداقت نے اُس کے منہ پر زوردار چھڑ مارا۔ واجدہ نے اسی قسم کا چھڑ اُس کے

”میں نے ایک ہی بات کہتی ہے۔“ آصف نے کہا۔ ”اپنے ماں باپ اور اپنے خاندان کی عزت کا خیال رکھو۔ میں تمہیں ابھی گھر سے نکال سکتا ہوں۔ یہ سوچو کہ بہیز سمیت جب تم اپنے گھر واپس جاؤ گی تو تمہارے باپ کی کیا عزت رہ جائے گی۔ مجھ سے لوگ پوچھیں گے کہ میں نے تمہیں واپس کیوں بھیجا ہے تم پر بہت بڑا الزام عائد کر دیا گیا ہے تم ساری عمر گھر بیٹھی رہو گی۔ میں ضد میں آ کر تمہیں طلاق نہیں دلوں گی میں جانتا ہوں تم کسی اور کو چاہتی ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے دل میں میری محبت پیدا کر لو لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ جس کسی کو بھی تم چاہتی ہو وہ تمہارے ساتھ بیوفائی بھی کر سکتا ہے۔“

واجدہ نے یہ باتیں صداقت کی سنائی تھیں جو صداقت نے مجھے کچھ بھیجیں اورواجدہ نے صداقت سے کہا کہ یہ ساری باتیں خانی کو کچھ دینا۔ صداقت نے یہ بھی لکھا کہواجدہ نے آصف سے اپنی یہ شرط منوالی ہے کہ وہ آصف کی غیر حاضری میں اُس کے گھر نہیں رہے گی، اپنے ماں باپ کے پاس رہا کرے گی۔ آصف چلا گیا اورواجدہ اپنے گھر آ گئی۔

میں جانتا تھا کہواجدہ میں مردوں سے زیادہ جرأت تھی اور وہ کسی سے دینے والی نہیں تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آصف اس سے دب گیا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ اگر اُس نےواجدہ کا پتھر لکھا کہ بھی ایسی باتیں کی تھیں تو میں آج بھی یہی کہتا ہوں کہ وہ اُوپے کر دار کا آدمی تھا۔ وہ توواجدہ کو ذلیل و خوار کر سکتا تھا۔

ایک بات اور تھی۔واجدہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ آصف اتنی خوبصورت لڑکی کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ میں جانتا تھا کہ اُس کے حسن میں کوئی طلسماتی سا اثر تھا جو دیکھنے والے پر بہت بڑا اثر جیسا تاثر کر دیتا تھا۔

میری ٹریننگ کے تقریباً چار مہینے گزر گئے تھے۔ صداقت کا خط آیا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ آصف فوری چھاؤنی میں آ گیا ہے۔ یہ چھاؤنی ہمارے قصبے سے تقریباً تیس میل دور تھی۔ میں اس کا نام نہیں بھولوں گا۔

ٹریننگ ہوتی رہی۔ بڑی ہی سخت ٹریننگ تھی۔ حمید تو دیہاتی تھا، سختیاں جھیلنے کا عادی تھا، میں شہری زندگی کا عادی تھا۔ آہستہ آہستہ میں بھی فوجی ڈسپلن کا عادی ہو گیا۔

اس کے زمانے میں ٹریننگ کا عرصہ زیادہ تھا لیکن جنگ کی وجہ سے یہ عرصہ کم کر دیا گیا تھا۔ اُدھر چائپانی فوجیں برما کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ آگے ہندوستان تھا۔ انگریزوں کی جان پر جی بھڑکی ہوئی تھی۔ ٹریننگ سات مہینوں میں ختم کر دی گئی اور مجھے اور حمید کو چند اور سپاہیوں کے ساتھ بٹالین میں بھیج دیا گیا۔ یہ بٹالین اُسی چھاؤنی میں تھی جس میں آصف کی کنگل یونٹ تھی۔

بٹالین میں بھیجنے سے پہلے ہمیں پانچ پانچ دن کی چھٹی دی گئی۔ صداقت سے ملاقات ہوئی۔ میں کسی نہ کسی طرح واجدہ سے ملنا چاہتا تھا لیکن صداقت نے بتایا کہ تین دن گزرے آصف آیا تھا۔ اُسے سرکاری کوارٹر مل گیا ہے اور وہ واجدہ کو ساتھ لے گیا ہے۔

شام ہونے کو تھی۔ میں بازار سے گھر کو آ رہا تھا کہ وہ بد معاش مل گیا جس نے مجھے دھکی دی تھی کہ اس شہر سے چلے جاؤ ورنہ پھنساؤ گے۔ ”کیوں خانی!“ اُس نے طنز یہ کہا۔ ”کیسی گزر رہی ہے یہاں رہتے تو بہت خوار ہوتے۔“

”کون خوار کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم؟ کرائے کے غنڈے!“ ”جا جاؤ جا!“ اُس نے ایسے انداز سے کہا جیسے مجھے کچھ سمجھتا ہی نہ ہو۔ ”ابھی تیری استریاں بازار میں بھری ہوئی ہوں گی۔“

میں تو اُس کی شکل دیکھ کر ہی کھول اُٹھا تھا۔ اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ میسرارادے کے بغیر میرے دائیں ہاتھ کی ٹٹھی بند ہوئی اور میرا منکا اُس کی آنکھوں کے درمیان ناک پر اتنی زور سے پڑا کہ وہ چار پانچ قدم پیچھے کو گرہا۔ اٹھنے لگا تو اُس نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ اُس سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ میسرارادے میں اُس کے خلاف اُٹھ نو مہینوں سے قہر بھرا ہوا تھا جو کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ میرا ہاتھ اُس کی گردن پر نہیں چلا گیا تھا ورنہ میں اُس کا گلا گھونٹ دیتا۔ میسرارادے میں جان تو پہلے ہی بہت تھی لیکن فوجی ٹریننگ نے میسرارادے کو لوہے جیسا مضبوط بنا دیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرا منکا ہتھوڑے کی طرح اُسے لگا ہو گا۔ مجھ میں اتنی طاقت تھی یا نہیں، یہ بات بھی تھی کہ اُس کے جسم میں چرس نے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ بد معاشی کے زور پر برکسی کے لیے خوف کا باعث بنا ہوا تھا۔

وہ ابھی پوری طرح اٹھا نہیں تھا۔ میں نے اس کے سر کے بال مٹھی میں سے لیے اور جھٹکے سے اوپر کو کھینچے۔ وہ فوراً اٹھا۔ اس نے بڑی تیزی سے کڑتے کی پہلو والی جیب سے چاقو نکالا۔ یہ لمبا چاقو تھا جو بد معاش اور غنڈے اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ اسے ہم کافی دیر چاقو کھا کرتے تھے۔ میں نے چاقو دیکھ لیا تھا اس کے بال میری مٹھی میں تھے۔

اس نے دائیں طرف سے چاقو میرے پہلو میں مارنا چاہا۔ اس کا وار ہڑا تیز تھا لیکن میں چونکا نہ تھا۔ میں نے بائیں بازو سے اس کا وار روک لیا اور اس کے بال چھوڑ کر اس کے منہ پر پہلے جیسا کہ مارا۔ وہ پہلے کی طرح تیار کر گر ادا اس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑا۔

اس میں اب مزید مار کھانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے دو تین آدمی درمیان میں آ گئے۔ وہ غنڈہ اٹھ کر چاقو اٹھانے لگا۔ اس کا ایک پہلو میرے سامنے تھا۔ وہ جھکا ہوا تھا۔ دو آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ میں نے اس پہلو میں بڑی زور سے ٹھٹھا مارا۔ اس کے بعد وہ اٹھ نہ سکا۔

”تم عزت دار خانہ کے آدمی ہو خانی!“ ایک آدمی مجھے کہہ رہا تھا۔

”کس گھٹیا آدمی کے ساتھ تم نے لڑائی مول لے لی ہے۔“

”یہ پولیس سے ملے ہوئے ہیں خانی!“ ایک اور آدمی نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔

”یہ پولیس کے مجر ہوتے ہیں اس کیمنے سے منہ نہ لگاؤ۔“

وہ کیمنہ پہلو میں لات کھا کر اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ میں بڑی ہی بلند اور غصیلی آواز میں کہہ رہا تھا کہ یہ فلاں راجے کا کرا کا غنڈہ ہے۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اس شہر سے نکل جاؤ ورنہ ساری عمر بچتا

گے۔ راجہ صاحب اس کی ہلا شیری کر رہے ہیں۔ میں نے تو ویلے بھی فوج میں بھجوا دیا تھا۔ میں بھرتی ہو گیا۔ کل ہی جھپٹی ہوا تھا۔ آج یہ مجھے راتے میں ملا اور میرے ساتھ اس طرح باتیں کیں جیسے میں اس کا کچی کمین ہوں اور جیسے میں اس ڈر سے شہر سے بھاگ گیا۔ اور فوج میں بھرتی ہوا تھا۔

میں نے مزید جھوٹ بولا کہ میں نے اس کے ساتھ شرافت سے بات کی تو اس نے چاقو نکال لیا اور مجھے مارا لیکن میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اس کے اسے دو تین کھٹے مارے۔

اس چرسی غنڈے کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں نے کہا کہ میں تمھارے جا رہا ہوں۔ دو تین آدمیوں نے مجھے تھانے جانے سے روکا۔

”میں تمھارے ضرور جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے کل پیرسوں اپنی لڑکی پر چلے جانا ہے۔ میرے بعد یہ میرے گھر والوں کو تنگ کرے گا۔ میں تو اس کے پالنے والے راجے کے خلاف رپورٹ کھواؤں گا۔“

جو لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس لیے حیران تھے کہ میں ایک راجہ صاحب کے خلاف زبان درازی کر رہا ہوں۔ میں اس وجہ سے اتنا دلیر ہو گیا تھا کہ میں فوجی تھا۔ جنگ عظیم کے وقت

کے جو لوگ زندہ ہیں، ان سے پوچھنے کہ اس زمانے میں فوجی کی کتنی قدر تھی اور انگریزوں نے لوگوں پر ہی نہیں بلکہ سرکاری محکموں پر بھی فوجیوں کا رعب بٹھا

رکھا تھا۔ تحصیلداروں، تنخواہداروں اور ان سے چھوٹے سرکاری اہلکاروں کو ڈپٹی

مکسروں کی طرف سے حکم ملا ہوا تھا کہ کوئی فوجی کسی بھی قسم کی کوئی شکایت لے کر آئے

یا کوئی درخواست دے تو فوری طور پر اس کی شکایت رفع کی جائے اور اس کی درخواست پر کارروائی کی جائے۔ وجہ یہ تھی کہ انگریز بادشاہ اپنی اتنی بڑی بادشاہی

کو جرنیوں اور جاہانیوں سے فوجی طاقت سے ہی بچا سکتا تھا۔

فوجیوں کے متعلق لوگوں کی جو رائے تھی وہ میں اپنے محلے کے ایک بزرگ کی زبانی

بتاتا ہوں۔ میں چھٹی آیا تو وہ مجھے ملے اور بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ آج کل دو ہی چیزوں کی قدر ہے۔ ایک سرکاری ڈبیری کی گائے اور دوسرے فوجی۔

میرے دو تین دوست بھی تماشا بیروں میں موجود تھے۔ انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ انہیں اس لڑائی کے پس منظر کا علم تھا۔ میں نے انہیں ساتھ لیا اور ہم تھانے چلے

گئے۔ میں چونکہ وردی میں نہیں تھا اس لیے اپنا تعارف کرانا پڑا۔ میں حوالدار کرک تھا۔ اس کے ساتھ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں انٹیلی جنس میں ہوں۔ تھانے دار پر

اچھا خاصا اثر ہوا۔ اس نے بڑی ہمدردی سے پوچھا کہ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ میں نے اس غنڈے اور اس کی پشت پناہی کرنے والے راجہ صاحب کے خلاف جھوٹ سچ ملا کر تھانہ دار کو سارا معاملہ سنایا اور آخر میں کہا کہ اس غنڈے نے

”نہیں جی!“ میں نے جواب دیا۔ ”میں پرسوں چلا جاؤں گا۔ کون عدالتوں کی پیشیاں جھگٹتا رہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس غنڈے کو لگام ڈال دیں۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ تھانیدار نے خوش ہو کر کہا۔ ”میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ مقدمے بازی میں نہ ہی پڑیں۔ آپ باہر بیٹھیں میں ابھی ان کا بندوبست کرتا ہوں۔“

ہم باہر بیٹھ گئے۔ تھانیدار نے راجہ صاحب اور اس کے غنڈے کو بلایا۔ کچھ وقت تو لگ گیا لیکن تماشا بڑا اچھا رہا۔ تھانیدار نے دونوں کو اپنے پاس بلایا۔ مجھے اور میرے دوستوں کو بھی بلایا۔ پھر اس نے راجہ صاحب کی جو بے عزتی کی ہے وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھی۔ میں پوری تفصیل سے لکھنا ضروری نہیں سمجھتا کہ تھانیدار نے راجہ صاحب کو کیا کیا باتیں کہی تھیں۔

”وہ چاقو میرے حوالے کر دو۔“ تھانیدار نے غنڈے سے کہا۔ ”تیرے خلاف تو میں قاتلانہ حملے کا پرچہ کر رہا ہوں۔ تمہارے یہ راجہ صاحب بھی اس واردات میں شامل ہیں۔ میں دونوں کو حوالات میں بند کروں گا۔“

دونوں نے تڑپنا شروع کر دیا۔ اپنی صفائی میں کچھ نہ کچھ کسے جا رہے تھے اور کبھی ہاتھ جوڑ کر تھانیدار کی منبت سماجیت کرتے لیکن تھانیدار ان پر دباؤ ڈالت چلا گیا۔ غنڈے نے جیب سے چاقو نکال کر تھانیدار کے حوالے کر دیا۔ پھر تھانیدار نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ صاحب تمہیں معاف کر دیں تو میں یہ پرچہ نہیں کوڑوں گا۔ دونوں نے درخ میری طرف کر لیا اور میری منبت کرنے لگے۔ میں نے غنڈے کے چہرے کو دیکھا۔ دو جگہ پر اُبھار تھا اور وہاں اس کے چہرے کا رنگ نیلا ہو گیا تھا۔ تھانیدار نے اس کے ان نشانات کی طرف توجہ ہی نہ دی حالانکہ اس نے کہا تھا کہ میں نے اسے مارا ہے۔

”جواب عالی!“ میں نے تھانیدار سے کہا۔ ”کوئی ضمانت ہونی چاہیے کہ میری غیر حاضری میں یہ لوگ میرے گھر والوں کو پریشان نہیں کریں گے۔“

”میں اس کی ضمانت کا بندوبست تو ابھی کر دیتا ہوں۔“ تھانیدار نے اس بدعاش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ پھر اس نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور کہا۔

”اسے لے جاؤ اور اس کے دماغ سے بدعاشی نکال دو۔“

ہیڈ کانسٹیبل نے اسے بازو سے پکڑا اور باہر لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد تھانے کے

”اس راجے کو آپ کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟“ تھانیدار نے پوچھا۔

”دشمنی یہ ہے جناب!“ میں نے کہا۔ ”راجہ صاحب اپنی بیٹی کو تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ لڑکی کو اردو انگریزی پڑھایا کروں۔ میں نے ان کا حکم مانا اور ان کے گھر جا کر لڑکی کو پڑھانا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس لڑکی میں اپنے باپ والا اور اپنی اونچی ذات والا تکبر اور غرور بالکل نہیں۔ وہ بڑی شریف اور سمجھ دار لڑکی ہے۔ اس کی ایک جگہ منگنی ہو گئی تھی۔ جب شادی کا دن مقرر کرنے کا وقت آیا تو لڑکی نے اس لڑکے کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے یہ یوقنی یہ کی کہ اپنی ماں سے یہ کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ راجہ صاحب کو پتہ چلا تو انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں آئندہ ان کے گھر نہ آیا کروں۔ اگلے روز انہوں نے اس بدعاش کو میرے پیچھے ڈال دیا۔ اس شخص نے مجھے دھکی دیا کہ شہر سے فوراً نکل جاؤ ورنہ پکھتاؤ گے۔۔۔۔“

”میں ان دھکیوں سے ڈرنے والا نہیں تھا لیکن میرے والد صاحب اور دوسرے بزرگوں نے بھی مشورہ دیا کہ بہتر یہی ہے کہ تم فوج میں بھرتی ہو جاؤ ورنہ یہ لوگ تمہیں تنگ کرنے لگیں گے۔ جناب عالی! میں نے ماں باپ کی عزت کی خاطر یہ فیصلہ مان لیا اور فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میری قابلیت کو دیکھتے ہوئے انگریز افسروں نے مجھے انٹیلی جنس کی ٹریننگ دی۔ رجبے حوالدار کا عہدہ دے دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ انٹیلی جنس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہ دشمن کے جاسوسوں کو پکڑنے والا محکمہ ہوتا ہے۔ اب میں ٹریننگ کے بعد پانچ دنوں کی چھٹی آیا ہوں۔ آج یہ بدعاش راستے پر مل گیا۔“

اس کے بعد میں نے وہی جھوٹ بولا جو تماشا یوں کے سامنے بولا تھا۔ میں نے بار بار یہ کہا کہ اس بدعاش نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔

تھانیدار نے زوردار تہمتہ لگایا اور بولا۔ ”یہ تو فلمی سٹوری ہے۔۔۔۔ 1۔“

لڑکی کے ساتھ آپ نے کوئی چکر چلایا ہو گا۔“

”نہ جی نہ!“ میں نے کہا۔ ”میں پہلے بتا چکا ہوں کہ بڑی شریف اور بڑا سمجھنے والا لڑکی ہے۔ اس کی تو شادی بھی ہو چکی ہے۔“

”کیا آپ اس غنڈے کے خلاف قاتلانہ حملے کا پرچہ کرانا چاہتے ہیں؟“

تھانیدار نے پوچھا۔

پچھواڑے سے بیچ و پکار سنائی دینے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ بدمعاش کے دماغ سے بدمعاشی نکالی جا رہی ہے۔

”راجہ صاحب!“۔ تنہا نڈارنے کہا۔ ”میں آپ کو زیادہ ذلیل مہنیں کروں“ آپ کوئی مہنہ زوردار خاص پیش کر دیں جو دو گواہوں کے سامنے یہ تحریر دے دے کہ آپ ان کے خاندان کو عملی یا زبانی طور پر پریشان نہیں کریں گے۔“

”جو حکم سرکار!“۔ راجہ صاحب نے کہا۔ ”میں ایک خاص لے آتا ہوں۔“ مختصر یہ کہ تنہا نڈار نے میرا رعب جما دیا۔ راجہ صاحب سے ایک خاص کی تحریر لی گئی۔ اس بدمعاش کا تو یہ حال تھا کہ پہلے اُس نے مجھ سے مار کھائی پھر تنہا نے اُس کی پٹائی ہوئی۔ میں اور میرے دوست تنہا نڈار سے ہاتھ ملا کر تنہا نے سے آئے اور ہنستے کھلتے اپنے گھر پہنچے۔ گھر والے بہت پریشان تھے۔ انہیں اطلاع مل چکی تھی کہ میری لڑائی ہو گئی ہے اور معاملہ تنہا نے تک پہنچ گیا ہے۔ میں نے گھر والا کو بتایا کہ میں اپنی اور ان کی حفاظت کا کیا انتظام کر کے آیا ہوں۔



میں تیسرے روز اپنی بٹالین میں چلا گیا۔ یہ تو آپ سب کو معلوم ہو گا کہ بٹالین ویسی زبان میں پلٹن کہا جاتا تھا۔ حمید بھی آگیا تھا۔ میں چونکہ حوالدار کلرک تھا لیے مجھے دفتر میں کلرک کا کام ملا۔ حمید سا ہی تھا۔ اُسے اُس کی کچنی میں شامل کر گیا۔ ہماری نئی زندگی شروع ہو گئی۔ یہ ٹریننگ سنٹر سے اچھی مختلف اور آرام دہ زمانہ تھی۔ دو تین دنوں بعد مجھے پتہ چلا کہ آصف کی بٹالین ہماری بارکوں کے قریب ہے۔ دو تین دن گزرے، سوچ غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے میں ٹہلنا ٹہلنا سگند بٹالین کی بارکوں کی طرف چلا گیا۔ سڑک کے ساتھ ایک جنگلہ تھا۔ اس جنگلے سے ذرے پانچ چھ عورتیں کھڑی بائیر، کمر رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں یقین نہ آیا۔ ان میں واجدہ بھی کھڑی تھی۔ تب میں نے ذرا اچھی طرح دیکھا۔ یہ اس یونہی کے فیملی کو اور بڑھتے۔ میں جنگلے کے نزدیک گیا اور زور سے کھانا۔ سب عورتوں میری طرف دیکھا واجدہ کے چہرے پر یہی ہی جھرت اگئی جیسی میرے چہرے پر تھی۔ بار ہی جھرت والی تھی۔ وہاں ہمارا ایک دوسرے کے آٹے سامنے آجانا ایک معجزہ تھا یہ دل میں ایسی توقع نہیں تھی کہ واجدہ میرے قریب آجائے گی۔ وہ فوجی ماحول تھا اور فوجی ماحول بالکل دیہات جیسا ہوتا ہے۔ کوئی غیر مرد اور عورت کھلے عام اکٹھے کھڑے ہو کر

کمرنے کی سوچ بھی نہیں کتے تھے لیکن واجدہ تیز تیز چلتی میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”تم کہاں خانی!“۔ واجدہ نے آنسو دوپٹے سے پونچتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہاری پلٹن نہیں ہے؟“

”ہاں واجو!“۔ میں نے کہا۔ ”ہماری بارکیں یہ بالکل قریب ہیں ہمارا خاندان کہاں ہے؟“

”ڈیوٹی پر ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”رات نو بجے آئے گا۔“

”ان عورتوں کو کیا بتاؤ گی، میں کون ہوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”کہوں گی میرے ماموں کا بیٹا ہے۔“ واجدہ نے جواب دیا۔ ”تم ان کی فکر نہ کرو۔۔۔ صداقت میں خط لکھنا رہا ہے؟“

”ہاں!“۔ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے اُسے جتنی باتیں بتائیں تھیں وہ اُس نے ساری کی ساری لکھ دی تھیں۔ اُس نے اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ اب میں پانچ دنوں کی چٹھی پر گھر گیا تھا۔ صداقت نے ساری باتیں زبانی بھی سنائی تھیں۔ یہ بتاؤ کیسے گزر رہی ہے؟“

”بس گزر رہی ہے۔“ واجدہ نے کہا۔ ”یہاں ہمارا زیادہ دیر کھڑا رہنا ٹھیک نہیں۔ اس کے ساتھ میں نے کچھ شرطیں طے کر لی ہیں۔ عجیب آدمی ہے۔ کبھی تو میرے آگے غلاموں کی طرح جھک جاتا ہے اور کبھی بیٹھے بیٹھے غصے میں آجاتا ہے، لیکن خانی! میں اس کے ساتھ ساری عمر تو نہیں گزار سکتی!“

”وہ تو گزارنی پڑے گی۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں گزارنا چاہو گی تو کیا کرو گی؟“

”کچھ دیر میرے پاس بیٹھو خانی!“۔ واجدہ نے کہا۔ ”تم مل گئے ہو تو مجھے نیا حوصلہ مل گیا ہے میں تمہیں ساری باتیں سنانا چاہتی ہوں۔“

”سچ پوچھتی ہو واجو!“۔ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ تمہیں دل سے نہیں نکال سکتا۔ اس چٹھی پر گھر گیا تو ماں نے پہلی بات یہ کہی کہ اس سال کے اندر اندر تمہاری شادی کر دینی ہے۔ میں شادی نہیں کر دوں گا واجو! تمہیں دل سے نکال کر میں کسی اور کو دل میں نہیں رکھ سکتا۔“

”یہی تو مشکل ہے خانی!“۔ واجدہ نے کہا۔ ”لوگ شادی کو دلوں کا ملاپ سمجھتے ہیں۔ یہی حشر میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ میں اس خاندان سے طلاق لے سکتی ہوں چاہے

کے کوارٹر میں چلے جاؤ گے تو میں قریب ہی کہیں چھپ کر دیکھتا رہوں گا۔ تم بھی مصیبت میں پھنس گئے تو مدد کو پہنچو گے۔“

عام شہری اس خطرے کو نہیں سمجھ سکتے جو میں مول لے رہا تھا۔ رات کے وقت کبھی دوسری ٹہالین کے علاقے میں داخل ہونا اور داخل بھی فیملی کوارٹروں کے علاقے میں ہونا اتنا بڑا جرم تھا کہ کورٹ مارشل ہو سکتا تھا۔ جس میں سروس سے توڈیس ہونا ہی تھا، جیل بھی جانا پڑتا۔ پھر بھی میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلے روز شام سے کچھ دیر پہلے میں اور حمید اُدھر گئے۔ سامنے سڑک تھی۔ ادھر گیٹ تھا۔ وہاں ہر وقت سنتری موجود رہتا تھا۔ چونکہ یہ سگنل ٹہالین تھی اس لیے اس کے بارکوں اور دفاتروں کے علاقے کے ارد گرد لوہے کے کھڑے پائپوں کا جنگل تھا۔ ایک گیٹ پیچھے کی طرف تھا۔ وہاں بھی جو بیس گھنٹے سنتری موجود رہتا تھا۔ سنتری کسی کو اندر جانے سے روکتے تو نہیں تھے لیکن یہ بتانا پڑتا تھا کہ کس سے ملنا ہے۔ جنگ لگی ہوئی تھی، ہندوستان میں جرمنی اور جاپان کے جاسوس موجود تھے جو جرمنی اور جاپان کے باشندے نہیں بلکہ ہندوستانی تھے۔ اس لیے ہر آنے اور اندر جانے والے کو چیک کیا جاتا تھا۔ یہ سگنل ٹہالین تھی جہاں پیغام آتے جاتے رہتے تھے اس لیے وہاں چیکنگ زیادہ سخت تھی۔

ہم نے فیملی کوارٹروں کے ایک پہلو میں جنگل دیکھا۔ ایک جگہ سے دو پائپ نکلے ہوئے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں سے گزرنے کا رستہ خود ہی بنالیا گیا ہے۔

یہ رستہ ٹھیک ہے“ — حمید نے کہا — ”رات کو ادھر اندھیرا بھی ہوتا ہو گا اور وہ کوارٹر بھی دُور نہیں۔“ ہم واپس اپنی بارکوں میں چلے گئے۔

۱۱

وہ رات آگئی۔ میں اور حمید نو بجے چل پڑے۔ پتھوڑا سا نوفاصلہ تھا۔ ایک ڈیرہ تھا کہ آصف کسی وجہ سے گھری نہ ہو، وہ بیمار ہو سکتا ہے، ڈیوٹی بدل بھی سکتی ہے۔ ”مت ڈرو یا را!“ — حمید نے کہا — ”میدھے اندر نہ چلے جانا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک دینا۔ اگر دروازے میں درز ہوئی تو اس میں سے اندر دیکھ لینا۔ اگر وہ آنا نظر آیا تو بھاگ آنا۔“

یہ کوئی دانشمندی والا مشورہ نہیں تھا۔ میں نے واجدہ کے پاس جانا ہی تھا۔

گھر والے مجھے قتل کر دیں۔ میں چاہوں تو اس خاوند کو زہر بھی دے سکتی ہے لیکن یہ بتاؤ خانی! پھر تم مجھے کس طرح ملو گے۔ یہ جو ذاتوں کا معاملہ ان لوگوں نے بنا رکھا ہے اس کا کیا بنے گا۔ میں نے تمہارے ساتھ یہ بات کہی ہے۔“

”زہر دینے والی بات تو دماغ سے نکال دو“ — میں نے کہا — ”طلاق لینے کے متعلق سوچ لیں گے۔ اگر تم طلاق کے بعد گھر سے بھاگ آئیں تو میں تمہارے ساتھ نکاح پڑھوا لوں گا۔ پھر دیکھوں گا کون ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے.... اب یہ بتاؤ کہ ہماری ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے۔“

وہ سوچ میں پڑھ گئی۔

”ایک ہفتہ کر سکتے ہو؟“ — واجدہ نے کہا — ”پرسوں رات میرا خاوند ڈیوٹی پر ہو گا۔ اس کی ڈیوٹی آٹھ بجے شروع ہوتی ہے اور صبح پانچ بجے ختم ہوتی ہے۔ آج اس کی پہلے ٹائم کی ڈیوٹی تھی اس لیے نو بجے آجائے گا۔ پرسوں ساری رات ڈیوٹی پر ہو گا۔ یہ درمیان والی لمبی بارک دیکھ رہے ہو۔ ادھر سے تیسرا کوارٹر ہمارا ہے۔ رات کسی بھی وقت آجانا۔ باہر والا دروازہ کھلا ہو گا۔“

”میں آؤں گا و اجو!“ — میں نے کہا — ”رات نو ساڑھے نو بجے آ جاؤں گا۔ واجدہ نے جگے کو پکڑا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ پھر وہ خود توں کی طرف چلی گئی اور میں وہاں سے ہٹ آیا۔

۱۲

میں نے اپنے دوست حمید کو بتایا۔ وہ تو اچھل پڑا۔ حمید غیر معمولی طور پر بلکہ غیر عادی طور پر دلیر جوان تھا۔ یاری دوستی میں اتنا وفادار کہ دوست کی خاطر آگ میں بھی کود جاتا۔ ”میری بات کو سوچ مانو خانی!“ — حمید نے کہا — ”تمہارا اور واجو کا ملاپ اللہ کو منظور ہے۔ نہ ہوتا تو وہ تمہیں یہاں نہ ملتی۔ تمہیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ تمہارے اتنی قریب رہتی ہے۔ تم اللہ کے اشارے پر ادھر چلے گئے تھے اور وہ تمہیں نظر آگئی اور اس کے ساتھ تمہاری باتیں بھی ہو گئیں۔“

”اتنے صوفی اور ولی نہ بنو یا را!“ — میں نے کہا — ”مجھے یہ بتاؤ کہ میں پرسوں رات اس کے ہاں جاؤں یا اس خطرے میں نہ پڑوں؟“

”تم جاؤ“ — اس نے کہا — ”اور اس خطرے میں پڑو۔ وہ یہ نہ کہے کہ جس سے دل لگایا تھا وہ بزدل نکلا.... اور یہ بھی سن لو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں گا تم ان

اُس نے میری خاطر گھر والوں سے مار کھائی تھی۔ اپنی ازدواجی زندگی میں زہر گھول لیا تھا۔ اُس نے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ اُس نے مجھ سے محبت کی تھی اور مردوں کی طرح کہا تھا کہ وہ میرے سوا کسی کو قبول نہیں کرے گی۔ اب اس نے مجھے بلایا تھا۔ میں مرد ہو کر کیسے کہہ دیتا کہ میں اُس کے گھر آنے سے ڈرتا ہوں۔

ہم دونوں اُس جگہ پہنچے جہاں سے جھگڑے میں سے کسی نے دوپائی نکال کر سستہ بنایا ہوا تھا۔ میں نے حمید سے کہا کہ وہ یہیں ٹھہرے لیکن اُس نے جھگڑے کے اندلیک درخت دیکھ لیا تھا۔ یہ پھیل کا درخت تھا جس کا تن بہت چوڑا تھا۔ سڑک کی بتی دُور تھی۔ حمید تنے کی اندھیری طرف کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے اُسے واجدہ کا کوارٹر نظر آتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب ایک ایک کمرے کے کوارٹریں ہیں۔

میں تیسرے کوارٹر سے چار پانچ قدم دُور تھا کہ دروازے سے ایک سرباہر نکلا۔ میں نے اندھیرے میں بھی پہچان لیا کہ یہ واجدہ ہے۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے دروازہ کھول دیا اور ہمارے علاقے کے رواج کے مطابق "بسم اللہ، بسم اللہ" کہہ کر میرا استقبال کیا۔ میں اندر گیا تو اس نے دروازہ بند کر کے چٹنی چڑھا دی۔

چھوٹا سا صحن تھا، ذرہ جتنا برآمدہ تھا اور تنگ سا ایک کمرہ تھا۔ سیاہی سے حوالدار تک کوالیے ہی کوارٹر دیے جاتے تھے۔ انگریز بادشاہ ہندوستانیوں کو اسی قابل سمجھتا تھا۔ کتے کے ڈربے جیسے فیملی کوارٹر بناد لیے تھے۔ بعض پڑلے فوجیوں اور حوالداروں کے چار چار پانچ پانچ بچے ہوتے تھے۔ اتنی بڑی فیملی کو بھی یہی ڈربے جیسے ایک کمرے کا کوارٹر دیا جاتا تھا۔

واجدہ نے مجھے اندر لے جا کر چارپائی پر بٹھایا اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ ہم دونوں کے ضمیر پر ایسا بوجھ نہیں تھا کہ ہمارے تعلقات ناجائز تھے۔ ہماری محبت و حوصلہ کا ملاپ تھا۔ البتہ اُس گناہ کا مجھے احساس تھا کہ میں ایک شادی شدہ عورت کے پاس اُس کے خاندان کی عین حاضری میں بیٹھا ہوا تھا لیکن جوانی میں اتنی گہرائی میں کون سوچتا ہے۔

ذرا سی دیر میں ہم دونوں بھول ہی گئے کہ ہم کہاں بیٹھے ہیں۔ مجھے آج بھی وہ وقت اس طرح یاد ہے جیسے کل پر سول ہم اُس کوارٹر میں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ دل سے سب خوف اور خطرے نکل گئے تھے۔ واجدہ مجھے اپنی ازدواجی زندگی کی داستان سنارہی تھی۔ کبھی اُس کے آنسو نکل آتے اور کبھی وہ مسکرانے لگتی۔ اُس نے

وہی باتیں سنائیں جو صداقت مجھے کچھ چکا تھا۔

"میں نہیں ایک بات بتا دوں خانی؟" واجدہ نے کہا۔ "میں نے اسے تمہارا بتا دیا تھا۔ یہ شخص مسیکر زیر ہو گیا اور میری باتیں ماننے لگا تو میں نے اس کے ساتھ اپنا رویہ نرم کر لیا۔ ایک روز یہ مسیکر پیچھے پڑ گیا کہ بناؤ تم کسے چاہتی ہو۔ میں ٹالتی رہی۔ اس نے محنت سماجت کے بجائے میں پوچھا تو میں نے اسے تمہارا نام بتا دیا اور ساتھ یہ کہا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میرے اُس کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ وہ میرا استاد ہے اس لیے میرے دل میں اُس کا احترام ہے اور ہماری جو محبت ہے وہ آسمان پر چمکے والے ستاروں کی طرح پاک اور شفاف ہے۔"

"وہ تو مجھے جانتا ہے" میں نے کہا۔ "کبھی اس سے میرا آئنا سامنا ہو گیا تو وہ مسیکر ساتھ کیا سلوک کرے گا؟"

"وہ جیسا بھی سلوک کرے" واجدہ نے کہا۔ "تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ اگر تمہارے ساتھ رعب یا دہ بے کی بات کرے اور زیادہ پتیلی کرے تو میری طرف سے اجازت ہے۔ جو بہتر سمجھو وہ کرنا۔ ہو سکتا ہے تمہارے ساتھ بک بک کمرے۔ یہ کتنا تنگ خانی تو چھوٹی ذات کا آدمی ہے.... میں نے اسے کہا تھا کہ ہم اونچی ذاتوں والوں میں نیچ پن ہوتا ہے کہ خانی کی ذات ہم سے نیچے ہے لیکن وہ بہت اونچا آدمی ہے۔"

"اب یہ بتاؤ کہ ہم کمریں گے کیا؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے سوچا کیا ہے؟"

اس کے ساتھ بنا کر رکھو یا ادھر ادھر ہو جاؤ۔

"جب دل ہی کہیں اور ہو تو بنا کر کیسے رکھوں؟" واجدہ نے کہا۔ "یہ خدا کی ذات نے مجھ پر رحم کیا ہے کہ اس اکھڑ آدمی کو مسیکر آگے جھکا دیا ہے باقی رہا ادھر ادھر کا معاملہ، یہ فیصلہ تم کرو گے۔"

"میں وہی ہوں جو پہلے تھا" میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا۔ میرے گھر میں تم آؤ گی یا کوئی نہیں آئے گا۔"

↓

دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم دونوں چونک اُٹھے۔

"یہ کون ہے؟" واجدہ نے پوچھا۔

"میرا دوست ہوگا" میں نے کہا۔ "وہ میرے ساتھ آیا ہے۔ جھگڑے کے قریب پہنچنے کے کھڑا ہے۔"

دستک چھڑ ہوئی۔

”آصف ہی نہ ہو“ — واجدہ نے کہا۔ ”تم اس چارپائی کے نیچے ہو جاؤ۔“
ہوا تو جلدی چلا جانے لگا۔

میں چارپائی کے نیچے ہو گیا۔ واجدہ نے چارپائی پر بھی چادر کو اور نیچے کر دیا۔
دوسری طرف سے چارپائی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ واجدہ دروازہ کھولنے چلی گئی
وہ واجدہ کا خاندان آصف تھا۔ کتنا آدرا تھا کہ تم شاید گہری نیند سو گئی تھیں۔ میں
نے دو تین دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ واجدہ بے کنتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، میری آ
ایسی آنکھ لگی کہ ہوش ہی نہ رہا۔

”ڈیوٹی ہو گئی؟“ — واجدہ نے پوچھا۔

”ہو کہاں گئی“ — آصف نے کہا۔ ”ساری رات کی ڈیوٹی ہے۔ ہمیں دیکھ
آ گیا ہوں۔“

وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا بلکہ رومانی موڈ میں۔

”کچھ دیر دو گئے نا!“ — واجدہ نے پیادے پوچھا۔

”تھوڑی دیر!“ — آصف نے کہا۔ ”پہلے کبھی میں ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں آیا۔
آج معلوم نہیں کیا ہوا کہ اچانک دل گھبرانے لگا اور پھر اس طرح محسوس ہونے لگا
جیسے کوئی بہت بڑی خبر آرہی ہے یا کچھ ہونے والا ہے۔ بار بار خیال تمہاری طرف ہ
تھا۔ پہلے بھی میں تمہیں اکیلا چھوڑ جایا کرتا تھا لیکن آج معلوم نہیں کیوں بڑ
وہم ہو گیا کہ تم خیریت سے نہیں ہو۔“

دونوں اسی چارپائی پر بیٹھ گئے جس کے نیچے میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل
چھپا ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آصف نے مجھے دیکھ لیا تو وہ کیا کرے گا اور
کیا کمروں کا۔ اُس نے یہ تو ضرور ہی کرنا تھا کہ واجدہ کو اُس نے گھر سے نکال د
تھا اور مجھے جان سے مار دیتا تھا۔

میں یہی سوچتا رہا اور آصف رومانی اور جذباتی حرکتیں کرتا رہا۔ وہ آخر میاں
تھے۔ میں اُس لائوبالی عمر میں تو کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔ آج اس بڑھاپے میں جب
زندگی کے تجربات، واقعات اور حالات نے دماغ کو بختہ کر دیا ہے، اُس وقت
کی ہر بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ میں آصف کی غیر حاضری میں واجدہ کے پاس جا بیٹھا تو
آصف نے اپنے دل میں گہرا ہٹ محسوس کی اور اُس پر بے چینی کی ایسی کیفیت ط

ہو گئی کہ وہ ڈیوٹی چھوڑ کر واجدہ کے پاس دوڑ آیا۔ یہ ایک صاف علامت تھی یا نبوت
تھا کہ آصف کے دل میں اور روح میں واجدہ کی محبت بڑی گہری اُتری ہوئی تھی۔
ایک غیر مرد واجدہ کے پاس جا بیٹھا تو آصف کا دل بے چین ہو گیا۔

اسے ٹیلی پتھی کہیں، روحانی تعلق کہیں، یہ حقیقت ہے کہ انسانوں کا آپس
میں غائبانہ تعلق ہوتا ہے۔

”واجو!“ — آصف واجدہ سے کہہ رہا تھا۔ ”میری محبت کا اندازہ کرو۔ دل
نے بے چین ہو کر مجھے مجبور کر دیا کہ آؤ کہ تم تک پہنچوں۔ تمہیں دیکھ لیا ہے کہ تم ٹھیک
ٹھاک ہو تو دل کو سکون آ گیا ہے، اور تم ایسی پتھر دل ہو کہ....

”میں تمہاری کونسی ضرورت پوری نہیں کرتی!“ — واجدہ نے بڑے ہی پیادے
لہجے میں کہا۔ ”میں پتھر دل نہیں ہوں۔ یہ سمجھ لو کہ میں نے دل پر پتھر رکھا ہوا ہے
لیکن تمہیں ناراض نہیں کروں گی.... تم ڈیوٹی پر پہنچو۔ یہ باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی افسر راولڈ پر آ جائے۔“

جارہا ہوں واجو!“ — آصف نے کہا۔

میں چارپائی کے نیچے بیچ و تاب کھاتا رہا تھا اور چارپائی پر محبت کا کھیل کھیلا جارہا
تھا۔ ایک بار تو میں بے قابو ہو چلا تھا۔ میری ذہنی اور جذباتی کیفیت اُس نیچے میس
تھی جس کے کھلونے کے ساتھ کوئی اور بچہ کھیل رہا ہو۔

بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا ورنہ میں اس ارادے سے چارپائی کے
نیچے سے نکلنے لگا تھا کہ آصف کا گل گھونٹ دوں گا اور واجدہ کو ساتھ لے کر کہیں
بھاگ جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا کہ مجھے یہ سوچ آگئی کہ میں فوراً پکڑا جاؤں
گا۔ میں تو سزاے موت خوشی سے قبول کر لوں گا لیکن واجدہ بے گناہ ماری جائے
گی اور اس کی رسوائی الگ ہوگی۔

اتنے میں آصف جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چارپائی کے نیچے سے مجھے
دونوں کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں جو مجھ سے صرف ایک قدم دور تھیں۔ آصف دردی
میں تھا۔ اُس نے فوجی بوٹ پہن رکھے تھے۔ واجدہ اُس کے ساتھ دروازے
تک گئی۔

مجھے خیال آتا ہے کہ کمزوری عورت ایک بڑے ہی طاقتور آدمی کی کتنی بڑی کمزوری
بن جاتی ہے۔ آصف بزدل اور بے غیرت خاندان کا آدمی نہیں تھا۔ اس خاندان کے

پہلے جاؤ گے؟
 ہم اندھا دھند کچھ نہیں کریں گے۔ میں نے کہا۔ ”اچھی طرح سوچ سمجھ کر کریں گے۔ میں تمہیں پہلے بتا دوں گا۔۔۔ اب مجھے جانا چاہیے۔“
 ہم نے اگلی ملاقات اس طرح طے کی کہ میں دس دنوں بعد فلاں دن چار بجے کے لگ بھگ جنگل کے باہر سڑک سے گزروں گا اور واجدہ مجھے بتا دے گی کہ آصف کی رات کی ڈیوٹی کس روز ہوگی۔

میں وہاں سے نکل آیا۔ دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ حمید پھیل کی اوٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھا۔

”کوآرٹر میں کون آیا تھا؟“ اُس نے پوچھا۔ ”اُس کا خاوند تو نہیں تھا؟“
 ”وہی تھا یا رہا؟“ میں نے اُسے ساتھ لے کر چلتے ہوئے کہا۔ ”واجو نے مجھے چارپائی کے نیچے چھپا دیا تھا۔“

”میں نے دیکھا تھا وہ جلدی چلا گیا تھا۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ اچانک آگیا تھا اور تم دونوں کو قتل کر کے چلا گیا ہے۔ یا، مجھے تو ایک اور خطرہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ میں نے سمجھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ واجو نے تمہیں دھوکے میں گھرا کر مروا دیا ہے۔ میں تین بار کوآرٹر کے دروازے تک گیا اور کان کوآرٹر سے لگائے۔ ایک بار تو میں دروازہ کھٹکھٹانے لگا تھا لیکن اندر سے دھبی سی آواز آئی۔ یہ شاید تمہاری آواز تھی۔ اس سے مجھے ذرا تسلی ہوئی اور میں پس آکر بیٹھ گیا۔ لیکن میری بے چینی تمہیں دیکھ کر ختم ہوئی ہے۔“
 یہ تھی اُس وقت کی دوستی۔ دوست دوستوں پر جانیں قربان کرتے تھے۔



آج کی فوج اُس وقت کی فوج سے بہت مختلف ہے۔ اُس زمانے میں سپاہی اُن پڑھتے ہوتے تھے اور ہر سپاہی کی اتنی سی اہمیت ہوتی تھی کہ وہ سپاہی ہے، حکم کا پابند جس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ بعض سپاہی دماغی لحاظ سے اچھے نکل آتے تھے، بات چیت اچھے اور پڑا اثر انداز نہ کر لیتے تھے اور اچھے بڑے کی تمیز رکھتے تھے۔ ایسے ہی سپاہی ترقی کرتے اور عہدے حاصل کرتے تھے۔

حمید ایسے ہی سپاہیوں میں سے تھا۔ جہاں جہاں لحاظ سے سمارٹ اور دماغی لحاظ سے بہت اور چالاک۔ جرأت سے بات کرتا اور عہدیداروں وغیرہ پر اپنا اثر پیدا کر لیتا تھا۔

مردوں نے کسی وقت اپنے ایک دشمن خاندان کے ساتھ کھلی لڑائی میں دو آدمی قتل کیے اور اپنا ایک آدمی پھانسی چڑھوا یا تھا۔ ان کے گاؤں میں ارد گرد کے علاقے میں اس خاندان کا رعب چلتا تھا۔ آصف بھی جو ان مرد اور لٹھے باز تھا لیکن یہ آصف واجدہ کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

اگر واجدہ آصف سے غصے اور احتجاج والا رویہ اختیار کرتی اور اکھڑ پن دکھاتی تو آصف اُسے دن کو تارے دکھا دیتا۔ اس کی بجائے واجدہ نے اسے پیار اور اپنے حسن کی مادی اور اس کے سامنے ایک رقیب کھڑا کر دیا۔ اُس کے اشاروں پر چلنے لگی اور ساتھ اُسے یہ کہہ دیا کہ اُسے اس سے محبت نہیں اور وہ مجھے چاہتی ہے۔

میں چارپائی کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ میں اپنے اوپر ان دونوں کی بات سن رہا تھا اور اور ان کی حرکتیں محسوس کر رہا تھا۔ میں نے پہلی بار واجدہ کی باتیں سنیں اور آصف کے ساتھ اس کلمہ بناؤ کیجا۔ میں حیران ہوا کہ اس لڑکی میں اتنی عقل ہے۔ وہ فریب کار اور چالاک نہیں تھی۔ بڑی کھری اور سچ بولنے والی لڑکی تھی۔

آصف کو رخصت کر کے اور دروازے کی چٹخنی چڑھا کر وہ اندر آئی۔
 ”کچھ دیر وہیں رہو۔“ اُس نے کہا۔ ”اُسے اپنی ڈیوٹی والی جگہ تک پہنچ لینے دو۔“

تھوڑی دیر بعد اُس نے مجھے باہر آنے کو کہا۔ میں چارپائی کے نیچے سے نکلا۔
 ”دیکھا خانی!“ اُس نے کہا۔ ”میں نے کس طرح دل پر پتھر رکھ کر اس شخص کو خاوند بنا رکھا ہے۔ جس سوچتی ہوں کہ میں یہ کب تک برداشت کروں گی۔ میں نے اسے فریب سے رام کیا ہوا ہے۔ اسے میں گناہ سمجھتی ہوں۔ کوئی راستہ نکالو خانی!“
 اُس وقت میرے جذبات دھکتے انگارے بنے ہوئے تھے۔ میری سانسیں جھولی ہوئی تھیں۔

”مجھے ایک ہی رستہ نظر آتا ہے واجو!“ میں نے کہا۔ ”میں اپنے دوست حمید کو ساتھ لے کر اسے یہیں قتل کر سکتا ہوں۔ ہم ایسا طریقہ سوچ لیں گے جس سے قاتل کا سراغ نہیں ملے گا۔ تم اپنے گھر چلی جاؤ گی، پھر تم میرے ساتھ بھاگ آنا۔ نکاح پڑھالیں گے۔ تمہارا باپ ہمارے خلاف انتقامی کارروائی کرنا چاہے گا تو میں ڈپٹی کمشنر کو درخواست دے کر اُس کا منہ بند کر دوں گا۔“

”چاہتی تو میں بھی یہی ہوں۔“ واجدہ نے کہا۔ ”لیکن ڈر صرف یہ ہے کہ تم

ایسی ہی کچھ خوبیوں کی بدولت وہ اپنے پلاٹون حوالدار اور کمپنی کے حوالدار میجر کا منظور نظر بن گیا تھا۔ اتفاق سے یہ دونوں عہدیدار ہمارے ہی علاقے کے تھے۔

میں حوالدار کرک تھا اور میں میڈیکل کوارٹر کمپنی میں تھا۔ کمرکوں کو پٹن میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اللہ نے مجھے بھی کچھ خوبیاں اور کچھ جوہر عطا کیے تھے جن میں ایک یہ تھا کہ میں خوش طبع اور زندہ دل تھا اور میں ہر بات مزاحیہ انداز میں کیا کرتا تھا۔ ان اوصاف نے مجھے ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔

ہماری بٹالین میں ایک نایک اور اس کی ایک واردات بہت مشہور تھی۔ یہ دو اڑھائی سال پہلے کا واقعہ تھا۔ اس وقت بٹالین جالندھر چھاؤنی میں تھی۔ یہ نایک جالندھر سے پٹن میل دور ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کی کسی کے ساتھ خاندانی دشمنی تھی۔ دشمن خاندان میں ایک آدمی قفسہ اور فساد کی اصل چڑ تھا۔ بعض لوگوں کو قفسہ و فساد میں لطف آتا ہے۔ یہ نایک اس آدمی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس آدمی نے نایک کے خاندان کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ نایک اپنے کمپنی صوبیدار کا خاص آدمی تھا۔ اس نے کمپنی صوبیدار کو اپنا ارادہ بتایا صوبیدار نے اسے قتل کا پلان بنا دیا۔ ایک شام گنتی کے بعد نایک ایک لمبا چاقو لے کر چلا گیا۔ رات کو اس نے اپنے دشمن کے گھر پہنچ کر اسے آواز دی۔ وہ سویا ہوا تھا۔ جاگ کر باہر آیا۔ نایک نے اس کے سینے اور پیٹ میں چاقو مارے اور بھاگ آیا۔

وہ شخص فوراً مرا نہیں۔ اس نے گھر والوں کو آواز دیں۔ سب باہر آئے تو اس نے نایک کا نام لے کر بتایا کہ وہ اسے مار گیا ہے۔ اسے اٹھا کر تھکانے لے گئے۔ وہاں تک وہ زندہ رہا۔ تختانیدار کو بیان دے کر مرا۔

ناک کو معلوم تھا کہ رات ایک پیچہ خریدیں جالندھر کو جاتی ہے سٹیشن چار میل دور تھا۔ ناک گاڑی کے وقت پر پہنچ گیا اور اس گاڑی نے اسے جالندھر پہنچا دیا۔ وہ اپنی بیرک میں گیا اور کپڑے بدل کر سو گیا۔ تختانیدار اس کی گرفتاری کے لیے اس کے گاؤں گیا۔ اس کے گھر پر چھاپہ مارا۔ گھر والوں نے کہا کہ وہ گھر آیا ہی نہیں گاؤں کے کسی بھی مرد، عورت یا بچے نے نہیں کہا کہ وہ گاؤں میں دیکھا گیا تھا۔

تختانیدار جالندھر چھاؤنی ناک کی گرفتاری کے لیے بٹالین کے صوبیدار میجر سے ملا اور انکے میجر کا آفسر سے ملا اور اسے بتایا کہ فلاں ناک ایک آدمی کو قتل کر آیا ہے۔ کمپنی صوبیدار اور ناک کو بلایا گیا۔ ناک نے حیران ہو کر کہا کہ میں تو رات

دس بجے تک صوبیدار صاحب کے حکم سے فلاں کام کرتا رہا ہوں۔ صوبیدار نے اس کے بیان کی تائید کی۔ بیرک میں اس کے ساتھ رہنے والے جوانوں کو بلایا گیا۔ سب نے کہا کہ یہ تو صوبیدار صاحب کا بتایا ہوا کام کر کے سو گیا تھا اور صبح اپنے بستر سے اٹھا تھا۔ کمانڈنگ آفسر نے تختانیدار کو چلتا کیا اور قتل ہضم ہو گیا۔



خانی بھائی! — ایک روز حمید سیک پاس آیا اور کہنے لگا — ”میں اس ناک سے ملے ہوں اور اس سے پوری واردات سنی ہے۔ اب ذرا تم میری بات پر غور کرو اور مجھے مشورہ دو۔۔۔ میں نے اس شاہ جی کے ساتھ حساب برابر کرنا ہے۔ اس نے مجھے دھوکے میں اپنے گھر بلایا اور اپنے دو بد معاشوں سے مجھ پر حملہ کروایا تھا میں ٹریننگ سنٹر سے پانچ دنوں کی چھٹی گھر گیا تھا تو عائشہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ابھی تک اس کے ہاتھ نہیں آئی اور شاہ جی اس کے مال باپ کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ اب اس نے عائشہ کو دھکی دی تھی کہ وہ اسے اپنے بد معاشوں سے اغوا کر لے گا۔“ ”تمہارا ارادہ کیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا — ”کیا تم اس ناک جیسی واردات کرنا چاہتے ہو؟“

”نہیں!“ اس نے جواب دیا — ”میں شاہ کو قتل نہیں کروں گا۔ اس کے ساتھ کوئی اور سلوک کروں گا۔“

”تم نے خود بھی تو کچھ سوچا ہو گا۔“ میں نے کہا — ”اکیلے جاؤ گے۔“

”نہیں!“ اس نے کہا — ”تم میرا ساتھ دو گے۔ میں نے جو سوچا ہے وہ بتاتا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ میرا ساتھ دو گے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے یا!“ میں نے کہا — ”میں نے تمہیں بھائی بنایا ہے۔“

”پھر کام ہو گیا۔“ اس نے کہا — ”شام گنتی کے بعد یہاں سے نکل جائیں گے بس مل جانے گی۔ تمہارے شہر (قبضے) میں آئیں گے۔ وہاں سے میرا گاؤں سات اٹھ میل دور ہے۔ پیدل چلیں گے۔ شاہ کے گھر تک جائیں گے۔ باہر والی دیوار پر چڑھنا اور اندر اترنا کوئی مشکل نہیں۔ شاہ کو جگا کر باہر لے آئیں گے۔ مار پٹائی کریں گے۔ اس کے پٹے آتا کر گھر سے دور درخت کے ساتھ باندھ دیں گے اور واپس آجائیں گے۔ رات دو بجے ریل گاڑی تمہارے سٹیشن سے گزرتی ہے۔ یہ گاڑی ہمیں ڈیڑھ گھنٹے میں

واپس لے آئے گی۔

”یار! یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دینا چاہتا۔“ میں نے کہا۔ اہل بات یہ ہے کہ یہ واردات اتنی آسان نہیں جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ یہ سوچو کہ شاہ گھریں اکیلا نہیں ہوگا۔ اس کی بیوی اور بچوں کا تو ڈر نہیں، ہو سکتا ہے اس نے ایک دو بدعاش ڈپوڑھی میں سلائے ہوئے ہوں۔“

”ہاں خانی! — حمید نے کہا — بدعاشوں کی تو میں نے سوچی ہی نہیں اور نہ ہی سوچوں گا۔ ایک اور خطرہ یاد آگیا۔ شاہ کا رکھوالی والا کتنا مشہور ہے۔ میں نے یہ کتا دیکھا ہے۔ بولہ نسل کا خوشخوار کتا ہے۔ شاہ رات کو اسے کھول دیتا ہے اور یہ کتا کسی کو مکان کے قریب سے گزرنے ہی نہیں دیتا۔“ حمید سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد بولا — ”اس کا بندوبست ہو جائے گا۔“

جوانی میں دماغ میرا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میری فطرت ایڈوینچر کو بہت پسند کرتی تھی جسے اُردو میں شاید ہم جوئی کہتے ہیں لیکن اللہ نے عقل بھی عطا کی تھی۔ اندھیرے میں جانے سے پہلے میں سوچ لیا کرتا تھا کہ اندھیرے میں کیا ہے۔ مطلب یہ کہ میں کوئی کارروائی اندھا دھند نہیں کیا کرتا تھا۔

میں نے حمید سے کہا کہ میں اس کا ساتھ دوں گا لیکن ہر خطرے کا پہلے بندوبست کر کے چلیں گے۔



انگریزوں کی حکومت میں جنگ عظیم سے پہلے فوج میں سپاہی کو بھی ٹھونک بجا کر بھرتی کیا جاتا تھا۔ چند ایک ذاتوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ بھرتی ہونے والے کے گاؤں کے سردار سے اور اس علاقے کے تھانے سے چال چلن اور ذات کی تصدیق کرائی جاتی تھی۔ جسمانی صحت اور قد وغیرہ کا بڑا سخت معیار تھا۔ اگر معیار نہیں تھا تو تعلیم کا نہیں تھا۔ سپاہی کورے اُن پڑھ ہوتے تھے۔ انہیں فوجی روپٹ (مشینی انسان) بنا دیا جاتا تھا، پھر ان سپاہیوں کی سوچیں بھی فوجی بن جاتی تھیں۔ وہ انگریز کو بادشاہ، اُن داتا اور خدا سمجھنے لگتے تھے۔

جنگ عظیم شروع ہوئی تو انگریز کی بادشاہی تباہ و برباد ہونے لگی۔ ادھر جا پاتی فوجوں نے سنگاپور، ملایا اور برما پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان خطرے میں آگیا۔ جنگ سے پہلے کے تندرست و توانا جوان محاذوں پر مارے گئے یا جا بایوں نے

تھک کے حباب سے جنگی قیدی بنائے۔ انگریزوں نے بھرتی کے تمام معیار نظر انداز کر دیے اور جو آیا اسے بھرتی کر لیا۔ نہ قد دیکھا نہ چھاتی اور نہ صحت دیکھی۔ میری بتائیں میں دو نئے سپاہی ٹریننگ کمر کے آئے۔ ایک میں یہ نقص تھا کہ وہ چلتا تھا تو اس کے گھٹنے آپس میں ٹکراتے تھے اور دوسرے کے گھٹنے ٹکراتے تھے۔ ڈبلے۔ لاغر اور مرل سے جوانوں کو بھی بھرتی کیا جا رہا تھا۔

اس بھرتی کو بڑا موزوں نام دیا گیا تھا — GUN FODDER — جس کے لفظی معنی ہیں، توپوں کا چارہ، توپوں کو کھلانے کے لیے ہرے پٹھے۔ مطلب یہ کہ اس قسم کی غیر معیاری بھرتی کا استعمال یہ تھا کہ دشمن کی توپوں کا نشانہ بنے گی اور دشمن کا ایمونیشن ضائع ہوگا۔ اور اس کی پیشقدمی کی رفتار تیز نہیں ہو سکے گی۔

یہ تو جہاں لحاظ سے کمزور اور ناقص جوان تھے۔ ایسے جوان بھی بھرتی کر لیے گئے تھے جو اخلاقی لحاظ سے ناقص تھے۔ ان میں ایسے جوان بھی تھے جو پولیس کو مطلوب تھے، وہ چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں کر کے آئے تھے۔ ہماری بتائیں کی سیکھ کمپنی میں ایک سیکھ سپاہی دو آبلے (شرقی پنجاب) کے علاقے کے بڑے مشہور ڈاکو اتم سنگھ عرف اُتو کا بالکا تھا۔ ڈاکہ زنی کی ایک واردات میں مطلوب تھا۔ وہ بھاگ کر بھرتی ہو گیا تھا۔

ان جرائم پیشہ جوانوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان میں دو تین نے بڑی دلچسپ بات سنائی تھی۔ کسی بڑے گھر میں ڈاکہ زنی یا لٹب زنی کی واردات کرتی ہو اور وہاں رکھوالی والا خوشخوار کتا ہو تو ڈاکو اس کو اس طرح قابو میں لاتے ہیں کہ بھینس یا بیل کا سینک کسی مردار سے کاٹ لاتے ہیں۔ خشک بینگ کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتا ہے۔ اس میں گوشت یا قیمہ بھر کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ جس مکان میں واردات کرتی ہو، اس کے قریب جا کر بینگ کتے کے آگے پھینک دیتے ہیں۔ کتا بینگ میں سے گوشت نکالنے میں مگن ہو جاتا ہے۔ بینگ میں سے گوشت یا قیمہ نکلتا نہیں اور کتا اسے چھوڑتا بھی نہیں۔ ڈاکو بڑے آرام سے اپنا کام کر جاتے ہیں۔

اتم سنگھ اُتو کے بالکے نے بتایا کہ بینگ نہ ملے تو بانس کا ایک یا ڈیڑھ فٹ لمبا ٹکڑا لے لو۔ بانس اندر سے کھ کھلا، بوتابے۔ اس کا ایک سرابندہ کھ دو اور اس میں گوشت یا چھینٹے اس طرح دبا کر بھر دو کہ آسانی سے نکل نہ سکیں۔ یہ کتے کے آگے پھینک دو تو کتا دنیا جہاں کو بھول کر بانس سے گوشت نکالنے میں لگ جاتا ہے، بانس کو اُچھالنا ہے اور اسے کوئی زندہ چیز سمجھ کر اس سے لڑتا ہے۔... اُتو کتا تھا

کہ اس نے اس طرح ڈکیتی کی دو وارداتیں کی تھیں۔

حمید کا تو یہ عالم تھا کہ یہ طریقہ معلوم ہو جانے پر خوشی سے پھولا نہیں سانا تھا۔ اس نے شاہ جی سے انتقام لینے کا بیڑا ہی پکا ارادہ کر چکا تھا۔ میں خود بھی ان بیڑوں اور عاتلوں اور شاہ صاحبوں سے بدظن ہو چکا تھا۔ اس کا ذریعہ عائشہ بنی تھی۔ حمید اور اس کے گاؤں کے شاہ جی کی دشمنی کی وجہ بھی عائشہ ہی بنی تھی۔

ایک دو دن ہی گزرے تھے کہ حمید نے مجھے بانس کا ایک ٹکڑا دکھایا جو ایک فٹ سے کچھ زیادہ تھا۔ اس کا منہ دوا سچ سے ذرا زیادہ کھلا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مجھے ادوائیں کی رستی دکھائی۔

”ایک چاقو مسیکے پاس ہے“ اس نے کہا۔ ”اپنے لیے چاقو کا بندوبست تم خود کرو۔ بید کی دو چھڑیاں مل گئی ہیں“

”تم کرنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
اس نے اپنی سکیم بتائی۔ یہ بہت ہی مشکل سکیم تھی بلکہ ناممکن بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے اس میں رد و بدل کرنا چاہا ہی لیکن اس نے میرا پورا مشورہ نہ مانا۔ صرف دو تبدیلیاں قبول کر لیں۔

پھر اس نے مجھے اپنے پلاٹون حوالدار اور کپنی حوالدار سے ملوایا۔ میں چونکہ حوالدار کلرک تھا اس لیے یہ دونوں حوالدار مسیکے ساتھ عزت سے پیش آئے۔ وہ ہمارے ہی علاقے کے رہنے والے تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ حمید ان کے ساتھ بات کر چکا ہے اور دونوں اس کے ساتھ پورا پورا اتفاقاً دن کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں اس کا ساتھ دوں گا۔

ہم سب نے آپس میں جو باتیں کیں اور سکیم کو جو آخری شکل دی، وہ بتانے کی ضرورت نہیں، میں سناؤں گا کہ اس سکیم پر میں نے اور حمید نے کس طرح عمل کیا۔

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہم رات کے وقت بیڑوں سے بغیر حاضر نہیں ہو سکتے تھے۔ فوجی قانون کے تحت یہ جرم تھا۔ ہم حکماً چھردانیاں لگا کر سوتے تھے۔ میں جس بیرک میں رہتا تھا اس میں سب حوالدار کلرک تھے۔ فوج میں یہ خوبی ہو ا کرتی تھی (معلوم نہیں اب ہے یا نہیں) کہ ساتھی ایک دوسرے کی بہت مدد کیا کرتے تھے۔ ہم نے جس رات غائب ہونا تھا، اس شام گنتی کے بعد میں نے اپنے تین چار ساتھیوں

سے کہا کہ میری والدہ بیمار ہے، آج ہی خط آیا ہے۔ میں ابھی غائب ہو جاتا ہوں۔ بس مل جائے گی جو مجھے ایک گھنٹے میں گھر پہنچا دے گی۔ تین چار گھنٹے مال کے پاس رہوں گا۔ دو بجے کی بیسٹر ٹرین سے واپس آ جاؤں گا۔

میرے ساتھیوں نے تسلی دی کہ کچھ نہیں ہوگا، تم جاؤ، خیال یہ رکھنا کہ صبح چار بجے سے پہلے پہلے آ جانا۔

اُدھر حمید کو پلاٹون حوالدار اور کپنی حوالدار میرے تسلی دلا س دے کر بھیج دیا۔ ہم دونوں الگ الگ بتالین کی حدود سے نکلے اور بہت دور جا کر اکٹھے ہوئے۔ حمید نے دن کے وقت بڑا گوشت لانگڑی کے ہاتھ منگوا لیا تھا جو کپڑے میں بندھا ہوا اس کے پاس تھا۔ اس کے پاس ایک نوادراں تھی اور بید کی پستلی سی دو چھڑیاں تھیں۔ جنگ سے پہلے یہ چھڑی ہر جوان کو ملتی تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو جوانوں سے چھڑیاں واپس لے لی گئیں۔ حمید حوالدار سے دو چھڑیاں لے آیا تھا۔ ہم دونوں کے پاس چاقو تھے۔ حمید کے پاس بانس کا ٹکڑا بھی تھا۔

اس علاقے میں تھوڑے فاصلوں کے لیے لاریاں چلتی تھیں۔ تھوڑا ہی عرصہ پہنچے بلے فاصلوں کے لیے لاہور کے دسٹرائپوٹروں نے بس سروس شروع کی تھیں۔ ان کے اڈے الگ الگ تھے۔ ہم ایک اڈے پر گئے لیکن بس میں جگہ نہ ملی۔ دوسرے اڈے پر گئے۔ بس چلنے والی تھی۔ ہم دونوں کو جگہ مل گئی۔ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ہم بس میں بیٹھے اور بس چل پڑی۔

تیس میل سے ذرا کم ہی فاصلہ تھا۔ بس نے ایک گھنٹہ اور پندرہ بیس منٹ میں میرے قصبے میں پہنچا دیا۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ اڈے پر تین آدمی مجھے پہچاننے والے تھے۔ میں منہ چھپا کر وہاں سے نکل آیا۔ ہم دونوں نے قصبے کے اندر سے گزرنے کی بجائے باہر باہر سے حمید کے گاؤں کا رخ کر لیا۔ ہم بہت تیز چل رہے تھے۔ راستے میں چلتے چلتے حمید نے بانس میں گوشت بھر لیا۔

حمید کا گاؤں آگیا۔ شاہ کا گھر گاؤں سے الگ تھلگ تھا۔ گاؤں اور شاہ کے مکان کے درمیان قبرستان تھا۔ ہم اس طرف چل پڑے۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ ہم بہت دیر اور نڈر تھے لیکن ہم جن محنت نہیں تھے۔ جوں جوں شاہ کا گھر قریب آ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکنیں تیز اور بے قاعدہ ہوتی جا رہی تھیں۔ سبھی پوری امید

تھی کہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ شاہ کا کتا گوشت کے دھوکے میں آجائے گا۔ مجھے یہ خطرہ بھی نظر آ رہا تھا کہ شاہ کے گھر سے دو تین آدمی اٹھیں گے اور ہم دونوں کو پکڑ لیں گے۔ پہلے خود ہماری ہڈیاں توڑیں گے پھر تھانے لے جائیں گے۔ بٹالین سے ہم غیر حاضر ہوں گے تو ہمیں جھگڑنا قرار دے کر ہمارے تھانوں کو اطلاع دی جائے گی۔ جنگ کے دوران جھگڑنا ہونا سنگین ظرم تھا۔ کم از کم سزا دو سال تھی۔

میں آج اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو کانپ سا جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جوانی عقل پر پردہ ڈال دیا کرتی ہے۔ یہی کہتا ہوں کہ میں جوانی میں بہت بیوقوف ہوا کرتا تھا۔

پھر ہوا یہ کہ ہم شاہ کے گھر سے ذرا ہی دُور تھے کہ اُس کا کتا غراتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اندھیرے میں بھی شاہ کے گھر کی چار دیواری نظر آ رہی تھی۔ ہم نے اس دیوار پر چڑھنا اور اندر جانا تھا۔ شاہ کو اُٹھا کر باہر لانا تھا۔

کتا غصے سے بھونکا اور ہم پر حملہ کرنے کے انداز سے آیا۔ شاہ کے صحن میں سے آواز آئی۔ ”ہلا ڈبو... شاہ بائیں ڈبو“۔ یہ آدمی کتے کی آواز پر اُس کی ہلاکاری کر رہا تھا۔

”یہ شاہ کی آواز ہے“۔ حمید نے تیزی سے سرگوشی میں کہا۔ ”جاگ رہا ہے“۔ یہ کتے کتے حمید نے بانس کا ٹکڑا کتے کے آگے پھینک دیا۔ کتا ذرا بدکا اور خوفناک طریقے سے غرایا لیکن گوشت کی بو نے اُس کا موڈ بدل دیا۔ اُس نے بانس کو منہ میں لیا اور پھینک دیا، پھر اسے ایک سرے سے پکڑا اور بھنبھوڑا۔ گوشت تو بالکل نہیں سکتا تھا اور کتا کتا تھا کہ نکال کے چھوڑ دل گا۔

جب کتا بانس کے ساتھ مصروف ہو گیا تو ہم دونوں دیوار کی طرف چل پڑے لیکن بہت آہستہ آہستہ ہماری نظریں کتے پر لگی ہوئی تھیں۔ خطرہ یہ تھا کہ ہمیں مکان کے قریب دیکھ کر کتا بانس کو چھوڑ کر ہم پر حملہ کر دے گا۔ ہم ڈرتے ڈرتے اُس کی طرف دیکھتے دیوار کے قریب چلے گئے۔ یکلخت کتے کی یسی آواز آئی جیسے کتے آپس میں لڑتے وقت نکالتے ہیں۔

”افق سے چاند ابھر رہا تھا۔ اس کی روشنی میں ہمیں کتا بانس کے ٹکڑے کے ساتھ لڑتا دکھائی دیا۔ بانس اچھلتا اور گرتا تھا اور کتا شاید اُسے کوئی زندہ چیز سمجھتا

تھا۔ اُس کی غصیلی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

مکان کے اندر صحن سے آواز آئی۔ ”اوئے کون ہے تیرے ساتھ!“۔ پھر چلتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ مکان کا دروازہ دوسری طرف تھا۔ دروازے کی زنجیر اُترنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا۔ ہم دونوں دیوار کے ساتھ ساتھ دروازے کے قریب ہو گئے۔ دروازہ ساتھ والی دیوار میں تھا۔ کتا دروازے کے سامنے پندرہ سولہ قدم دُور تھا۔

”اوئے آج کیا ہو گیا تجھے!“۔ اس آدمی نے دروازے سے نکل کر کتے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

حمید چپتے کی طرح جھپٹا۔ ٹریننگ سنٹر میں ہمیں خالی ہاتھ لڑانی سکھائی گئی تھی۔ حمید نے پیچھے سے شاہ کی گردن کے گرد ایک بازو لپیٹ دیا۔ سکیم کے مطابق میں نے بڑی ہی تیزی سے رومال شاہ کے منہ میں مٹھوٹس دیا کہ اُس کی آواز نہ نکلے۔ پھر جاقو کھول کر اس کی نوک شاہ کے پیٹ پر رکھ دی۔

”آرام سے ہمارے ساتھ چل پڑو“۔ میں نے کہا۔ ”ذرا سی بھی گڑبڑ کی تو جاقو پیٹ کے اندر چلا جائے گا“۔

اُس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ حمید نے اُس کی گردن چھوڑ دی۔ اُس کا ایک بازو میں نے پکڑا دوسرا حمید نے پکڑا اور اُسے قبرستان میں لے گئے۔ اُس کا غورخوار ڈبو بانس میں سے گوشت نکالنے میں پائل ہوا جا رہا ہے۔

چاند ذرا اوپر آ گیا تھا۔ ہمیں کچھ دُور سے دیکھا جاسکتا تھا۔ قبرستان کے درمیان میں ایک مقبرہ اور اُس کے ساتھ کیکر اور پھلا ہی کے تین چار درخت تھے۔ ہم شاہ کو دہاں لے گئے۔ وہ مقبرے کی اوٹ تھی۔ اس لیے چاندنی نہیں تھی۔ ہم نے شاہ کے پکڑے اتار کر بالکل برہنہ کر دیا تھا۔ حمید نے ادواہین کھولی۔ اس سے اُس کے ہاتھ اُگے کو باندھے۔ اسی رستی سے اُس کے پاؤں باندھے۔

”چل میرے بھائی!“۔ حمید نے مجھے کہا۔ ”اکلا کام شروع کر دے“۔ اُس نے شاہ کے پہلو میں ہو کر بیک کی چھڑی کی اتنی زوردار ضرب شاہ کی پیٹھ پر لگائی کہ شاہ کے منہ میں رومال مٹھوٹا ہوا تھا پھر بھی اُس کی آواز سنائی دی جیسے بکرا ذبح ہو رہا تھا۔

”تم نے مجھے دھوکے میں گھر بلا کر مجھ پر اپنے بدعنوانی چھوڑے تھے۔“ حمید

”اب میری بات سن شاہ!“ — حمید نے کہا — ”ہم نے تجھے قتل کرنا تھا لیکن تو نے اپنے بچوں کا واسطہ دیا ہے۔ میں تیرے بچوں پر رحم کرتا ہوں۔ تو نے جو کام کرنے ہیں وہ سن لے۔ ایک یہ کہ تو نے میرا نام نہیں بتانا۔ میرے اس دوست کو تو جانا ہی نہیں۔ کہنا کہ تو نے کسی کو پہچانا نہیں۔ معلوم نہیں کون تھے۔ دوسرا کام یہ کہ عائشہ کا پیچھا چھوڑ دے۔ اس کے ماں باپ کو تنگ نہیں کرنا۔ تیسرا کام یہ کہ عائشہ کے ماں باپ اور میرے ماں باپ سے کہنا کہ عائشہ پر جو جنم آتا تھا، اس نے حکم دیا ہے کہ عائشہ کی شادی حمید کے ساتھ کر دو ورنہ میں سب کا بیڑہ غرق کر دوں گا.... آگے بات بنانا تیرا کام ہے۔ باتیں بنانا تو تو جانتا ہے۔ زبان کا جادو چلا کر ہی تو سب کا بادشاہ بنا ہوا ہے“

شاہ رضامندی میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔ دوبارہ اس نے کہا — ”یہی ہو گا۔“
 ”اگر تو نے میرے پیچھے پولیس بھیجی“ — حمید نے کہا — ”تو یہ سوچ لے کہ مرنے والی ہیں۔ صبح سے پہلے پہلے اپنی بیڑوں میں پہنچ جائیں گے اور تمہاری اور پولیس کی کوئی نہیں سنے گا کہ ہم یہاں آئے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تو نے ہمارے خلاف کوئی بھی انتقامی کارروائی یا ایسے گھر والوں کو پریشان کیا تو ہم ملزمی پولیس بھیج کر تجھے گرفتار کرا دیں گے اور ثابت کر دیں گے کہ تو جاہلیوں کا جاسوس ہے۔ یہ نہ کیا تو یہ ضرور کریں گے کہ تیری اس بیٹی کو جو جوان ہو رہی ہے، اٹھا کر لے جائیں گے اور تجھے قتل کر دیں گے۔ تیرے پاس معلوم نہیں غیبی طاقت ہے یا نہیں لیکن ہمارے پاس دنیا کی جو طاقت ہے، یہ تیرا بیڑہ غرق کر دے گی۔“

اس نے کمر اہتی ہوئی آواز میں وعدہ کیا کہ وہ خاموش رہے گا۔
 ہم نے اپنی سکیم کے آخری حصے پر عمل کیا۔ وہ یہ تھا کہ اسے کیکر کے قریبی درخت کے پاس لے گئے اور تنے کے ساتھ اسے اس طرح کھڑا کیا کہ اس کا منہ درخت کی طرف اور پیٹھ باہر کی طرف تھی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ادوائی کی پوری رستی اس کی ٹانگوں، پیٹھ اور درخت کے تنے کے گرد لپیٹ کر گانٹھ دے دی اور ہم وہاں سے چل پڑے۔

وقت بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ ہم دوڑنے کی رفتار تک تیز چل رہے تھے۔ اگر ہم ناکام رہتے تو ہمارے قدم پھیل ہوتے۔ ہم نے خلاف توقع سکیم کے عین مطابق بیڑے تھوڑے وقت میں اپنی واردات مکمل کر لی تھی۔

نے شاہ سے کہا اور بید کی ایک اور ضرب لگائی۔

میں بھی اسے بید مارنے لگا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اور حمید نے اس کی پیٹھ پر کتنے بید مارے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس بید کی ضرب کتنی شدید ہوتی ہے اور صرف ایک ضرب انسان کا کیا حال کر دیتی ہے۔ یوں درد ہوتا ہے جیسے کسی نے تیز چھری یا چاقو سے لمبا کٹ لگا دیا ہو۔ شاہ جس طرح تڑپا تھا وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ حمید ساتھ ساتھ کتا جا رہا تھا۔ ”تو مجھے اپنے بد معاشوں سے مروانا چاہتا تھا.... تو عائشہ کی عزت کے پیچھے پڑا ہوا ہے.... بلا اپنے جنوں اور بیڑوں کو.... تجھ میں فطری طاقت ہے تو ہمارے ہاتھ روک لے“ — حمید نے اور میں نے جو گالیاں کہیں وہ تحریر میں نہیں لائی جاسکتیں۔

ہم نے اسے اٹھایا۔ اس کے منہ میں سے رومال نکالا۔ اس کا منہ کھلا ہی رہا۔ میں تو سمجھا تھا کہ مر گیا ہے لیکن اس نے منہ بند کیا۔ اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ حمید نے اس کے پاؤں کھول دیے اور وہ پیچھے مقبرے کے سارے کھڑا ہو گیا۔
 ”او ظالمو.... او ظالمو!“ — اس کی سسکیاں سنائی دیں — ”پانی پلا دو۔“
 ”پلائیں گے شاہ جی!“ — حمید نے طنز یہ کہا — ”پانی کے ساتھ ہم شیرینی اور نذرانہ بھی پیش کر دیں گے۔“

”زیادہ مت رکوبار!“ — میں نے کہا — ”اس کی شرہ رگ پر چاقو چھرو اور حلو! ہم نے اسے قتل نہیں کرنا تھا، صرف ڈرانا تھا۔ وہ تڑپنے لگا۔“
 ”مجھے بخش دو حمید!“ — اس نے حمید کو پہچان لیا تھا۔ سسک سسک کر کہنے لگا — ”مجھے زندہ رہنے دو۔ میرے چھوٹے بچوں پر رحم کر دو۔ میری بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا۔“

بیدوں کی اتنی زیادہ اتنی شدید ضربیں کھا کر بھی وہ ہوش میں تھا۔ اس کی صحت سرکاری سائنڈ جیسی تھی۔ لال سرخ آوی تھا۔ عمر پینتیس چھتیس سال ہو گی۔ وہ اس علاقے کا ”خدا“ بنا ہوا تھا۔ بڑے بڑے راجے اسے جھک کر سلام کرتے تھے۔ موت کا نام سن کر وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ اس سے اچھی طرح بولا نہیں جاتا تھا۔ کراہتا زیادہ اور بولنا کم تھا۔

چھرو رو پڑا اور بہت ہی دبی ہوئی کمرہ بانگ آواز میں بولا — ”قتل نہ کرنا۔“

پڑا۔ صبح کے چار بجے دل لے تھے۔

صبح اُٹھے۔ نہ میری بیک میں نہ حمید کی بیک میں کسی کو پتہ چلا کہ ہم ساری رات غیر حاضر رہے ہیں۔ حمید مجھے دوپہر کے وقت ملا تھا۔ اب ہم پولیس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ شاہ نے نھانے رپورٹ نہ کی ہو اور حمید نام نہ نکھوایا ہو۔ وہ دن گزر گیا۔ اگلا دن بھی گزر گیا اور پھر سات آٹھ دن گزر گئے۔ پولیس نہ آئی۔ ہمیں کچھ یقین سا آنے لگا کہ شاہ نے پولیس کو یہ واردات نہیں بتائی۔ اس سے ہمیں شک ہونے لگا کہ شاہ کسی اور طریقے سے انتقام لے گا۔ یہ ضروری ہو گیا تھا کہ حمید گاؤں جائے اور دیکھ آئے کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔

تیرہ چودہ دن گزرے تھے تو حمید نے مال کی بیماری کا ہسپتال بنا کر پانچ دلوں کی چھٹی منزلہ رومر والی اور گاؤں چلا گیا۔ مجھے یہ نکرہ ہونے لگا تھا کہ حمید گاؤں میں پکڑا جائے گا لیکن وہ چھٹی کاٹ کر واپس آ گیا۔

اُس نے بڑی عجیب بات بتائی۔ گھر والوں نے اُسے یہ نئی خبر سنائی کہ شاہ جی کو جنات اٹھا کر لے گئے تھے اور اُن کی بہت بڑی حالت کر کے ایک درخت کے ساتھ باندھ گئے۔ چھٹی کے دوران حمید جس کسی سے بھی ملا اُس نے اُسے یہی واقعہ سنایا۔ حمید نے مجھے یہ بات سنا کر کہا کہ میرے دل میں بار بار یہ ارادہ آتا تھا کہ سارے گاؤں والوں کو اور شاہ کے مریدوں کو اٹھا کر کے سناؤں کہ شاہ کو جنات نہیں بلکہ ہم دو انسان اٹھا کر لے گئے تھے۔ لیکن میں یہ بات اپنے کسی دوست کے ساتھ بھی نہ کر سکا، کیونکہ لوگ اس واقعے کو سچ مانتے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ بات شاہ نے خود شہور کی تھی۔ لوگوں نے علی الصبح شاہ جی کو کھیکر کے تنے کے ساتھ بندھا ہوا دیکھا۔ اُس کے جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں تھا اور اُس کی پیٹھ پر گھری لال نیکروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بعض نیکروں میں سے خون چھوٹ آیا تھا۔ یہ خبر فوراً ہی گاؤں میں پھیل گئی۔ شاہ پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ لوگوں نے شاہ کو کھولا، اُس پر چادر ڈالی اور اٹھا کر اس کے گھر لے گئے۔

گاؤں کے حکیم اور جراح کو بلایا گیا۔ انہوں نے علاج معالجہ شروع کر دیا۔ شاہ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ شاہ نے بتایا کہ ایک بڑا ہی شیطان جن شیطان کے اُگلے پر اُس کے قبضے سے نکل گیا ہے۔ شاہ نے اُسے زندہ جلانے کی

میں اسے آج بھی ایک معجزہ کہتا ہوں۔ معلوم نہیں میں اور حمید نیکی کر رہے تھے یا بدی لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ شاہ اصل شیطان یا شیطان کا چیلہ تھا۔ وہ اللہ کا کلام تعزید دل پر رکھ دیتا، سادہ لوح دیہاتیوں سے پیسے بھرتا اور کوئی جوان عورت مصیبت کی ماری اُس کے پاس چلی جاتی تو اُس کے ساتھ ہکاری کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خداوند تعالیٰ نے اُسے سزا دینے کے لیے کتنے کی آواز پر باہر نکال دیا اور ہمارے حوالے کر دیا تھا۔

اب ہم یہ انتظار کرنے لگے کہ ہم سزا سے بچتے ہیں یا اتنی سنگین واردات دہی رہ جاتی ہے۔

ہمارا علاقہ میدان میں نہیں، ٹیلوں، ٹیکریوں، کھڈوں اور برساتی نالوں کی بھرمار ہے۔ اگر علاقہ میدانی ہوتا تو سات ساڑھے سات میل کا فاصلہ ہم فوجی جوانوں کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہاں تو گھاناٹیاں اُترتی اور چڑھتی تھیں جو ہم اُترتے اور چڑھتے جا رہے تھے۔ ہماری دوڑ تو زندگی اور موت کی دوڑ تھی۔ ریل گاڑی چھوٹ جانے کے نتیجے سے ہم آگاہ تھے۔ ہم صبح بتالین لائنوں سے غیر حاضر ہوتے۔ دوسری طرف شاہ نے حمید کے پیچھے پولیس بھیج دی تھی۔ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیا جاتا یا کوڑا لاش ہوتا۔ ہم جب قبضے کے قریب پہنچے تو دوسرے ریل گاڑی کے انجن کی روشنی دکھائی دی۔ گاڑی کم دیش دو میل دُور تھی۔ ہم دو نو دوڑ پڑے۔ میرے قبضے کے سٹیشن پر گاڑی صرف دو منٹ رکتی تھی۔ اب دیکھنا تھا کہ ہم سٹیشن پر پہلے پہنچتے ہیں یا گاڑی۔ میں اپنے قبضے کے بند بازار سے دوڑتا گزر رہا تھا۔ چونکہ ریل روکا۔ میں نے اُس کے بغیر کہا ہٹ جاؤ، گاڑی چھوٹ جائے گی۔

ہم ابھی اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئے تھے کہ گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ ہماری تو ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ پھر بھی ہم تیز دوڑے۔ ٹیکٹوں والی کڑی سے ابھی دُور ہی تھے کہ انجن نے رولنگ کی کوسل بھائی۔ ہم نے ٹکٹ لینے کا خیال چھوڑ دیا۔ دوسری ریل بھی تو گاڑی چل پڑی۔ ہم دوڑ پڑے اور آخری ڈبے کو پکڑ لیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد گاڑی نے ہمیں ہماری چھاؤنی کے سٹیشن تک پہنچا دیا۔ ہم پلیٹ فارم پر اترنے کی بجائے دوسری طرف اُترے اور باہر باہر سے سٹیشن سے نکل گئے۔ ہماری بیکیں کوئی زیادہ دُور نہیں تھیں لیکن بے ٹکٹ ہونے کی وجہ سے ہم اتنے بڑے سٹیشن کی دوسری طرف چلے گئے تھے اس لیے بڑا لمبا چکر کاٹ کر ہمیں اپنی منزل تک پہنچنا

کوشش کی تھی لیکن جن بچ گیا اور اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر رات کو شاہ کو اٹھا کر لے گیا۔ ہر کوئی مان رہا تھا کہ شاہ جو بیان دے رہا ہے بالکل سچ ہے۔ اگر واقعہ سے شاہ کی مقبولیت اور اس کا رعب پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا۔ شاہ کو تھکا کہ وہ ان جنات کو جو اُسے اٹھا کر لے گئے تھے، حاضر کر کے سارے گاؤں کے سامنے زندہ جلانے کا۔

حمید عائشہ سے ملا۔ عائشہ بھی مان رہی تھی کہ شاہ کے قبضے میں جنات ہیں اور اُسے جنات نے ہی مارا پیشا ہے۔ حمید نے اُسے بتایا کہ وہ جنات وہ اور اس کا ایک دوست تھے۔

غور اس پر کہیں کہ اس واقعہ کے بیس بائیس سال بعد یہ شاہ مر گیا تھا۔ اُس وقت تک اس کی مریدی اور عقیدت کا سلسلہ بہت دور تک پھیل گیا تھا اور اس کے مرنے کے بعد اُس کے مزار پر آج بھی بڑی شان و شوکت سے عرس ہوتا ہے اور لوگ اس کی قبر پر بھی ہوئی چادر دل کو ہاتھ لگانے کے لیے دھکے دیتے اور دھکے کھاتے ہیں اور وہاں جا کر اپنی مشکلیں اور مرادیں بیان کرتے ہیں۔ لوگوں نے اُس کے مزار کے ساتھ مجترہ نما کرامتیں گڑھ رکھی ہیں۔

’اچھے‘ کچھ دور میرے ساتھ چلے۔ بھٹکا ہوا مسافر آپ کو ان سنگلاخ وادیوں میں لئے چلتا ہے جہاں جا کر وہ سمجھا تھا کہ اور ہی زیادہ بھٹک گیا ہے اور اُس کی قسمت میں گم ہو جانا ہی لکھ دیا گیا ہے لیکن وہیں سے اُسے منزل کے نشان ملے۔ سوچوں اور خیالوں کا دھارا کسی اور رخ پر چل پڑا۔ پہلے مجھے واجدہ اور آصف کی بات پوری کر لینے دیں۔

اپنے علاقے کے مشہور و معروف اور ”بڑی پہنچ والے“ شاہ جی کے ساتھ بڑی کالیاب اور خطرناک واردات کر کے میں نے اپنے دل و دماغ میں زلزلے جیسے جھٹکے محسوس کئے جن سے میرے عقیدے تہہ وبالا ہو گئے تھے۔ میں اگر مکمل طور پر نہیں تو بہت حد تک پیروں اور اُن کی کرامات کو مانا کرتا تھا۔ جنات کے وجود سے تو میں نے کبھی انکار کیا ہی نہیں تھا، اور میں یہ بھی مانتا تھا کہ پیروں اور ”شاہ صاحبوں“ کے قبضے میں جن ہو کر رہتے ہیں لیکن اس شاہ نے ہم سے پھینٹی کھا کر اس سے بھی فائدہ اٹھالیا اور مجھے اور حمید کو جن بنا دیا تو میرے عقیدوں کی چولیس ڈھیلی ہو گئیں اور مجھے وہ علم حاصل ہوا جو عالم مونی مونی کتابوں میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

اس واردات کے بعد مجھ میں عجیب سی جرات پیدا ہو گئی۔ اسی کو شاید اخلاقی جرات کہتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ باطل کا ایک بڑا مضبوط بت توڑا تھا۔ یہ لوگوں کی جمالت، پسماندگی اور بد نصیبی ہے کہ وہ ابھی تک اس باطل کی پوجا کر رہے ہیں لیکن میں جس زنجیر میں جکڑا ہوا تھا وہ ٹوٹ گئی اور میرا ایمان آزاد ہو گیا۔

لوگوں کی سادگی پر اُس زمانے میں افسوس ہوتا ہی تھا، آج دل کو دکھ ہوتا ہے کہ تعلیم کی روشنی گھر گھر پہنچ گئی ہے لیکن پیر پرستی کی تاریکی بدستور موجود ہے۔ میں وعظ

نہیں کروں گا نہ میں آیات قرآنی کے حوالے دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ جبر پرستی شرک ہے۔ ایک دو ذواتِ خداؤں گا۔

جنگِ عظیم کے دوران ہمارے دیہاتی علاقے میں پیروں کی منڈی خوب چمکی تھی۔ ہر گھر کا کم از کم ایک جوان تو ضرور ہی فوج میں تھا۔ بعض گھروں کے تین تین چار چار جوان فوج میں تھے۔ ان کی اکثریت محاذوں پر گئی ہوئی تھی۔ محاذ کو فرنٹ کہتے تھے..... برافرنٹ، اٹلی فرنٹ وغیرہ..... فوجیوں کے باپ، مائیں، بہنیں اور بیویاں دلوں میں آس لے کر پیروں کے آستانوں پر جانتے رگڑتی تھیں کہ ان کا آدمی جہاں کہیں بھی ہے، زندہ اور سلامت رہے۔ بعض لوگ یہ مراد لے کر پیروں کے ہاں جاتے تھے کہ — ”میرا بیٹا چھاؤنی میں ہے۔ وہ چھاؤنی میں ہی رہے، اُسے سمندر پار یا کسی فرنٹ پر نہ بھیجا جائے۔“

پیروں نے دعاؤں، پھوکوں اور تعویذوں کے ریٹ چڑھا دیئے تھے۔ کوئی پیر اپنے کسی سائل سے نہیں کہتا تھا کہ تمہارا آدمی زخمی ہو جائے گا یا مارا جائے گا۔ ہر پیر کی زبان پر یہ الفاظ چڑھے ہوئے تھے — ”اللہ خیر کرے گا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ مجھے نظر آرہا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی ہر روز دو تین گھروں میں سرکاری چھٹیاں آتی تھیں کہ آپ کا بیٹا فرنٹ پر مارا گیا ہے یا زخمی ہو گیا یا لاپتہ یا جنگی قیدی ہو گیا ہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ لوگ اس حقیقت کو قبول کر کے پیروں سے منہ موڑ لیتے کہ جہاں تو ہیں چلا کرتی ہیں وہاں تعویذ نہیں چلا کرتے اور جرموں اور جلیانیوں کے لڑاکا بمبار ہوئی جہازوں کو پیروں کی پھونکیں نہیں روک سکتیں، لیکن ہوتا یہ تھا کہ کسی گاؤں میں کسی فوجی کے مارے جانے یا زخمی ہو جانے کی سرکاری اطلاع آتی تھی تو اس گاؤں کے فوجیوں کے والدین وغیرہ اپنے پیر کے پاس دوڑے جاتے اور اپنے بیٹوں کی سلامتی کے لئے دعائیں کراتے اور نئے تعویذ لاتے اور پہلے سے زیادہ نذرانہ پیش کرتے تھے۔

ہمارے دیہاتوں میں عقل کی کمی تھی اور جرات کی بھی۔ انہیں یوں کرنا چاہئے تھا کہ جن کا بیٹا مارا جاتا وہ پیر کے ہاں جاتے اور کہتے، یا سرکار پیر، دیگر پیروں کے پیر، ہمارے بیٹے کے گلے سے آپ کا تعویذ بندھا ہوا تھا۔ ایک تعویذ ہم نے اپنے گھر میں بھی رکھا ہوا تھا۔ آپ نے ہمارے بیٹے پر پھونکیں بھی ماری تھیں پھر بھی بیٹا مارا گیا ہے۔ آپ کم از کم ہمارے پیسے ہی واپس کر دیں، لیکن لوگوں کا ردِ عمل اور رویہ کچھ اور ہی ہوتا

تھا۔

میں ایک سو فیصد سچا واقعہ سنا ہوں۔ یہ ہمارے قصبے کے بالکل ساتھ والے گاؤں کا واقعہ ہے۔ ایک سپاہی برافرنٹ پر مارا گیا۔ اُس کا باپ میرے والد صاحب کے ملنے والوں میں سے تھا۔ والد صاحب تعزیت کے لئے گئے۔ انہوں نے سنایا کہ وہاں گاؤں کے کسی آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے اُس فوجی کے باپ سے کہا کہ پیر صاحب نے اُس جوان کو گلے میں ڈالنے کے لئے تعویذ دیا تھا پھر بھی وہ مارا گیا۔

”پیر صاحب نے جو کہا تھا وہ سچ نکلا۔“ مرے ہوئے جوان کے باپ نے کہا۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ تمہارا بیٹا گولی سے نہیں مرے گا۔ وہ گولی سے نہیں مرا۔ اُس کے ایک ساتھی نے بتایا ہے کہ اُس کے مورچے کے قریب بم گر تھا۔“ اس شخص کا جوان بیٹا مارا گیا لیکن پیر کا وہ بدستور عقیدت مندر رہا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ۔

میں ان پیروں کی بے شمار کہانیاں سنا سکتا ہوں۔ ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ، شرمناک اور افسوسناک۔ ان پیروں کے ہاں بے تحاشہ بدکاری ہوتی تھی۔ بعض حاجت مند اور سائل پیروں کے حضور شراب پیش کرتے تھے اور بعض شر سے خوبصورت طوائفیں لے جاتے تھے۔ گانے اور ناچنے والیاں بھی مجرے کے لئے پیش کی جاتی تھیں مگر ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی سرکاری اطلاعوں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو ہمارے ضلع کے فوجیوں کی ایک چوتھائی سے کچھ زیادہ نفری جنگ کی بھینت چڑھ چکی تھی۔

وہ شاہ جسے میں نے اور حمید نے ننگا کر کے اور بید مار مار کر بیہوش کر دیا تھا، معمولی سا ”شاہجی“ تھا لیکن جنگِ عظیم میں وہ باقاعدہ پیر بن گیا اور اس کی گدگی کو بہت شہرت ملی۔

○

پیروں کی کہانیاں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔

آئیے، میں آپ کو اپنے سفر پر لے چلتا ہوں۔

واپسہ کو میں اُس کے کوارٹر میں ملا تھا۔ ایک خوشی تو ملاقات کی تھی۔ یہ روحانی مُرت تھی۔ دوسری خوشی یہ کہ اس کا خاوند آگیا تھا اور میں چارپائی کے نیچے چھپ گیا تھا اور اس کا خاوند چلا گیا اور میں پال پال بچ گیا تھا۔ ایک خوشی اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ میں

بولنے کا انداز یہ تھا کہ گردن اکڑا کر سرو اُنچا کرتے اور جس کے ساتھ بات کرنی ہوتی
اُسے شیرمھی نظروں سے دیکھتے اور یوں بات کرتے جیسے یہ شخص انتہائی گھٹیا خاندان کا
آدی ہے۔

یہ سب کچھ سوچ کر مجھ پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ آصف کے ساتھ میری ٹکڑ ہوگی اور
مگر معمولی نہیں ہوگی۔ میں نے کہا ہے مجھے آصف کا کوئی ڈر نہیں تھا، میری پریشانی یہ
تھی کہ آصف واجدہ کے ساتھ نہ جانے کیسے ردِ عمل اور غصے کا اظہار کرے۔ وہ آخر
خاندان تھا اور کوئی بزدل اور گھٹیا آدمی بھی نہیں تھا، اُس کی برداشت کی آخر کوئی حد ضرور
تھی۔ اُس نے واجدہ کا یہ اعتراف تو قبول کر لیا تھا کہ وہ اُسے صرف خاندان کی حیثیت سے
قبول کرتی ہے لیکن اس کی دلی محبت میرے ساتھ ہے، لیکن وہ یہ صورت قبول نہیں کر
سکتا تھا کہ میں اُس کی غیر حاضری میں اُس کی بیوی سے ملتا۔

یہ تو میری سوچیں تھیں جو مجھے پریشان ہی کرتی جا رہی تھیں، اس کا کوئی حل نہیں
نوجھ رہا تھا۔ یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ آصف نے واجدہ کے ساتھ کیا
سلوک کیا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ سلوک اچھا نہیں ہو گا لیکن خطرہ یہ تھا کہ واجدہ اینٹ کا
جواب پتھر سے دینے والی لڑکی تھی۔ یہ تو میں پہلے بتا چکا ہوں کہ عروسی کی رات آصف
نے واجدہ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا تو ایسا ہی تھپڑ واجدہ نے آصف کے منہ پر مار دیا تھا مگر
اب صورت اور تھی۔ اب میں درمیان میں آگیا تھا۔ مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ آصف
واجدہ کو قتل ہی نہ کر دے۔ اگر یہ نہ کرے تو اسے طلاق دے کر گھر بھیج دے گا۔

اس معاملے میں میرا رازدار حمید تھا۔ میں اُس کی بارک میں گیا اور اُسے بتایا کہ یہ
واقعہ ہو گیا ہے۔ اُس نے پہلی بات یہی کہی کہ یہ اچھا نہیں ہو گا۔ معاملہ بگڑ کر خاندانوں کی
دشمنی تک پہنچ سکتا تھا۔ اس صورت میں میرا خاندان آصف اور واجدہ کے خاندانوں کا
مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں اور حمید ہر زاویے سے سوچتے رہے لیکن کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ سوال
صرف یہ تھا کہ واجدہ سے کس طرح معلوم کیا جائے کہ آصف نے گھر جا کر اُس کے
ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

○

میں نے بتایا ہے کہ آصف کی سگنل ہالین ہماری لائٹوں کے بالکل قریب تھی۔ میں

پہلی بار اتنی خوبصورت لڑکی سے رات کے وقت اور بند کمرے کی تنہائی میں ملا تھا۔ میں
بتا چکا ہوں کہ اُس پر میری محبت کی دیوانگی طاری تھی لیکن میں وہاں سے پاک صاف نکل
آیا تھا۔ یہ میری بہت بڑی فتح تھی۔ میں نے اپنے نفس کو من مانی نہیں کرنے دی تھی۔
واجدہ نے کہا تھا کہ میں دس دنوں بعد اسے کوارٹروں کے قریب والے جنگلے کے
پاس ملوں۔ اس نے مجھے بتانا تھا کہ آصف کی رات کی اگلی ڈیوٹی کب ہوگی۔ ہم شاہ کی بار
پٹائی کر آئے تو ایک ہی روز بعد دس دن پورے ہو گئے۔ میں شام سے کچھ دیر پہلے ٹہلا
ٹہلا جنگلے کے قریب اُس جگہ چلا گیا جہاں سے واجدہ کا کوارٹر نظر آتا تھا۔ اُس نے بھی
یقیناً ”گن گن گردن گزارے تھے۔ وہ اپنے کوارٹر کے باہر کھڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ میری طرف آہستہ آہستہ چل پڑی۔ فاصلہ خاصا تھا۔ میں نے دائیں
طرف دیکھا اور میں پریشان ہو گیا۔ آصف آ رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ اپنے کوارٹر
کی طرف مڑا تو اُسے واجدہ اسی طرف آتی دکھائی دی۔ میں بڑی تیزی سے وہاں سے
کھسک آیا۔ آصف کم عقل تو نہیں تھا۔ وہ فوراً ”سمجھ گیا ہو گا میں واجدہ سے ملنے کے
لئے وہاں کھڑا تھا اور واجدہ مجھ سے ملنے جنگلے کی طرف آ رہی تھی۔

میں یہ سوچتا ہوں اپنی بارک میں آگیا کہ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ مجھے اپنا کوئی غم نہیں تھا
اور مجھے آصف کا بھی کوئی ڈر نہیں تھا۔ میں صرف واجدہ کے لئے پریشان تھا۔ واجدہ نے
مجھے بتایا تھا کہ اُس نے آصف کو اپنے رعب میں لے لیا ہے۔ اُس نے آصف کو یہ بھی بتا
دیا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ اس کے باوجود آصف نے واجدہ کو اپنے گھر آباد کر لیا تھا۔
میں حیران تھا کہ آصف نے واجدہ کی یہ باتیں کس طرح برداشت کر لی تھیں۔ ہمارے
علاقے میں تو لوگ صرف شک کی بنا پر ہی قتل کر دیا کرتے تھے لیکن آصف تو واجدہ کا
پروانہ بن گیا تھا۔

بے شک آصف نے واجدہ کے آگے ہتھیار ڈال کر اُس کی اطاعت قبول کر لی تھی
لیکن سوچنے والی بات یہ تھی کہ اُس نے میری اطاعت تو قبول نہیں کی تھی۔ وہ مجھے
معاف نہیں کر سکتا تھا۔ ایک وجہ تو صاف تھی کہ اُس کی بیوی نے اُسے کہہ دیا تھا کہ وہ
مجھے چاہتی ہے اور دوسری وجہ یہ کہ وہ اُنہی ذات کا آدمی تھا اور میری ذات اُس سے دو
تین درجے کم تھی۔ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ وہ قوموں اور ذاتوں کا زمانہ تھا۔
ہمارے علاقے میں راجے دوسری ذاتوں کے لوگوں کو اپنے غلام سمجھتے تھے۔ ان کے

کچھ سوچ کر اُس کی یہ بات قبول کر لی ہے۔ سوچ یہ ہے کہ ہم اوپنجی ذات کے لوگ ہیں۔ ایک یو قوف لڑکی کی یو قوفی سے میں نہیں چاہتا کہ دو اوپنجی ذات کے خاندان بدنام ہو جائیں۔ تم چھوٹی ذات کے آدمی ہو۔ ان باتوں کو تم نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ مت بھولو کہ میں واجدہ کا خاوند ہوں اور میں بالکل برداشت نہیں کروں گا کہ تم میری بیوی سے ملو۔ میں تمہیں بھائیوں کی طرح نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی حیثیت اور اپنی ذات کو بچاؤ اور کوشش کرو کہ واجدہ سے دُور ہو جاؤ۔ محل میں کیمبل کی ٹالی نہیں لگ سکتی۔ اگر نہیں ہونگے تو اُس کا نتیجہ تمہارے ماں باپ کے لئے بہت بُرا ہو گا۔

”ایک کام کرنا آصف بھائی!“ میں نے کہا۔ ”اگر سزا دینی ہے تو مجھے دینا واجدہ پر ہاتھ نہ اٹھانا اور اُس کی زندگی برباد نہ کرنا۔“

”تم اُس کے کیا لگتے ہو؟“ آصف نے کہا۔ ”وہ میری بیوی ہے۔ میں جو سلوک چاہوں گا اس کے ساتھ کروں گا۔ میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ وہ تمہاری عزت صرف اس لئے کرتی ہے کہ تم اُس کے استاد رہے ہو۔ تم نے اسے تعلیم دی ہے لیکن تم اُس کے عاشق بن بیٹھے ہو۔“

”تم یہ نصیحتیں واجدہ کو کیوں نہیں کرتے!“ میں نے کہا۔ ”وہ تمہاری بیوی ہے۔ کیا تم اُس سے ڈرتے ہو؟“

”میں تمہارے ساتھ بات کر رہا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”یہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ کون کس سے ڈرتا ہے۔ میں تم سے درخواست نہیں کر رہا کہ میں عرض کرنے آیا ہوں۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ میرے راستے میں نہ آؤ۔“

”بات ختم کرو آصف!“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارا حکم نہیں مانوں گا۔ یہی بات اگر واجدہ مجھے کہہ دے تو میں اُس کا حکم مان لوں گا۔ تم نے مجھے چھوٹی ذات کا آدمی کہا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔“

”پھر میرا فیصلہ سن لو۔“ آصف نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کے کہا۔ ”تم زندہ رہو گے یا میں۔“

وہ میرا جواب سنے بغیر چلا گیا۔ اُس نے مجھے جو چیلنج دیا تھا یہ کھوکھلی دھمکی نہیں تھی اور نہ ہی اُس نے کسی پنجابی فلم کا مکالمہ بولا تھا۔ اُس نے اپنا فیصلہ سنایا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ اس پر عمل بھی کرے گا۔ میں نے اپنے آپ کو اس امتحان کے لئے تیار کر لیا۔

جب حمید کے ساتھ بات کر کے آیا تو شام رات میں بدل چکی تھی۔ میرے ایک ساتھی نے باہر سے آکر بتایا کہ کوئی آدمی مجھے ملنا چاہتا ہے لیکن اندر نہیں آتا۔ میں باہر گیا تو دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور پریشانی بھی کہ وہ واجدہ کا خاوند آصف تھا۔ میں آگے بڑھ کر اُسے تپاک سے ملا لیکن اُس نے میرے ساتھ ہاتھ نہ ملایا۔ میں نے ہاتھ آگے کیا تھا۔ ”اندر آ جاؤ آصف بھائی!“ میں نے ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں ہاتھ ملائے نہیں آیا۔“ اُس نے کچھ رعوت سے کہا۔ ”اور نہ ہی تمہارا مسمان بن کر آیا ہوں۔ یہ سمجھ لو کہ تم نے میری بات پر توجہ نہ دی تو تم دونوں کے مسمان ہو گے۔“

”تم میری جگہ پر آئے ہو آصف!“ میں نے بڑے تحمل سے کہا۔ ”یہ میرا گھر ہے اور تم میرے گھر آئے ہو۔ ماں بہن کی گالی دو گے تو وہ بھی سن لوں گا۔“

”میں گالیاں دینے نہیں آیا۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہیں ایک دو باتیں کہنے آیا ہوں۔ اس کے بعد دو دیکھوں گا کہ تم میرے کہنے پر عمل کرتے ہو یا نہیں۔ ذرا میرے ساتھ اُدھر چلو۔“

میں خالی ہاتھ تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ آصف کا ارادہ کیا تھا اور نہ ہی یہ معلوم تو کہ اس کی جیب میں چاقو یا ریوالتور ہے یا کچھ بھی نہیں۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ چلتے چلتے ہم پڑ گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔

یہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ آصف ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور میں واجدہ کے قصبے کا جسے شہر کہا جاتا تھا، باشندہ تھا۔ میں نے آصف کو اپنے شہر میں آتے جاتے دیکھا تھا اور اُس نے مجھے دیکھا تھا اور صرف ایک بار سلام دعا ہوئی تھی۔ اب تو واجدہ نے اُسے بتا دیا تھا کہ اس کی زندگی میں میرا کیا مقام تھا۔ صحیح الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ میں اُس کا قریب اور دشمن تھا۔

”غور سے سن لو، خانی!“ آصف نے کہا۔ ”میں جو بات آج کہنے آیا ہوں پھر کبھی نہیں کہوں گا۔ اگر تم میں عقل ہے تو تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کیا بات کہنے آیا ہوں۔“

”پہلے بات تو کرو آصف بھائی!“ میں نے کہا۔ ”میری بیوی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ آصف نے کہا۔ ”اور میں نے

میں عورتیں فارغ تھیں۔ اُن کا شغل گپ شپ لگانا ہی رہ گیا تھا۔ وہ تین تین چار چار کی ٹولوں میں باہر بیٹھ جاتی تھیں اور گپ شپ لگاتی تھیں۔

واجدہ نے مجھے دیکھا تو اُٹھ کر آگئی۔ اُس نے عورتوں کو میرے متعلق بتایا تھا کہ میں اُس کاموں زاد بھائی ہوں۔ میں نے اُس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اُس روز آصف نے گھر جا کر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

”سلوک کیا کرتا تھا!“ —واجدہ نے ہنستے ہوئے کہا — ”پہلے تو اس نے خاندنوں جیسا رعب جھاڑا جو میں اُس کا دل رکھنے کے لئے سنبھال رہی۔ آخر میں نے کہا کہ خانی جنگل کے پاس کھڑا تھا۔ وہ مجھے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ تو سڑک پر جا رہا تھا، اُس نے اُدھر دیکھا تو میں باہر کھڑی تھی، وہ جنگل کے قریب آگیا اور میں اُس کی طرف چل پڑی۔ اگر میں اُس تک پہنچ بھی جاتی تو ہم کون سی بدی کر لیتے..... آصف نے کہا کہ یہ بدی نہیں تو اور کیا ہے کہ کسی کی بیوی کسی غیر مرد سے ملے۔ میں نے اُسے قسمیں کھا کر کہا کہ خانی تمہاری غیر حاضری میں میرے گھر آجائے گا تو بھی ہم بدی نہیں کریں گے..... اس کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن میں نے اس کے چہرے سے اندازہ کیا کہ وہ میری باتیں سن کر صرف چپ ہوا ہے، اُس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔“

”میرے بارے میں کچھ کہتا تھا؟“ —میں نے پوچھا۔

”نہیں!“ —واجدہ نے جواب دیا — ”اُس نے صرف اتنا کہا تھا کہ تم نے چھوٹی ذات کے آدمی کا پار دل میں بٹھا کر بہت برا کیا ہے۔“

”مجھے تو وہ قتل کی دھمکی دے آیا ہے۔“ —میں نے کہا اور وہ ساری باتیں سنائیں جو میرے اور آصف کے درمیان ہوئی تھیں۔ پھر کہا — ”اگر اس نے تمہیں یہ باتیں نہیں سنائیں تو اُس سے نہ پوچھنا۔ اگر پوچھو گی تو یہ ثبوت ہو گا کہ میری اور تمہاری ملاقات ہوئی ہے..... مجھے اپنا کوئی غم نہیں دواؤ! میں تو اُس کا پورا مقابلہ کروں گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ تمہیں تنگ نہ کرے۔ تم نے اُس کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں کہی کہ وہ مجھے ملا تھا اور میری اور اُس کی باتیں ہوئی تھیں۔“

”میری ایک بات دل میں رکھ لو خانی!“ —واجدہ نے کہا — ”اس شخص کے آگے جھک نہ جانا۔ اُس کے رعب میں نہیں آنا۔ اگر موقع محل دیکھو تو اُسے سرے سے صاف ہی کر دو۔ خیال صرف یہ رکھنا کہ پکڑنے نہ جاؤ۔ یہ تم پر وار کرے گا ضرور۔ یہ ان

اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال تھی، شاید اس لئے کہ میری نیت صاف تھی۔ میں۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آصف کو راستے سے ہٹانے کے لئےواجدہ کو یہ مشورہ دوں! اُسے کسی طرح زہر دے دے پھر ہم شادی کر لیں گے۔ شادی شدہ عورتوں کی محبت کمائیوں میں ایسے واقعات بہت ملتے ہیں کہ عورت نے اپنے آشنا کو ساتھ ملا کر خاوند کو زہر دے دیا یا کسی اور طریقے سے قتل کر دیا۔ میں نے تو یہ بھی سوچ رکھا تھاواجدہ سے کہوں گا کہ اُس کا خاوند اگر اُس کے سامنے جھک گیا ہے تو وہ مجھے دل سے اُدے اور اپنی ازدواجی زندگی میں کانٹے نہ نکھیرے۔

میں نے یہ جو کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال تھی، یہ بات یوں بنی کہ وہ جنگ زمانہ تھا۔ ہندوستان کی کئی چلتیں اور توپ خانے وغیرہ محاذوں پر چلے گئے تھے اور جو فوج ملک میں رہ گئی تھی اُس کی ٹریننگ جاری رہتی تھی۔ ایک ٹریننگ تو یہ ہوتی تھی کہ بریگیڈ یا کسی یونٹ کو حکم ملتا کہ وہ جنگی حالت میں فوراً فلاں مقام تک پہنچے، پھر دیکھا تھا کہ یہ بریگیڈ یا یونٹ کتنی جلدی بتائے ہوئے مقام پر پہنچتی ہے اور اس مقام پر پہنچ کتنی جلدی مورچے تیار کرتی ہے۔

ایسا ہی حکم ہمارے بریگیڈ کو مل گیا۔ بریگیڈ میں آصف کی سنگٹل بٹالین بھی شامل تھی اور میری بٹالین بھی لیکن میں نے بٹالین کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ کچھ شاف نے پوچھا رہنا ہوتا تھا۔

اگلے ہی روز بریگیڈ چلا گیا۔ بریگیڈ کو پنجاب کے ایک پہاڑی علاقے میں پہنچانا یہ ایک ایکسرسائز یعنی جنگی مشق تھی۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ بریگیڈ نے وہاں کتنے دن رات تھا۔ حمید بھی چلا گیا تھا۔ اب میںواجدہ سے مل کر معلوم کر سکتا تھا کہ ان کے گھر میں ہوا تھا لیکن میں رات کو نہیں جاسکتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ جب کوئی یونٹ ایکسرسائز کچھ دنوں کے لئے باہر جاتی ہے تو فیملی کو وارنروں پر رات کو پہرہ ہوتا ہے۔ میںواجدہ دن کے وقت ہی مل سکتا تھا لیکن پکڑے جانے کا خطرہ موجود تھا کیونکہ یونٹ کے جو آدمی پیچھے رہ جاتے تھے وہ وارنروں پر نظر رکھتے تھے۔

میں شام چار بجے سے کچھ دیر بعد ٹھٹھا ٹھٹھاواجدہ کے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ وہ نظر آگئی۔ جن عورتوں کے خاوند جنگی مشق کے لئے چلے گئے تھے۔ ان کی غیر حاضر

کے خاندان کی روایت ہے۔ میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ اس کا قصہ ہی پاک کر دو۔ اگر تم پکڑے گئے تو دیکھنا میں تمہیں کس طرح چھڑواتی ہوں۔“

یہ تو جذباتی باتیں تھیں جو واجدہ کر رہی تھی۔ کسی کو قتل کرنا آسان نہیں ہوتا..... دراصل کہنا یہ چاہئے کہ قتل کرنا تو بہت ہی آسان کام ہے۔ گولی مار دو، چھری یا چاقو چلا دو، دھوکے سے زہر پلا دو، کوئی اور طریقہ اختیار کر لو، دراصل مشکل کام قتل کو، ضم کرنا اور اپنے اُس جرم کو چھپائے رکھنا ہے۔ یہ اکثر ناممکن ہوتا ہے۔

جہاں تک آصف کا معاملہ تھا، اس میں ذرا سا بھی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ ہم میں خونی و دشمنی پیدا ہو گئی تھی اور اب یہ دیکھنا تھا کہ وہ مجھے قتل کرتا ہے یا میں موقع ملے ہی اس کا کام تمام کرتا ہوں۔

”رات کو آؤ گے؟“ — واجدہ نے پوچھا۔

”نہیں واجو!“ — میں نے کہا۔ ”تمہیں شاید معلوم نہیں۔ جب بٹالین باہر چلی جاتی ہے تو فیملی کو ارٹروں پر دو سنتریوں کا پہرہ ہوتا ہے جو تین تین گھنٹے بعد بدلتے ہیں اور کو ارٹروں کے آگے پیچھے گشت کرتے رہتے ہیں۔“

”پھر نہ آنا“ — واجدہ نے کہا۔ ”اللہ ملائے گا۔“



پانچویں یا چھٹے دن بریگیڈ واپس آگیا۔ اس دوران واجدہ کے ساتھ ایک اور ملاقات ہوئی۔ یہ بھی جنگلے کی ملاقات تھی۔

تین چار دن ہی گزرے تھے کہ ایک سرکاری حکم نے مجھ میں اور واجدہ میں بڑا جدائی ڈال دی۔ حکم یہ تھا کہ ہماری پلٹن فوراً ”بنوں پنچے۔ بنوں شمال مغربی سرحد صوبے کی ایک مشہور چھاؤنی ہے۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں بنوں چھاؤنی کو بہت اہمیت حاصل تھی کیونکہ یہ قبائلی علاقے میں واقع تھی۔ یہ وزیرستان کا علاقہ ہے۔

میں نے اس قبائلی علاقے کے پٹھانوں کی بملوری اور جذبہ حب الوطنی کے بہت قے قے سنے تھے۔ میرے قصبے میں دو ریٹائرڈ صوبیدار اور تین ریٹائرڈ جمدار ہوا کرتے تھے (پاک آرمی میں جمدار کو نائب صوبیدار کہتے ہیں)۔ یہ پانچوں فرنٹیر کے قبائل میں خاہ عرصہ رہے تھے اور قبائلیوں کے خلاف لڑے تھے۔ وہ قبائلیوں کی لڑائی کی باتیں سنا کرتے تھے۔

میں اپنی بٹالین کے ساتھ بنوں چھاؤنی پہنچا تو وہاں کے پہاڑ دیکھ کر خوشی سی ہوئی۔ میں کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے میرے دل میں ایک مدت سے یہ خواہش پرورش پاتی رہی ہے کہ یہ علاقے دیکھوں۔ میں نے مری کے پہاڑ دیکھے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت ہیں۔ دیودار، پھیل اور سفیدے کے درختوں سے ڈھکے ہوئے یہ سرسبز پہاڑ دیکھی دلوں کو مسرور، محمور اور تروتازہ کر دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں بنوں کے پہاڑ بلکہ وزیرستان کے پہاڑ بالکل ننگے ہیں۔ ان پر گھاس کی ایک ہری جتنی بھی نظر نہیں آتی۔ گرمیوں میں ان میں سے غیر مرنی شعلے اٹھنے لگتے ہیں، لیکن یہ مجھے مری اور کشمیر کے پہاڑوں جیسے اچھے لگے۔

آپ میری کہانی سننے کے لئے جہاں ہوں گے لیکن میں آپ کو تھوڑی سی تاریخ سنا دوں تو آپ میری کہانی کو زیادہ دلچسپ پائیں گے۔

ہماری آج کی نسل جب اپنے قبائلی علاقے کا نام سنتی ہے تو سب سے پہلی چیز جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے ہیروئن، منگٹک، اغوا برائے تاوان، غیر قانونی اسلحہ کی خرید و فروخت، فرقیہ کے قبائلی علاقے کو علاقہ غیر کہتے ہیں۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں بھی اسے علاقہ غیر ہی کہتے تھے لیکن اُس دور میں اُس کا مطلب یہ تھا کہ یہ علاقہ انگریزوں کے لئے غیر ہے اور یہ پٹھانوں کا یعنی مسلمانوں کا آزاد علاقہ ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اسے فخر سے علاقہ غیر کہا کرتے تھے۔ ان میں جذبہ حریت بیدار ہو جاتا تھا۔

آج بھی اس علاقے کو علاقہ غیر ہی کہتے ہیں مگر کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے ناپسندیدگی کا گھٹاؤ ناسا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اب علاقہ غیر کے ساتھ جذبہ نہیں جرم وابستہ ہو گیا ہے۔ پاکستان میں جو کاریں اور موٹر سائیکل چوری ہوتے ہیں، ان میں سے زیادہ تر علاقہ غیر میں چلے جاتے ہیں۔ قاتل اور ڈاکو علاقہ غیر میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ علاقہ غیر سے اب ہیروئن آتی ہے جس نے پاکستان کو اقوامِ عالم میں ذلیل و رسوا کر دیا ہے۔ علاقہ غیر سے کلاشنکوف اور ریوالور آتے ہیں۔ انگریزوں کے دور میں ہندوستان کا کوئی حریت پسند علاقہ غیر میں چلا جاتا اور اسے صرف پناہ ہی نہیں ملتی تھی بلکہ قبائلی پٹھان اُسے سر آکھوں پر بٹھاتے تھے۔ آج پاکستان کے مفزور مجرم علاقہ غیر میں جاتے ہیں اور انہیں وہاں پناہ ملتی ہے۔

یہ وہ خطہ ارض ہے جہاں سید احمد شہید اپنے مجاہدین کے لشکر کو لے گئے اور

سکھوں کے خلاف لڑے تھے۔

پٹھانوں نے اپنے خون سے حریت کی تاریخ لکھی ہے۔ قبائلی پٹھان پورے ایک سو سال انگریزوں کے خلاف لڑے اور اپنے علاقے کے ایک انچ پر انگریزوں کا قبضہ نہ ہونے دیا۔ انگریزوں نے کہیں کہیں جھوٹی بڑی فوجی پوشیں بنائی تھیں لیکن ان کے باہر انگریز کا قانون مفلوج ہو جاتا تھا اور باہر ان کے لئے موت کے سوا کچھ نہ تھا۔

قبائلی پٹھانوں نے 14 اگست 1947ء کے مقدس دن اپنی ایک سو سالہ جنگ کی فائز بندی کی۔ قائد اعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے تو انہوں نے تمام قبائلی علاقوں کی فوجی پوشیں خالی کر دی۔ وزیرستان کی آخری چھاؤنی رومک سے بھی فوج نکال لی۔ قبائلی پٹھان پاکستانی کھلانے لگے مگر قائد اعظم کے انتقال کے بعد جب پاکستان اقتدار کے پجاریوں، جاگیرداروں، وڈیروں اور کارخانہ داروں کے قبضے میں آگیا تو نہ کسی کو قبائلی پٹھان یاد رہے نہ یہ ضرورت محسوس کی کہ ان کے پسماندہ اور نظر انداز کئے ہوئے علاقے کو ترقی دینی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ قبائلی پٹھان پاکستان سے دُور ہوتے گئے اور قبائلی علاقہ لا قانونیت، ہیروئن فروشی، سنگٹنگ اور جرائم کا گڑھ بن گیا۔

○

کہنے کو بہت کچھ ہے۔ کبھی تو جی میں آتی ہے کہ اسی غیور اور حریت پسند قبائلی علاقے کی باتیں لکھتا جاؤں۔ انگریزوں نے اس علاقے میں قبائلیوں سے بہت مار کھائی ہے۔ قبائلی علاقے کی گلدھوں، گیدھوں، بھیڑیوں اور کتوں نے برٹش آرمی اور انگریزوں کی انڈین آرمی کے ہزار ہا فوجیوں کی لاشیں کھائی ہیں اور ان کی ہڈیاں سرحد کی خاک میں مل کر خاک ہو گئی ہیں۔

میں نے لاشیں کھانے والی بات ویسے ہی یا جذباتی انداز میں نہیں لکھ دی۔ یہ حقیقت ہے اور میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں دیکھے ہیں۔ قبائلیوں کی طرف سے صرف ایک گولی چلتی تھی۔ اس کے جواب میں اوہرے مشین گنوں اور رائفلوں کے منہ کھل جاتے تھے۔ آپ اپنے علاقے میں رائفل یا بندوق کی ایک گولی چلائیں تو چڑیا سے چیل تک ڈر کر اڑ جائیں گے۔ کوئی گدھ بھی نہیں ٹھہرے گا لیکن میں نے قبائلی علاقے میں دیکھا تھا کہ جو خنی دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہوتی تھی، گدھوں کے غول فضا میں مڑلانے لگتے تھے۔ ان میں چیلیں بھی ہوتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ جب گولیاں چلتی

ہیں تو کھانے کو ملتا ہے۔

لاشیں فوجیوں کی ہی ہوتی تھیں۔ پٹھان ایک گولی فائر کر کے ایک فوجی لے لیتا اور پہاڑی پر ہی اودھر اودھر ہو جاتا تھا۔ قبائلی پٹھان بہترین گوریلے اور سنا پڑتے۔ وہ فوجوں کی طرح اندھا دھند فائر نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک گولی اُس وقت چلاتے تھے جب انہیں یقین ہوتا تھا کہ گولی ضائع نہیں جائے گی۔ ان کے پاس فوج کی طرح پھونکنے کے لئے ایمونیشن نہیں ہوتا تھا۔

عموماً یوں ہوتا تھا کہ قبائلی فوجی کی لاش اٹھانے نہیں دیتے تھے۔ لاش کے قریب جو جاتا وہ منا پڑ پٹھان کی گولی کا نشانہ بن جاتا تھا۔ انگریزوں کا حکم تھا کہ اپنے ساتھی کی لاش قریب ہے اور اپنے آپ کو محفوظ رکھ کر اٹھائی جاسکتی ہے تو اٹھائی جائے ورنہ اسے اٹھانے کا خطرہ مول نہ لیا جائے۔ اس حکم سے یہ کرواج ہو گیا تھا کہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں بڑی رہنے دو۔

انگریزوں کا اپنا رواج یہ تھا کہ وہ اپنے افسر کی لاش ہر قیمت پر لے لیتے تھے۔ جھڑپ کے بعد جب فوج واپس چلی جاتی تھی تو پٹھان سب سے پہلے یہ دیکھتے تھے کہ ان کا اپنا کوئی ساتھی شہید ہو گیا ہے تو اس کی لاش اٹھا لیتے تھے۔ پھر وہ کسی فوجی کی لاش یا لاشیں ڈھونڈتے تھے۔ سپاہیوں وغیرہ کی لاشوں سے وہ رائفل، ایمونیشن اور ان کی جیبوں سے جو کچھ برآمد ہو لے لیتے تھے۔ اگر کسی انگریز افسر کی لاش ملتی تو اُسے اٹھالے جاتے تھے۔ قبائلیوں اور انگریزوں کے درمیان رابطے کے لئے پولیٹیکل ایجنٹ ہوا کرتا تھا۔ وہ قبائلیوں کے کسی ذمہ دار آدمی سے رابطہ قائم کرتا اور لاش کی واپسی کی بات چیت کرتا تھا۔ پٹھان لاش کا تالان بناتے تھے۔ کچھ سودا بازی ہوتی اور تالان طے ہو جاتا جو پٹھانوں کا کوئی سربراہ (ملک) نقد وصول کر کے لاش پولیٹیکل ایجنٹ کے حوالے کر دیتا تھا۔

پٹھان انگریز افسروں کی لاشیں جس طرح واپس کرتے تھے اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ 8 جناب رجمنٹ کا ایک انگریز افسر میرج فاکنر رومک سے تھوڑی دور مارا گیا اور اس کی لاش پٹھان لے گئے۔ دو ہزار روپے پر سودا طے ہوا۔ پٹھانوں نے لاش دے دی لیکن لاش کی حالت یہ تھی کہ پٹھانوں نے اس کا پیٹ چاک کر کے اندرونی اعضاء، شکم، انتڑیاں، معدہ، دل، جگر وغیرہ نکال کر پھینک دیئے اور پیٹ میں پتھر بھر کر پیٹ اس طرح سی دیا تھا جس طرح بوری کا منہ سیسے یا سوتلی سے سیا جاتا ہے..... یہ ذہن

میں رکھیں کہ اس وقت کا وہ چار آج کے دولاکھ کے برابر تھا۔
پنجان صرف مسلمان فوجیوں کی لاشوں کا احترام کرتے تھے۔ غیر مسلموں کی لاشوں کے ساتھ تو بہت ہی توہین آمیز سلوک کرتے تھے۔

میں پنجانوں کے جہاد کی پوری تاریخ نہیں لکھ رہا۔ میری یہ آپ بیتی یا زندگی کا سفر نامہ پڑھنے والوں میں بہت سے خواتین و حضرات مجھ سے کہیں زیادہ تعلیم اور علم والے ہوں گے۔ میں تو صرف دس جماعتیں پڑھا ہوا ہوں۔ تاریخ کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ رکھتا ہوں۔ اُس دور کی مکمل تاریخ آپ خود پڑھ لیں جب تحریک مجاہدین کے بانی سید احمد شہیدؒ نے صوبہ سرحد کو سکھوں کے خلاف میدان جنگ بنایا۔ انگریز سکھوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ہندوستان میں مقلد بادشاہی کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ سید احمد شہیدؒ کے جہاد کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اسلام کا پرچم لہراتا رہے اور ہندوستان اسلامی سلطنت ہی رہے۔

سید احمد شہیدؒ بہت سی فتوحات حاصل کر کے بالا کوٹ پہنچے تو اپنے ان چار پانچ ساتھیوں کے ساتھ جنہیں ان کا جانشین بننا تھا، شہید ہو گئے۔ پوری کی پوری ہائی کمان شہید ہو گئی۔ مجاہدین کا لشکر بدول ہو کر بکھر گیا اور تحریک مجاہدین دم توڑ گئی۔ سکھ مجاہدین کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھا چکے تھے۔ انگریزوں نے انہیں بالکل ہی ختم کر دیا اور ہندوستان پر اپنے قبضے کو مستحکم کرنے لگے۔

ہندوستان میں تو کئی واقعات ہوئے، سرحد میں یوں ہوا کہ پنجانوں نے اپنے پہاڑی علاقے کو مورچہ بنالیا۔ ہر گھر مورچہ بن گیا۔ پہلے پہلے، پچھلی صدی کے وسط میں، پنجان تلواروں اور خنجروں سے لڑے پھر ان کے پاس توڑے دار راتھلیں آگئیں جو انہوں نے فوج سے چھینی تھیں۔ راتھلیں آئیں تو راتھلیں بنانے والے کاریگر بھی آگئے۔ پھر یوں ہوا کہ فوج کے پاس 303 راتھلیں آئی تو یہ پنجانوں کے پاس بھی آگئی۔ انہیں مشین گن نہ ملی نہ انہوں نے بنانے کی کوشش کی۔

ابتداء میں پنجان ہجوم کی صورت میں لڑتے تھے۔ وہ ہلکے بولنے کے انداز سے حملہ کرتے تھے لیکن مورچہ بند فوج راتھلیں اور مشین گنوں سے ان کا بہت نقصان کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ پنجانوں نے لڑنے کے انداز بدل دیئے اور وہ گوریلا طریقہ جنگ پر آگئے۔ یہ طریقہ کامیاب رہا۔ انہوں نے چھاؤنیوں کے اندر جا کر شیخون مارے اور

نانوں سے راتھلیں اور ایمونیشن اٹھالے گئے۔ وہ فوجی کنوئیں پر بھی حملے کرتے تھے۔

○

قبائلی پنجانوں کی داستان شجاعت ایسی دلورہ انگیز اور ایمان افروز ہے کہ سناتے چلے جاؤ اور کہیں ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ انگریز جرنیلوں اور وقائع نگاروں نے ان پر کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے دشمن ہوتے ہوئے پنجانوں کی حُب الوطنی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اب اپنی کہانی پر آجاؤں۔ اسی سے آپ پر قبائلی علاقے کے اسرار و رموز معلوم ہوتے جائیں گے۔

میں قبائلی پنجانوں کے متعلق اس لئے زیادہ باتیں سنا سکتا ہوں کہ میں ان کا قیدی رہ چکا ہوں۔ یہی وہ واقعہ ہے جو میں نے آپ کو سنا ہے۔ میری بیالین بنوں پنچنی تو میں نے دیکھا کہ اتنے بڑے شہر اور اتنی بڑی چھاؤنی کے ارد گرد کم و بیش دس فٹ اونچا آہنی جنگلہ تھا جو ڈیل تھا یعنی دو جنگلے تھے۔ دونوں کے درمیان چھ سات فٹ فاصلہ تھا۔ اس میں خاردار تاروں کے کچے پھینکے ہوئے تھے۔ باہر والے جنگلے پر خاردار تاروں پر چڑھایا ہوا تھا جیسے دیوار پر نیل چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ باہر سے کوئی آدمی یہ جنگلہ چھاند کر اندر نہیں آ سکتا تھا۔

یہ حفاظتی انتظام شہر کے چاروں طرف کیا گیا تھا۔ اس میں چار یا پانچ گیٹ تھے جو جنگلہ نما چھانک تھے۔ دن کے وقت کھلے رہتے اور سورج غروب ہوتے ہی بند ہو جاتے تھے۔ ہر دروازے پر پوری پوری گارڈ پسرے پر ہوتی تھی۔

بنوں انگریزوں کی عملداری میں تھا لیکن جنگلے کے باہر انگریز کا قانون نہیں چلتا تھا۔ باہر علاقہ غیر تھا۔ بنوں کے ارد گرد اس قدر مضبوط حفاظتی انتظام کی وجہ یہ تھی کہ اس شہر میں تجارتی منڈی تھی اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ قبائلی پنجانوں نے تین چار بار اس شہر پر حملہ کیا اور منڈی سے کپڑوں کے بے شمار تھان، اناج اور ضرورت کی دیگر اشیاء اٹھالے گئے تھے۔ انہوں نے رات کو اندر آنے کا کیا طریقہ اختیار کیا اور اتنا مسلمان لے کیے گئے تھے، ایک الگ داستان ہے۔

بنوں میں ہماری بیالین کو دو مہینے ہو گئے تھے۔ ایک روز اچانک حکم ملا کہ پورا بریگیڈ تمبرتار رہا ہے۔ تمبرتار بنوں سے پندرہ سولہ میل دور ایک جگہ ہے۔ آج کل شاید یہ جگہ

قصبہ یا بڑا گاؤں بن گئی ہو۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں، اُس وقت لتبر چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔

بنوں کا بریگیڈ جس میں میری بٹالین بھی شامل تھی، لتبر پہنچ گیا اور ایک وسیع و عریض میدان میں خیمے نصب کر دیئے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں خیموں کی بستی آباد ہو گئی۔ میں پہلے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں ہوتا تھا پھر میں اُسے کمپنی میں بھیج دیا گیا تھا۔ یہ رائل انفنٹری کمپنی تھی۔

قبائلی پٹھانوں کے خلاف یہ ایک جوابی جنگی کارروائی تھی۔ ایسی جنگی کارروائیاں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ یہ پہلی جنگی کارروائی تھی جس میں میں شریک ہوا تھا۔ پٹھان بڑا زبردست وار کر گئے تھے۔ اس جگہ راجپوتانہ رائل انفنٹری ایک بٹالین کچھ عرصے کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس بٹالین نے قریبی پہاڑیوں پر پوشیں بنائی ہوئی تھیں جن میں تھوڑی تھوڑی نفری رہتی تھی۔ ایک پوسٹ کیمپ سے تقریباً چار میل دُور ایک ٹیکری پر تھی۔

اس علاقے سے پکی سڑک گزرتی تھی جو کوہاٹ کو بنوں سے ملاتی تھی۔ اس پر کوئی ٹریفک نہیں ہوتی تھی۔ یہ علاقہ غیر تھا۔ ہفتے میں دو بار اس سڑک سے فوجی کوائے گزرا کرتی تھی جس کی حفاظت کے لئے سڑک کے دائیں بائیں پہاڑوں پر فوج پھیلا دی جاتی تھی۔ باقی دن سڑک بالکل ویران اور سنسان رہتی تھی۔ یہ علاقہ دراصل میدانِ جنگ تھا۔ کوئی شہری اکیلا دیکھا سفر کر ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک روز راجپوتانہ رائل انفنٹری اس پوسٹ کی بدلی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پوسٹ میں جو جوان ڈیوٹی پر تھے، ان کا ایک ہفتہ پورا ہو گیا تھا۔ ان کی جگہ دوسرے جوان جارہے تھے۔ چار میل کا فاصلہ تو انفنٹری کے جوان پیدل طے کیا کرتے تھے لیکن جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی اور انفنٹری کو میکانائز کر دیا گیا تھا یعنی ہر بٹالین کو تھوڑے ٹرک بھی دے دیئے گئے تھے۔

راجپوتانہ رائل انفنٹری کے ان جوانوں کی نفری سترہ تھی جو پوسٹ پر جارہے تھے۔ ان میں ایک حوالدار اور دو لائسنس ٹانک اور باقی چودہ سپاہی تھے۔ یہ سب ٹرک پر جارہے تھے۔ ٹرک پر تریال نہیں تھا۔ کیمپ سے دو میل دُور گئے تو ٹرک کیمپ والوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا کیونکہ وہ پہاڑی علاقہ تھا۔ موڑ زیادہ تھے۔

تقریباً تین میل آگے گئے تو اونچی پہاڑیاں شروع ہو گئیں۔ وہاں نوے درجے کا ایک موڑ تھا۔ اس موڑ کے ساتھ ذرا آگے سڑک پر چھوٹی سی ایک چلی تھی۔ اس کے نیچے سے چھوٹا سا خشک نالہ گزرتا تھا۔ میں نے بعد میں یہ پل دیکھی تھی۔ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ جب ٹرک اس چلی کے قریب آیا تو دائیں طرف سے ایک گولی آئی جو ڈرائیور کی کھوپڑی میں سے گزر گئی۔ حوالدار اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک گولی سامنے سے اُس کی شہ رگ میں لگی اور گردن کے پیچھے سے نکل گئی۔ دونوں گولیاں قریب سے فزکی گئی تھیں۔

ڈرائیور تو فوراً ہلاک ہو گیا ہو گا چونکہ گولی اُس کے دماغ میں سے گزر گئی تھی۔ ٹرک سڑک کے بائیں طرف ہو گیا۔ آہستہ آہستہ جگہ اور ایک ٹیکری تھی۔ اس ٹیکری نے ٹرک کو روک لیا۔ ٹرک میں جو جوان بیٹھے ہوئے تھے وہ گاڑی کا رخ مڑنے اور پھر ٹیکری کے ساتھ نکلانے سے ایک دوسرے پر لڑھک گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے بہت سے پٹھان جو یقیناً ”پُلّی کے نیچے چھپے ہوئے تھے ٹرک میں کود آئے اور خنجروں سے ان جوانوں کو ختم کر دیا۔

خنجر زنی میں قبائلی پٹھان خاص مہارت رکھتے تھے۔ پٹھان عورتیں بھی اسی مہارت سے خنجر چلاتی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ آدمی کو فوراً ختم کرنے کے لئے خنجر کہاں اور کتنی بار مارا جاتا ہے۔ اس ٹرک کو گھات لگا کر روکا گیا تھا۔ پٹھانوں نے معلوم کر لیا ہو گا کہ اس پوسٹ کی نفری کی بدلی کس دن اور کس وقت ہوگی۔ وقت بڑا خطرناک تھا۔ جب ٹرک پر حملہ ہوا اُس وقت سورج غروب ہو گیا تھا۔ ایک حکم تھا کہ سورج غروب ہونے کے بعد کیمپ سے یا چھاؤنی سے کسی کی مدد کے لئے کوئی نفری نہ بھیجی جائے۔ جس پوسٹ پر یہ لوگ جارہے تھے وہ ذرا ہی آگے ایک اونچی ٹیکری پر تھی۔ دو گولیاں فائر ہونے سے پوسٹ الٹ ہو گئی تھی لیکن پوسٹ والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی بدلی کے لئے آنے والی نفری نیچے کٹ گئی ہے۔

مہان میں ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ہے کہ پٹھانوں کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ آج فلاں وقت پوسٹ کی نفری کی بدلی کے لئے جوان آرہے ہیں۔ یہ پٹھانوں کی جاسوسی کا ایک خفیہ انتظام تھا۔ کیمپ میں اور چھاؤنیوں میں بھی باہر سے پٹھان مختلف کام کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ انہیں سرکاری اصطلاح میں قلی کہا کرتے تھے۔ ان میں

کے لکھوا کر سڑک پر کیا۔ ڈرائیور اور خالدار کی لاشوں کو ٹرک میں ڈالا۔ ٹرک کو شارٹ کیا تو وہ شارٹ ہو گیا۔ اس طرح لاشوں سے بھرا ہوا ٹرک کیمپ میں لے آئے اور کمپنیاں واپس آ گئیں۔

یہ جو دو سپاہی زندہ بچ رہے تھے، انہوں نے حملے کا پورا واقعہ سنایا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ حملہ آور پٹھانوں میں عورتیں بھی تھیں۔ انہوں نے ان عورتوں کو دیکھا تو نہیں تھا، ان کی آوازیں سنی تھیں۔ قبائلی علاقے میں ایسے ہی کئی اور واقعات ہوئے تھے جن میں پٹھان عورتیں بھی شامل تھیں۔

اس علاقے میں پٹھانوں نے ایک اور پوسٹ پر شب خون مارا تھا۔ وہ کوئی اسلحہ بارود تو نہیں لے جاسکے تھے لیکن جانی نقصان کر گئے تھے۔

جب کسی علاقے میں اس قسم کے دو تین واقعات ہو جاتے تھے تو انگریز اس علاقے پر فوج کشی کرتے تھے جسے PUNITIVE EXPEDITION یعنی تعزیری مہم کہا جاتا تھا۔ یہ ایک بڑی ظالمانہ کارروائی ہوتی تھی۔ فوج کو سارے علاقے میں پھیلا دیا جاتا اور جو گاؤں راستے میں آتا اسے تباہ کر دیا جاتا تھا۔ پٹھانوں کو پہلے پتہ چل جاتا تھا اس لئے وہ گاؤں خالی کر جاتے تھے۔ ان کے گھروں میں کوئی فرنیچر اور زیادہ مال اسباب تو ہوتا نہیں تھا۔ ان کے بیوی بچے ہوتے تھے یا مویشی اور بکریاں۔ انہیں ساتھ لے کر وہ ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔ وہ فوج کے سامنے جارہے ہوتے تھے لیکن حکم یہ تھا کہ کسی بوڑھے اور بچے کو اور کسی عورت کو گرفتار نہیں کرنا۔ انہیں کسی بھی طریقے سے تنگ کرنا ہے۔ انگریز جانتے تھے کہ ایک پٹھان عورت پر ہاتھ اٹھایا گیا تو پٹھان ایک پوری چھاؤنی پر حملہ کر کے انتقام لیں گے۔ فوج کے لئے حکم تھا کہ کسی گاؤں کو سلامت نہ رہنے دیا جائے۔ آج کل کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کے گاؤں کیسے ہیں، میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں، اس وقت وہاں کوئی بڑا گاؤں نہیں ہوتا تھا۔ چند ایک مکان ایک جگہ ہوتے اور اس سے خاصے فاصلے پر دو تین اور مکان نظر آ جاتے تھے۔ یہ سب مکان پتھروں اور گارے کے بنے ہوتے تھے۔ انہیں گرا دیا جاتا تھا اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ ان پتھروں کے گولے فائر کئے جاتے تھے۔

یہ ایک بزدلانہ کارروائی ہوتی تھی۔ دیت نام میں امریکہ ایسی ہی انتقامی اور تعزیری کارروائیاں کیا کرتا تھا۔ ذرا سے شک پر پورے کے پورے گاؤں کو نذر آتش کر دیا جاتا

بعض قبائلی ہوتے تھے جو بڑی خوبی سے فوج کی نقل و حرکت کی جاسوسی کرتے تھے۔ قبائلیوں کی جاسوسی کا دو سرا ذریعہ فوج کے مسلمان جوان تھے۔ مسلمان سپاہی سے لے کر مسلمان صوبیدار تک قبائلی پٹھانوں کے حامی تھے۔ جب کبھی بریگیڈ نے یا کسی یونٹ نے باہر جانا ہوتا تھا تو مسلمان ہی قبیلوں کو یہ خبر دے دیا کرتے تھے۔ ایسے بھی ہوتا تھا کہ کہیں قبائلیوں کے ساتھ آنے سامنے فائرنگ ہوتی تھی تو مسلمان فوجی اپنی رائفلوں اور مشین گنوں کی ٹالیاں ذرا سی اونچی رکھتے تھے تاکہ گولیاں پٹھانوں کے اوپر سے گزر جائیں۔ اُس زمانے میں فوجی پگڑیاں باندھتے تھے جو خاکی رنگ کی ہوتی تھیں۔ مسلمانوں کی نشانی یہ تھی کہ ان کی پگڑیوں کے شملے ہوتے تھے۔ قبائلی پٹھان شملے والی پگڑی پر کبھی فائر نہیں کرتے تھے لیکن انگریز بڑی چالاک قوم تھی۔ وہ مسلمانوں کو بعض خاص قسم کی صورت حال میں بندوؤں اور سکھوں کے ساتھ ملا دیتے تھے۔ اس طرح بعض اوقات مسلمان بھی پٹھانوں کی گولیوں سے مارے جاتے تھے۔



میں اُس ٹرک کی بات کر رہا تھا جس پر حملہ ہوا تھا۔ سترہ جوانوں میں سے صرف دو زندہ رہے۔ وہ بھی اُس طرح کہ وہ اپنے ساتھیوں کے نیچے آ گئے تھے۔ اندھیرا بھی ہو گیا تھا۔ پٹھان جلدی میں بھی تھے۔ انہوں نے تمام رائفلیں، ایمونیشن اکٹھا کیا۔ سب کی پگڑیاں اتار کر اکٹھی کر لیں اور جو ہاتھ لگا لے گئے۔ اُن کی زیادہ تر دلچسپی رائفلوں اور ایمونیشن کے ساتھ تھی۔ ایک تو وہ ایمونیشن تھا جو ہر جوان کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ ایمونیشن کے چار پانچ بکس بھرے ہوئے تھے۔

یہ جو دو سپاہی زندہ رہ گئے تھے، ان میں ایک زخمی تھا۔ اُس کے کندھے پر خنجر لگا تھا اور دوسرا بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ پٹھان چلے گئے ہیں اور ہر طرف خاموشی ہو گئی ہے تو وہ وہاں سے نکلے اور ڈرتے کانپتے چل پڑے۔ آخر وہ کیمپ میں پہنچ گئے اور اطلاع دی کہ ساری نفری ماری گئی ہے۔

حکم یہ تھا کہ رات کو کوئی کیمپ سے باہر نہ نکلے لیکن اس بیان کا انگریز کمانڈنگ آفیسر کوئی بڑا ہی دلیر آدمی تھا۔ اُس نے دو رائفل کمپنیاں لیں اور خود ان کے ساتھ گیا۔ یہ ساری فورس پیدل گئی تھی۔ کمانڈنگ آفیسر نے دونوں کمپنیوں کو ہر طرف ارد گرد پھاڑوں پر پھیلا دیا اور اپنے ساتھ ضرورت کے مطابق نفری رکھی جس سے اُس نے ٹرک

میری کہنی کو ایک پہاڑی کی چوٹی پر پکٹ بنانے کا حکم ملا۔ پکٹ ایک قسم کا مورچہ ہوتا ہے۔ فوراً پھر اکٹھے کر کے ایک گول دیوار کھڑی کر دی گئی۔ اس میں دو سیکشنز نے رہنا تھا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہم چوبیس جوان تھے اور ایک حوالدار ہارلمیڈر تھا۔ دیوار کو ہم نے پھر رکھ رکھ کر کم و بیش پانچ فٹ اونچا کر لیا۔ ہمارے ساتھ دو فخریں بھی تھیں جن پر ایمونیشن کے بکس لدے ہوئے تھے۔ بکس اتار کر فخریوں کو ہی پکٹ کے اندر کر لیا۔ ہمارے ساتھ سنگل پلاٹون کے دو جوان بھی تھے۔ اس وقت منڈی اور آئینے سے پیغام بھیجے جاتے تھے۔

پہاڑی لڑائی میں، خصوصاً قبائلیوں کے ساتھ لڑائی میں پہاڑیوں پر اس قسم کی پٹیں بنائی جاتی تھیں۔ ان سے نیچے دُور دُور علاقہ نظر آتا تھا۔

دن گزر گیا۔ بریگیڈ پہاڑیوں سے نکلا اور دامن میں ایک وسیع میدان میں رک لیا۔ رات کو بغیر خیموں کے وہیں قیام کرنا تھا۔ اسی لئے پہاڑیوں میں ہماری پکٹ جیسی ان چار اور پکٹیں بنائی گئی تھیں۔ یہ پکٹ کی حفاظت کا انتظام تھا۔

رات خیریت سے گزر گئی۔ دوسرے دن پھر بریگیڈ پہاڑیوں کے اندرونی علاقے کا گلیا گیا اور شام کو واپس ہوا۔ اُس روز بھی توپ خانے کی گولہ باری ہوئی تھی۔ وٹے ہتھیاروں کی بھی فائرنگ ہوئی تھی۔ ہم پکٹ میں رہے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں لگا کہ یہ گولہ باری یا فائرنگ کہاں ہوئی اور کیوں ہوئی تھی۔ ہماری پکٹ کی ذمہ داری اُن علاقے میں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہم الٹ رہے۔

شام کو بریگیڈ پھر یکپ والی جگہ آگیا۔ ہمیں خچر کے ذریعے کھانا اوپر بھیجا جاتا تھا۔ اُن کے کھانے کے ساتھ ہمارے حوالدار کے لئے یہ پیغام آیا کہ علی الصبح بریگیڈ واپس آئے گا اور ہم پکٹ اُس وقت چھوڑیں گے جب بریگیڈ کم از کم ایک میل دُور نکل گیا گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پہاڑیوں پر جو چار پانچ پکٹیں تھیں، یہ بریگیڈ کے زیرِ نگرانی رکھیں گے۔

یہ ذہن میں رکھیں کہ پہاڑی کے دامن سے ریگستان شروع ہو جاتا تھا جو کم و بیش میل چوڑا اور اُس سے کچھ زیادہ لمبا تھا اور یہ سڑک تک جاتا تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں گلیاں تھیں۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ مری اور کشمیر جیسے سرسبز پہاڑ نہیں تھے درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل ننگے، پتھریلی زمین جیسے پہاڑ تھے جن پر گھاس

تھا۔ عورتوں اور بچوں کو پیام بموں سے جلا دیا گیا تھا۔ زہریلی گیس تک استعمال کی گئی تھی۔ آخر امریکہ کو شکست کھا کر وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔ انگریزوں نے بوڑھوں، عورتوں اور بچوں پر تو ہاتھ نہیں اٹھایا تھا لیکن ان کے گھر تباہ کر دینا ان کے فصل روند ڈالنا کچھ کم ظلم نہیں تھا۔

یہ تعزیری کارروائی دو مہینے اور کبھی تین مہینے جاری رہتی تھی۔ پورا بریگیڈ باہر نکل جاتا اور خانہ بدوشوں کی طرح آج یہاں کل وہاں کیمپ لگاتا سارے علاقے میں گھوم پھر جاتا تھا جس طرح سر میں سنگھی پھیری جاتی ہے لیکن لڑنے والا کوئی ایک بھی پٹھان فوج کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔

لڑنے والے قبائلی یعنی جوان اور اوجیز عمر، اس کارروائی کے دوران پہاڑیوں کے اندر چلے جاتے تھے لیکن وہ روپوش ہونے کے لئے نہیں جاتے تھے بلکہ لڑنے کے لئے جاتے تھے۔ فوج ان ہی پہاڑیوں کے اندر جاتی تھی۔ پٹھان ان پہاڑیوں پر موجود ہوتے تھے لیکن دُکے رہتے اور جب فوج پہاڑیوں کی خاک چھان کر واپس ہوتی تھی تو پٹھان فوج کے پچھلے حصے (ریئر گارڈ) پر فائرنگ شروع کر دیتے تھے۔

میں اپنا واقعہ سنا ہوں۔

○

راچونانہ راتقلز کے ٹرک پر پٹھانوں نے حملہ کر کے اتنے زیادہ جوانوں کو مار ڈالا اور تمام راتقلز اور ایمونیشن لے گئے تو بنوں کے بریگیڈ کو اس علاقے میں تعزیری کارروائی کا حکم ملا۔ میری بٹالین بھی اس میں شامل تھی۔ کارروائی آدھی رات کے وقت شروع کی گئی۔ ستمبر سے بنوں کی طرف جاؤ تو دائیں طرف بہت دور تک ریگستانی میدان پھیلا ہوا ہے اور جہاں یہ میدان ختم ہوتا ہے وہاں سے پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں۔

رات کو ہم اس میدان سے گزرے۔ ابھی صبح طلوع نہیں ہوئی تھی کہ ہم پہاڑی علاقے میں پہنچ گئے تھے اور ایک پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ صبح کی روشنی پھوٹی تو ہم پہاڑی کے اوپر تھے۔ میں یہ تفصیلات سن کر بات کو لمبا نہیں کرنا چاہتا کہ تعزیری کارروائی کس طرح کی گئی اور قبائلیوں نے بھی کچھ کیا تھا یا نہیں۔ میں اتنا ہی بتانا کافی سمجھتا ہوں کہ بریگیڈ ان پہاڑوں میں دور تک پھیل گیا۔ اُس روز تو پٹھانوں نے بھی پہاڑیوں پر گولہ باری کی تھی۔ دُور کہیں راتقلز اور مشین گنوں کی بھی فائرنگ ہوتی رہی تھی۔

کی ایک ہری پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ بہت بڑا خطرہ تھا۔

○

صبح ہوئی اور بریگیڈ واپس چل پڑا۔ جہاں بریگیڈ نے کیمپ کیا تھا وہ جگہ ذرا اونچی تھی۔ بریگیڈ ابھی نصف میل ہی گیا ہو گا کہ کم و بیش بیس پٹھان دوڑتے آئے اور کیمپ کی خالی جگہ بکھر کر جہاں آؤ ملی وہاں پوزیشن لے لی اور بریگیڈ پر فائرنگ شروع کر دی۔ بریگیڈ کسی ترتیب میں نہیں جا رہا تھا۔ تقریباً ایک میل دائیں بائیں ہر اونٹ بندہ بندہ ہو کر بھری ہوئی تھی۔ اس علاقے اور ایسی صورت حال میں اسی طرح بے ترتیب ہو کر ایک دوسرے سے دور دوڑ پیچھے آتے تھے۔ اگر اکٹھے (کلوز فامیشن) میں پیچھے آتے تو بغیر شہت لے گولی فائر کرتے تو کسی نہ کسی فوجی کو لگ جاتی۔

وہ پٹھان ہماری پکٹ سے بہت دور اور پیچھے تھے۔ ہماری رائفلوں اور لائٹ مشین گنوں کی گولیاں وہاں تک پہنچ سکتی تھیں لیکن پٹھان پوزیشنیں بدل کر فائر کرتے تھے۔ بریگیڈ کے عقب کو محفوظ رکھنا ہماری ڈیوٹی تھی لیکن پٹھان بریگیڈ کے تعاقب میں رہے تھے اس لئے ہماری ارجح سے نکل گئے تھے۔ ہمارے لئے یہ حکم تھا کہ جب بریگیڈ خاصا آگے نکل جائے تو ہم پکٹ سے آئیں اور بریگیڈ سے مل جائیں۔ ہمارے حوالدار نے ہمیں حکم دیا کہ پکٹ سے نکلو۔ ”یہ سوچ لو جو انو!“ اُس نے کہا۔ ”راستے میں پٹھان ہیں۔ آج ان کے ساتھ دو بدو مقابلہ ہو گا۔“

”نہیں استاد!“ میرے یکشن کمانڈر نانک نے کہا۔ ”وہ ہمیں پہچان لے گئے۔ ہم ان پر گولی نہیں چلائیں گے۔“

نانک کی بات ابھی مکمل ہوئی تھی کہ ہمارے ایک ساتھی کے منہ سے بڑی بے آواز نکلی۔ ”ہا..... ہا“۔ ہم نے اُدھر دیکھا۔ ہمارا ایک سپاہی جو ضلع جہلم کی کسی گاؤں کا رہنے والا تھا، پکٹ کی دیوار سے ایک دو قدم پیچھے ہٹا اور چکر اکر گرل کے ماتھے سے جیشے کی طرح خون پھوٹ رہا تھا۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اسے گولی ہے۔ گولی سر کے پیچھے سے نکلی تھی۔ وہاں سے خون اُبل اُبل کر نکل رہا تھا۔ گولی میں جدھر سے نکلتی ہے اُدھر زخم چوڑا ہوتا ہے۔

وہ مر چکا تھا۔

ہمارے جوان رائفلیں دیوار پر رکھ کر فائر کرتے تھے۔ اب ہم فائر نہیں کر رہے تھے۔ اس سپاہی کے گرتے ہی سب نے سر پیچے کر لئے اور اس کے ساتھ ہی ہم پر دو لولیاں اور فائر ہوئیں..... ہم گھبرے میں آگئے تھے۔ یہ پٹھانوں کی ایک خاص چال تھی۔ وہ اپریشن ختم ہونے کے بعد اُس وقت کسی ایک پکٹ کو گھیرے میں لے لیا کرتے تھے جب فوج واپس جا رہی ہوتی تھی اور پکٹیں چھوڑ کر پیچھے آنے کا حکم ملتا تھا۔ لیکن اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے تھے کہ پکٹ کو اب کہیں سے مدد نہیں مل سکے گی۔

پکٹ والے اپنے دفاع کے لئے پکٹ ایسی چوٹی پر بناتے تھے جہاں ہر طرف حلالن ہوتی تھی۔ حملہ آوروں کو پکٹ تک آنے میں بہت مشکل پیش آتی تھی۔ باری پکٹ ایسی جگہ تھی جہاں دو طرف ڈھلان نہیں تھی۔ پٹھان ان دونوں اطراف سے قریب آ رہے تھے۔ اُن کے لئے آڑ بڑی اچھی تھی۔

”بھائیو!“ ہمارے حوالدار نے بلند آواز سے کہا۔ ”ہم سب مسلمان ہیں۔ تم تم پر فائر نہیں کریں گے۔“

”تم کافر ہے۔“ اُدھر سے اعلان ہوا۔ ”تم نے ہمارا بھائی پر فیر کیا۔ ہم تم کو نہیں جانے دے گا۔“

”ہم نے تمہارا نقصان نہیں کیا۔“ حوالدار نے کہا۔ ”ہم نے تمہارے ماتھیوں پر سیدھا فائر نہیں کیا تھا۔“

”تم زلف اور ایمونیشن اُدھر چھوڑو اور جاؤ۔“ پٹھان نے اعلان کیا۔ ”ہم تم کو کچھ نہیں بولے گا۔“

اُس روز پٹھانوں کا موڈ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے شاید صرف اُس دن کے لئے یہ اصول توڑ دیا تھا کہ مسلمان فوجیوں پر گولی نہیں چلائی۔ ان کے گھر گرا دیئے گئے تھے۔ ہمارا بریگیڈ یا اپنی بٹالین کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایسی صورت میں حکم یہ ہوتا تھا کہ ہتھیار اور ایمونیشن اٹھاؤ اور پکٹ سے بھاگو۔

حوالدار نے دیکھنے کی کوشش کی کہ محاصرہ ہر طرف ہے یا کوئی طرف خالی ہے۔ ایک طرف پٹھان زیادہ تھے۔ حوالدار نے ایک گریڈنگ نکالا اور ہمیں کہا کہ جو نمی گریڈنگ پیچھے تین چار جوان اس طرف نکل جاؤ اور پہاڑی سے اُتر جاؤ..... یہ کہہ کر اُس نے

گریڈ کی پن نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔ بڑے زور کا دھماکہ ہوا۔

میں تین جوانوں کے ساتھ پکٹ سے نکلا۔ میں آگے تھا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ میرے ساتھ نکلنے والے جوان کس طرف نکل گئے۔ میں ایک طرف ڈھلان دیکھ کر کوڑتا پھلا نکلتا تھا۔ دل اور دماغ پر یہ خوف سوار تھا کہ ابھی کسی پٹھان کی گولی آئے گی اور میں مارا جاؤں گا۔ اس خوف کی وجہ سے اور پہاڑی کی ساخت کی وجہ سے میں پہاڑی کی پچھلی طرف چلا گیا۔ ایک جگہ پاؤں پھسلا اور لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ بڑی مشکل سے سنبھلا۔ معمولی چوٹیں آئیں تھیں۔

پہاڑی خاصی اونچی تھی۔ میں اترتا چلا گیا، اور نیچے جا پہنچا۔ ادھر ادھر دیکھا تو میرے دل پر ہول طاری ہو گیا۔ میرے سامنے پتھر ملی ٹیکریاں اور گہرے سلیٹی رنگ کی ٹوگی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وحشت تھی اور ہیبت تھی۔ اگر کوئی پرندہ نظر آجاتا تو میں کہتا کہ میرے علاوہ یہاں کوئی جاندار بھی موجود ہے۔ وہاں تو زندگی کے کوئی آثار ہی نہیں تھے۔ وہ تو جوتوں اور بھوتوں کا دیس لگتا تھا۔ کبھی ایسا خوفناک سا احساس ہوتا کہ میں ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔

میرا رشتہ میری دنیا سے کٹ گیا تھا۔

یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں اس اتنی اونچی پہاڑی سے اُترا کس طرح ہوں۔ سمت کا تو کچھ خیال رہا ہی نہیں تھا۔ پہاڑی کے اُس طرف یہ ہنگامہ کہ بریگیڈ واپس جا رہا تھا اور پٹھان اُس کے تعاقب میں تھے، اور پہاڑی کے اِس طرف بھیانک سناٹا تھا۔

○

میں ایک طرف چل پڑا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ میں موت کی طرف جا رہا تھا یا زندگی کی طرف۔ میرے پاس رائفل تھی، ستر رائنڈ ایمونیشن پوچوں میں ڈالا ہوا تھا۔ پٹھانوں کی دلچسپی ان ہی دو چیزوں کے ساتھ تھی جو میں اُن کے حوالے کر کے اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن یہ کئی بات نہیں تھی کہ انہوں نے مجھے چھوڑ ہی دینا تھا۔ فوجی کبھی کبھی اُن کے ہاتھ آتا تھا۔ میں نے ان قبائلی پٹھانوں کے متعلق بڑی خوفناک باتیں سن رکھی تھیں۔ اگر کوئی ہندو یا سکھ فوجی ان کے ہاتھ چڑھ جاتا تو اسے وہ زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک بات مشہور تھی کہ قبائلی پٹھان کسی ہندو یا سکھ فوجی کو پکڑ لیتے ہیں تو ایک جشن مناتے ہیں۔ روایت کے مطابق یہ بات اس طرح بیان کی جاتی تھی کہ تمام قبیلہ اکٹھا ہو جاتا

ہے۔ قیدی کو درمیان میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ ایک طرف آگ پر چھوٹا توڑ کھا ہوتا ہے جو لال سرخ ہو جاتا ہے۔ ایک آدمی اس توڑے کو ٹکڑیوں سے تھام کر اٹھالیتا ہے۔ ادھر ایک پٹھان پیچھے سے قیدی کی گردن پر ایسی مہارت سے تلوار چلاتا ہے کہ سر جسم سے الگ ہو جاتا ہے۔ توڑے والا آدمی فوراً "تو اکئی ہوئی گردن پر رکھ دیتا ہے۔ اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ سر کئی لاش گرتی نہیں بلکہ ناچنے لگتی ہے۔ اگر گر پڑے تو بھی اس طرح تڑپتی ہے جیسے کھڑکی کو نچایا جا رہا ہو۔ اس دوران پٹھان اس کے ارد گرد ڈھول کی تھاپ پر ناچتے ہیں۔

یہ مجھے ان قبائلیوں میں جا کر معلوم ہوا تھا کہ یہ بات من گھڑت ہے لیکن دو تین پٹھانوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ایسا کرتے ہیں۔ یہ بات جو میں نے آپ کو سنائی ہے، صحیح تھی یا غلط، یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ غیر مسلم فوجی کے ساتھ بہت برا سلوک کرتے تھے۔ میں مسلمان تھا۔ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مسلمان کے ساتھ ان کا سلوک ویسا ہی ہوتا تھا جیسا دو مسلمان بھائیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اُس دن ان قبائلیوں کا مؤڈ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ جب ہماری پکٹ کو اُنہوں نے گہرے میں لیا تو ہمارے حوالدار نے بلند آواز میں کہا تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ ایک پٹھان نے جواب دیا تھا کہ تم کافر ہو، تم نے ہمارے آدمیوں پر فائر کیا ہے۔ اس پٹھان کی اسی بات نے میرے اندر خوف پیدا کر دیا تھا کہ انہوں نے اگر مجھے پکڑ لیا تو میرے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو یہ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ میں جاؤں کہاں۔ چھپنے کے لئے تو وہ علاقہ بہت ہی موزوں تھا۔ میں کہیں بھی بیٹھ جاتا تو خدا کے سوا مجھے کوئی بھی نہ دیکھ سکتا لیکن کب تک وہاں بیٹھا رہتا؟ زندہ کیسے رہتا۔ وہ علاقہ ایسا تھا جہاں سے کبھی کوئی انسان نہیں گزرا ہو گا۔ دوسرا خطرہ سانپوں اور بھوؤں کا تھا۔ یہ میں جانتا تھا کہ صحرا اور پتھریلے علاقے کے سانپ اور بھوؤں اتنے زہریلے ہوتے ہیں کہ دس لیں تو چند منٹوں میں آدمی مر جاتا ہے۔ مجھے قریب ہی توپوں کے گولے پھٹنے کے دھماکے سنائی دیئے۔ ان نکلے اور خشک پہاڑوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ایک گولی فائر ہوتی یا ڈور سے توپ کا فائر کیا ہو گا تو پہاڑوں کے اندر پھٹتا تو اُس کی گونج وادیوں کے اندر کچھ دیر تک گھومتی رہتی تھی۔ یہ گونج بڑی ہی ڈراؤنی ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے توپ کا گولہ پہاڑوں کے درمیان اُڑتا پھرا رہا ہے اور اسے جو بھی آدمی نظر آئے گا اس کے جسم کے پرچے اُڑا دے گا۔ ہرے

بھرے اور درختوں والے پہاڑوں میں ایسا نہیں ہوتا۔

میں نے دھماکے سے جو اوپر تھے اور قریب ہی تھے۔ میں جان گیا کہ ہماری پکٹ ملاپ اپنی بٹالین یا بریگیڈ سے ہو گیا ہے اور انہیں پکٹ سے نکالنے کے لئے پکٹِ ارد گرد گولے فائر کئے جا رہے ہیں۔ اُس طرف اب کچھ بھی ہوتا، وہ میرے کام نہیں آسکتا تھا۔ میں اب اُن تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ایک ہی ذریعہ تھا کہ میں پھر اُس پہاڑی چڑھ جاتا، دوسری طرف اتر جاتا اور چھتا چھتا آدھر کو بھاگ اٹھتا جہر بریگیڈ گیا تھا۔ یہ نے یوں کرنے کا ارادہ کیا بھی لیکن اس خیال سے یہ ارادہ دل سے نکال دیا کہ اوپر مجھے پٹھان دیکھ سکتے ہیں جنہوں نے ہماری پکٹ کو گھیرے میں لیا تھا۔ انہوں نے تو بڑے چھوڑنا ہی نہیں تھا کیونکہ توپوں کی گولہ باری سے ان کا جانی نقصان ہوا ہو گا۔ انہوں۔ تو مجھے دیکھتے ہی گولی مار دینی تھی یا اٹھا کر پہاڑی سے نیچے پھینک دیتا تھا۔ میں جانتا تھا پٹھان خون کا بدلہ خون سے لینا اپنا فرض سمجھتا ہے اور جب تک وہ بدلہ نہیں لے لے اپنے آپ کو بے غیرت سمجھتا رہتا ہے۔

خوف اور دہشت نے میری جسمانی اور روحانی توانائی بہت ہی کمزور کر دی تھی اس کے ساتھ ہی پیاس نے مجھے بے حال کرنا شروع کر دیا۔ میں منہ بند کرتا تھا تو وہ میں کانٹے چُسنے کا احساس ہوتا تھا۔ میں جوان آدمی تھا، برداشت کرتا رہا اور آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ میں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ میں بڑی تیزی سے بے جان ہوتا جا ہوں اور میری سوچنے کی صلاحیت بھی کمزور ہو رہی ہے۔ اگر ان پہاڑوں پر گھما جھاڑیاں اور درخت ہوتے تو اس ہریالی کا بڑا اچھا اثر ہوتا اور اگر پانی نہ ملتا تو میں پتے سے شبنم کے قطرے چوس لیتا لیکن وہ پہاڑ ایسے تھے جن پر خدا کا قہر برس رہا تھا۔ سر پر آگیا تھا۔ اس کی گرمی تو تھی ہی، دوسری تپش خشک چٹانوں کی تھی جو دھوپ تپنے لگی تھیں۔

میں ایک چٹان سے دائیں طرف مُڑ گیا۔ ادھر بھی ایسی ہی چٹانیں تھیں۔ جہاں سے ان چٹانوں نے رستہ دیا، میں ادھر مُڑتا گیا اور پھر میں ایک جگہ رک گیا۔ مجھے بھیانک خیال آیا کہ میں اتنا زیادہ مُڑ مُڑ کر کہیں اُسی جگہ ہی تو نہیں پہنچ گیا جہاں سے تھا؟ لیکن میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ کچھ سوچ کر میں ایک چٹان کے اوپر گیا اور ہر طرف دیکھا۔ ایک طرف تو وہ پہاڑ کھڑا تھا جس پر میری پکٹ تھی اور اس

دائیں میں چٹانوں کا ایک سلسلہ تھا۔ میں نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف جانا چاہئے۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ کچھ کچھ پتہ چلتا تھا کہ میں چٹانوں کی ان دہشتناک بھول بھلیوں سے نکل جاؤں تو آگے میدانِ علاقہ مل جائے گا یا وہاں چھوٹی بڑی ٹیکریاں ہوں گی اور شاید وہاں پانی بھی مل جائے گا جو بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ اس طرف ڈیڑھ دو میل دور ایک اور پہاڑ تھا۔

میں اس چٹان سے اُتر۔ یہ دراصل سلوں والی چٹانیں تھیں۔ سنبھل کر پاؤں رکھنا پڑتا تھا۔ ایک جگہ میرا پاؤں ٹھیک نہ پڑا۔ ایسا پھسلا کہ میں قلابازیاں کھاتا نیچے آ پڑا۔ راتقل ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں گر کر اٹھ رہا تھا تو راتقل میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی جو میں دیکھ اور سمجھ نہ سکا۔ اس کے گرنے کی آوازوں سے میں بدک گیا کہ مجھے پکڑنے کے لئے قبائلی دوڑے آرہے ہیں۔ اتنے میں راتقل میرے قدموں میں آگری اور میں نے اٹھالی۔

میرا سر جھکانے لگا۔ ایک بار تو یوں محسوس ہوا جیسے خوفناک پہاڑوں اور دہشتناک چٹانوں کی یہ دنیا میرے ارد گرد ایک دائرے میں گھوم رہی ہو۔ میں بیٹھ گیا۔ اُس وقت صرف ایک خواہش اور ضرورت دل میں رہ گئی تھی کہ پانی کے دو گھونٹ مل جائیں۔ مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں بے ہوش ہو گیا تھا یا آنکھ لگ گئی تھی۔ اتنا یاد ہے کہ وہاں کچھ وقت گزر گیا تھا اور میں اپنے آپ میں ہی کہیں گم ہو گیا تھا۔

میں اُٹھنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میں تندرست جوانوں کی طرح نہیں اُٹھ سکوں گا۔ میں راتقل کے سہارے اٹھا اور ارد گرد دیکھا۔ سامنے بڑے پہاڑ کی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ یوں نظر آیا جیسے پہاڑ آہستہ آہستہ بھجول رہا ہو۔ پھر ان چٹانوں کو دیکھا جن کے درمیان میں کھڑا تھا۔ یوں لگا جیسے آگے اور پیچھے والی چٹانیں میری طرف بڑھ رہی ہوں اور یہ مجھے چلنے کے دو پاؤں کے درمیان آتے ہوئے دانے کی طرح پیس ڈالیں گی۔ میرے منہ سے اپنے آپ ہی چیخ نکل گئی۔

”اللہ..... یا اللہ!“ — میں نے راتقل پھینک کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے بلند آواز سے کہا — ”تیری ذات باری ہر چیز پر قادر ہے۔ تو نے حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ سے نکالا تھا، اپنے اس گناہگار بندے کو ان خوفناک چٹانوں کے پیٹ سے نکال دے۔“

مجھے دھچکا سالگ۔ صاف طور پر محسوس ہوا کہ کسی نظر نہ آنے والی طاقت نے مجھے دھکا دیا ہے۔ مجھے خیال آگیا کہ یوں تو پیغمبر تھے اور میں گناہگار انسان ہوں۔ میں اس طرح بیٹھ گیا جیسے مجھ میں پاؤں پر کھڑا رہنے کی طاقت نہ رہی ہو۔ یہ شاید میرے دماغ کی خرابی تھی یا میرے تصوروں کا سلسلہ اُٹ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ میں وردی میں نہیں بلکہ اُن عام سے کپڑوں میں تھا جو میں گھر پہنا کرتا تھا۔ یہ میری شبیہ تھی جو تین چار سیکنڈ میرے سامنے رہی اور غائب ہو گئی۔ میں نے اپنے سر کو زور زور سے دائیں بائیں جھٹکا۔ میں نفسیات اور ڈاکٹری کے علوم سے بالکل ہی واقف نہیں تھا۔ اپنی شبیہ دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ خدا نے مجھے میرا اصلی روپ دکھایا ہے اور شاید یہ اشارہ دیا ہے کہ مجھے میرے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔

یہ تو انسان کی سرشت ہے کہ اُس پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو وہ گناہوں سے توبہ کرتا اور خدا کو یاد کرتا ہے اور جب اسے خدا مال و دولت اور تندرستی جیسی نعمت عطا کرتا ہے تو وہ سب سے پہلے خدا کو دل سے نکالتا اور اپنے آپ کو اور سب کو یہ تاثر دیتا ہے کہ مجھ سا اور کوئی نہیں۔

مجھے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ سب سے پہلے واجدہ یاد آئی۔ اُس کے باپ نے اُسے میرے حوالے کیا تھا کہ میں اُسے تعلیم دوں لیکن میرا اس کے ساتھ عشق بازی کا ذرا امہ چل پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ محبت کا اظہار اُس نے کیا تھا لیکن میں اُس کا استاد تھا۔ یہ میرا فرض تھا کہ اسے ان فضول باتوں سے روک دیتا اور اُسے کتنا کہ پہلے اپنے خیالوں کو تعلیم سے آراستہ کرو اس کے بعد سوچنا کہ تمہیں کون اچھا اور کون بُرا لگتا ہے مگر میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور خود بھی اُس کے ساتھ اُس راستے پر چل پڑا۔

پھر مجھے وہ رات یاد آئی جب میں اس کے گھر اُسے اُس کے خاوند کی غیر حاضری میں ملنے گیا تھا۔ یہ ایک کبیرہ گناہ تھا کہ میں اُس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول رہا تھا۔ میں عملی طور پر اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ بے وفائی کرے اور میری ہو کے رہے۔ پھر میں نے واجدہ کی اتنی زیادہ حوصلہ افزائی کی کہ اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ موقع ملے تو آصف کو قتل کر دو۔ میں نے اُسے کہا کہ میں آصف کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

پھر مجھے عائشہ یاد آئی۔ میرے جسم نے بڑی زور سے جھرجھری لی۔ وہ ہمارے

مزارعوں کی بیٹی تھی، غریب تھی اور اُس نے میری ذات میں پناہ لی تھی لیکن میں نے اُس کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھایا اور اُسے عیش و لذت کا ذریعہ بنا لیا اور پھر اُس نے اپنے سرال اور اپنے ماں باپ کے ساتھ اتنا بڑا فراڈ کھیلا کہ فراڈیہ پیروں تک نے اسے سچ مان لیا۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس سے بڑا گناہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

”اللہ..... یا اللہ!“ — میں نے انتہائی بلند آواز میں منہ آسمان کی طرف کر کے کہا — ”میری توبہ..... میرے یہ گناہ بخش دے پھر میں باقی عمر تیری عبادت اور تیرے دین اسلام کی تبلیغ میں گزاروں گا۔“

میں نے کچھ سکون سا محسوس کیا اور یہ بھی کہ میری توانائی واپس آ رہی ہے۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ پانی کی بوتل تو میرے جسم کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ میں نے بڑی تیزی سے بوتل نکالی لیکن یہ ہلکی پھلکی تھی۔ ڈھکنا کھول کر منہ سے لگائی تو پورے دو گھونٹ بھی پانی نہ نکلا۔ اُس سے اتنا ہوا کہ زبان اور حلق ذرا تر ہو گئے اور حلق میں کانٹے جھپنے کا جو احساس تھا وہ ختم ہو گیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ پیاس اور بڑھ گئی۔



میں اُٹھا۔ شاید یہ گناہوں سے توبہ کا اثر تھا کہ میں راتقل کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ امید افزا خیال بھی آیا کہ خدا نے میرے گناہ معاف کر دیئے ہیں اور اب جو بھی ہو گا وہ میرے لئے بہتر ہو گا لیکن میں جب چلنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میری ٹانگیں جسم کا بوجھ نہیں اٹھا سکیں گی۔ میں جسم کا بوجھ ہلکا کر سکتا تھا۔ میں نے ستر راؤنڈ ایمونیشن اور ایک راتقل اٹھا رکھی تھی۔ جھولے میں بھی کچھ سامان تھا۔ میں سب کچھ اتار کر پھینک دیتا تو بیس بائیس سیر وزن سے آزاد ہو سکتا تھا لیکن راتقل اور ایمونیشن کی یہ ضرورت تھی کہ یہ دونوں چیزیں پچھانوں کو پیش کر کے میں اُن کی دوستی حاصل کر سکتا تھا۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے اپنی کسی بھی چیز سے دستبردار ہونے کی نہ سوچی۔

جسم پر چوٹیں بھی آئی تھیں۔ پہلے میں پہاڑی سے گرا اور پھر اس چٹان سے پھسلا تھا۔ سر کو بھی ضرب لگی تھی۔ ان چوٹوں کے اثرات بھی تھے۔ پھر بھی میں چل پڑا۔ اب کے میں نشانیاں دیکھتا تھا کہ یہاں سے مُڑا تھا۔ کچھ دُور جا کر مجھے بڑی پہاڑی کا دامن نظر آیا اور میں چٹانی بھول حلیوں سے نکل کر پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو وہ مجھے ہندو سمجھ کر دُور سے ہی گولی مار دے گا۔ یہ ایک نیا
ن تھا جس نے میرے دل کو گرفت میں لے لیا۔

بھوک اور پیاس نے دماغ پر اثر کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے صحرا کا سراب سنا ہو گا
ن دیکھا کبھی نہیں ہو گا۔ وہ میں نے دیکھا ہے۔ یہ میں آج کہہ رہا ہوں کہ وہ سراب
لیکن اُس وقت اُسے میں حقیقت سمجھتا تھا۔ تقریباً "ایک میل دور مجھے ویسے کپکپے
ہاں نظر آئے جیسے قصبوں میں ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک کنواں تھا جس میں سے
رپانچ عورتیں پانی نکال کر اپنے گھرے بھر رہی تھیں۔

"اللہ نے میری سن لی ہے" — میں نے نعرہ لگایا اور دوڑ پڑا۔ ان عورتوں نے جو
پڑے پن رکھے تھے وہ پنجاب کا لباس تھا۔ میں دوڑا تو ضرور لیکن جلدی تھک گیا۔
ن دوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے چلنا شروع کر دیا۔ کچھ آگے جا کر دیکھا تو مکان غائب تھے
دہریں بھی نہیں تھیں اور نہ ہی کنواں تھا۔ ان کی بجائے تین چار ایک دوسرے کے
پرب گھنے درخت کھڑے تھے۔ ان کے نیچے پانی نظر آ رہا تھا۔ میں تیز چلنے کی کوشش
ر کرنے لگا۔



پھر نہ جانے کیا ہوا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اس طرح کی نیم تاریکی چھا گئی تھی جس طرح
الی گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور ان کے ساتھ گرد و غبار کی آندھی آتی ہے۔

میرے پہلو میں اور میرے کولہوں پر کوئی پاؤں کی ٹھوکریں مار رہا تھا اور میں آہستہ
آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ سورج کی چمک تھی۔ میں نے
آنکھیں ملیں اور پھر کھولیں۔ میں ہوش میں آچکا تھا اور مجھے عورتوں کی آوازیں سنائی
ینے لگیں۔ مجھے پھر پہلو میں زور سے ٹھوکریں لگی۔ میں اٹھ بیٹھا۔

پہلی چیز جو مجھے نظر آئی وہ رائفل کی ٹالی تھی جو میرے منہ سے چند انچ ہی دور
تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ اوپر دیکھا۔ ایک پٹھان عورت میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ
نواں تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ سفید اور گلابی تھا اور وہ بڑی ہی خوبصورت عورت
تھی لیکن میں اُس کے حسن کو اس طرح نہیں دیکھ رہا تھا جس طرح مجھے جیسے جوان آدمی
خوبصورت عورتوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ اس عورت کے حسن میں جلالی سی کیفیت تھی
اور تقدس کا تاثر بڑا صاف تھا۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر غصے کا اور حقارت کا تاثر تھا۔

سورج کچھ آگے چلا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ رات کا اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے
مجھے کیسے پناہ ملنی چاہئے خواہ یہ قید ہی ہو۔ پیاس کے ساتھ بھوک نے بھی اپنا ظالمانہ اثر
دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں سیدھا چلا گیا۔ جسم ذرا گرم ہوا تو چوٹوں کا درد بھی ذرا کم ہو
گیا۔ چلنے کی رفتار کچھ تیز ہو گئی۔ تقریباً "آدھا میل آگے جا کر چٹانیں یکلفت ختم ہو
گئیں اور کھلا سا علاقہ آگیا جو پتھر بلا بھی تھا اور ریگستانی بھی۔ مجھے ایک اور سوچ آئی۔
میری رائفل کی میگزین میں دس رائونڈ تھیں۔ میں نے رائفل سیدھی کی بولٹ پیچھے کر
کے آگے کیا، ایک رائونڈ چیمبر میں چلا گیا اور میں نے رائفل کا بٹ کندھے کے اوپر رکھا
اور ٹالی آسمان کی طرف کر کے ایک رائونڈ فائر کیا۔ رائفل نیچے کر کے پھر ایک رائونڈ چیمبر
میں دھکیلا اور پہلے کی طرح رائفل اوپر کر کے ہوا میں فائر کیا۔

میں نے یہ دو رائونڈ اس اُمید پر چلائے تھے کہ پٹھان کیسے قریب ہوئے یا جہاں
کیسے بھی ہوئے وہ فائر کی آوازیں سن کر ادھر آجائیں گے اور میں اپنے آپ کو اُن کے
حوالے کر دوں گا اور کہوں گا کہ میں مسلمان ہوں۔ اچانک میرا ہاتھ سر پر گیا تو میں کانپ
اٹھا۔ میرے سر پر گیزی نہیں تھی۔ یہ مسلمان کی نشانی تھی۔ یہ فکر والی بات تو نہیں
تھی۔ میں پٹھانوں کو منوا سکتا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ خطرہ یہ تھا کہ دُور سے کسی پٹھان

اُس کے دائیں بائیں دو اور عورتیں کھڑی تھیں۔ وہ بھی جوانی کی عمر میں تھیں اور وہ ہنس رہی تھیں۔ میں نے اپنے بائیں طرف اور ذرا پیچھے دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر عورت کھڑی تھی۔ میں پشتو بالکل ہی نہیں جانتا تھا۔ ان کی باتوں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت خوش تھیں کہ انہوں نے ایک فوجی کو پکڑا ہے۔

”مسلمان!“ — میں نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا — ”بسم اللہ الرحمن الرحیم..... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ“۔

”کافر!“ — ادھیڑ عمر پٹھانی نے میرے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

میں نے پھر بسم اللہ شریف پڑھ کر پوری الحمد شریف، قل شریف اور پھر پورا درود شریف نماز والا پڑھ ڈالا اور ایک بار پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ”مسلمان، پھر اپنے ایک ہاتھ کا چلو بنا کر منہ سے لگایا اور کہا پانی۔ ان چاروں نے آپس میں کچھ باتیں کیں۔ میں بیتابی سے اُن کے فیصلے کا منتظر تھا۔ میں شاید چلتے چلتے گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا تھا یا شاید سو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر میری رائفل اٹھالی اور مجھے جگایا۔

آخر ادھیڑ عمر عورت نے اشارہ کیا کہ میں ان کے آگے آگے چلوں۔ میں چل پڑا۔ وہ چاروں میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔ مجھے یہ تسکین ہوئی کہ میرا وہ سفر ختم ہوا جس نے مجھے بے جان کر دیا تھا اور یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں جا کمال رہا ہوں۔ اب یہ تو معلوم تھا کہ میں ان عورتوں کا قیدی ہوں اور یہ مجھے اپنے ٹھکانے پر لے جا رہی ہیں۔ مجھے یہ اطمینان بھی ہوا کہ خدا نے میری توبہ قبول کر لی ہے اور نجات کا راستہ بھی مل جائے گا۔

وہ علاقہ ایسا تھا کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ایک فرلانگ آگے کیسی زمین آئے گی۔ کیونکہ کہیں ذرا اونچی ٹیلری تھی، اس کے ساتھ سلوں والی چٹان تھی، کہیں کھڈ تھے اور کہیں سے زمین ویسے ہی ابھری ہوئی تھی اور یہ ساری زمین پانی کی بوند بوند کو ترس رہی تھی۔

ان نشیب و فراز سے گزرتے اور ایک خاصی اونچی اور لمبی چٹان کے پہلو سے دائیں کو مڑے تو ایک وسیع میدان نظر آیا۔ تین ساڑھے تین سو گز دور پانچ چھ کچے مکان تھے جن کی منڈیروں پر قلعوں جیسی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ عورتیں مجھے وہاں لے گئیں۔ ان مکانوں کے قریب کیکر کے دو درخت تھے۔ وہاں پہنچے تو چار پانی پر ایک سفید

ریش ضعیف العمر آدمی بیٹھاملا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا۔ اس کے منہ سے پہلا لفظ نکلا — ”کافر؟“ — میں نے نفی میں سر ہلایا اور السلام علیکم کہا پھر کلمہ شریف پڑھا۔ مختصر یہ کہ اسے بھی میں نے پوری نماز پڑھ کر سنائی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور کمرے میں لے گیا۔ واپس لا کر اس نے مجھے چار پانی پر بیٹھایا اور اُن عورتوں سے کچھ کہا۔ ایک عورت گئی اور میرے لئے پانی لے آئی۔ میں نے مٹی کا پیالہ منہ سے لگایا اُسے میں ایک ہی سانس میں ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن بوڑھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پیالہ میرے منہ سے ہٹا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اردو بولتا اور سمجھتا تھا۔

”آہستہ“ — اُس نے کہا — ”تھوڑا تھوڑا“ — اُس نے پیالہ میرے منہ سے لگا دیا اور اپنے ہاتھوں سے پیالہ ہٹا ہٹا کر تھوڑا تھوڑا پانی پلایا۔

”باباجان!“ — میں نے پوچھا — ”اب کیا ہو گا؟“

”ہمارا بیٹا آئے گا“ — اُس نے کہا — ”ہمارا دو بیٹا..... ایک ہمارے بھائی کا بیٹا... وہ آئے گا..... وہ جو بولے گا وہ ہو گا“۔

میں اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ اس کے بیٹوں کے ساتھ میرے لئے موت آئے گی یا ایک نئی زندگی!

میں نے جاہلوں سے عقل اور ان پڑھوں سے علم حاصل کرنے کی بات کی ہے۔
 وقت میرے ذہن میں وہ ضعیف العمر بچان ہے جس کا میں قیدی تھا۔ میرا جسم ٹوٹ
 پٹ گیا تھا۔ مجھے اتنا سا اطمینان تو تھا ہی کہ میں مسلمان تھا اور پھان میرے ساتھ وہ
 لوگ نہیں کریں گے جو وہ غیر مسلموں کے ساتھ کرتے ہیں۔ میری جسمانی حالت
 یک نہیں تھی۔ تھکان نے جسم توڑ دیا تھا۔ ایسی غنودگی طاری ہوئی کہ میں بیٹھے بیٹھے
 اربابی پر لڑھک گیا اور نیند نے مجھے اٹھنے نہ دیا۔

میں نے گھر کے خواب دیکھے۔ واحدہ کے خواب دیکھے اور جب آنکھ کھلی تو سیاہ کالی
 قیقت نے میرے دل پر دہشت طاری کر دی۔ میرے اوپر کبیل پڑا ہوا تھا۔ مجھے یاد آگیا
 کہ میں سو گیا تھا اور یہاں ایک بوڑھا پھان تھا۔ تین چار عورتیں تھیں۔ دو نوجوان
 لڑکیاں بھی تھیں۔ ان لوگوں نے مجھے جگانے کی بجائے مجھ پر کبیل ڈال دیا تھا۔
 میں گھبرا کر اٹھا۔ اس مکان کے آگے صحن نہیں تھا۔ اس کے آگے جتنی زمین تھی
 وہ اس مکان کا اور دوسرے چار پانچ مکانوں کا صحن تھا جو دو اڑھائی فرلانگ آگے ایک
 بنان تک چلا گیا تھا۔ چٹان کے پیچھے ننگا پہاڑ کھڑا تھا۔ اس پر ہریالی کا نام و نشان نہ تھا۔
 مکان کے اندر لالین جل رہی تھی اور باتوں کی آواز آرہی تھی۔

○

میں اٹھا۔ رات سرد اور تاریک تھی۔ میں دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اندر وہی بوڑھا
 چارباکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے فرش پر تین آدمی بیٹھے تھے۔ دو جوان اور ایک
 لوجیز عمر تھا۔ ان کے درمیان حقہ رکھا تھا۔ تین عورتیں الگ بیٹھی تھیں۔ ان میں ایک
 نوجوان تھی اور خاصی خوبصورت۔ ان سب نے میری طرف دیکھا۔
 ”تم اٹھا“۔ بوڑھے نے کہا۔ ”آجا..... آ“۔

میں اندر جا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے پشتو میں عورتوں سے کچھ کہا۔ دو تین
 منٹ بعد میرے آگے ایک چنگیر آگئی جس میں مکئی کی روٹیاں تھیں اور پلیٹ میں پننے کی
 دال تھی۔ میں تو بھوک سے مر جا رہا تھا۔ میں نے سب کی طرف باری باری دیکھا۔
 ”ہم نے کیا“۔ بوڑھے نے کہا۔ ”تم کاؤ“۔

میں نے بہت کوشش کی کہ تمیز سے کھاؤں لیکن بھوک اتنی لگی ہوئی تھی کہ جی
 چاہتا تھا مکئی کی یہ موٹی موٹی دو روٹیاں ایک ہی بار نگل لوں۔ میں چڑچڑ کر تادونوں

میں کہوں کہ میں نے جاہلوں سے عقل لی اور ان پڑھوں سے علم حاصل کر
 ہے۔ تو میری کہانی پڑھنے والے کئی ایک لوگوں کے ہونٹوں پر ایسے
 مسکراہٹ آجائے گی جس میں طنز ہوگی اور جن کے پاس کالجوں کی ڈگریاں ہیں، ان کے
 ماتھوں پر شکنیں پڑ جائیں گی۔ وہ کہیں گے پرانے زمانے کا میٹرکولیٹ بڑھاپے میں آکر
 اپنے آپ کو دانش مند سمجھ رہا ہے۔
 میری مشکل یہ ہے کہ میں نے زندگی کا عملی پہلو دیکھا ہے، اور میں حرکت میں رہ
 ہوں۔ حرکت زبان کی نہیں، حرکت جسم کی اور حرکت دماغ کی۔ میں کتابوں کی زنجیروں
 سے آزاد رہا ہوں۔ کافندوں پر چھپے ہوئے کالے الفاظ کو راستے کے کانٹے سمجھ کر راستہ
 بدل بدل کر چلتا رہا ہوں۔

میں نے ہمیشہ عمل کیا ہے۔ عمل سے ہی زندگی بنتی ہے..... جنت بھی جہنم بھی!
 میری زندگی کبھی جنت بنی کبھی جہنم بنی، کہیں دوسروں کا تماشا دیکھا کہیں خود تماشا
 بنا..... اور شب و روز میرے آگے تماشا ہوتا رہا اور ہو رہا ہے۔ اب تو اپنے لیڈروں کی
 سیاست ایسے تماشا دکھا رہی ہے کہ ہم پر ساری دنیا کی انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔
 اب تو یہی دعائیں سے ہوک بن کر نکلتی ہے۔ ”اللہ“ اب اٹھالے۔ اپنے
 زمانے میں پیار، خلوص اور وقار دیکھا تھا۔ اب تو بندہ بندے کو کھا رہا ہے۔ لوٹ کھسوٹ
 ہے۔ خون خرابہ ہے۔

قیصر و کسری جیسی ہیبت ناک جنگی طاقتوں کو خون میں ڈبو دینے اور خاک میں ملا
 دینے والی قوم آج اپنے ہی خون میں ڈوب رہی ہے اور قرآن کی اس سرزمین پر خاک اڑ
 رہی ہے۔

”ایا جان!“ — میں نے کہا — ”میں نے فوج میں بھرتی نہیں ہونا تھا۔ میں اس لڑکی کے باپ سے نہیں ڈرتا لیکن میرے ماں باپ ڈرتے تھے کہ لڑکی کا باپ مجھے مروا دے گا۔ میں ان کی خاطر بھرتی ہوا ہوں۔ آپ کے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں۔ میں تم کھا کر کہتا ہوں کہ مسلمان فوجی رانفلیں اور مشین گنیں ذرا اوپر کر کے فائر کیا کرتے ہیں کہ گولی کسی پٹھان کو نہ لگ جائے۔“

میں نے جھوٹ بولا — ”آج کی لڑائی میں آپ کے آدمیوں نے ہماری پکٹ کو گھیرے میں لے کر ہمارے ایک آدمی کو گولی مار دی تو میں نے دو پٹھانوں کو دیکھ لیا۔ میں بڑی آسانی سے دونوں کو مار سکتا تھا لیکن مسلمان اپنے بھائی کو نہیں مارا کرتا۔“

بوڑھا پٹھان اردو بولتا تھا تو گر میرے اسی طرح تازاد ہو کر بولتا تھا جس طرح وہ انگریزوں سے آزاد تھے لیکن وہ اپنا مطلب واضح کر لیتا تھا۔ وہاں اُس کے جو بیٹے اور بھتیجا بیٹھے ہوئے تھے، وہ اردو سمجھتے تھے لیکن بول نہیں سکتے تھے۔ ادھیڑ عمر پٹھان چند ایک الفاظ جوڑ کر بات کر لیتا تھا۔

ان لوگوں کے ساتھ گپ شپ چلتی رہی اور پھر بوڑھا سنجیدہ ہونے لگا۔ میں اس کی باتیں اُس کی ٹوٹی پھوٹی اور گریمر سے آزاد اردو میں نہیں ذرا سلیس اردو میں سناؤں گا۔

”تم فرنگی کو اچھا سمجھتے ہو؟“ — اُس نے پوچھا۔

”میں کافر فرنگی پر لعنت بھیجتا ہوں“ — میں نے کہا — ”میں نے آپ کو نجووری بتائی ہے کہ میں کیوں بھرتی ہوا تھا۔“

”نہیں!“ — اس نے کہا — ”تم میری بات نہیں سمجھتے۔ میں تم سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم ہماری طرح آزاد نہیں رہنا چاہتے؟“ — میرا جواب سنے بغیر اُس نے کہا — ”نہیں۔ تم آزاد نہیں رہنا چاہتے۔ تم ہمیں دیکھ کر سوچتے ہو گے کہ یہ لوگ تو غریب ہیں۔ پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ انہیں دنیا کی کوئی نعمت میسر نہیں۔ پہاڑی بھیڑیوں اور بکریوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن تم یہ نہیں سوچتے کہ ہم پر کافر کا قانون نہیں چلتا۔ یہاں اللہ کا قانون چلتا ہے۔ ادھر کوئی جرم نہیں ہوتا۔ اگر ہو جائے تو مجرم کو پوری سزا ملتی ہے۔ یہاں ہم دروازے کھلے چھوڑ کر کہیں چلے جائیں، صندوقوں میں زیور ہو، رانفل اور گولیاں بھی ہوں تو انہیں کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ سب اللہ کے قانون سے ڈرتے ہیں۔۔۔۔۔“

روٹیاں کھا گیا۔ وال کا ایک دانہ نہ چھوڑا، پھر مٹی کے دو پیالے پانی پی کر ڈکار مارا۔ میں نے اتنی لمبی عمر میں بڑے ہی اچھے اور مرغن کھانے کھائے ہیں۔ آج کل کے ویسے تو بہت ہی پُر تکلف ہوتے ہیں۔ روسٹ گوشت، روسٹ مرغی، کباب، چکن پلاؤ اور ایک سے بڑھ کر ایک کھانے کھائے ہیں لیکن میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ جو لذت مٹی کی اُن دو روٹیوں اور چنے کی دال میں تھی وہ مجھے کسی اور کھانے میں نہیں ملی، حالانکہ میں نے وہ روٹیاں اور دال دہشت زدگی کی کیفیت میں اور بھائی کی کیفیت میں کھائی تھیں۔

بوڑھے پٹھان نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے نام بتایا تو اُس نے پوچھا میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ یہ بتایا تو اس نے پوچھا میں فوج میں کیوں بھرتی ہوا ہوں۔ میں نے اپنی عقل کے مطابق اس سوال کا جواب بھی دیا۔

میں نے اُسے جواب دیا تھا کہ یہ ہمارے علاقے کی روایت ہے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہمارے علاقے کی اونچی ذاتوں کے لوگ بھی فوج میں سپاہی بھرتی ہوا کرتے تھے، حالانکہ ان کی زمینیں اتنی زیادہ ہوتی تھیں کہ انہیں نوکری کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔

میں صحیح بات بتاتا ہوں، اور یہ میں اپنے متعلق بتا رہا ہوں، کہ میں جس وقت فوج میں بھرتی ہوا تھا اس وقت میرے ذہن میں آزادی کا تصور ہی نہیں تھا۔ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ بادشاہی صرف انگریز کر سکتے ہیں اور بادشاہی کا حق صرف انگریزوں کو حاصل ہے۔ ہم کہتے تھے کہ پہلے مغلوں کے خاندان نے ہندوستان پر بادشاہی کی تھی۔ انگریزوں نے آکر مغلوں سے بادشاہی چھینی اور بادشاہ بن گئے۔ جنگ عظیم شروع ہوئی تو ہم کہتے تھے کہ اب ہندوستان پر جرمنوں یا جاپانیوں کی بادشاہی ہوگی۔

اس کے علاوہ میں نے ان پٹھانوں کو اپنے بھرتی ہونے کی اصل وجہ بھی بتادی۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ یہ تھی واجدہ کی محبت، اُس کے باپ کی دہمکیاں۔ میں نے انہیں یہ بھی سنایا کہ میں نے واجدہ عکے باپ کے غمخیز کو کس طرح مارا بیٹھا تھا۔ یہ بھی سنایا کہ میں نے اپنے ایک دوست حمید کے ساتھ ایک بدکار پیر کو کس طرح سزا دی تھی اور رات ہی رات اپنی چھاؤنی میں واپس آگئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ یہ سارے پٹھان میری بات دلچسپی سے سن رہے ہیں اور لطف اٹھا رہے ہیں تو میں نے اس واقعہ میں کچھ مبالغہ آمیزی کر کے دلچسپی میں اضافہ کر دیا۔

لیکن آزاد رہتا۔ امیر بننے کے لئے فرنگی کا غلام نہ بن جاتا.....

”وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور فوت ہو گیا..... میں نے آٹھ دس سال پہلے لڑنا چھوڑا ہے۔ اب پہاڑوں پر نہیں چڑھ سکتا اور دوڑ نہیں سکتا۔ اب میرے یہ بیٹے فرنگی کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کو اللہ کے نام پر قربان کر دیا ہے۔“

بہت بعد کی بات ہے۔ میں نے ایک جگہ پڑھا کہ جب قائد اعظم پاکستان کے لئے جدوجہد کر رہے تھے تو ایک انگریز صحافی نے ان سے پوچھا کہ اگر آپ کو پاکستان مل گیا تو اس ملک کو چلانے کے لئے روپیہ پیسہ کہاں سے لائیں گے؟ آپ کا ملک تو بہت غریب ہو گا۔ قائد اعظم نے اس سے پوچھا۔ ”کیا آپ وہ امیر برطانیہ پسند کریں گے جو جرمنی کا غلام ہو یا وہ غریب برطانیہ جو آزاد ہو؟“

”یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے؟“۔ انگریز صحافی نے جواب دیا۔ ”ہم آزاد برطانیہ پسند کریں گے خواہ غریب ہی ہو۔“

میں نے جب یہ مکالمہ پڑھا تو مجھے وہ بوڑھا پٹھان یاد آیا تھا جسے باپ نے وصیت کی تھی کہ غریب رہنا لیکن آزاد رہنا۔

”میری بات سمجھو“۔ بوڑھا پٹھان جو بالکل ہی آن پڑھ تھا، کہہ رہا تھا۔ ”تم لوگ دعائیں کیا کرتے ہو، یا اللہ ترقی دے۔ یا اللہ دولت دے۔ یا اللہ بہت بڑا مکان دے۔ ہم لوگ اللہ کو تنگ نہیں کیا کرتے۔ ہم ایک دعایہ کیا کرتے ہیں، یا اللہ بیٹا دے اور دوسری یہ کہ یا اللہ میرا بیٹا غدار نہ ہو۔“

بوڑھے نے بہت باتیں کیں اور اس کی باتیں میری روح میں اُترتی جا رہی تھیں اور میرے خیالات بدلتے جا رہے تھے۔ مجھے بالکل ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میں ان لوگوں کا قیدی ہوں اور یہ چاہیں تو مجھے گولی بھی مار سکتے ہیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ بوڑھا پٹھان میرا پیر استاد ہے اور مجھے پروقاہ زندگی بسر کرنے کا وہ سبق دے رہا ہے جو میں نے پہلے کہیں سے بھی نہیں حاصل کیا تھا۔

”اگر آپ لوگ مجھ پر اعتبار کریں تو میں آپ کے پاس ہی رہ جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

بوڑھا تو کچھ نہ بولا، دوسروں نے پشتوں میں کچھ کھسک پھسکی جو میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔

”تم نہیں جانتے کہ مسلمان کا غلام ہو جائے تو مسلمان کا ایمان برباد ہو جاتا ہے۔ وہ مسلمان نہیں رہتا۔ تمہاری نماز قبول نہیں ہوگی۔ تمہارا روزہ قبول نہیں ہوگا۔ یہ مت سوچو تمہیں پیسہ کدھر سے ملتا ہے۔ یہ سوچو کہ تمہارا ایمان کس طرح ٹھیک رہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کافروں نے ہمارے خلاف یہ مشہور کیا ہوا ہے کہ قبائلی پٹھان ڈاکو ہیں۔ کنواریوں کو لوٹے ہیں، بنوں، شرو، کوہاٹ اور پشاور شہر میں ڈاکے ڈالتے ہیں۔ اگر ہر ڈاکو ہوتے تو ہمارا رہن سہن یہ ہوتا؟ ہم شہروں جیسے مکان نہ بناتے؟ ہم اچھے کپڑے نہ پہنتے؟ ہم اچھی اچھی چیزیں نہ کھاتے؟“

”میں آپ کو ڈاکو نہیں سمجھتا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ مجاہد ہیں۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”تم نے یہ بات مجھے خوش کرنے کے لئے کہی ہے کیونکہ تم ہمارے قیدی ہو..... خوشامد غلام کیا کرتے ہیں۔“

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس بوڑھے نے میرے جسم کی ساری طاقت سلج کر لی ہو۔ اس کی داڑھی دودھ جیسی سفید تھی۔ چہرے کا رنگ سپیدی مائل تھا اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی نظریں میری آنکھوں کے راستے میرے وجود میں اُتر رہی ہوں اور میرے وجود کے اندر سویا ہوا ایک انسان بیدار ہو رہا ہو۔

یہ بزرگ پٹھان شاید اسی انسان کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم خوبصورت جوان ہو۔“ اس نے کہا۔ ”فرنگی نے تمہیں بہت سستا خریدا ہے..... میری عمر اسی سال سے اوپر ہو گئی ہے۔ میں پچھلی صدی میں پیدا ہوا تھا۔ یہ باپ سکھوں کے خلاف لڑا تھا پھر انگریزوں کے خلاف لڑا۔ میں ابھی چار پانچ سال کا تھا کہ اس نے میرے ہاتھ میں خنجر دے دیا تھا۔ نو دس سال کی عمر میں اس نے مجھے ران نقل چلائی سکھا دی تھی۔ اس وقت ران نقل آج والی نہیں ہوتی تھی۔ اس زمانے کی ران نقل میں سامنے سے نالی میں بارود ڈالا جاتا اور پھر چھڑے یا ایک موٹا چھڑا ڈالا جاتا تھا.....

”میری عمر وہ پندرہ سال تھی جب میرے باپ کو دو گولیاں لگیں۔ اُسے اٹھا کر گالے آئے۔ میرا ایک بڑا بھائی تھا۔ باپ نے مجھے کہا کہ تمہارا بھائی زندہ ہے۔ اس کی بات ماننا تمہارا فرض ہے..... اور یاد رکھو، یہ زمین تمہاری ہے۔ یہ پہاڑ تمہارے ہیں فرنگی نے ہندوستان میں اپنی بادشاہی قائم کر لی ہے۔ فرنگی ادھر نہ آئے۔ غریب رہا

میں بھاگ بھی تو جاؤں گا کہاں۔ اس پتھر لیے پہاڑی علاقے کی بھول بھلیوں سے نکلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور بنوں یا تمبر کتنی کتنی دور ہے۔

○

صبح آنکھ کھلی۔ دھوپ کمرے میں آ رہی تھی۔ وہاں صرف بوڑھا تھا یا عورتیں نہیں۔ میں پھر بوڑھے کے پاس بیٹھ گیا اور اُس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ دن گزر گیا پھر رات بھی گزر گئی۔ مجھے ایک اور خیال پریشان کرنے لگا۔ وہ یہ تھا کہ میرے متعلق یہ رائے نہ قائم کر لی جائے کہ میں بھاگ کر پٹھانوں کے پاس چلا گیا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس صورت میں میرے گھر پر پولیس کو چڑھا دیا جائے گا۔ پھر یہ نظر بھی نظر آنے لگا کہ ان پٹھانوں نے مجھے چھوڑ دیا تو بھی میرے انگریز افسر شائد نہ اُن کے میں جان بوجھ کر پٹھانوں کے پاس نہیں گیا تھا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ ایسا نہ ہو کہ میرے گھر یہ سرکاری اطلاع دے دی جائے کہ میں لڑائی میں مارا گیا ہوں۔ دو دن اور اسی ذہنی کیفیت میں گزر گئے۔ میں نے کئی بار بوڑھے پٹھان سے پوچھا کہ میرا کیا بنے گا۔

”خدا کو یاد کرو“۔ آخر بوڑھے نے میرے اس سوال سے تنگ آ کر کہا۔ ”اگر تم ہندو یا سکھ ہوتے تو ہم پہلے دن ہی تمہارا فیصلہ کر دیتے۔ جرگے کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن تم مسلمان ہو اس لئے ہم اپنی مرضی سے تمہیں نہیں چھوڑ سکتے۔ مسلمان فوجی کا فیصلہ جرگہ کیا کرتا ہے۔ تم ہمارے پاس مہمان ہو۔“

اگلے ہی روز جرگے کی اطلاع آگئی۔ دوسرے دن وہاں پہنچا تھا۔ اگلے روز علی الصبح منہ اندھیرے مجھے جگایا گیا۔ بوڑھا اور اس کے دو بیٹے میرے ساتھ چل پڑے۔ میری رائفل اور ایمونیشن انہوں نے اٹھا رکھا تھا۔ تین ساڑھے تین گھنٹے کا پہاڑی سفر کر کے ہم ایک گاؤں میں پہنچے۔ یہ پتھر لی وادیاں تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ ان میں سے کتنی بار ہم دائیں اور بائیں مڑے اور ایک کشادہ وادی میں پہنچے جہاں یہ گاؤں تھا۔ مجھے اس گاؤں کا نام معلوم نہیں۔ اسے میں صرف اس لئے گاؤں کہہ رہا ہوں کہ وہاں دس بارہ گھر تھے۔ گاؤں کے باہر بہت سے پٹھان موجود تھے۔

اس گاؤں کے قریب شاید پانی تھا۔ اس پانی کی وجہ سے ہی وہاں چند ایک ہرے

”نہیں!“۔ بوڑھے نے اپنے بیٹوں سے بات کر کے کہا۔ ”ہم تم پر اعتبار کر سکتے ہیں لیکن تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھیں گے۔ تم اس وقت یہ بات جوانی کے جوش میں کر رہے ہو لیکن تم یہ نہیں سوچ رہے کہ تمہارے ماں باپ کا کیا حال ہو گا۔ تم اگر ہمارے ساتھ رہ گئے تو پھر ساری عمر اپنے گھر نہیں جا سکو گے اور پولیس دن رات تمہارے گھر والوں کو پریشان کرتی رہے گی۔ تمہارے ملک کے تین چار فوجی اُدھر سے بھاگ کر ہمارے پاس آئے ہیں۔ تمہارا فیصلہ جرگہ کرے گا کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے یا کیا کیا جائے۔ اگر تمہیں جرگے نے چھوڑ دیا تو واپس اپنی پلٹن میں چلے جاؤ گے۔ وہاں جا کر سوچنا کہ تمہیں اُدھر آنا چاہئے یا نہیں۔ اگر تمہارا دل مان لے تو بھاگ آنا۔“

اس بزرگ پٹھان نے جن فوجیوں کا ذکر کیا تھا کہ وہ فوج سے بھاگ کر پٹھانوں سے جا ملے تھے، ان میں سے ایک کو میں جانتا تھا۔ اُس کا نام محمد سرور تھا لیکن قبائلی علاقے میں وہ سرور پنجابی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ آٹھ پنجاب رجمنٹ میں سکینئر تھا۔ وہ 1940ء میں بھاگا تھا اور پھر بڑے ہی سنسنی خیز اور ڈرامائی واقعات ہوئے۔ آخر وہ پکڑا گیا اور اسے بنوں جیل میں بھانسی دے دی گئی تھی۔

میں نے بڑی عمر میں اگر جب اخبار رسالے پڑھنے شروع کئے تھے تو سرور پنجابی کی پوری کہانی ”حکایت“ میں پڑھی تھی۔ میں تو اُسی وقت سے سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی کی داستان لکھوں لیکن کوئی لکھنے لکھانے والا نہیں مل رہا تھا۔ اب اللہ نے کرم کیا ہے اور مجھے یہ تعاون حاصل ہو گیا ہے اور میں ایسی داستان بنا رہا ہوں جس سے ہمارے نوجوانوں کو کچھ روشنی ملے گی۔

میں نے جرگے کا نام سنا تو میں کچھ گھبرایا۔ جرگے میں چار پانچ بزرگ بیٹھ کر فیصلہ کیا کرتے تھے کہ ملزم کو سزا دی جائے یا یہ بے قصور ہے۔ ان لوگوں کے ہاں کوئی تحریری قانون نہیں تھا نہ ان کی کوئی پولیس تھی۔ جرگہ کتنی ہی سخت سزائیوں نہ دے دیتا سب اسے قبول کرتے تھے۔ ایسے کوئی بھی نہیں کہتا تھا کہ ہم نہیں مانتے، دیکھی جائے گی، ہمارا کوئی کیا گاڑ لیتا ہے۔ میں نے اپنا آپ اللہ کے حوالے کر دیا۔

سب کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ عورتیں کسی اور کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ہم سب مرد اسی کمرے میں رہے اور سو گئے۔ ان پٹھانوں نے مجھے ایسی وارننگ نہ دی کہ بھاگنے کی کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔ انہیں مجھ پر بھروسہ تھا یا انہیں یہ یقین تھا کہ

بھرے درخت نظر آرہے تھے اور تھوڑا سا سبزہ بھی تھا۔ باہر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ پٹھان ان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ زمین پر ہی بیٹھ گئے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو سب اٹھ کھڑے ہوئے اور بوڑھے پٹھان کے ساتھ سب نے باری باری ہاتھ ملایا۔

ان میں سے کئی ایک نے میرے ساتھ بھی ہاتھ ملایا اور بعض نے میرے ساتھ ہاتھ ملانا ضروری نہ سمجھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انہیں ابھی معلوم نہیں تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں ان سب کے لئے تماشا بن گیا تھا۔ مجھے آوازیں سنائی دیں۔

”مسلمان..... مسلمان“ — مجھے ایک طرف بٹھادیا گیا۔ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

دو بڑی اچھی قسم کی چارپائیاں سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد پانچ چھ بزرگ سے پٹھان آئے۔ سب ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ میں نے خاص طور پر دیکھا کہ ان کا لباس دو سروں سے بہت مختلف تھا۔ اس لباس سے وہ بہت ہی معزز لگتے تھے۔ وہ دراصل مختلف قبیلوں کے سردار تھے جنہیں ملک کہا جاتا تھا۔ یہ سب ان دو چارپائیوں پر بیٹھ گئے جنہیں میں نے اچھی قسم کی چارپائیاں کہا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ جرگہ میرا فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھا ہے۔ میں حیران بھی ہو رہا تھا کہ میں اتنا اہم قیدی ہوں کہ میرے لئے اتنے بڑے جرگے کا اہتمام کیا گیا ہے لیکن میری یہ خوش فہمی جلدی رفع ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ ایک اوجیز عمر پٹھان کو اس طرح جرگے کے سامنے لایا گیا کہ اُس کے دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے رسی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اسے جرگے کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔

یہ ساری کارروائی پشتو میں ہو رہی تھی اس لئے میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ ملزم نے بڑی آہستہ آہستہ اور دہلی زبان میں اپنا بیان دیا۔ جرگے کا کوئی نہ کوئی ممبر تھوڑی تھوڑی دیر بعد بڑے غصے کے عالم میں اُسے کچھ کہتا تھا۔ چار گواہوں کے بیان بھی ہوئے۔

اس کے بعد پھر ملزم سے کچھ سوال کئے گئے۔ اب اُس نے ذرا جاندار آواز میں جواب دیا۔ جرگے کے بزرگوں نے آپس میں کھسپھسپ کر اور ایک آدمی کو آواز دے کر کچھ کہا۔ وہ آدمی دوڑا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں غلاف میں لپٹا ہوا قرآن پاک تھا۔ جرگے کے حکم سے ملزم کے ہاتھ کھول دیئے گئے اور قرآن اُس کے آگے کر دیا گیا۔ یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ ملزم سے قرآن پر قسم لی جا رہی تھی۔

پاکستان کی پکڑیوں میں اکثر حلفیہ بیان لئے جاتے ہیں۔ لوگ بڑی ڈھٹائی سے اللہ کو ماضی حاضر جان کر جھوٹا حلف اٹھاتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔ قرآن کی قسم کھانا تو لوگ معمولی سی بات سمجھتے ہیں۔ قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر بھی قسم کھا لیتے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم پر خدا نے حکمران بھی جھوٹی قسمیں کھانے والوں جیسے مسلط کر دیے ہیں اور مذہبائی نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ یہ سب جھوٹی قسموں کی سزا ہے جو روز بروز بڑھتی جائے گی اور وہ دن بھی آجائے گا جب اللہ اپنے فرمان کے مطابق ہم پر کسی غیر قوم کو مسلط کر دے گا۔

میں نے اُس پٹھان کو دیکھا۔ اُسے کہا گیا کہ قرآن پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہو کہ تم بے گناہ ہو۔ یہ اُس کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ ایسے کر سکتا تھا کہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا لیتا اور اپنی جان بچا لیتا لیکن اُس کا رویہ یہ دیکھا کہ اُس نے قرآن پاک کو دیکھا پھر جرگے کے ملکوں کی طرف دیکھا پھر تمام تماشاویں پر نظر گھمائی اور آخر اُس نے سر ہلا کر کہا کہ وہ قسم نہیں کھائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجرم تھا۔

جھوٹی قسم نہ کھانے کا نتیجہ میں نے یہ دیکھا کہ جرگے کے حکم سے اُس کے ہاتھ پھر پیٹھ پیچھے باندھ دیئے گئے۔ جرگے کے سب سے زیادہ معزز بزرگ نے بلند آواز سے تماشاویں سے مخاطب ہو کر اپنا فیصلہ سنایا جو میں نہ سمجھ سکا۔ جب تماشاویں نے ہاتھ کھڑے کر کے بلند آواز سے کچھ کہا تو میں سمجھ گیا کہ ان سب نے جرگے کے فیصلے کی تائید کی ہے۔

اس بزرگ کے اشارے سے ملزم کو چار آدمی ایک طرف لے گئے۔ کچھ آگے زمین نیچے چلی جاتی تھی۔ نیچے خشک ٹالہ تھا۔ وہ سب وہاں سے نیچے گئے تو نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ چار رانٹلیں فار ہوئیں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ چاروں رانٹلیں اکٹھی فار ہوئی ہیں۔

وہ چاروں آدمی اوپر آئے۔ مجرم ان کے ساتھ نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اُسے سزائے موت دے دی گئی ہے۔ جب وہ چاروں آدمی جرگے کے سامنے آئے تو ان میں سے ایک نے جرگے کے ساتھ کوئی بات کی۔ میرا خیال ہے انہوں نے جرگے کو یہ اطلاع دی تھی کہ مجرم کو سزائے موت دے دی گئی ہے۔ جرگے نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ تمام تماشاویں نے، میں نے بھی ہاتھ اٹھائے۔ جسے سزائے موت دی گئی تھی وہ

آخر مسلمان تھا اور پٹھان تھا اس لئے فاتحہ لازمی تھی۔

○

اس کے بعد جرگے کے سامنے پیش ہونے کی میری باری تھی۔ میرے مقدمے کی کارروائی سننے کی بجائے آپ یہ ضرور جانتا چاہیں گے کہ اس پٹھان کا جرم کیا تھا جسے گولی مار دی گئی تھی۔ میں پہلے آپ کو اس کا مقدمہ سناتا ہوں۔

وہ خاصہ وار تھا۔ انگریزوں نے ایک تو پٹھان رنجشیں الگ بنائی تھیں جن میں پٹھانوں کو بھرتی کیا جاتا تھا۔ پٹھانوں کی انہوں نے ایک فورس اور بنائی تھی جسے سکاؤٹ کہا جاتا تھا۔ ان کی الگ الگ پلیٹیں بنا کر ان کے مختلف نام رکھ دیئے گئے تھے مثلاً "ٹوچی سکاؤٹس وغیرہ۔ یہ لوگ سرحد میں ہی رہتے تھے اور انہیں قبائلی پٹھانوں کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے ایک فورس اور بنائی تھی جنہیں خاصہ وار کہا جاتا تھا۔ یہ نیم فوجی تنظیم تھی۔ انہیں رانٹھلیں دی جاتی تھیں اور تھوڑی تھوڑی تنخواہ بھی دی جاتی تھی۔ قبائلی علاقے میں کہیں کہیں ان کی پوشیں بھی تھیں لیکن انہیں فوج کی طرح استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔

اُس زمانے میں یہ مشہور تھا کہ خاصہ وار مخبری کرتے ہیں۔ وہ قبائلی علاقے میں بھی جاتے تھے اور شہروں میں بھی آتے تھے۔ ان میں بعض دوغلی مخبری کرتے تھے یعنی انگریزوں کی خبریں قبائلی پٹھانوں تک پہنچاتے اور قبائلیوں کی مخبری انگریزوں کے آگے کرتے تھے۔ ان میں کوئی ایسا بھی نکل آتا تھا جو مکمل طور پر انگریزوں کا جاسوس بن جاتا اور انعام و اکرام کے لالچ میں اپنے بھائیوں سے غداری کرتا تھا۔ دراصل انگریز بھی ان پر کوئی زیادہ بھروسہ نہیں کرتے تھے پھر بھی یہ لوگ انگریزوں کی فوج کے کام آتے تھے۔ بعض اوقات فوج کو کسی دور دراز قبائلی علاقے میں کسی خاص جگہ بھیجنا ہوتا تو خاصہ وار گائیڈ کے طور پر ان کے ساتھ ہوتے تھے۔

میں جس اپریشن میں اپنی پوسٹ سے اُترتے ہلک گیا اور پٹھانوں کا قیدی ہو گیا تھا۔ یہ بہت بڑا فوجی اپریشن تھا۔ پٹھانوں نے بھی جم کر مقابلہ کیا تھا۔ دونوں طرف نقصان ہوا تھا۔ میں نے بعد میں اپنے میزبانوں سے پوچھا تھا کہ جس پٹھان کو گولی مار دی گئی ہے اُس کا قصور کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک جگہ دس بارہ قبائلی اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے ایک فوجی پوسٹ پر حملہ کرنا تھا جس طرح ہماری پوسٹ پر حملہ ہوا تھا۔

یہ خاصہ داران قبائلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے قریب کی فوجی پوسٹ کو بتا دیا کہ فلاں جگہ دس بارہ پٹھان اکٹھے کھڑے ہیں اور ان کا یہ پروگرام ہے۔ کسی انگریز لیفٹیننٹ یا کپٹن نے اپنے کچھ فوجی ساتھ لئے اور اُس ٹکری تک پہنچ گیا جس کے دوسری طرف پٹھان کھڑے شاید اپنے کچھ اور ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

اس انگریز افسر نے خود یا اُس کے حکم سے اُس کے فوجیوں نے صرف دو گرینیڈ پھینکے۔ پٹھانوں میں سے صرف ایک آدمی وہاں سے زندہ نکلا باقی سب مارے گئے۔ وہ جو زندہ نکلا تھا اُس کی ٹانگیں زخمی تھیں لیکن وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ اُس نے سب کو بتایا کہ یہ خاصہ داران کے قریب سے گزرا تھا یا کہیں سے اس نے دیکھ لیا تھا اور ان کی نشاندہی کی تھی۔

میں آپ کو صحیح بتاتا ہوں کہ فوج کبھی بھی اتنی خوش قسمت نہیں ہوئی تھی کہ اُسے اتنے زیادہ پٹھان ایک ہی جگہ مل جاتے اور انہیں صرف دو گرینیڈوں سے ختم کر دیا جاتا۔ یہ اُسی صورت میں ممکن تھا کہ کہیں پٹھان اکٹھے ہوتے اور کوئی مخبری کر دیتا۔ قبائلی پٹھانوں کا انداز یہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے دُور دُور اکیلے اکیلے رہتے تھے۔ ایک پٹھان ایک گولی فائر کر کے فوراً اُس جگہ سے بھاگ جاتا تھا۔

یہ ان قبائلیوں کا کمال تھا کہ انہوں نے اس خاصہ دار کو ایک دو دنوں میں ہی پکڑ لیا اور اُسے ہٹلا پھٹلا کر ساتھ لے آئے۔ جو نمی وہ ٹکریوں کے پیچھے آیا تو پٹھانوں نے اسے پکڑ کر اٹھالیا اور اس گاؤں میں لے آئے جہاں جرگہ بیٹھا تھا۔

میں حیران ہوں کہ اس شخص کو معلوم تھا کہ اس کے خلاف غداری کا جرم ثابت ہو گیا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ گواہوں کے بیانات کے باوجود وہ اپنا جرم تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ آخر اُس کے آگے قرآن پاک رکھا گیا تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ قسم کھا کر بیچ سکتا ہے، اُس نے جھوٹی قسم نہ کھائی اور سزائے موت قبول کر لی۔

یہ اُس دور کے قبائلی پٹھانوں کا کردار تھا۔ اسی کردار کی برکت تھی کہ یہ لوگ پوری ایک صدی انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے اور اپنی زمین کا ایک انچ بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ آج ان مجاہدین کے کارنامے محض افسانے لگتے ہیں کیونکہ آج قبائلی علاقے کا چہرہ ہی مسخ ہو گیا ہے اور وہ روح رہی ہی نہیں جو کبھی ہوا کرتی تھی۔

○

غلاری کا مقدمہ چلا اور فیصلہ ہوا اور فیصلے پر فوراً ہی عمل درآمد ہو گیا تو میری باری آئی۔ مجھے جرگے کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ جرگے کے سارے ممبر اردو بولتے اور سمجھتے تھے۔

”اے تم کیوں کافر کا نوکری کرتا ہے؟“ — جرگے کے بزرگ نے کہا۔

”تھوڑی سی تنخواہ اور راشن کے لئے تم اپنی جانیں انگریزوں کے حوالے کر دیتے ہو۔“

میں نے انہیں بھی وہی جواب دیا جو میں اپنے بوڑھے میزبان کو پہلے دے چکا تھا۔

میں جواب دے چکا تو میرے بوڑھے میزبان نے جرگے کے ساتھ کوئی بات کی۔

”تم اُدھر رہنا چاہتے ہو؟“ — جرگے کے بزرگ نے پوچھا۔

”ہاں بابا جان“ — میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”یہاں آکر میری غیرت جاگی

ہے۔ میں آپ کی طرح آزاد رہنا چاہتا ہوں اور میرا ایمان کتا ہے کہ فرنگی کے خلاف لڑو۔“

”تم ابھی بچے ہو“ — بزرگ نے کہا۔ ”جوش میں آکر بات نہ کرو۔ جس روز

تم فوج سے بھاگ کر ہمارے پاس آؤ گے تو ہم تمہیں اپنا بیٹا بنالیں گے۔“

مجھ سے کچھ اور سوال پوچھے گئے۔ میرا بوڑھا میزبان اور اس کے بیٹے باری باری

جرگے سے کچھ کہتے تھے۔ وہ دراصل میری سفارش کر رہے تھے۔

”تم مسلمان ہو“ — جرگے کے بزرگ نے فیصلہ سنایا۔ ”ہم کسی مسلمان کو

سزا نہیں دے سکتے۔ ہم تمہیں واپس بھیج دیں گے لیکن تمہاری رانقل اور تمہارا

ایمونیٹن نہیں دیں گے۔ ہمارا ایک آدمی تمہارے ساتھ جائے گا اور بنوں میں داخل کر

کے واپس آجائے گا۔“

”بابا جان!“ — میں نے کہا۔ ”اگر آپ میری رانقل اور ایمونیٹن یہاں رکھنا

چاہتے ہیں تو پھر مجھے بھی یہیں رکھیں۔ انگریزوں کو ہماری اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی

رانقل اور ایمونیٹن کی ہوتی ہے۔ میں اگر بغیر رانقل اور ایمونیٹن کے واپس گیا تو وہ

اس جرم میں میرا کورٹ مارشل کر دیں گے کہ میں پٹھانوں کے پاس خود ہی چلا گیا تھا اور

بدنیتی سے اپنی رانقل اور ایمونیٹن پٹھانوں کو دے آیا ہوں۔ اس کی کم سے کم سزا جو

مجھے ملے گی وہ دو سال ہوگی۔ اس سے تو آپ اچھے ہیں جو مجھے بغیر کسی شرط کے آزاد کر

رہے ہیں۔ آپ نے مجھ پر اتنا رحم کیا ہے تو یہ رحم بھی کریں کہ میری رانقل اور

ایمونیٹن مجھے دے دیں ورنہ میں مارا جاؤں گا۔“

جرگے کے ملکوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور مجھے اجازت دے دی کہ میں

رانقل اور ایمونیٹن ساتھ لے لوں۔

اُس روز بہت دیر ہو گئی تھی اس لئے مجھے میرے میزبانوں کے ساتھ رات گزارنے

کے لئے بھیج دیا گیا۔ اگلے روز علی الصبح مجھے جگایا گیا۔ بوڑھے پٹھان کا بیٹا جو ادھیڑ عمر تھا

میرے ساتھ چل پڑا۔ یقین کریں کہ میرے اندر کوئی ایسی قوت بیدار ہو گئی تھی جو مجھے

وہاں سے نہیں آنے دے رہی تھی۔ میں جب وہاں سے چلا تو میرے آنسو نکل آئے

تھے۔ میں وہاں سے جو تحفہ لے کر آیا وہ یہ تھا کہ میرے اندر آزادی کا جذبہ پیدا ہو گیا

تھا۔

مجھے اندازہ نہیں کہ ہم نے کتنا فاصلہ طے کیا تھا کیونکہ زیادہ تر سفر پہاڑی تھا۔ ہم

جب بنوں کے دروازے پر پہنچے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ شہر کے دروازے ابھی

کھلے ہوئے تھے۔ میرا میزبان باہر سے ہی واپس چلا گیا۔ میری بیٹالین عارضی طور پر بنوں

آئی تھی۔ میں پیدل چلتا وہاں گیا تو اپنی پٹلن کو وہیں پایا۔ جب میں اپنی پٹلن میں پہنچا تو

جس جس نے مجھے دیکھا وہ یوں دوڑا آیا جیسے میں اگلے جہان سے واپس مڑا ہوں۔

صوبیدار میجر کو اطلاع دی گئی تو اُس نے حکم دیا کہ اسے کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا

جائے۔ مجھ سے رانقل اور ایمونیٹن لے کر کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا۔ اگلے روز پہلے

میری پیشی کمپنی کمانڈر کے سامنے ہوئی۔ اُسے میں نے ساری بات سنائی کہ میں کہاں چلا

گیا تھا۔ پھر مجھے کمانڈنگ آفیسر کے سامنے لے جایا گیا۔ وہاں پھر مجھے وہی کہانی سنائی

پڑی۔ مجھ پر بہت جرح ہوئی، آخر اللہ نے کرم کیا کہ مجھے بری کر دیا گیا۔ بعد میں پتہ چلا

تھا کہ میرا انگریز کمانڈنگ آفیسر اس بات پر بہت خوش ہوا تھا کہ میں اپنی رانقل اور

ایمونیٹن ساتھ لے آیا ہوں۔

○

ہماری بیٹالین عارضی طور پر بنوں گئی تھی۔ مجھے واجدہ یاد آنے لگی تھی۔ میں

دعائیں کرتا تھا کہ بیٹالین جلدی اپنی چھاؤنی میں واپس جائے اور میں واجدہ کو دیکھوں۔

اُس سے ملنا تو آسان نہیں تھا، اتنا ہی کافی تھا کہ جنگلے سے اُسے دُور سے دیکھ لیتا، لیکن حکم

ایکاکہ ہماری بیٹالین اب بنوں میں ہی رہے گی۔ ہمیں قلعے کے اندر بھیج دیا گیا۔

اس قلعے کا نام فورٹ ایڈورڈ ہے۔ اس میں ایک پلٹن کے رہنے کے لئے جگہ تھی۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر بھی قلعے کے اندر ہی تھا۔ معلوم نہیں اب یہ قلعہ کیسا ہے۔ اُس زمانے میں اس کی دیواریں کچی اور اوپر سے اتنی چوڑی ہوا کرتی تھیں کہ ایک نیل گاڑی ان پر چل سکتی تھی۔

میں واجدہ کی یاد میں بے قرار رہا۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ آصف نہ جانے اُس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہو گا۔ میں نے اپنے دوست صداقت کو خط لکھا کہ واجدہ کبھی گھر آئے تو اُسے میرا سلام کہے اور اُس سے خط لکھوا کر میرے بنوں کے ایڈریس پر پوسٹ کر دے۔

دس گیارہ دنوں بعد صداقت کا جواب آیا۔ اس لفافے میں واجدہ کا خط بھی تھا۔ آصف اُن دنوں دس دنوں کی چھٹی گیا ہوا تھا۔ وہ اپنے گاؤں چلا گیا تھا اور واجدہ اپنے ماں باپ کے پاس آئی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے لکھا ہے کہ صداقت واجدہ کے قریبی رشتہ داروں میں تھا اور وہ بلا روک ٹوک اُس کے گھر جاتا اور اُس کے پاس الگ بیٹھتا بھی تھا۔ صداقت رشتہ داری کے علاوہ بڑا بھلا لڑکا تھا۔ اُس پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جاتا تھا۔ اُس نے اپنے خط میں لکھا کہ اُس نے واجدہ تک میرا سلام پہنچا دیا تھا اور واجدہ سلام کے جواب میں خط لکھ رہی ہے۔

واجدہ نے بڑا جذباتی خط لکھا تھا۔ جس طرح میں اُسے دیکھنے کو چاہتا اور بے قرار تھا اسی طرح وہ بھی میرے لئے تڑپ رہی تھی۔ آصف کے رویتے کے متعلق اُس نے لکھا کہ اب اس میں کچھ تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ یہ تبدیلی کوئی اچھی نہیں تھی۔ اُس نے اب واجدہ پر ہلکا ہلکا رعب بھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ تبدیلی اُس دن کے بعد آنی شروع ہوئی تھی جس دن اُس نے مجھے اپنے فیملی کوارٹروں کے قریب جنگلے کے پاس کھڑا دیکھ لیا تھا اور پھر اسی رات وہ میرے پاس آیا تھا اور اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں پھر واجدہ سے ملا تو وہ مجھے غائب کر دے گا۔ میں نے اُس کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔

واجدہ نے لکھا کہ آصف اسے کہتا ہے کہ اس پنج ذات کے آدمی سے تعلق توڑلو ورنہ وہ میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا یا میں بالکل ہی اسے غائب کر دوں گا۔ واجدہ اُس سے کہتی تھی کہ ایسی غلطی نہ کرنا ورنہ میرے پیارے محروم ہو جاؤ گے اور میں بتا نہیں سکتی کہ میں اور کیا کر بیٹھوں..... اس خط سے یہ صورت سامنے آئی کہ آصف اور واجدہ

میں کشمکش یا چپقلش شروع ہو گئی تھی۔ واجدہ نے لکھا تھا کہ وہ اس شخص سے دب کر نہیں رہے گی۔ اُس نے یہ خطرناک بات بھی لکھی کہ آصف کا رویتہ صحیح نہ ہوایا مزید بگڑ گیا تو وہ مجھے یہی مشورہ دے گی کہ اس شخص کو باہر ہی کہیں قتل کرادو۔ اگر اسے باہر قتل نہ کرایا جاسکا تو واجدہ خود اُسے ایسے طریقے سے زہر پلائے گی کہ کسی کو واجدہ پر شک نہیں ہو گا۔

میں نے اُسی روز صداقت کو خط لکھا جس میں بڑے پرزور طریقے سے لکھا کہ وہ واجدہ کو سختی سے سمجھا دے کہ جو باتیں اُس نے آصف کو راستے سے ہٹانے کی لکھی ہیں وہ نہ لکھا کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خط کسی اور کے ہاتھ لگ جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

○

مجھے واجدہ تو نہ ملی لیکن میرے دوست حمید کو عائشہ مل گئی۔ یہ ایک معجزہ تھا۔ میں سنا چکا ہوں کہ عائشہ مزارعوں کی بیٹی تھی اور وہ طلاق یافتہ بھی تھی اور اُس کے ساتھ بہت بڑا خطرہ یہ وابستہ تھا کہ اُس پر جن آتا تھا جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ اُسے عائشہ کے ساتھ اتنی محبت ہے کہ وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ عائشہ کسی اور کی بیوی بنے۔ یہ تو میں پہلے ہی تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ عائشہ کے اس جن کی حقیقت کیا تھی۔ یہ ایک ناکم تھا جو کھیل کر اُس نے اپنے پہلے خاوند سے طلاق لی تھی لیکن گاؤں میں اُس نے اپنے دل میں حمید کی محبت بٹھالی تھی اور حمید اُس کی محبت میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ ان کی شادی ناممکن تھی۔

ایک تو ذات میں فرق تھا اور سوشل سٹیشن میں تو زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ واقعہ یاد کریں جو میں تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ ان کے گاؤں کا شاہ عائشہ کے پیچھے پڑ گیا تھا اور عائشہ کے ماں باپ شاہ کے مطالبے کے مطابق اسے مجبور کرتے تھے کہ وہ اکیلی شاہ کے گھر جائے۔ عائشہ تو اُس کے گھر نہ گئی۔ اس کی بجائے میں اور حمید ایک رات شاہ کے گھر پہنچ گئے اور پھر کس طرح ہم دونوں نے اُسے مارا پیٹا اور ایک درخت کے ساتھ باندھ کر آگے تھے۔ ہم نے یہ ظاہر کیا تھا کہ ہم اسے ابھی قتل کریں گے لیکن وہ لمبا اٹھل۔ حمید نے اُسے کہا تھا کہ وہ عائشہ کے ماں باپ سے کہے کہ وہ اس کی شادی حمید کے ساتھ کریں اور پھر حمید کے ماں باپ سے کہے کہ وہ اس کی شادی عائشہ کے ساتھ

کریں۔ اگر ان کی شادیاں ادھر ادھر ہو گئیں تو دونوں کی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔

میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ گاؤں کے لوگوں نے شاہ کو درخت کے ساتھ بندھا ہوا دیکھا تو شاہ نے یہ مشورہ کر دیا کہ رات کو اُسے جنت اٹھالائے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف گاؤں میں ہی نہیں بلکہ ارد گرد کے دیہات میں بھی شاہ مشہور ہو گیا کہ اس کے قبضے میں جنت ہیں جن میں بعض جن شیطان فطرت ہیں۔ ان میں سے ایک جن کسی طرح شاہ کے قبضے سے نکل گیا اور شاہ کو درخت کے ساتھ باندھ کر بھاگ گیا تھا۔

حمید نے مجھے بتایا کہ جب کچھ زیادہ عرصہ ہو گیا اور شاہ نے عائشہ کی اس کے ساتھ شادی کی بات نہ چلائی تو حمید نے گاؤں میں اپنے ایک بد معاش قسم کے دوست کو خط لکھا کہ شاہ کو میرا یہ پیغام پہنچادے کہ تم نے ابھی تک میرا کام نہیں کیا، اگر تم نے تھوڑا ہی عرصہ اور میرا کام نہ کیا تو تم پر دوسرا حملہ پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گا۔

شاہ جو لوگوں کی نظروں میں پہلے سے زیادہ برگزیدہ اور مقبول ہو گیا تھا، حمید سے اتنا خوفزدہ تھا کہ اُس نے حمید کے دوست سے کہا کہ حمید کو تہی دے دو کہ تمہارا کام جلدی ہو جائے گا۔ شاہ نے یہ بھی کہا تھا کہ کام مشکل ہے اور وہ اس کے لئے زمین ہموار کر رہا ہے۔ ایک روز حمید میرے پاس بیرک میں آیا۔ وہ اتنا زیادہ خوش تھا کہ اس کے منہ سے صحیح بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ اُس نے اپنے والد صاحب کا خط دکھایا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ حمید کو فوراً "بلاؤ اگر اُس نے دیر کر دی تو اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اُس کے والد صاحب نے بات بالکل صاف لکھ دی تھی کہ اُس کی شادی عائشہ کے ساتھ کرانی ہے۔

حمید کو شادی کے لئے ایک ہفتے کی چھٹی مل گئی۔ میں نے بھی ایک معقول بہانہ تراش کر پانچ دنوں کی چھٹی لے لی۔ حمید کہتا تھا کہ تمہارے بغیر میری شادی مکمل نہیں ہوگی۔

میں اپنے گھر پہنچ گیا اور حمید مجھے یہ کہہ کر اپنے گاؤں چلا گیا کہ شادی کا جو دن مقرر ہو گا وہ مجھے بتادے گا۔ اگلے ہی روز حمید کے گاؤں سے ایک آدمی یہ پیغام لے کر آیا کہ دو روز بعد حمید کی شادی ہے۔ شادی کا دن بہت ہی جلدی مقرر کیا گیا تھا۔ دیہات میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔ میں یہ سننے کے لئے بیٹاب تھا کہ شاہ نے یہ چکر کس طرح چلا لیا ہے۔ میں

نے لکھا ہے کہ یہ شادی ناممکنات میں سے تھی۔

میں حمید کے گاؤں ایک دن پہلے ہی جا پہنچا۔ وہ تو سوائے ہسنے کے کوئی بات ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ شاہ نے ناممکن کو ممکن کس طرح کر دکھایا ہے۔ میری یہ داستان پڑھنے والے خواتین و حضرات غور کریں کہ ہمارے دیہاتی (اور شہری) معاشرے پر بیروں اور شاہ صاحبوں کی گرفت کتنی سخت ہے کہ وہ جو چاہیں لوگوں سے کروا سکتے ہیں۔

حمید نے چھٹی آکر عائشہ سے ملاقات کی اور اُس سے پوچھا کہ یہ چکر کس طرح چلا ہے۔ عائشہ نے اُسے بتایا، پھر وہ شاہ سے ملا۔ شاہ نے بھی اُسے اپنا یہ کمال بتایا۔ یہ بات اس طرح بنی کہ عائشہ کی ماں بھی اور باپ بھی شاہ کے ہاں جاتے رہتے تھے۔ ان کی ایک ہی مراد تھی کہ عائشہ کی کہیں شادی ہو جائے۔ شاہ کہتا تھا کہ عائشہ اُس کے پاس آگئی آئے لیکن عائشہ نہیں جاتی تھی۔ ماں باپ کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ عائشہ جوان ہے، خوبصورت ہے اور بڑی شوخ اور چنچل ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کے ساتھ درپردہ دوستی لگالے۔ عائشہ کے رشتے کے لئے تو کوئی آتا ہی نہیں تھا۔ دُور دُور مشہور ہو گیا تھا کہ عائشہ پر بڑا ہی خطرناک جن آتا ہے۔

عائشہ ایک بات نہیں سمجھ رہی تھی۔ پہلے شاہ اسے بدینتی سے بلاتا تھا لیکن اب اُس کا مطلب کچھ اور تھا۔ اُس نے مجھ سے اور حمید سے جو بڑی مار کھائی تھی اور پھر حمید نے اُسے جو دھمکی دی تھی اس کے مطابق وہ حمید کو خوش کرنے کی فکر میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عائشہ ایک بار آجائے تو اُسے وہ سمجھا دے کہ اب اُس نے کیا نائک کھیلنا ہے لیکن عائشہ کے دل میں اُس کے لئے ایسی نفرت بیٹھ گئی تھی کہ وہ شاہ کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔

شاہ کسی کی زبانی اسے یہ پیغام نہیں بھیج سکتا تھا کہ اُس نے عائشہ سے ڈرامہ کرانا ہے۔ یہ ایسا راز تھا جو وہ کسی کو نہیں دے سکتا تھا۔ ایک روز شاہ نے عائشہ کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھ لیا۔ شاہ دُور کا چکر کاٹ کر کھیتوں میں گیا اور عائشہ کے راستے میں آگیا۔

”شاہ جی!“ عائشہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”آپ کے قبضے میں بہت جن ہوں گے لیکن میں ایسی شیطان جن ہوں جو کبھی بھی آپ کے قبضے میں نہیں آؤں گی۔ میں آپ کی حقیقت سے واقف ہوں۔ میرے راستے میں نہ آئیں۔“

”یہ قیوف لڑکی!“ شاہ نے کہا۔ ”میں نے تم سے کوئی اور کام کروانا ہے اور تم

سے لینا کچھ بھی نہیں..... آج ہی رات یا کل دن کو وہی تماشا دکھا دو۔“
”کون سا تماشا؟“

”وہی جن والا تماشا“۔ شاہ نے کہا۔ ”میں نے حمید کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کرنا ہے۔ تم نے اُسی طرح کرنا ہے جیسے پہلے شہر میں کیا تھا۔ تمہارے ماں باپ میرے پاس ہی آئیں گے۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔ میں نے تمہاری شادی حمید کے ساتھ کرانی ہے۔“

عائشہ حمید کا نام سن کر مان گئی۔ اُسی شام گاؤں والوں نے دیکھا کہ عائشہ کا باپ شاہ کے گھر کی طرف دوڑا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا کہ عائشہ کو جن پڑ گیا ہے۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ یہ سن کر کئی عورتیں عائشہ کے گھر کی طرف دوڑ پڑیں۔ انہوں نے دیکھا کہ عائشہ کسی کے ہاتھ نہیں آ رہی۔ وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے اچھلتی تھی۔ وہ آخر جوان تھی۔ اُس کے جسم میں طاقت تھی۔ عمو توں کے قابو میں تو وہ آہی نہیں رہی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ شاہ جی کو بلاؤ۔

شاہ بھی آگیا اور اُس نے آتے ہی اپنا ٹانگ دکھانا شروع کر دیا۔ اُس نے پہلے تو جن کو گالیاں دیں پھر کہا کہ وہ اسے زندہ جلا دے گا۔ عائشہ نے یہ ڈرامہ پہلے کھیلا ہوا تھا اور اس میں کامیاب بھی رہی تھی اس لئے وہ بڑی خوش اسلوبی سے ایکٹنگ کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جن کسی پر آتا ہے تو وہ کس طرح بولتا ہے۔

شاہ نے ”جن“ کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ پہلے تو دونوں ایک دوسرے کو دھمکیاں دیتے رہے پھر شاہ دوستانہ باتوں پر آگیا۔ اس کمرے میں گاؤں کی بہت سی عورتیں تھیں اور کچھ آدمی بھی آگئے تھے۔ شاہ نے کسی کو بھی نہ کہا کہ باہر چلے جائیں۔ وہ یہ ٹانگ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دکھانا چاہتا تھا۔ آخر ”جن“ نے ایک حکم دیا۔

”حمید کے ماں باپ کو فوراً بلاؤ“۔ عائشہ نے کہا جسے لوگ جن کی آواز سمجھ رہے تھے۔ ”وہ آئیں گے اور میری بات مانیں گے تو ہی میں رخصت ہوں گا۔“
تماشاویوں میں سے کوئی شاہ کے کہنے پر دوڑا گیا۔ تھوڑی دیر بعد حمید کی ماں اور اُس کا باپ دوڑے آئے۔

”لو بھائی!“۔ شاہ نے ”جن“ سے کہا۔ ”تمہارے حکم کی تعمیل ہو گئی ہے۔“

حمید کے والدین آگئے ہیں۔
”دونوں میرے قریب آؤ“۔ عائشہ نے جن کی زبان میں کہا۔ دونوں اُس کے قریب ہوئے تو عائشہ نے کہا۔ ”مجھے اس لڑکی کے ساتھ اتنی زیادہ محبت ہے کہ میں

اس کی شادی اُس لڑکے کے ساتھ کراؤں گا جو مجھے پسند ہے۔ اس کا پہلا خاوند مجھے پسند نہیں تھا اس لئے میں نے اُس سے اسے آزاد کر لیا تھا۔ میرے پیر استاد نے کہا ہے کہ اس کی شادی حمید کے ساتھ کراؤ۔ اب تم دونوں بیٹے کی شادی اس لڑکی سے کرا دو۔ اگر نہیں کراؤ گے تو میں تمہارے بیٹے کو اُسی دن مار ڈالوں گا جس دن تم اس کی شادی کسی اور لڑکی کے ساتھ کرو گے۔ ان کی شادی جلدی کرا دو۔ میں اس لڑکی کو پھر کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ میں ان دونوں کی قسمت چکا دوں گا۔“

حمید کے والدین تو بے بن گئے۔ انہیں یہ جو ڈالبل پسند نہیں تھا۔
”مت سوچو“۔ جن نے کہا۔ ”میں نے اس لڑکی کو نہیں چھوڑنا تھا۔ میں نے اس کو بھی اور حمید کو بھی غائب کر دینا تھا لیکن میں ان شاہ جی کا حکم نہیں ٹال سکتا۔“
”تم اب چلے جاؤ“۔ شاہ نے کہا۔ ”میں ان کی شادی کرا دوں گا۔“

شاہ نے ویسے ہی کچھ دیر ہونٹ ہلائے جیسے کچھ پڑھ رہا ہو، پھر اُس نے عائشہ کے سر سے پاؤں تک پھونک ماری۔ اُس نے عائشہ کو آنکھ کا اور ایک انگلی کا اشارہ دے دیا تھا۔ عائشہ نے ایسی انگڑائی لی جیسے اپنی ہڈیاں توڑ دے گی۔ پھر اٹھ بیٹھی اور حیرت زدہ نظروں سے ہر طرف دیکھنے لگی۔

”مجھے کیا ہوا تھا؟“۔ اُس نے خوفزدگی کے عالم میں پوچھا۔
”کچھ نہیں عائشہ!“۔ شاہ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔
”میرا جسم دکھ رہا ہے“۔ عائشہ نے رونے جیسی آواز بنا کر کہا۔
شاہ نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر عائشہ پر پھونک ماری۔
”اب؟“

”اب کچھ آرام آیا ہے“۔ عائشہ نے کہا۔
شاہ نے عائشہ اور حمید کے ماں باپ کو ساتھ لیا اور دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔
انہیں اس جن سے ڈرایا اور حمید کے ماں باپ سے کہا کہ حمید کی شادی عائشہ کے ساتھ کر دیں ورنہ جوان بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

حمید کے ماں باپ کے لئے مسئلہ پیدا ہو گیا۔ شاہ نے انہیں اور زیادہ ڈرایا اور حوصلہ ڈالا بھی کی۔ انہوں نے اپنے رشتہ داروں اور گاؤں کے بھروسے بات کی۔ سب نے ناکاک بیٹے کی شادی عائشہ کے ساتھ کر دو۔ اونچ نیچ نہ دیکھو۔
یہ ٹانگ کامیاب رہا اور حمید اور عائشہ کی شادی ہو گئی۔

میں ماضی بید کی باتیں سنارہا ہوں۔ ان وقتوں کے کچھ لوگ ابھی باقی ہیں میرا خیال ہے میری باتیں ان ہی پرانے لوگوں کو اچھی لگتی ہوں گی نئے دور کے لوگ بیزار ہوتے ہوں گے کہ ماضی کی دلدل میں پھنسا ہوا یہ بوڑھا ماضی کس کو پیچھے کو لے جانے کے جتن کر رہا ہے۔

میں نے پہلے بھی کہا ہے، اب بھی کہتا ہوں کہ میں عالم فاضل نہیں، نفسیات اور عمرانیات کا ریٹائرڈ پروفیسر نہیں اور میں فلسفے اور منطق سے بھی واقف نہیں، میں۔ اچھے برے، بہت ہی اچھے اور بہت ہی برے انسانوں کو پڑھا ہے۔ میں نے ان حالات مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے جو خود ہی پیدا ہو کر انسان کو بے حال اور بے بس کر دیا کرتے اور ان حالات کا بھی جو انسان اپنی حماقتوں اور اپنی لغزشوں سے خود پیدا کیا کرتا ہے۔ تجزیہ اسے نہیں کہتے کہ حالات نے انسان کے ساتھ کیا سلوک کیا بلکہ صحیح تجربہ ہوتا ہے کہ انسان نے حالات کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

کئے والے ٹھیک کہتے ہیں کہ زندگی ایک سفر ہے۔ اس سے وہی انسان کچھ سیکھ اور دوسروں کو بھی سکھا سکتا ہے جو گرد و پیش کو دیکھتا جائے اور یہ کیوں اور وہ کیسے جواب اور جواز ڈھونڈتا جائے۔ کہیں ٹھوکر کھائے تو اپنے آپ کو سمجھائے کہ سفر آنکھیں اور دل و دماغ کے درمیان کھلے رکھے جائیں۔

میں پٹھانوں کا قیدی ہوا تو مجھے خوفزدہ ہو کر کڑھنا اور پریشان ہونا چاہئے تھا کہ یہ گولی مار دیں گے یا بیوشہ کے لئے قید میں رکھیں گے لیکن میں نے دماغ کو حاضر رکھا اس کے نتیجے میں مجھے ان مجاہد اور غیور پٹھانوں سے وہ خزانہ ملا جو قارون کے پاس نہیں تھا۔

میں نے کہیں بڑے پتے کی بات پڑھی تھی۔ ایک انگریز مفکر نے لکھا تھا کہ ذہن ایک ڈرامہ ہے لیکن اس میں ہیرو جو کر کے رول میں نظر آتے ہیں اور جو کر ہیرو کا ادا کر جاتے ہیں۔

پاکستان کے آج کے معاشرے میں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہیرو کون، ولن کون جو کر کون ہے۔ سیاست میں دیکھ لیجئے، مذہب میں دیکھ لیجئے۔

معلوم نہیں میں اپنا کتنا نظروں پر واضح کر سکا ہوں یا نہیں۔ آج کی نسل اپنے آپ ترقی یافتہ سمجھتی ہے کیونکہ گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ یہ بھی ترقی

تخلی ہے کہ یہاں امریکہ جیسے جرائم شروع ہو گئے۔ پتلے ہم بیک ڈیکٹیوں کی کمائیاں باہر کے انگریزی رسالوں میں پڑھا کرتے تھے اور ان کے ترچے ہمارے اردو رسالوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان میں آئے دن بیک ڈیکٹی کی فہرست آتی ہیں۔

ترقی تو بہت ہوئی ہے۔ سیلی اب فرینڈ کلماتی ہے۔ اس لڑکی کو پسند کرتے ہیں اس کا بوائے فرینڈ نہ ہو۔ حجام کی دکان اب سیز کنگ سیلون کلماتی ہے۔ جی ہاں! ترقی بہت ہوئی ہے لیکن ذہن کرپٹ ہو گیا ہے۔

ترقی زمانے نے کی ہے ذہن نے نہیں! پسندگی کے دور میں ہمارے ذہن ترقی یافتہ ہوئے تو ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزاد ملک بنالیا۔

ترقی یافتہ دور میں ہماری اگلی نسلوں کے ذہن ترقی کر گئے تو ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ حکمرانوں نے ملک کو امریکہ کا غلام بنادیا اور نو جوان ذہن مغرب کے کلچر کے غلام بن گئے۔

میں اپنی اس تحریر میں اپنے آپ کو ہیرو نہیں بنارہا۔ اپنے آپ کو دانشمند ثابت نہ کر رہا۔ میں نے جو دیکھا وہ بیان کر رہا ہوں۔ اس پر غور کریں۔ کچھ باتیں کام کی ہیں۔

○

حمید اور عائشہ کی شادی ہو گئی۔ یہ تو تفصیل سے سنایا ہے کہ یہ شادی کس طرح ہوئی۔ جس شاہ نے یہ شادی کرائی تھی، اسے میری اور حمید کی پھینٹی ایسی راس آئی آج اس کا ہر سال عرس ہوتا ہے اور اس کی گدی پر اس کا بیٹا بیٹا اپنے علاقے کے لاپرواہ حکومت کر رہا ہے۔ اس گدی کے متعلق مشہور ہے کہ جنت بھی سلام کو آتے۔

اگر کسی کا یہ خیال ہے اس شاہ کو دیہات کے پسند لوگ ہی پیر مانتے اور اپنی نیکی پوری کرانے اس کے ہاں جاتے ہوں گے تو وہ شخص بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا۔ کابل اور یونیورسٹیوں کے ڈگری یافتہ لوگ اس پیر کے مرید ہیں اور یہی تعلی یافتہ اس پیر کی کرامات اور معجزے نشر کرتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔

حمید کو فوت ہوئے چار سال گزر گئے ہیں۔ عائشہ زندہ ہے۔ میری طرح بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔ کبھی کبھار اس کے گاؤں جاتا ہوں۔ ہمارا پیار آج بھی تروتازہ ہے۔ ڈیڑھ دو مہینے گزرے، میں اپنے قصبے کے بازار سے کچھ لینے گیا تو وہاں عائشہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنی ایک پوتی کی شادی کے کپڑے لینے آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ میں انہیں اپنے گھر لے آیا۔

”خلی!“ — عائشہ نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے مجھے کہا — ”ان پڑھے لکھے لوگوں سے تو ہم ان پڑھ اور گنوار اچھے تھے۔ اس پیر کے مزار پر جو عرس ہوتا ہے، کبھی وہ دیکھنے ہمارے گاؤں آتا۔ بعض مرید کاروں میں آتے ہیں۔ لوگوں کو میں نے اس شاہ کے مزار پر سجدے کرتے دیکھا ہے جسے تم نے اور حمید نے درخت کے ساتھ باندھ کر بیدوں سے پٹا تھا۔۔۔۔ میں دوسروں کی کیا کموں، میری اپنی اولاد پڑھ لکھ کر بھی اس پیر کی مرید ہے۔ میری ایک بہو ہر نئے چاند کی پہلی جمعرات مزار پر دیا جلاتی ہے۔ میں نے انہیں صرف ایک بار کہا تھا کہ اس گدی کی اصلیت کیا ہے۔ سب نے کہا، ”تم تو پیروں کی بددعائی ہوئی ہو۔“

”انہیں سنا دینا تھا کہ حمید کے ساتھ تمہاری شادی کس طرح ہوئی تھی۔“ — میں نے کہا۔

”نہ خالی!“ — اس نے ہنستے ہوئے کہا — ”یہ بات تو میں کسی کو بھی نہیں سنا سکتی۔ میں تو اللہ کو یاد کرتی ہوں۔ وہی دینے والا ہے، وہی لینے والا ہے۔ مجھے حمید اللہ نے دیا تھا لیکن یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ اللہ نے ہمیں پاکستان دیا تو میں کہتی تھی کہ اب لوگ اللہ کو ہی حکمران سمجھیں گے لیکن یہاں تو پیروں کی حکمرانی ہے۔“

”لوگوں کو انہی کے حال پر چھوڑ دے عائشہ!“ — میں نے کہا — ”ہر کسی نے اپنی قبر میں جانا ہے۔ تم اپنی قبر کی ٹھنڈک سالمان کرو۔“

عائشہ جب بھی ملتی ہے، ہم ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔



آئیے، میں آپ کو جوانی کے وقتوں میں لے چلتا ہوں جہاں سے میرا یہ سفر شروع ہوا تھا۔

میں تو یہ سمجھا تھا کہ دنیا واجدہ پر جا کر ختم ہو جاتی ہے اور یہی میری منزل ہے۔ میں

اس کی خاطر جان تک کا خطرہ مول لینے کو تیار ہو گیا تھا اور میں نے اپنے آپ کو خطروں میں ڈالا بھی تھا۔ میں نے فوجی نوکری کیا کرنی تھی، یہ تو ایک مجبوری تھی کہ میں فوج میں چلا گیا اور واجدہ مجھ سے چھن گئی۔ میں نے اس کو زندگی کا سب سے بڑا چیلنج سمجھ لیا اور نہہ کر لیا کہ واجدہ کو حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ یہ تو میں سنا چکا ہوں کہ میں نے واجدہ کے خاندان کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پھر مجھے دوست ملا تو حمید ملا۔ وہ عائشہ کو چاہتا تھا اور اسی کو زندگی کا مقصد سمجھتا تھا۔ میں جب قبائلی پٹھانوں کے خلاف لڑنے کے لئے گیا تھا تو دل پر یہ خوف طاری تھا کہ میں مارا جاؤں گا۔ میں پٹھانوں کا قیدی ہو گیا تو میں سمجھا کہ بس زندگی یہیں پر ختم ہو گئی ہے لیکن میں اس بوڑھے پٹھان کے سامنے بیٹھا اور اس کی باتیں سنیں تو میں نے محسوس کیا کہ زندگی تو یہاں سے شروع ہوئی ہے۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں بد معاش تھا یا ڈاکو اور چور اچکا تھا اور میں یک لخت مومن بن گیا۔ آپ نے ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی کہ ایک ڈاکو ڈاکہ ڈال کر جنگل میں جا رہا تھا تو اسے کوئی صوفی یا درویش مل گیا۔ اس نے ڈاکو کے ساتھ ایسی باتیں کیں کہ ڈاکو متاثر ہو گیا اور اس نے اسی وقت توبہ کر لی اور گھر جا کر تسبیح پڑھتا تھا۔ میں اور اللہ اللہ کرنے بیٹھ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بزرگ قبائلی پٹھان سے متاثر ہو گیا تھا لیکن میں اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کرتے ہوئے بھی زندگی کا یہ چیلنج نہیں بھولا تھا کہ میں نے واجدہ تک پہنچا ہے۔

ہاں، البتہ یہ ضرور ہوا کہ میں جب قید سے رہائی پا کر واپس اپنی بیالین میں آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ میں اب قید ہوا ہوں، پٹھانوں کے ہاں تو میں آزاد تھا۔ میں نے اپنے اندر ٹھٹھن سی محسوس کی۔ میں اس ٹھٹھن کو سمجھتا بھی تھا لیکن مجھ میں اتنی عقل نہیں تھی کہ میں کچھ سوچ سکوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ دوسری طرف یہ حال تھا یا دل کی یہ کیفیت تھی کہ واپس آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنے دوست صداقت کو خط لکھا کہ وہ واجدہ کے متعلق کچھ جانتا ہے تو مجھے لکھے۔ یہ تو میں سنا چکا ہوں کہ واجدہ کا خط آیا جس میں اس نے صاف لکھا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ اس کے خاندان نے اس کے ساتھ اپنا رویہ درست نہ کیا تو وہ اسے صاف کرا دے گی۔ اس نے مجھے بھی یہی کہا تھا کہ مجھے جہاں کہیں موقع ملے میں آصف کو قتل کر دوں۔

میں دراصل دو حصوں میں بٹا جا رہا تھا۔ ایک طرف مجھے قبائلی پٹھان یاد آتے تھے

جنیس میں نے لڑتے دیکھا تھا اور ان کی باتیں سنی تھیں دوسری طرف واجدہ تھی جس کی یاد آتی تو میں تڑپ اٹھتا اور میرے ذہن سے نکل ہی جاتا کہ میں انگریزوں کا غلام ہوا اور مجھے قبائلی پٹھانوں جیسا غیرت مند ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں اپنا ہی غلام ہو گیا تھا۔ اسے خواہشوں کی غلامی کہتے ہیں۔ لوگ انگریزوں کی غلامی میں خوش تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں نے ہمارے دلوں میں خواہشیں پیدا کر دی تھیں۔ ایک خواہش یہ کہ افسر مجھ پر خوش رہیں اور مجھے تڑا ملتی رہے۔ دوسری خواہش یہ کہ میری جیب میں اتنے پیسے ہوں کہ میں باعزت زندگی بسر کر سکوں اور میرے خاندان کا وقار بڑھے۔ انگریز نے ہماری ان خواہشات کی تکمیل ہمیں یہ طریقہ ذہن نشین کر دیا کہ اپنے سے اوپر والے کی خوشامد کرو اور افسروں کو جھکا کر سلام کرو تو سب کچھ پالو گے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ ہمارے ہندوستانی لوگ خصوصاً فوج میں عہدیدار اور جمہدار، صوبیدار وغیرہ انگریزوں کی خوشامد کس قدر ذلیل طریقہ سے کیا کرتے تھے۔ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انگریز نے ذہنی طور پر بلکہ میں تو کھوں گا کہ روحانی طور پر ہمیں غلام بنالیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ انگریز بڑی ہی عیار اور مکار قوم ہے اور اتنی زیادہ عقلمند کہ انہوں نے باتوں باتوں میں ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ میرا خیال کچھ اور ہے۔ انگریزوں نے تہیہ کر لیا تھا اور وہ یہ عزم لے کر آئے تھے کہ ہندوستان پر قبضہ کرنا اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنا ہے۔ دوسری طرف ہم نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ ہم نے انگریز کو اپنا بادشاہ ہے۔ اگر کسی کو میری یہ بات سمجھ میں نہ آئے تو پاکستان کی جو موجودہ کیفیت ہے وہ دلائل لیں۔ کیا ہمارے حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں نے امریکہ کو اپنا ان داتا اور اپنا بادشاہ تسلیم نہیں کر لیا؟ پھر اپنی ابھرتی ہوئی نسلوں کی اخلاقی حالت دیکھ لیں۔ انہوں نے امریکہ کچھ کو اپنا لیا ہے اور اپنے کچھ کو بیکار اور دقیا نوسی سمجھ کر الگ پھینک دیا ہے۔ یہ انظار اپنے آپ ہی نہیں آیا، یہ امریکہ بڑے ہی پیارے اور پرکشش طریقوں سے لایا اور لایا گیا ہے۔ اسے کہتے ہیں ذہنی غلامی۔ امریکہ نے اپنے پاکستانی ایجنٹوں کے ذریعے اور اور طریقوں سے ہم لوگوں کے دلوں میں خواہشات پیدا کیں۔ دولت اکٹھی کرنے خواہش، اچھی سے اچھی عورت سے دوستی لگانے کی خواہش اور اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ اور برتر سمجھنے کی خواہش۔

یہ ساری باتیں کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ ہم لوگ ذہنی طور پر غلام ہو گئے تھے۔ میں پٹھانوں سے ایک تاثر لے کر واپس اپنے ملک اور اپنے ساتھیوں میں آیا تو میرا ذہن ہر آہستہ آہستہ واپس اسی مقام پر آنے لگا جہاں سے میں اسے قبائلی علاقے کے میدان جنگ میں لے گیا تھا۔ میں پھر خواہشوں کا غلام بننے لگا مثلاً "حید کی شادی عائشہ کے ساتھ ہو گئی تو میں نے از سر نو عہد کر لیا کہ میں واجدہ کو حاصل کر کے ہی رہوں گا۔"



پھر اچانک پیام اجل آگیا۔ اسے میں پیام اجل ہی کہوں گا۔ وہ یہ تھا کہ حکم آیا کہ بریلین فوری طور پر کلکتہ پہنچے۔ ہم سمجھ گئے کہ ہمیں برا فرٹ پر بھیجا جا رہا ہے۔ اس وقت برا کا حماز برا ہی گرم تھا۔ جاپانیوں نے پورے برا پر قبضہ کر لیا تھا اور جاپان کے بمبار طیارے کلکتہ کی بندرگاہ تک بمباری کر رہے تھے۔ بنگال کے بڑے بڑے تاجر اور سیٹھ وغیرہ وہاں سے ہندوستان کی طرف بھاگ گئے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کو تھوڑی سی تاریخ بھی سنا دوں۔ یہی وہ موڑ تھا جہاں سے ہندوستانیوں میں کچھ بیداری پیدا ہوئی۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ ہندوستان کے لیڈروں نے انگریزوں کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان کی آزادی کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ اس وقت انگریزوں کی حالت یہ تھی کہ جاپانیوں نے آج کے انڈونیشیا، سنگاپور، ملائیا اور براہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ انگریزوں کی فوجیں جن میں انڈین آری خاص طور پر شامل تھی، براہ سے بہت ہی بری حالت میں پسپا ہوئیں بلکہ بے طرح بھاگی تھیں۔ سنگاپور اور ملائیا میں تو پوری چلنیں ان کے جرنیلوں سمیت جنگی قیدی بن گئی تھیں۔ یہ ممکن ہی نظر نہیں آتا تھا کہ انگریز جاپانیوں سے ہندوستان کو بچالیں گے۔

میں آپ کو کچھ دلچسپ باتیں سنانا چاہتا ہوں۔ جاپان نے جنگ میں جو کامیابیاں حاصل کی تھیں وہ جاسوسوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھیں۔ برا، ملائیا، سنگاپور اور انڈونیشیا کے تمام علاقوں میں جاپان کے جاسوس موجود تھے جو جنگ کے دوران جاسوس نہیں بنے تھے بلکہ بہت عرصہ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ جاپان کی فوجیں جو بحری جہازوں میں آئی تھیں، ان کی راہنمائی ان کے جاسوسوں نے کی تھی جو جاپانی نہیں بلکہ مقامی لوگ تھے۔

ان جاسوسوں کی بعض کارروائیاں افسانوی سی لگتی ہیں۔ شاید کچھ انہیں حقیقی تسلیم

نہ کریں لیکن ہم فوجی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ بالکل سچی تھیں۔ مثلاً "جلیانی فوجیوں نے فرض کیا ملایا پر حملہ کیا اور اس کے ساتھ جلیان کے لڑاکا بمبار طیارے آتے تو جاسوسوں نے ان کی راہنمائی اس طرح کی کہ آپ نے کھیتوں میں دیکھا ہو گا کہ ایک مصنوعی انسان بنا کر کھڑا کیا ہوا ہے۔ ایک بانس زمین میں گاڑا ہوا ہے اس کے اوپر صلیب کی طرح ایک چھوٹا بانس باندھ کر اس پر قبض چڑھا دی جاتی ہے اور اوپر ہانڈی رکھ دی جاتی ہے۔

کوے یا دانے چکنے والے پرندے اسے انسان سمجھتے ہیں اور قریب نہیں آتے۔ ملایا میں ایسے ہی مصنوعی انسان کھیتوں میں گاڑے ہوئے تھے۔ جلیان کے بمبار طیارے آتے تھے تو ان مصنوعی انسانوں میں سے ایک یا دو اپنے ایک طرف کے بازو نیچے گرا دیتے تھے۔ ایک ایک بازو باہر یعنی کندھے کی لائن میں پھیلا ہوا ہوتا تھا۔ بمبار پائلٹ اس بازو کو دیکھتے اور سمجھ جاتے تھے کہ ان کا ٹارگٹ اس سمت کو ہے۔ یہ اشارے دینے والے انسان مصنوعی نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ اصلی انسان تھے جو جلیانیوں کے جاسوس تھے۔ وہ جلیانی بمبار ہوا بازو کی راہنمائی اس طریقے سے کرتے تھے۔ کسی کو ان پر شک نہیں ہوتا تھا۔

ہمیں معلوم ہوا کہ جلیانی ہوا بازو اور شاید ان کی فوج کے لئے بھی کچھ اور اشارے بھی مقرر تھے۔ مثلاً "ان علاقوں میں کیلا، ناریل اور پیتہ زیادہ ہوتا تھا۔ کسی سڑک پر کیلے کے درخت کے پتے بکھرے ہوئے ہوتے تو کسی کو خیال نہیں آسکتا تھا کہ ان پتوں کا اس کے سوا کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی پھینک گیا ہے۔ یہ جلیانی فوج کے بڑے افسر جانتے تھے کہ کیلے کے ان بکھرے ہوئے پتوں کا مطلب کیا ہے۔ یہ ایک اشارہ ہوتا تھا کہ یہاں قریب ہی کوئی اہم فوجی ٹھکانہ ہے۔

آج کل جاسوسی کے ایسے سائنسی آلات بنائے جا چکے ہیں کہ جاسوس اپنے کمرے میں بیٹھا سمندر پار پیغام بھیج سکتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور برطانیہ نے سائنسی طریقے اختیار کئے تھے۔ مثلاً "ایک عام سی تحریر کا خط کوئی آدمی اپنے کسی دوست کو لکھتا ہے اور یہ خط ٹاپ کیا ہوا ہے۔ اس میں جو فل شاپ دیئے گئے ہوتے ان میں پورے پورے پیغام چھپے ہوتے تھے۔ جہاں یہ خط جاتا وہاں تمام فل شاپ اس طرح بڑے کئے جاتے جس طرح کوئی فوٹو اس انگیٹو سے بڑا یعنی اتاراج کیا جاتا ہے۔ اس میں

جاسوس کا پیغام ہوتا تھا۔ جلیان نے ان علاقوں میں جہاں اس نے قبضہ کر لیا تھا جاسوس پہلے سے ہی بھیج دیئے تھے لیکن اس کے پاس ابھی تک کوئی سائنسی طریقہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے جاسوس کچھ اور ہی قسم کے اشارے دیتے تھے۔

البتہ ہندوستان میں جلیان کے جو جاسوس تھے، ان کے طور طریقے کچھ اور تھے۔ جاسوسی اور تخریب کاری ایک الگ موضوع ہے جس پر میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن یہ تحریر بڑی لمبی ہو جائے گی۔ میں اتنی ہی بات کروں گا جتنی عام قاری کے لئے دلچسپ ہوگی۔ میں چونکہ حوالدار کلرک تھا اس لئے میرا رابطہ افسروں کے ساتھ رہتا تھا۔ G.H.Q نے ایک خفیہ پمفلٹ لکھا تھا جو صرف افسروں تک پہنچایا گیا تھا۔ اس پمفلٹ میں وہ سارے طریقے لکھے گئے تھے جو جلیان کے مقامی ایجنٹوں اور جاسوسوں نے سنگاپور، ملایا اور برما میں استعمال کئے تھے۔ یہ برابری دلچسپ پمفلٹ تھا۔

جلیانیوں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا تھا جو جلیان کے لئے بہت ہی فائدہ مند تھا۔ آپ نے اکثر ایک نام سنا ہو گا۔ یہ ہے انڈین نیشنل آرمی اس طرح بنی تھی کہ کانگرس کا ایک بنگالی لیڈر سہاش چندر بوس بنگال سے فرار ہو کر جلیان چلا گیا تھا۔ اسے دراصل مہاتما گاندھی اور کانگرس کے پنڈت جو ہر لال نہرو جیسے لیڈروں نے اس پیغام اور پلان کے ساتھ بھیجا تھا کہ جلیان ہندوستان پر حملہ کرے تو کانگرس جو خالصتاً "ہندوؤں کی جماعت تھی، جلیانی فوج کی پوری پوری مدد اور راہنمائی کرے گی۔ اس پلان کے مطابق جلیان کی حکومت نے یہ کارروائی کی کہ اس نے انڈین آرمی کے افسروں اور سپاہیوں وغیرہ کی ایک الگ فوج بنائی جسے انڈین نیشنل آرمی کا نام دیا گیا۔

یہ ہندوستانی افسر اور جوان جلیان کے پاس موجود تھے اور ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں تھی۔ یہ وہ جنگی قیدی تھے جو سنگاپور، ملایا اور برما سے جلیانی فوج کے ہاتھ لگے تھے۔ یقین کریں کہ جلیانی فوج نے ہندوستانی فوج کی پوری پوری پلٹنیں پکڑ لیں اور ان سے ہتھیار ڈلو کر انہیں جنگی قیدی بنالیا۔

مثلاً "میں ایک ہلالین کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ یہ تھی آٹھویں پنجاب رجمنٹ کی فرسٹ ہلالین۔ اسے جلیانیوں نے ایک راؤنڈ بھی فائر کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ پوری کی پوری ہلالین سے ہتھیار ڈلو کر ساری نفری کو جنگی قیدی بنالیا تھا۔ ہمارے ہاں یعنی ہندوستان میں جو فوج تھی، اس میں ایک مذاق مشہور ہو گیا تھا کہ انگریزوں نے

انڈین آرمی کی دو ہائٹس سنگاپور اور ملایا ملک کے طور پر بھیجیں تو جاپانیوں نے انگریزوں کو یہ پیغام بھیجا کہ آپ کی دونوں ہائٹس بخیر و خوبی وصول پائیں، آپ کا شکریہ۔
 نقشے میں دیکھیں جاپان کتنی دور ملک ہے۔ اس کی فوجیں آج کے انڈونیشیا کے جزائر پر قبضہ کرنے کے لئے آتی ہیں۔ جاپانی حکومت کو معلوم تھا کہ یہ انگریزوں کی سلطنت ہے اور وہاں فوج موجود ہے۔ یہ علاقے جو دراصل چھوٹے بڑے ہزار ہا جزیروں کا مجموعہ ہے، جاپانی فوج کے لئے اجنبی علاقے تھے۔ اگر یہ ایک ہی ملک ہو تا تو یہ ساری جنگی ہوتی تو اور بات تھی لیکن یہ جزیرے ہی جزیرے تھے جن میں جاپانی اجنبی تھے لیکن جاپانی فوجیں اس طرح آئیں اور ان تمام جزیروں پر اس طرح پھیل گئیں اور انگریزوں کی فوج سے ہتھیار ڈالوا کر قابض ہو گئیں جیسے وہ ان ہزار ہا چھوٹے بڑے جزیروں کے ایک ایک انچ سے واقف تھیں۔ میں آپ کو حقیقت بتا چکا ہوں۔ یہ ان مقامی لوگوں کا کمال تھا جو جنگ سے بہت عرصہ پہلے سے جاپان کے جاسوس بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے جس طرح جاپانیوں کی راہ نمائی کی وہ میں نے مختصراً بیان کر دی ہے۔

○

بات ہو رہی تھی آئی این اے کی۔ جاپانیوں نے جنگی قیدیوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ ان سے اتنی زیادہ مشقت لی جاتی تھی جو انسانی جسم کے لئے قابل برداشت نہیں ہوتی تھی۔ خوراک اتنی کم اور ایسی خراب دی جاتی تھی کہ قیدیوں کے جسم کمزور ہوتے گئے۔ ان میں جو بیمار ہو جاتا یا زیادہ مشقت اور کم غذا کی وجہ سے بہت کمزور ہو جاتا، اسے گولی مار دی جاتی تھی۔ یہاں تک سنا تھا کہ جاپانی سپاہی جنگی قیدیوں کو درختوں کے ساتھ باندھ کر یا باندھے بغیر اپنے سامنے کھڑا کر کے ان پر سنگین بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ رانگل کے آگے سنگین جڑھی ہوتی ہے۔ سنگین بازی کی الگ تھلگ ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس میں یورپوں میں بھوسہ بھر کر دشمن کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اسے ڈمی کہتے ہیں۔ جاپانی فوج زندہ قیدیوں کو ڈمی کے طور پر استعمال کرتی۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ان زندہ فوجیوں کے جسم کس طرح چھلتی ہوتے ہوں گے بلکہ کس طرح چیرے پھاڑے جاتے ہوں گے۔

جب ہندو کانگریس کے لیڈر سہاش چندر بوس نے جاپان کے بادشاہ ہیرو ہٹو کے ساتھ معاملہ طے کر لیا اور ملایا برما وغیرہ میں انڈین نیشنل آرمی کی بنیاد رکھ دی۔ انڈین

آرمی کے جو ہزار ہا جنگی قیدی جاپان کے پاس تھے انہیں کہا گیا کہ اس طرح ایک فوج بنائیں۔ ہندوستانیوں کی بنائی گئی ہے اور یہ فوج ہندوستان کو آزاد کرانے کی اور پھر انگریز ہرجاں جائیں گے اور ہندوستان پر ہندوستانیوں کی اپنی حکومت ہوگی۔ جنگی قیدیوں کو اس فوج میں شامل ہونے کے لئے کہنے والوں میں ایک تو سہاش چندر بوس تھا اور اس کے ساتھ ہندوستانی فوج کے چند ایک ہندوستانی افسر تھے جو جنگی قیدی تھے۔ ظاہر ہے کہ انڈین آرمی کے ان افسروں اور جوانوں کو سبزی باغ دکھائے گئے تھے اور انہیں سب سے بڑی سہولت تو یہ نظر آئی کہ وہ جنگی قیدی نہیں رہیں گے بلکہ ایک فوج کے باقاعدہ فوجی بن کر جاپانیوں کے مہمان ہوں گے۔ جنگ کے بعد اس انڈین نیشنل آرمی کے جو جوان مجھے ملے، انہوں نے بتایا کہ وہ اس مشقت اور کم اور ناقص غذا سے بچنے کے لئے جو جنگی قیدیوں کی قسمت میں لکھی گئی تھی، آئی این اے میں شامل ہوئے تھے۔

آئی این اے کے سلسلے میں تین نام بہت مشہور ہوئے تھے۔ ان میں ایک مسلمان تھا۔ اس کا نام کمیشن شاہنواز تھا۔ ایک ہندو تھا اور ایک سکھ۔ ان دونوں کے نام مجھے یاد نہیں رہے اور مجھے یہ بھی شک ہے کہ تیسرا کمیشن بھی ہندو تھا یا سکھ تھا۔ ان تینوں کو آئی این اے میں بڑے عہدے دیئے گئے تھے۔ اس کا یعنی اس فوج کا کمانڈر انچیف سہاش چندر بوس تھا۔ میں نے بہت بعد میں انگریزی کی ایک کتاب دیکھی تھی جس میں سہاش چندر بوس کی فوٹو تھی۔ اس نے جرنیلی وردی پٹنی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ دو جوان اور خوبصورت ہندو عورتیں تھیں۔ یہ عورتیں بھی فوجی وردن میں تھیں۔ پتہ چلا کہ سہاش چندر بوس خوبصورت عورتوں کا رسیا تھا اور ان دو عورتوں کو ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ ملایا سنگاپور وغیرہ کے علاقوں میں ہی رہتا تھا جس پر جاپانیوں کا قبضہ تھا۔

بعد میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ یہ جو تین پاکستان آئی این اے کے کمانڈر بنائے گئے تھے وہ جب اکٹھے بیٹھے تو ہندوستان کو آپس میں بانٹنے رہتے تھے۔ ایک کہتا کہ اتنا ملک اور فلاں فلاں علاقے میرے ہوں گے، دوسرے دو اپنے اپنے علاقے الگ کرتے تھے۔ انہیں سو فیصد یقین تھا کہ جاپان کی فوجی مدد سے وہ ہندوستان کو فتح کر لیں گے اور آپس میں بانٹ لیں گے۔

تاثر یہ دیا جاتا تھا کہ آئی این اے کسی ایک مذہب یا قوم کی فوج نہیں بلکہ یہ تمام

ہندوستان کی فوج ہے اور جب یہ فوج ہندوستان کو آزاد کرا لے گی تو ہندوستان کی حکومت ہوگی یہ حکومت نہ ہندوؤں کی ہوگی نہ سکھوں اور نہ مسلمانوں کی بلکہ آزاد ہندوستان میں ہندوستانی بھائی بھائی ہوں گے۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ فوج ہندو کانگریس نے بنوائی تھی اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزی راج سے آزاد کرا کے یہاں ہندو راج قائم کیا جائے۔ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں تھا۔ اتنی سی بات تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ سبھاش چندر بوس کانگریسی لیڈر تھا اور اسے جاپان بھیجنے والے کانگریس کے ہی کرنا دھر تالیڈر تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ تینوں پاکستان پکڑے گئے تھے اور دہلی کے لال قلعے میں ان کا کورٹ مارشل ہوا تھا اور ان کا وکیل پنڈت جواہر لال نہرو تھا جس نے تینوں کو چھڑوا لیا تھا۔ سبھاش چندر بوس جنگ کے دوران ہی جاپان میں ایک ہوائی جہاز میں سفر کر رہا تھا اور ہوائی جہاز ایک اڈے پر اترتے ہوئے کریش کر گیا اور سبھاش چندر بوس مار گیا تھا۔ یہاں میں آپ کو ایک اور دلچسپ بات بھی بتا دوں۔ سبھاش چندر بوس مہاتما گاندھی کے سخت خلاف تھا حالانکہ ہندو گاندھی کو اپنا روحانی باپ تسلیم کرتے تھے۔ سبھاش چندر بوس نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے مہاتما گاندھی کے دوغلے پن اور دیگر عیاریوں کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ سبھاش چندر بوس خود کانگریس کا اتنا ہی بڑا لیڈر بننا چاہتا تھا جتنا بڑا گاندھی یا پنڈت نہرو تھا۔

قارئین سوچتے ہوں گے کہ میں اپنی کہانی سے ہٹ کر سیاسی باتوں پر آگیا ہوں۔ آپ سے میری یہ گزارش ہے کہ میں آپ کو ایک باب اس ملک کی تاریخ کا سنا رہا ہوں جو ہماری ان نسلوں کے لئے ضروری ہے جنہوں نے ہندو کو قریب سے نہیں دیکھا اور وہ ہندو کو دوست سمجھتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہندو اتنا ہی اچھا اور خوبصورت ہے جتنا انڈیا کی فلمیں اور اس کی ایکٹریس خوبصورت ہیں۔ میں آپ کو تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بتا رہا ہوں کہ ہندو لیڈروں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے کے لئے کیا کیا جتن کئے۔ ان میں آئی این اے ایک بڑا ہی خوفناک پلان تھا۔ اگر جاپان کی فوج ہندوستان داخل ہو جاتی تو ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت ہوتی اور آج ہم سب مسلمان ہندو کے غلام ہوتے، ہمارا مذہب ہندو کا غلام ہوتا اور یہاں کوئی مسجد سلامت نہ ہوتی۔



برما پر جب جاپان کا قبضہ ہو گیا تو سارے ہندوستان میں آئی این اے کا اتنا زیادہ پروپیگنڈہ ہوا کہ بچے بچے کی زبان پر آئی این اے چڑھ گیا تھا۔ یہ پروپیگنڈہ نہ ریڈیو سے ہوا تھا اور نہ ہی اخباروں سے۔ یہ زبانی زبانی پروپیگنڈہ ہوا اور پروپیگنڈہ کرنے والے جاپان کے جاسوس تھے جو زیادہ تر ہندو تھے۔

پھر دیکھئے کہ آئی این اے یا دوسرے لفظوں میں جاپانیوں کے پروپیگنڈے کے انتظامات کتنے موثر تھے۔ برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تو انگریزوں نے امریکہ کی فوج کی مدد سے برما پر جوبلی حملہ کیا۔ جنگ میں فتح یا شکست تو ہوتی ہی ہے۔ اصل شکست خوردہ اسے کہتے ہیں جو شکست کو تسلیم کر کے الگ بیٹھ جائے۔ ہم نے یعنی ہم پاکستانیوں نے مشرقی پاکستان میں کیا کیا تھا۔ سیاست کی بددیانتی کی وجہ سے ہمیں وہاں شکست کا سامنا ہوا تو ہماری آنے والی حکومت نے بجائے اس کے کہ فوج کی حوصلہ افزائی کرتی کہ فوج اپنی شکست کا انتقام لے، یہ کیا کہ گھنیا پروپیگنڈے کے ذریعے فوج کو رسوا کر دیا اور اتنی بڑی شکست کو جس میں آدھا ملک ہاتھ سے نکل گیا، ہضم کر کے آپس میں اقتدار کی جنگ شروع کر دی۔ انگریز زندہ قوم تھی اور زندہ رہنا چاہتی تھی اس لئے اس نے برما سے انتہائی ذلیل پسپائی کے بعد اپنی فوجوں میں نئی روح پھونکی، ادھر امریکہ کو ساتھ ملایا اور برما پر جوبلی حملہ کر دیا۔ یہ جنگ عظیم کا بڑا ہی خونریز محاذ تھا۔ ظاہر ہے کہ جاپانیوں نے برما سے پسپائیں ہونا تھا لیکن ادھر انگریزوں نے اپنی پسپائی کو فتح میں بدلنے کا عزم کر رکھا تھا اس لئے دونوں قوموں نے برما میں اپنے زیادہ سے زیادہ فوجی قربان کر دیے۔ ادھر آئی این اے بن گئی تھی۔ اس کے لئے مزید نفری کی ضرورت تھی۔ جاپانیوں نے میدان جنگ میں یہاں تک معلوم کر لیا کہ محاذ کے کس حصے میں انڈین آرمی کی کون کون سی یونٹ لڑ رہی ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ برما کا محاذ میدانی نہیں تھا بلکہ وہ سارا علاقہ پہاڑی اور جنگلاتی ہے۔ بڑا ہی دشوار گزار علاقہ ہے۔ ایک ایک ٹکڑی پر بڑی ہی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ ان لڑائیوں میں سے کچھ میں ہمارے فوجی جاپان کے ہاتھ جنگی قیدی ہو جاتے تھے۔ جاپانی فوجی ان کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے تھے کیونکہ انہیں انہوں نے آئی این اے میں شامل کرنے کے لئے تیار کرنا ہوتا تھا۔ ان سے پوچھ لیتے تھے کہ وہ کون کی یونٹ کے ہیں۔

پھر یوں ہوتا کہ جنگ جاری ہے اور جاپانیوں کے مورچوں سے لاؤڈ سپیکروں سے

اس طرح آوازیں آرہی ہیں کہ کوئی ایک جوان بڑی بلند آواز سے ادھر کی کسی یونٹ کے جوان کا نام لے کر پکار رہا ہے اور اسے کہہ رہا ہے کہ انگریزوں کی غلامی چھوڑو اور اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے ہماری طرف آجاؤ۔ مثلاً ”یہ یوں ہوتا تھا: ”راجپوتانہ رافٹل کی اس کمپنی کے لانس ٹانک محمد خاں! السلام علیکم۔ میں تمہاری کمپنی کا سپاہی نور احمد بول رہا ہوں۔ تم میرے گرائیں ہو۔ انگریزوں کی غلامی چھوڑو اور پکے مسلمانوں کی طرح آزاد ہو جاؤ۔ فوراً ”ادھر ہمارے پاس پہنچ جاؤ اور دیکھو ہم کتنی عیش کر رہے ہیں۔ تم بھی آؤ اور ہم سب مل جل کر ہندوستان کو آزاد کرائیں۔“

میں نے یہ مختصر سے الفاظ بطور نمونہ پیش کئے ہیں۔ یہ آوازیں رات کو جب محاذ پر ذرا خاموشی ہوتی تھی، بہت آتی تھیں۔ ان آوازوں کا اثر یہ ہوا کہ ہماری طرف سے جوان بھاگنے لگے اور اس طرف پہنچ گئے۔ یہاں یہ بھی ہوا کہ اس زمانے کی فوج کا سپاہی اتنا بیدار مغر نہیں تھا کہ آزادی اور غلامی کا فرق سمجھ سکتا۔ مثلاً ”میرا علاقہ جو فوجی علاقہ کہلاتا ہے، ایک طرح کا غلاموں کا علاقہ تھا کیونکہ لوگ انگریزوں کی انڈین آرمی میں فخریہ انداز میں بھرتی ہوتے تھے اور ترقی حاصل کرنے کے لئے خوشامد کو ذریعہ بناتے تھے۔ خوشامد کے علاوہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بمباری کے کارنامے بھی کر دیتے تھے۔ ان میں سے جو عہدیدار یا سپاہی ادھر بھاگ کر چلے گئے وہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے نہیں گئے تھے۔ وہ جائیں بچانے یا زخمی ہو کر ہمیشہ کے لئے لپانج ہونے سے بچنے کے لئے ادھر چلے گئے تھے۔

برما کی زمین میں نے بیان کی ہے۔ پہاڑی اور جنگلاتی زمین تھی۔ زیادہ تر مورچے ٹیکریوں پر اور بلند یوں پر تھے۔ وہاں سے بھاگ نکلنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ رات کے اندھیرے میں اپنے مورچے سے نکل کر ٹیکری سے اتر جانا یا درختوں کی اوٹ میں غائب ہو جانا بڑا آسان تھا۔ اس طرح انڈین آرمی کی جو یونٹیں وہاں لڑ رہی تھیں، ان کے سپاہیوں میں سے بھگوا ہونے کی خبریں آنے لگیں۔ جو یونٹیں ابھی پیچھے تھیں، انہیں اس قسم کے لیکچر دیے جاتے تھے کہ تم لوگ جب آگے جاؤ گے تو تمہیں اس قسم کی آوازیں سنائی دیں گی۔ ان آوازوں کی طرف توجہ نہ دینا۔ یہ جاپانیوں کا دھوکا ہے۔ وہ ہندوستان کے جنگی قیدیوں کو مار ڈالنے کی دھمکی دے کر انہیں کہتے ہیں کہ اپنی اپنی یونٹ

کے دوستوں کو پکارو اور انہیں کہو کہ ادھر آ جائیں۔ اس لیکچر میں ہندوستانی فوجیوں کو بتایا جاتا تھا کہ جاپانی اس طرح دھوکے سے تمہیں بلاتے ہیں اور جو ان کے مورچوں میں چلا جاتا ہے اسے مار کر اس کا گوشت کھاتے ہیں اور اگر وہ قیدیوں کو زندہ رکھیں تو ان سے اتنی مشقت لیتے ہیں کہ قیدی کام کرتے کرتے مر جاتے ہیں۔ قیدیوں کو چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار ایک روٹی دیتے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ جاپانی ہمارے فوجیوں کو سبزاغ دکھاتے اور اپنی طرف بڑے پیار اور احترام سے بلاتے تھے اور ادھر انگریز اپنے فوجیوں کو ڈراتے تھے اور انہیں بڑی ہی خوفناک باتیں سناتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ہندوستانی فوجی ادھر چلا جاتا تھا اسے جاپانی ہاتھوں ہاتھ لیتے اور پوری عزت سے اسے پیچھے اس جگہ بھیج دیتے جہاں انڈین نیشنل آرمی کو تیار اور منظم کیا جا رہا تھا۔ اس میں زیادہ تر ہندو تھے۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ غلامی کیا ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہندوستانیوں نے غلامی کا وہ ذائقہ تو چکھایا نہیں تھا جو انگریزوں نے بنگالیوں کو چکھایا تھا۔ یہ ایک زہر تھا جو بنگالیوں کو دیا گیا تھا۔ آپ نے ایک اصطلاح سنی ہوگی — ”بھوکا بنگالی“ — مجھے یاد ہے کہ یہ اصطلاح ہمارے گاؤں تک بھی پہنچی۔ جب بنگالی کا نام آتا تھا تو جب تک بھوکا نہ کھاتا، اس نام کو نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ اصطلاح جلی کس طرح تھی۔ اس زمانے کے فوجی ابھی زندہ ہیں جو بنگالی میں رہے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ انگریزوں نے بنگالیوں کو کس طرح بھوکا مارا تھا۔ یہ میں اپنی اس داستان میں اس لئے شامل کر رہا ہوں کہ ہمارے وہ فوجی جو سمجھتے ہی نہیں کہ آزادی کیا ہے، انہیں پتہ چلے کہ جب خداوند تعالیٰ کی یہ بات یا یہ فرمان الہی پورا ہو جاتا ہے کہ تم اگر اپنے اخلاق اور کردار کو نہیں سنو اور گے یا قرآن کے مطابق نہیں کرو گے تو ہم تم پر ایک اور قوم کو مسلط کر دیں گے۔ تو یہ قوم جو کسی بدکار اور بدعہد قوم پر مسلط ہوتی ہے تو وہ محکوم قوم کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔

بنگالی لڑنے والی قوم ہے۔ خصوصاً ”مسلمان جنگجو ہیں اور جنگجو چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ سہاش چندر بوس جو بنگالی تھا جاپان کے پاس چلا گیا ہے اور جاپان کا مدد سے ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتا ہے تو بنگالیوں نے فوج میں بھرتی ہونا چھوڑ دیا۔

ہماری طرف دیکھا۔

”اپنے ساتھ لے جائے گا؟“ — اس نے پوچھا — ”میرے گھر جائے گا؟“

وہ پوچھ رہا تھا کہ ہم لڑکیوں کو کہاں لے جائیں گے۔

”ہم تمہاری بیٹیوں کو کہیں بھی نہیں لے جائیں گے“ — میں نے کہا — ”ہم مسلمان ہیں، ہم یہ راشن تمہارے بچوں کے لئے لائے ہیں۔ یہ بھی اور اپنی بیٹیوں کو بھی واپس لے جاؤ۔“

اس نے میری طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حمید نے اس کے کندھے پر تھکی دی اور اسے گھر جانے کو کہا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ مسلمان ہو کر اپنی بیٹیوں کی عزت اس طرح نہ بیچے۔

”کب تک!“ — اس نے روتے ہوئے کہا — ”آپ پر روز تو مجھے یہ چیزیں نہیں دے سکتے۔ بچوں کے پیٹ بھرنے کے لئے کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ ہمارے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔“

میں نے حمید کو بازو سے پکڑا اور اسے کہا آؤ چلیں۔ میری عقل تو جیسے بیکار ہو گئی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا یہ ہے غلامی، یہ ہے غلامی۔ ... حمید کو بازو سے پکڑے ہوئے میں واپس آ رہا تھا۔ بے شمار ننھے منے ہاتھ ہمارے آسے پھیلنے چلے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کی کھیتیاں بخر نہیں ہوئی تھیں، بانجھ بھی نہیں ہوئی تھیں۔ ہوا صرف یہ تھا کہ ان کی کھیتوں پر انگریز قابض ہو گیا تھا۔ اس رات مجھے وہ بزرگ قبائلی پٹھان بہت یاد آیا۔ اس کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے کہا تھا کہ تم نہیں جانتے کہ مسلمان کافر کا غلام ہو جائے تو مسلمان کا ایمان برباد ہو جاتا ہے۔ وہ مسلمان نہیں رہتا۔ اس کا روزہ قبول نہیں ہوتا اور اس کی نماز بھی قبول نہیں ہوتی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ مت سوچو کہ تمہیں پیسہ کدھر سے ملتا ہے۔ یہ سوچو کہ تمہارا ایمان کس طرح ٹھیک رہتا ہے اور اس بزرگ پٹھان نے یہ بھی کہا تھا کہ فرنگی نے تمہیں بہت سستا خرید لیا ہے۔

مجھ میں اتنی عقل نہیں تھی کہ میں سوچتا کہ انگریزوں سے کس طرح آزاد ہوا جا سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس اوہڑ عمر مسلمان کو میں کس طرح ہر روز راشن پہنچا سکتا ہوں۔ ناممکن تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے وہاں کے صرف مسلمانوں کا

”مسلمان ہوں صاحب!“ — اس نے کہا — ”لو کی دیکھیں۔“

”کیا یہ تمہارا پیشہ ہے؟“ — میں نے پوچھا۔

”نہیں صاحب!“ — اس نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو نکل آئے اور بولا — ”پیسہ مت دو، ایک ٹائم کا چاول دے دو۔ روٹی کھلاؤ۔“

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں کوئی شریف آدمی تھا۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں اپنے آپ کو ہیرو ثابت نہیں کر رہا۔ میں اسی قسم کا فوجی تھا جس قسم کے فوجی اس وقت ہوا کرتے تھے۔ اگر وہ پیشہ ور عصمت فروش ہوتا تو میں اس کے ساتھ سودا بازی کرتا اور پھر اس کے ساتھ چل پڑتا لیکن اس نے جب یہ کہا کہ وہ مسلمان ہے اور یہ اس کا پیشہ نہیں تو میرے خون میں ایسا ابل آیا کہ پہلے یہ جی میں آئی کہ اس آدمی کا گلا گھونٹ دوں لیکن میں بے بس تھا اور یہ شخص مجبور تھا۔ بھوک نے اس کے دماغ پر سیاہ کالا پردہ ڈال دیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے کتنے بچے ہیں۔ اس نے آٹھ بچے بتائے۔ یہ دو لڑکیاں بڑی تھیں۔ ان میں سے ایک کی عمر چودہ اور دوسری کی سولہ سال ہو گئی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی بیوی ایک اور بچہ پیدا کرتے مر گئی ہے۔ اس کے بچے گھر میں بھوک سے تڑپ رہے تھے۔ میں نے حمید کے ساتھ بات کی اور ہم دونوں نے طے کر لیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ہمیں کھڑا رہے اور کسی گاہک کو پھانسنے کی کوشش نہ کرے۔

میں اور حمید وہیں سے واپس اپنے کیمپ میں آئے۔ میں چونکہ دفتر میں کام کرتا تھا اس لئے میرا کچھ رسوخ چلتا تھا۔ فوج میں راشن کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میں نے ایک حوالدار کو بلایا اور اس کے ساتھ بات کی۔ اس نے کہا کہ تم کس کس مسلمان بنگالی کا پیٹ بھرو گے۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے جس نے اپنی کسن بیٹیاں پیش کی ہیں، میں کم از کم اس کا ایک وقت کے لئے تو پیٹ بھروں۔

بہر حال کچھ بحث مباحثے کے بعد تھوڑے سے راشن کا بندوبست ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ دو سیر چاول ہوں گے اور اتنی سی ہی وال تھی اور کچھ اتنا ہی آٹا باندھ کر میں اور حمید پھر وہاں گئے جہاں وہ شخص ہمیں ملا تھا۔ کیمپ سے یہ راشن نکالنا مشکل تھا کیونکہ سنتری گھومتے رہتے تھے لیکن ہم دونوں ادھر ادھر سے نکل گئے۔ وہ شخص وہیں کھڑا تھا ہم نے یہ راشن اس کے حوالے کیا تو اس نے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھا پھر اس نے

حکم کے پابند تھے اور وہاں کا ماحول اور دھماکے صاف بتا رہے تھے کہ اب ہم موت کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد فضا میں بڑی زبردست گھن گرج سنائی دی۔ اوپر دیکھا، آٹھ نو ہوائی جہاز تھے۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ ہوائی جہاز انگریزوں کے ہیں یا جاپانیوں کے پتہ اس وقت چلا جب ایک جہاز غوطے میں آیا اور ہماری پوزیشنوں پر مشین گن کا فائر کرتا آگے نکل گیا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ اس فائرنگ نے ہماری پٹیلین کے کتنے جوان مار لئے ہیں یا کچھ بچت ہو گئی ہے۔ اب تو یہ عالم تھا کہ اپنے آپ کو بچاتا تھا۔ صرف یہ یکتا تھا کہ میں زندہ ہوں یا نہیں۔ نفسا نفسی شاید اسی کو کہتے ہیں۔

چار یا پانچ ہوائی جہاز ہمارے اوپر سے گزر گئے۔ ان کی مشین گنیں گولیاں اگل رہی تھیں۔ ہمارے مشین گنوں نے اس پر فائرنگ کی اور ایک جہاز کو مار لیا۔ اس ہوائی جہاز اس سے پہلے دھواں نکلا پھر یہ دھماکے سے پھٹا اور اس کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔

دوسرے جاپانی ہوا بازوں نے اسی وقت انتقام لے لیا۔ میں نے ایک بلند ٹیکری سے پیچھے دو دیکھا۔ ہم جن ٹرکوں سے اترے تھے، وہ مجھے نظر آ رہے تھے۔ وہ جہاں کے کھڑے تھے، وہ کوئی وسیع و عریض میدان نہیں تھا۔ وہ اڑھائی تین سو گز چوڑی جگہ تھی۔ اس کے تین طرف ٹیکریاں تھیں۔ جگہ کم ہونے کی وجہ سے ٹرک ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے کھڑے تھے۔ میدان جنگ میں ٹرکوں کو اس طرح اکٹھا نہیں رکھا جاتا لیکن ان لوگوں میں سے سامان اتار جا رہا تھا۔ اس سامان میں ہماری پٹیلین کا ریزرو ایمونیشن تھا اس میں گرینیڈ بھی تھے اور پٹیلین کا دوسرا سامان بھی تھا۔ ہیڈ کوارٹر کمپنی کے کچھ جوان یہ لمان ٹرکوں میں سے اتار رہے تھے۔ ایک جاپانی ہوا باز نے اپنے ہوائی جہاز کو غوطے میں ل کر ان ٹرکوں پر مشین گنیں فائر کیں اور آگے نکل گیا۔ اس کے پیچھے دو سرا ہوائی ناز آیا۔ اس کے پروں کے نیچے سے دو بم نکلے جو ٹرکوں کے بھر مٹ کے وسط میں گرے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بم ایمونیشن کے بکسوں پر گرے ہیں۔ بڑی ہی زور کا دھماکہ والا اور اس کے ساتھ ہی کئی ایک ٹرکوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ہیڈ کوارٹر کمپنی کے کتنے آدمی مارے گئے ہیں لیکن جہاں اتنی زور کا دھماکہ ہوا۔

دھماکا زیادہ ایمونیشن پھٹا وہاں شاید ہی کوئی زندہ بچا ہو گا۔

وہاں تو اب ایسے ہی دھماکے تھے۔ اپنا تو پ خانہ ہمارے پیچھے تھا۔ اپنی توپوں کے

خیال آ رہا تھا۔ میں عقل سے نہیں جذبات سے مغلوب ہو کر سوچ رہا تھا۔

مجھے آئی این اے کا خیال آیا۔ میں آئی این اے کے متعلق یا اس کے پس منظر اور اصلیت کے متعلق جو باتیں پہلے سنائی ہیں وہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ اس وقت تک جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، میں آئی این اے کو بالکل جائز سمجھتا تھا اور جس روز میں نے اس مسلماں بنگالی کو دیکھا اس روز میں آئی این اے کو ضروری سمجھنے لگا۔ یہاں سے مجھے ذرا سکون ملا۔ میں نے اسی رات طے کر لیا کہ میری پٹیلین جب فرنٹ پر جائے گی تو میں ادھر سے بھگوڑا ہو کر جاپانیوں کے پاس چلا جاؤں گا اور پھر میں آئی این اے کے ساتھ ہندوستان میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوں گا۔ مجھے نیند آنے لگی اور میں سو گیا۔

○

میں نے غلامی کی انتہا دیکھی ہے۔ یہ انتہا نہیں تو اور کیا تھا۔ انگریز فرعون بنا دیکھ رہا تھا کہ بنگالی بھوکے مر رہے ہیں، اپنی بیٹیوں کو بیچ رہے ہیں اور اپنے دودھ پیتے بچوں کو پھینک رہے ہیں۔ ایسی خبریں بھی سنی تھیں کہ کچھ بنگالیوں نے اپنے مرے ہوئے بچوں کا پاگھر کے کسی بڑے مرے ہوئے فرو کا گوشت بھی کھایا ہے۔ انگریز یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن وہ بادشاہ تھا۔ وہ اپنی رعایا کو اسی مقام پر لانا چاہتا تھا۔ بنگالیوں نے فوج میں بھرتی ہونا شروع کر دیا۔

اسی رات ہمیں جگایا گیا۔ تیاری کا حکم ملا۔ ٹرک آگئے۔ وہاں تو ہم تیاری کی حالت میں ہی رہتے تھے۔ ہم ٹرکوں میں بیٹھے اور ٹرک چل پڑے۔ ہم جانتے تھے کہ ہم ہندوستان کو واپس نہیں بلکہ برما کے محاذ پر جا رہے ہیں۔

صبح ہوئی تو میں بتا نہیں سکتا ہم کہاں تھے۔ ٹرک چلتے رہے۔ کہیں کھانے کے لئے رکے اور پھر چل پڑے۔۔۔۔۔ اور کچھ دنوں کی مسافت کے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جو میدان جنگ نہیں بلکہ قیامت کا میدان تھا۔ دھماکے دور سے سنائی دے رہے تھے۔

حکم ملنے پر ہم کو دو ٹرکوں سے اترے۔ میں اپنے کمپنی کمانڈر کے ساتھ تھا۔ ہم آگے ہی آگے دوڑتے جا رہے تھے۔ اب ہم فرنٹ پر تھے جہاں موت کی چیمیں اور زناٹے سنائی دے رہے تھے۔ میں آفسر تو تھا نہیں کہ مجھے معلوم ہو تاکہ ہماری پوزیشنیں کہاں ہیں اور ہماری پٹیلین کس سکیم کے تحت ان پوزیشنوں میں جا رہی ہے۔ ہم اب

گولے ہمارے اوپر سے گزر کر آگے جاتے تھے۔ توپ کے گولے کی چیخیں بڑی خوفناک ہوتی ہیں۔ جلابانیوں کے توپ خانے کی گولہ باری بھی ہو رہی تھی۔ مجھے کمپنی کمانڈر سے اتنا پتہ چلا تھا کہ جلابانی بڑا ہی سخت مقابلہ کر رہے ہیں لیکن وہ پیچھے بھی ہٹ رہے ہیں۔ ہمیں بار بار ایڈوائس کا حکم ملتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جلابانی پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ہم پورا ایک دن کسی ایک پوزیشن میں نہیں رہتے تھے۔ دن کیس اور رات کیس اور ہوتی تھی۔ ایک روز ہمیں پھر ایڈوائس کا حکم ملا۔ اس روز تو یہ عالم تھا کہ جلابانیوں کی مشین گنوں اور رائفلوں کا فائر صحیح معنوں میں بارش کی طرح آ رہا تھا۔ ان کی توپوں کے گولے ہماری پوزیشنوں کے قریب قریب پھٹ رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اطلاع آتی تھی کہ ہماری کمپنی کے اتنے جوان زخمی ہو گئے ہیں اور اتنے مارے گئے ہیں۔ صاف پتہ چلا تھا کہ جلابانی جم کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ میں پہلی بار اس خوف میں مبتلا ہوا کہ میں آج نہیں توکل مارا جاؤں گا۔ مجھے بار بار اپنے دوست حمید کا خیال آ رہا تھا۔ وہ بٹالین کی ایک اور رائفل کمپنی میں تھا۔ میں نے اپنے انگریز کمپنی کمانڈر کو بھی گھبراہٹ کے عالم میں دیکھا۔

لڑائی کی صورت کچھ اس طرح تھی کہ ہماری پوزیشنیں ایک لمبوتری ٹیکری پر تھیں اور جلابانی سامنے والی ٹیکریوں پر مورچہ بند تھے۔ یہ محاذ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پورے بریگیڈ کا محاذ تھا۔

میں اس لڑائی کی شدت اور خونریزی کو پوری طرح بیان نہیں کر رہا کیونکہ بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری کمپنی کے تقریباً "پندرہ جواڑ مارے جا چکے تھے اور کچھ اتنے ہی زخمی ہوئے تھے اور زخمی ہوتے جا رہے تھے۔ رات آئی تو یک لخت محاذ خاموش ہو گیا۔ یہ خاموشی خطرناک تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ جلابانی بھاگ گئے ہوں۔ ہم نے تھوڑا تھوڑا کھانا کھایا۔ امید تو یہ تھی کہ رات خیریت سے گزر جائے گی لیکن بارہ بج کر پانچ سات منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ رات کا سکوت دھماکوں سے لرزنے اور کانپنے لگا۔ ہمارے ہر طرف گولے پھٹ رہے تھے۔ بڑی شدید گولہ باری تھی۔ اس گولہ باری کا مطلب یہ تھا کہ جلابانیوں نے جوابی حملہ کیا ہے۔ توپوں کے گولے بڑی ہی زیادہ تعداد میں ہمارے پیچھے بھی، ٹیکری کے اوپر بھی اور ٹیکری کے سامنے بھی گر رہے تھے۔ ان کی چمک سے رات ذرا سی روشن ہوتی اور پھر تاریک

ہو جاتی تھی۔

ایک گولہ ہمارے بہت ہی قریب پھٹا۔ اس وقت میں اپنے کمپنی کمانڈر سے دس بارہ قدم دور ٹیکری پر پوزیشن لئے ہوئے تھا۔ گولہ باری کے دوران کوئی جوابی فائر نہیں کیا تھا۔ جوابی فائر کیا جاتا ہے تو وہ توپ خانہ کیا کرتا ہے۔ ہمارا توپ خانہ گولہ باری کر رہا تھا اور یہ بھی بڑی ہی شدید اور بہت ہی تیز گولہ باری تھی۔ میرے قریب جو گولہ پھٹا وہ جگہ کمپنی کمانڈر کی تھی۔ اس دھماکے سے مجھے یوں لگا جیسے میرے کان بند ہو گئے ہوں لیکن میرے کانوں میں اپنے کمپنی کمانڈر کی ایسی آواز پڑی جیسے وہ زخمی ہو گیا ہو۔ اس کا اردلی اس کے ساتھ تھا اور گنبد بھی اس کے قریب ہی تھا۔ ان کی اس قسم کی آوازیں سنائی دیں جیسے بھگدڑ مچ گئی ہو۔ میں اٹھا اور دوڑ کر ان تک پہنچا۔ توپ کے گولے کے دو یا تین ٹکڑے ہمارے کمپنی کمانڈر کو لگ گئے تھے۔ پیٹ پر ہاتھ رکھا تو صاف پتہ چلا کہ ساتھ پیٹ کے اندر چلا گیا ہے۔ وہ مریخا تھا۔ اردلی نے ماچس جلا کر دیکھا۔ ایک ٹکڑا اس کے سر میں لگا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی کھوپڑی کٹ گئی تھی۔

کمپنی کمانڈر نے اردلی سے کہا کہ کچھ پتہ نہیں کہ سی او صاحب کہاں ہیں۔ کمپنی کمانڈر کی موت کی اطلاع دینی تھی۔ گولہ باری نے اور زیادہ شدت اختیار کر لی۔ ہماری ٹیکری پر تین چار گولے اور پھٹے تو ہم تینوں ادھر ادھر دوڑ پڑے۔ میں ٹیکری کے پیچھے اتر گیا۔ اس انگریز کے مرنے کا مجھے ذرا سا بھی افسوس نہ ہوا بلکہ خوشی ہوئی کہ ایک انگریز تو کم ہوا۔ اس کے بعد یہی کچھ ہوتا رہا کہ دونوں طرف کے توپ خانے فائر کرتے رہے اور رات گزر گئی۔

رات تو گزر گئی اور توپ خانوں کے گولے بھی کم ہو گئے لیکن مشین گنوں اور رائفلوں کا جو فائر شروع ہوا تو ایک انچ بھی محفوظ نہ رہا۔ میں چھوٹے چھوٹے درختوں کے جھرمٹ میں جا بیٹھا تھا اور کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میری کمپنی کہاں گئی اور بٹالین کو دوسری کمپنیاں کہاں ہیں۔ میں وہاں سے اٹھا اور ایک ٹیکری کے پیچھے چل پڑا۔ میں نے فائر سے بچتا تھا۔ چلتے چلتے مجھے دو ٹیکریوں کے درمیان سے نظر آیا کہ میری بٹالین ان پوزیشنوں سے اتر کر اگلی پوزیشنوں میں جا رہی ہے۔ فائرنگ میں کچھ کمی آگئی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ جلابانی حملہ کرنے کی بجائے پسپا ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنی بٹالین کے ساتھ جانا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ میں اپنی کمپنی میں ہی

جاتا۔ میں ٹکریوں کے اندر اندر بچتا بچتا جا رہا تھا۔ کئی جگہوں پر مجھے دائیں یا بائیں مڑنا پڑا اور اس طرح میں ایسی جگہ پہنچ گیا جو ذرا کشادہ تھی۔ مجھے اپنی ہٹالین کے دس بارہ جوانوں کی لاشیں نظر آئیں۔ انہیں دیکھ کر میں اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے بہترین سی سمجھا کہ پیچھے ہی رہوں اور آہستہ آہستہ چلوں ہٹالین سے تو میں جا ہی ملوں گا۔

○

دوپہر کا وقت تھا۔ فائرنگ سے پتہ چلتا تھا کہ جاپانی بہت پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ میں ایک کشادہ سی جگہ جا پہنچا۔ اس جگہ بھی درخت بے شمار تھے اور یہ درخت اونچے نہیں تھے بلکہ ان کی ٹہنیاں دائیں بائیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کشادہ جگہ کے ارد گرد ٹیکریاں تھیں۔ ان درختوں کے نیچے بھی میں نے چار پانچ لاشیں دیکھیں اور ایک جوان نظر آیا جو ایک درخت کے تنے کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے وہیں سے نظر آ گیا کہ اس کی پتلون کمری لال ہو گئی ہے۔ وہ زندہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ اپنا کوئی ساتھی فوجی ہے اور اگر یہ زندہ ہے تو اسے کم از کم پانی تو پلا دوں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں اسے اٹھا کر کہیں پیچھے لے جاتا۔ وہاں تو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے

میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس تک پہنچا اور سامنے ہو کر اسے دیکھا۔

میں نے جب اس کا چہرہ دیکھا تو مجھے صاف محسوس ہونے لگا کہ اتنی زیادہ شینگ اور فائر اور موت کے خوف سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے یا دماغ کی کوئی رگ DAMAGE ہو گئی ہے اس لئے مجھے ایسی چیزیں نظر آنے لگی ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ چہرہ واجدہ کے خاوند آصف کا تھا۔ وہ اب حوالدار ہو گیا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے بلایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں دو تین جگہوں سے ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ بھی تو یوں کے گولوں کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں سے زخمی ہوا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے جسم سے بہت سارا خون بہہ گیا تھا۔

”کیا تم آصف ہی ہو؟“ — میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھیں اور زیادہ کھول کر مجھے دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے مجھے کین ذات کا آدمی کہا تھا اور اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں پھر کبھی واجدہ سے ملا تو یہ مجھے قتل کر دے گا۔ اس کی یہ باتیں یاد آئیں تو میرے سارے

وجود میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میرا دشمن اپنی موت خود ہی مر رہا تھا۔ واجدہ اس سے آزاد ہو گئی تھی۔ مجھے واجدہ یاد آئی تو میرے دل میں آصف کی نفرت کا طوفان اٹھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اسے یہیں مرنے دو۔ میں وہاں سے اٹھنے ہی لگا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ میں رک گیا۔

”تم جیت گئے ہو“ — اس نے کہا — ”ایک مہربانی کرو۔ میں بڑی سخت اذیت میں مبتلا ہوں۔ میرے سر میں گولی مار دو اور اس اذیت سے نجات دلا دو۔ میں موت کی تلخی سے بچ جاؤں گا اور تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

معلوم نہیں مجھے کیا ہوا کہ میرا ہاتھ اپنی وائر بائل پر گیا جو پانی سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے بول نکالی اور اس سے کارک ہٹا کر بول اس کے منہ کی طرف کی۔ اس نے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیا۔

”یہ خالی ہے۔“ — اس نے کہا — ”میں تمہارے ہاتھ کا پانی نہیں پیوں گا۔“

”کیوں آصف!“ — میں نے کہا — ”کیا تم مجھے اتنا کین سمجھتے ہو کہ تم مر رہے ہو اور میں تمہیں پانی نہ پلاؤں؟ مجھے یاد ہے کہ تم نے مجھے کین ذات کا آدمی کہا تھا۔ میں کسی بھی ذات کا آدمی ہو سکتا ہوں لیکن یہ نہ بھولو کہ میں مرد ہوں..... میں تمہیں یہاں نہیں مرنے دوں گا..... لو پانی پیو۔“

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بول میرے ہاتھ سے لے کر پانی پی لیا۔

”میں تمہیں اٹھا کر پیچھے لے چلتا ہوں“ — میں نے کہا۔

”نہیں خانی!“ — اس نے بڑی اواں اور ہاری ہوئی آواز میں کہا — ”تم شاید اپنی ہٹالین سے بچ کر گئے ہو۔ آگے جاؤ، یہاں مت روکو، میں نے تو اب مرنا ہی ہے۔“

”میں تمہیں یہاں مرنے کے لئے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا آصف!“ — میں نے پرجوش لہجے میں کہا — ”تم میری موجودگی میں نہیں مرو گے۔“

میں خدا کی قسم واجدہ کو بالکل ہی بھول گیا اور آصف کو اٹھا کر پیچھے پہنچانے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج سمجھ لیا۔ ساتھ والی ٹکری کے پیچھے تھوڑی دور شاید ستر پچیسیر یعنی زخمیوں کو ستر پچیر اٹھا کر لے جانے والوں کے ملنے کا امکان ہے۔ اس نے کہا اور ایک طرف اشارہ کیا۔ یہاں میں آپ کو ایک اور بات بتانا چاہوں گا۔ وہ یہ کہ برما کی لڑائی

میں ایسی کوئی پابندی نہیں تھی کہ کوئی زخمی ہو جائے تو اسے ضرور ہی اٹھا کر پیچھے لانا ہے۔ دراصل زخموں کو اٹھا کر پیچھے لانے کی کسی کو ہوش ہی نہیں تھی۔

آصف نے جس طرف اشارہ کیا تھا۔ میں دوڑ پڑا۔ اس ٹیکری پر چڑھا اور دوسری طرف اترا تو وہاں کچھ دلدل سی دیکھی۔ دلدل کی وجہ سے وہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ میں دوڑتا ہوا ایک اور طرف گیا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہاں ایک عارضی میڈیکل پوسٹ بنی ہوئی تھی۔ یہ کوئی عمارت نہیں تھی نہ وہاں کوئی خیمہ لگا ہوا تھا بلکہ سڑیچروں پر زخمی فوجی بڑے ہوئے تھے اور انہیں فرسٹ ایڈ دی جا رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا لیکن یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ وہ سب گورے تھے یعنی انگریز تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خبیث قوم کسی ہندوستانی کو نہیں اٹھائے گی۔ وہاں دو ڈاکٹر تھے۔ میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور انگریزی میں انہیں کہا کہ مجھ پر رحم کریں، میرے بھائی کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں اور خون بننے سے مر رہا ہے۔ ایک ڈاکٹر نے اپنے ساتھ کھڑے دو تین گوروں کی طرف دیکھا لیکن کہا کچھ بھی نہیں۔ ان دو تین گوروں نے بھی میری بات سنی تھی۔

”ہم آپ کے لئے لڑ رہے ہیں“ — میں التجا کے لہجے میں کہا — ”کیا آپ میرے بھائی کی جان نہیں بچائیں گے؟“

”کیوں نہیں؟“ — ڈاکٹر نے بڑے اچھے لہجے میں کہا — ”تمہارا بھائی کتنی دور پڑا ہے؟“

”میں نے اسے بتایا تو اس نے دو گوروں سے کہا کہ وہ دوڑ کر جائیں۔ ان دونوں نے سڑیچر اٹھایا اور میرے ساتھ دوڑ پڑے۔

ہم آصف تک پہنچے اور اسے اٹھا کر سڑیچر پر لٹایا۔ ان دونوں نے سڑیچر اٹھالیا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا اور کہا کہ سڑیچر ایک طرف سے مجھے اٹھانے دیں۔ اس طرح میں نے کبھی آگے سے اور کبھی پیچھے سے سڑیچر اٹھایا یعنی ان دونوں سے باری باری سڑیچر لیا اس طرح آصف کو فرسٹ ایڈ پوسٹ تک پہنچا دیا۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔ اس کی ایک ٹانگ کی ہڈی گھٹنے اور پاؤں کے درمیان سے ٹوٹی تھی اور دوسری ہڈی جو دوسری ٹانگ کی تھی گھٹنے سے ذرا اوپر سے ٹوٹی تھی۔ میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ یہ میرا بڑا بھائی ہے، اسے بچالیں۔

”تم فکر نہ کرو“ — ڈاکٹر نے کہا — ”ہم اس کا خون روک دیں گے اور پیچھے بھیج دیں گے۔ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔“

میں نے دیکھا کہ یہ ڈاکٹر اور اس کا دوسرا شاغف انگریز نہیں تھے بلکہ آسٹریلیا کی میڈیکل کور کے لوگ تھے۔ بہر حال میں اسے ایک معجزہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اتنا کرم کیا کہ آصف کو اتنی توجہ دی۔ انہوں نے اسی وقت اسے عارضی طور پر مرہم پٹی کے عمل میں ڈال دیا تھا۔

”خالئی!“ — آصف نے مجھے بلایا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے کہا — ”تم اپنی ہڈیوں کے پیچھے جاؤ۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے ساتھ ہی میرے آنسو نکل آئے۔

”اللہ تجھے زندگی عطا کرے“ — میں نے آصف سے کہا۔

”جاؤ خالی بھائی!“ — اس نے کہا — ”زندہ رہے تو پھر ملیں گے۔“

میں وہاں سے چل پڑا اور میں نے پکا فیصلہ کر لیا کہ ادھر سے بھاگ کر جاپانیوں کے پاس چلا جاؤں گا۔ میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ بڑے صاف اور آزاد ذہن سے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں ادھر سے بھاگ کر جاپانیوں کے پاس چلا جاؤں گا اور انہیں کہوں گا کہ مجھے انڈین نیشنل آرمی میں شامل کر لیں۔

دل پر صرف ایک بوجھ تھا۔ وہ یہ کہ میں آصف کے متعلق پریشان تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میڈیکل ایڈ کے اور کیا انتظامات ہیں۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اتنی پیچھے پہنچتے پہنچتے آصف زیادہ خون نکل جانے سے مر جائے گا۔ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ میں کبھی واپس آکر آصف اور واجدہ سے مل سکوں گا؟

مداوت نکل گئی تھی۔

دوسری خوشی یہ تھی کہ میں جنگ کے جہنم سے نکل آیا تھا یا نکل کر جا رہا تھا یا یوں کہہ لیں کہ میں جنگ سے بچنے کے لئے بھاگ رہا تھا۔ جو کچھ تھا مجھے خوشی اس پر ہو رہی تھی کہ میں آزاد تھا۔

میں بھاگ رہا تھا لیکن ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ میں زندہ رہوں گا۔ توپوں کے گولے اور ہوائی جہازوں کی مشین گنوں کی گولیاں وہاں بھی پہنچ سکتی تھیں جہاں میں پہنچا ہوا تھا۔ میں نے جب یہ سوچا کہ اس پہاڑی اور جنگلاتی علاقے میں سے نکلوں گا کیسے تو میں کسی صحیح سوچ پر نہ پہنچ سکا۔ اگر آج بھی کوئی پوچھے کہ میں کس مقام پر تھا تو میں نہیں بتا سکوں گا۔ مجھے توپوں کے دھماکے، مشین گنوں اور رائفلوں کے فائر کی بے ہنگم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ان سے دور ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا لڑائی کسی اور طرف ہو رہی ہے لیکن مجھے امید تھی کہ جاپانیوں کی کوئی نہ کوئی پوسٹ نظر آ ہی جائے گی۔

میں ٹیکریوں اور چٹانوں کے درمیان چلتا چلا گیا۔ بعض جگہ درخت اتنے چھوٹے تھے کہ مجھے جھک کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ دوسری مشکل میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مجھے مڑنا پڑتا تھا جس میں خطرہ یہ تھا کہ میں جاپانیوں کی طرف جانے کی بجائے ہندوستان کی طرف بھی آسکتا تھا۔ میں نے دماغ کو حاضر رکھا اور ہر موڑ کو ذہن میں محفوظ کر لیا۔ پھر یہ خیال آیا۔ شام ہونے کو ہے اور میرے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ ان درختوں سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس خیال سے میں نے درختوں کو دیکھنا شروع کر دیا لیکن ان میں کوئی ایک بھی درخت پھل دار نہیں تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا اور آگے ایک ندی آگئی جس کا پانی کنوؤں کے پانی کی طرح صاف اور شفاف تھا میں نے ندی سے پانی کی بوتل بھری۔

میدانی علاقوں میں سورج غروب ہو جاتا ہے تو بھی کچھ دیر روشنی باقی رہتی ہے لیکن اس قسم کے پہاڑی اور جنگلاتی علاقے میں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ سورج ابھی افق سے تھوڑا ہی اوپر ہو گا لیکن وہ جنگل تاریک ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں ندی کے پار گیا تو کچھ علاقہ ہموار ہونے لگا۔

خیالوں میں انقلابی تبدیلی آگئی تھی۔

میرے

آصف کا مجھے وہاں مل جانا اور اس حالت میں ملنا کہ وہ مر رہا تھا آج بھی یوں لگتا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہا تھا۔ جنگلوں کا وہ علاقہ خواب کی ہی طرح تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیت ناک اور وہشت ناک جنگل تھا۔ آپ نے مری کے جنگلات اور پہاڑ دیکھے ہوں گے۔ سوات بھی آپ گئے ہوں گے اور آپ نے کوئی اور جنگلاتی علاقہ دیکھا ہو گا۔ وہ سب خوبصورت جنگل ہیں لیکن برما کے جنگل کچھ اور ہی قسم کے تھے۔ اونچی پہاڑیاں تھیں، کم اونچی پہاڑیاں بھی تھیں اور ٹیکریاں اور چٹانیں بھی تھیں۔ نیچے سے اوپر تک درخت تھے لیکن یہ چھوٹے اور بہت ہی کم بلند درخت تھے جن کے پتے چوڑے نہیں تھے۔ لمبوترے اور بہت ہی چھوٹے چھوٹے پتے تھے اور ان کی شاخیں زمین سے دو چار گز اوپر جا کر پھیل گئی تھیں۔ ہمارے ملک جیسے لمبے اور بڑے درخت جو بہت پھیل جاتے ہیں اس علاقے میں بہت ہی تھوڑے تھے۔

ان چھوٹے درختوں کا یہ فائدہ تھا کہ اپنے آپ کو چھپایا جاسکتا تھا۔ پہاڑوں اور ٹیکریوں کے درمیان کہیں جگہ خاصی کھلی تھی اور کہیں اتنی تنگ کہ ان کے دامن ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ یہ تو راستوں کی بھول بھلیاں تھیں۔ وہاں چھوٹی بڑی ندیاں بھی تھیں۔

میں اب فوج کا بھگوتا تھا۔ ایک خوشی یا ایک سرور سا اس بات کا تھا کہ میں نے آصف کو میڈیکل کور کے سپرد کر دیا تھا اور یہ تو اللہ کو ہی معلوم تھا کہ اس نے زندہ رہنا تھا یا وہیں مر جانا تھا۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اس کے دل سے میری

ہموار کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑیاں دور ہٹ گئیں اور ٹیکریوں اور چٹانوں کے درمیان قاصلے بھی زیادہ ہو گئے۔ مجھے ابھی تک کوئی پھل دار درخت نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں جوان آدمی ہوں، ایک رات اور شاید اگلا دن بھی کچھ کھائے پئے بغیر ہی گزار دوں گا۔

تاریکی سیاہ ہوتی گئی اور میں چلتا گیا۔ یہ بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ موسم گرمیوں کا تھا۔ رات کو مجھے پتہ چلا کہ رات تو کچھ ٹھنڈی ہو گئی ہے لیکن مجھ پر بیدار ہو گئے تھے۔ اس علاقے میں مجھ پر بہت ہی زیادہ تھے۔ ندیاں بڑی صاف ستھری تھیں یعنی ان کا پانی گدلا نہیں تھا لیکن ان میں ایک خطرہ یہ تھا کہ ان میں باریک اور ذرا لمبوتری جو تکس بڑی زیادہ تھیں اور موٹی جو تکس بھی تھیں۔

میں چلتے چلتے تھک گیا تو سوچا کہ اپنے جسم پر زیادہ ظلم نہ کروں اور اسے مشقت سے بچائے رکھوں تاکہ بھوک زیادہ محسوس نہ ہو۔ میں نے ایک جگہ ذرا اچھی دیکھی اور وہاں لیٹ گیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ مجھ پر اس انتظار میں تھے کہ میں لیٹ جاؤں۔ مجھروں نے مجھ پر یلغار کر دی۔ میرے جھولے میں جو پیٹھ کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور جسے فوجی زبان میں پٹو کہتے تھے، ایک چادر پڑی ہوئی تھی میں نے یہ چادر اوپر لے لی۔ تھکان اتنی زیادہ تھی کہ میں گہری نیند سو گیا۔

نیند پر سکون نہیں تھی ایک تو یہ مجھ پر تھے جو چادر کے اندر بھی آگئے تھے اور زمین بستر کی طرح آرام دہ نہیں ہو سکتی تھی اور تیسرے یہ کہ میں نے جنگی لباس پہن رکھا تھا اور جنگی ساز و سامان بھی میرے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس میں ایسوسی ایشن بھی تھا۔ نیند پر سکون کیسے آتی!

آنکھ کھلی تو سورج پہاڑیوں کے اوپر اُٹھا تھا۔ میں اٹھا، چادر اٹھائی اور یہ پٹو میں ڈال کر چل پڑا۔ تین ٹیکریاں آج بھی یاد ہیں راستے میں آئی تھیں۔ میں تیسری ٹیکری کے ساتھ ساتھ چلتا آگے سے مڑا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ وسیع و عریض میدان تھا۔ پہاڑیاں دور تھیں۔ چٹان کوئی تھی ہی نہیں نہ ہی کوئی اونچی نیچی ٹیکریاں تھیں۔ درخت بھی ذرا کم تھے۔ یہ ایک کھلا میدان تھا لیکن میدان کی طرح ہموار نہیں تھا۔ کہیں نیچے اور کہیں اوپر۔ گڑھے بھی تھے اور کہیں

ذرا بلند جگہ تھی۔

میں چلتا گیا۔ زمین پر ایسے نشان دیکھے جیسے یہاں توپوں کے یا مارٹر گنوں کے گولے گر کر پھٹے ہیں۔ کچھ اور نشانیاں نظر آئیں جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں لڑائی ہوئی ہے۔ جسے میں نے وسیع و عریض میدان کہا ہے، یہ ڈیڑھ دو میل چوڑا یا پانچ اس سے کچھ زیادہ لمبا تھا۔ میں تقریباً "اڑھائی فرلانگ آگے چلا گیا تو اس سے آگے زمین نیچے کی طرف چلی گئی تھی۔ وہاں کچھ درخت ہمارے علاقے کے درختوں کی طرح چوڑے تنوں والے، اونچے اور پھیلے ہوئے تھے اور باقی درخت جھاڑی نما تھے۔ میں ذرا بلندی پر تھا۔ آگے زمین ذرا نیچے تھی۔

وہاں سے زمین پر چند ایک گڑھے نظر آئے جو اندر سے ذرا ذرا کالے تھے۔ ان گڑھوں میں پینچنا تھا۔ یہ توپوں کے گولوں نے یہاں ہٹ کر کے بنائے تھے۔ میں آگے چل پڑا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہر طرف ایسے گڑھے نظر آئے اور ایک جگہ ایک مورچے کی شکل کا ذرا لمبا اور ذرا چوڑا گڑھا نظر آیا۔ اس کے باہر دو سنیل ہیلٹ پڑے ہوئے تھے اور کپڑوں کے ٹکڑے میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ فوجی وردی کے ٹکڑے تھے اور یہ سنیل ہیلٹ فوجیوں کے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں فوجی مرے ہیں۔ میں اس گڑھے تک گیا تو گڑھے میں انسانی ہڈیاں نظر آئیں۔ کھوپڑی ایک ہی تھی لیکن سینے کے تہہ دو تھے۔ فوجی بوٹ بھی وہاں پڑے ہوئے تھے۔ فوجی جھولے بھی وہاں پڑے ہوئے تھے اور پھٹی ہوئی وردیوں کے ٹکڑے گڑھے میں بھی تھے اور باہر بھی۔

میں آگے چلا گیا تو زمین پر انسانی ہڈیاں بکھری ہوئی نظر آئیں۔ سینے کے پتھر بھی دیکھے اور تین چار کھوپڑیاں بھی وہاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہاں بھی سنیل ہیلٹ اور پھٹی ہوئی وردیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اب جب میں اس میدان میں گھومنا پھرتا تو جگہ جگہ انسانی ہڈیاں، سینوں کے پتھر اور کھوپڑیاں نظر آئیں۔ اس سے مکمل ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں لڑائی ہوئی اور یہ سب مارے گئے تھے۔

یہ بتانا مشکل تھا کہ یہ فوجی ہندوستانی تھے، گورے تھے یا جاپانی تھے۔ سنیل ہیلٹ وہ تھے جو ہمیں انگریزوں نے دیے تھے۔ یہ جاپانیوں کے نہیں ہو سکتے تھے۔ ان ہڈیوں میں کوئی ہتھیار نظر نہ آیا۔ وہ انہیں ہلاک کرنے والے لے گئے ہوں

نمبر فلاں فرنٹ پر مارا گیا ہے۔ انگریز نے مرنے والے کے پس ماندگان کو یہ بھی ماہو گا کہ آپ کا بیٹا بڑا بہادر تھا اور بڑی بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا ہے۔ اس کے انگریز نے۔ فوجیوں کے ناموں پر لیکر پھیر دی ہوگی۔

معلوم نہیں انہیں مرے ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا تھا۔ ہڈیاں خشک ہو چکی تھیں۔ کسی ہڈی پر گوشت کا ایک ذرہ بھی نہیں تھا۔ مجھے بھوک ستا رہی تھی۔ میں سوچا کہ ان کے جھولے اور پٹھو بیس پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی تلاش لوں، شاید ان کی کوئی چیز مل جائے مثلاً "بسکٹوں کا ڈبہ مل سکتا تھا۔ چنے یا کوئی اور خشک چیز کئی تھی لیکن میں نے کسی جھولے وغیرہ کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس خیال سے کہ میں نے کی کوئی چیز تلاش کروں، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ان کا حق مار رہا ہوں یا میں ان کی چوری کر رہا ہوں۔ بکھری ہوئی ان ہڈیوں کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ بہت جلدی چلانیوں کے پاس پہنچ جانا چاہئے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ توپ کا کوئی ادھر اگرے یا دور سے کوئی مشین گن فائر ہو اور ہڈیوں کے ان بکھرے ہوئے ہوں میں ایک اور ڈھانچے کا اضافہ ہو جائے۔ میں نے ایک عمدہ کیا جو دراصل خواہش تھی کہ میں نے زندہ رہتا ہے۔ میں وہاں سے چل پڑا اور ان بکھری ہڈیوں میں سے گزرتا گیا۔ کوشش کی کہ میرا پاؤں کسی ہڈی پر نہ آئے لیکن یہ نہ تھا۔ بہت پیچ کر پاؤں رکھے۔ چند قدم جا کر کوئی نہ کوئی ہڈی پاؤں کے نیچے جاتی تھی۔

میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ٹھوکر لگی۔ نیچے دیکھا، میرا پاؤں ایک خشک ہڈی کے ساتھ ٹکرا گیا تھا۔ اس وقت میرے خیالوں کا رخ کسی اور طرف چلا

پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے خدا یاد آیا۔ جس طرح اُس وقت خدا یاد آیا اس میں نے کبھی خدا کو یاد نہیں کیا تھا۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میں اخلاقی لحاظ ٹھیک آدمی نہیں تھا۔ کچھ تو آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا۔ میں آج بڑھاپے کی عمر میں محسوس کرتا ہوں کہ جب میں ان بے گورو کفن انسانی ڈھانچوں میں سے رہا تھا تو حقیقت یہ تھی کہ میں ایک اور ہی زندگی میں داخل ہو رہا تھا۔

پلے میں نے کہا ہے کہ میرا دماغ کسی اور طرف چلا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ انسان

گئے۔ وہاں توپوں کے گولوں نے جو گڑھے بنائے تھے وہ اتنے زیادہ تھے کہ یہی کہا جاسکتا تھا کہ ان پر توپ خانے کے گولے برسائے گئے تھے۔ ایک جگہ سے مجھے ایک پے بک ملی۔ ہر فوجی کے پاس پے بک ہوتی تھی جس پر یونٹ کا نام نہیں ہوتا تھا، صرف فوجی کا نمبر اور نام اس پر لکھا ہوتا تھا۔ افسروں کے پاس شناختی کارڈ ہوتے تھے۔ میں نے یہ پے بک اٹھا کر کھولی، اس پر ایک سپاہی کا نام لکھا ہوا تھا۔ نام تھا فضل حسین۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ لوگ انڈین آرمی کے تھے۔ میں وہاں رک گیا اور ہر طرف دیکھنے لگا۔

میری جذباتی کیفیت کچھ اور ہی ہو گئی۔ دل ایک گرفت میں آگیا۔ خیال آیا کہ یہ کہاں پیدا ہوئے تھے اور مرے تو کہاں آئے۔ انہیں کفن بھی نصیب نہ ہوا، جنازہ بھی نہ پڑھا گیا اور ان کی ہڈیاں رہ گئیں اور گوشت جنگل کے درندے، گدھیں اور کیرے مکوڑے کھا گئے۔ ایک سوال میرے ذہن میں ترپنے لگا..... کس لئے؟ انہوں نے اپنی جانیں کس کے لئے دیں؟..... تنخواہ کے لئے؟ راشن اور وردی کے لئے؟ آخر کیوں ان لوگوں نے تھوڑے سے پیسوں پر اپنی جانیں انگریزوں کے حوالے کر دی تھیں؟..... میرے پاس ایک جواب تھا کہ یہ ان کی مجبوری تھی۔ بھرتی نہ ہوتے تو کیا کرتے۔ میں بھی تو بھرتی ہو کر اس وردی میں آگیا تھا۔

اس وقت مجھے یہ خیال نہ آیا کہ ہم لوگ آزاد ہوتے، ہمارا اپنا ملک ہوتا اور یہ اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے جانیں قربان کرتے تو سارا ملک انہیں یاد کرتا اور انہیں عظیم کہتا۔ یہ خیال مجھے ستمبر 1965ء میں آیا تھا۔ جب میرے گاؤں میں پہلے شہید کی لاش آئی تھی تو مجھے ہڈیوں کے وہ پتھر یاد آ گئے تھے جو میں نے برما کے اس دیرانے میں دیکھے تھے۔ میں کہتا ہوں وہ حرام موت مرے تھے۔ وہ کرائے کے سپاہی تھے اور ہمارا لڑکا شہید ہو کر آیا ہے اور اللہ نے بھی اسے عظمت دی ہے اور قرآن نے بھی اس لڑکے کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ شہید ہیں، یہ مرے نہیں، شہید مرا نہیں کرتے۔

مجھے برما کے جنگل میں یہ خیال بھی آیا کہ یہ جن کی ہڈیاں ہیں انہیں صرف اتنا ساق دیا گیا ہو گا کہ ان کے گھروں کو سرکاری چھٹیاں بھیج دی گئی ہوں گی جن میں صرف اتنا لکھا ہو گا کہ نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ کا بیٹا

بھی رعب جاتا ہے اسی طرح جنگ عظیم میں فوجی کرتے تھے۔ یہ بات بڑی ہی لمبی ہے۔ اگر میں آپ کو پوری بات سناؤں تو اس میں بڑے دلچسپ واقعات آتے ہیں لیکن میری اصل داستان زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ سڑکوں پر فوجی گاڑیاں بھاگتی دوڑتی نظر آتی تھیں۔ پنجاب کا تو یہ حال تھا کہ ہر چوتھا آدمی فوجی بن گیا تھا۔ فوجی ٹرکوں کے ڈرائیوروں نے ایسی بد تمیزیاں شروع کر دی تھیں جن سے پبلک کو نقصان بھی ہوا۔ مسافر ہمیں جی ٹی روڈ پر چلتی تھیں۔ یہ تو فوجی ڈرائیوروں کا ایک کھیل تھا کہ کوئی مسافر بس کسی فوجی ٹرک کو اور ٹیک کر جاتی تو فوجی ڈرائیور بس کو اور ٹیک کر کے سائیڈ مارتا تھا۔ بسوں کے ڈرائیور اکثر بس روک لیتے تھے۔

ہمارے علاقے میں ایک باریوں ہوا کہ ایک فوجی ڈرائیور نے اپنے ٹرک سے ایک بس کو سائیڈ ماری تو بس بائیں طرف ہو گئی۔ ساتھ ہی ڈھلان نیچے کو جاتی تھی۔ بس ڈھلان سے نیچے گئی۔ کچھ اس کی سپیڈ تھی اور کچھ ڈھلان تھی۔ بس کچھ اور تیز ہو گئی سامنے شیشم کا ایک درخت آگیا۔ بس درخت کے ساتھ اتنی زور سے ٹکرائی کہ بس کا انجن بس کے اندر چلا گیا اور 36 مسافر موقع پر ہی ہلاک ہو گئے اور فوجی ڈرائیور اور اس کے ساتھی قہقہے لگاتے ہوئے آگے نکل گئے۔

یہ انگریز کا حکم تھا کہ فوجی کا احترام کرو۔ راولپنڈی، لاہور اور اس قسم کے بڑے شہروں کے ریلوے سٹیشنوں پر سرکاری طور پر الگ ٹی ٹال بنا دیے گئے تھے جو صرف فوجیوں کے لئے تھے۔ ان پر انگریز بادشاہ نے لڑکیاں کھڑی کر دی تھیں جو فوجیوں کو مفت چائے پلائی اور ساتھ کیک اور بسکٹ بھی پیش کرتی تھیں۔ اس طرح فوجی کی ہر جگہ قدر و منزلت سرکاری طور پر ٹھونسی جا رہی تھی۔ فرنٹ پر جانے سے پہلے میں ایک باریل گاڑی پر سفر کر رہا تھا۔ ایک سیو سٹن مسافر نے کہا کہ آج کل دو ہی چیزوں کی عزت اور قدر ہے۔ ایک فوجی کی اور دوسرے سرکاری ڈیری فارم کی گائے کی۔

ایسے فوجیوں کی اکثریت تھی جو چھٹی آتے تو اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی فوجی زبان میں بڑے رعب سے بات کیا کرتے تھے۔ تھا تو لطیفہ مگر میں آپ کو بتاتا ہوں یہ حقیقت ہے۔ کہتے ہیں ایک فوجی چھٹی پر گھر آیا۔ اس کی ماں اسے کھانا دینے لگی تو پلیٹ میں پیچھے سے ہانڈی میں سے سالن نکال کر پلیٹ میں ڈالنے لگی۔ فوجی جوان

زندہ ہوتا ہے تو کس طرح اکڑ اکڑ کر چلتا ہے اور جس کے پاس چند کئے آجالتے ہیں وہ اپنے ساتھ کے انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتا۔ ایسے لوگ وہ منظر دیکھ لیتے ہمارے میں کھڑا تھا تو ان کے ہاتھ اپنے کانوں پر اور ان کا دل خدا کی طرف ہو جاتا۔ میں آپ کو وعظ نہیں سنا رہا۔ ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ ذرا اس پر غور کر لیں۔

میں فوجیوں کی باتیں سنا رہا ہوں۔ قدرتی طور پر آپ کے سامنے پاک فوج کے فوجی آگئے ہوں گے۔ یہ واضح کر دیتا ہوں کہ میں جس فوج کی بات کر رہا ہوں وہ پاک فوج سے بالکل ہی مختلف تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ پاک فوج سفید اور وہ فوج بالکل ہی سیاہ تھی۔ یہ مبالغہ نہیں کہ پاک فوج اور انگریزوں کی اس انڈین آرمی میں زمین اور آسمان جتنا فرق تھا۔ پاک فوج میں پڑھے لکھے لوگ ہیں اور اب تو پاک فوج کا ہر سپاہی پڑھا لکھا ہوتا ہے بلکہ لاٹگری بھی پڑھے لکھے مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاک فوج نے پاکستان بننے سے اب تک لڑائیاں بھی لڑیں اور اپنے عوام کی خدمت بھی کی۔ سیلاب آئے۔ زلزلے آئے، پاک فوج مدد کو پہنچی۔ اس طرح پاک فوج نے پاکستانیوں کے دلوں میں محبت اور عظمت پیدا کر لی ہے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ میں جب فوجیوں کی بات کروں تو آپ پاک فوج کو ذہن میں سے نکل دیں۔ پاکستان میں پیدا ہونے والی ہماری نسلوں نے انڈین آرمی نہیں دیکھی۔ اس میں صوبیدار اور صوبیدار۔ مجبوروں تک کی اکثریت ان پڑھ ہوتی تھی۔ جوان تو کورے لڑ پڑھ ہوتے تھے۔

اس زمانے میں فوجی کو صرف فوجی ہی نہیں بلکہ فوجی بے وقوف کہا جاتا تھا۔ دیہات کا ان پڑھ جوان کسی بڑے شہر میں جاتا تو اس کا دماغ اونچا ہو جاتا تھا اور اس کی بے وقوفی ہوتی تھی۔

وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کو پسماندہ اور جاہل سمجھنے لگتا تھا اور اکڑ اکڑ کر چلتا تو جیسے وہ بادشاہ بن گیا ہو اور پھر برتری جتانے کے لئے کارٹونوں جیسی حرکتیں کرتا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران جیسا کہ میں اپنی اس داستان میں سنا چکا ہوں، انگریزوں نے فوجیوں کو خوب سرچڑھایا تھا۔ انگریزوں نے ان بے وقوفوں کو لڑانا تھا اور ان بادشاہی کا تحفظ کرنا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہندوستان میں فوجی حکومت آئی ہو جس طرح ہماری پولیس عوام کو پریشان کرتی رہتی ہے اور معمولی سا ایک کانٹیل

شاید تھوڑا سا لیں کھانا چاہتا ہو گا۔ اس نے ماں کو یہ کہنے کی بجائے کہ اور سالن نہ ڈالو، یہ کہا "ہاٹ"۔ ماں سالن ڈالتی رہی۔ فوجی نے ماں کو بڑے غصے سے کہا ایک بار ہالٹ کہنے سے پورا بریگیڈ رک جاتا ہے، میں نے تین بار ہالٹ کہا اور تیرا چچہ نہیں رکا۔

انگریز آن پڑھ دیراتوں اور شہریوں کو فوج میں بھرتی کر کے کیوں بے وقوف بنا رہا تھا؟..... اُس کا جواب میرے سامنے بکھرا پڑا تھا، خشک ہڈیوں کی صورت میں۔ کوئی ایک بھی انسانی ڈھانچہ یکجا اور سلامت نہیں تھا۔ یہ تو پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ جو کھوپڑی ہے وہ اس ڈھانچے کی یا اس ڈھالنے کی۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ یہ لوگوں کو آکڑوں دکھا کر یہاں آئے تھے اور یہاں ہوا کیا؟..... توپوں کے گولوں نے ان کے جسموں کو بردہ کر دیا، جسموں کے ٹکڑے کر دیے اور پھر انہیں گڈھوں نے، جنگلی کتوں نے اور بھیڑیوں نے کھالیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ گردن اوچی کر کے نہ چل کہ تو پہاڑوں سے اُونچا نہیں ہو سکتا اور آکڑ کے نہ چل کہ تو زمین کو چھار نہیں سکتا۔ تجھے آخر ہمارے پاس ہی آنا ہے۔

○

میں اللہ کو یاد کرتا آہستہ آہستہ، قدم دیکھ دیکھ رکھتا ہڈیوں کے اس دیس میں سے گزر گیا۔ خاصا آگے جا کر میں رک گیا۔ وہ جگہ اس زمین سے ذرا اونچی تھی۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ سورج اس خطے پر اپنی دھوپ بکھیر چکا تھا۔ سبز گھاس میں سفید ہڈیاں، پنجر اور کھوپڑیاں بڑی صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں نے معلوم نہیں کس جذبے کے تحت اونچی آواز میں کہا — "میرے دوستو، میرے ہم وطنو، خدا حافظ۔" میں آگے کو چل پڑا۔ اب تو بھوک نے کچھ اور ہی رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں برداشت کرتا رہا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے چلتا رہا اور ایک ایسے خطے میں پہنچ گیا جہاں کچھ اور ہی قسم کے درخت تھے اور وہاں جھاڑیاں بھی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں چھوٹے چھوٹے بیر لگے ہوئے تھے جو سرخ رنگ کے تھے۔ یہ میرے علاقے کے جھاڑی بیر معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ایک بیر توڑا اور ڈرتے ڈرتے منہ میں ڈالا۔ اس کا ذائقہ بیروں جیسا ہی تھا۔ اُس کا سائز چنے کے دانے جتنا تھا اور کچھ اس سے ذرا بڑے تھے۔ میں نے یہ بیر توڑ توڑ کر کھانے شروع کر دیے۔ یہ پھل جو کچھ بھی تھانہ رہا

بھی ہو سکتا تھا لیکن میں نے ان سے پیٹ بھرنا شروع کر دیا اور سوچا کہ اگر یہ زہریلا لگا تو یہی ہو گا کہ مرجاؤں گا۔ میں موت کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کرنے کو تیار تھا۔ ایک ہی خیال دماغ میں سا گیا تھا کہ اب انگریز کی غلامی میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں یہ بیر کھاتا رہا۔ ذائقہ اچھا تھا اور پھر میں آگے چل پڑا۔ جسم میں کچھ جان آئی تھی۔ کچھ اور آگے گیا تو چار پانچ بڑے درخت دیکھے۔ ان کے ساتھ انجیر کی قسم کا پھل لگا ہوا تھا۔ اونچا تھا اس لئے میں شاخوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ درخت پر چڑھنے کے لئے بوٹ اتارنے پڑتے تھے۔ میں نے تین چار پتھر مارے تو یہ پھل جو کچھ بھی تھا، اس کے چند ایک دانے گرے۔ میں نے ایک دانہ اٹھا کر تھوڑا سا منہ میں ڈالا۔ ذائقہ اس کا بھی ٹھیک لگا۔ ذائقہ انجیر جیسا نہیں تھا۔ میٹھا تھا لیکن یہ پھل کچھ اور تھا۔ جو کچھ بھی تھا میں نے پتھر مار کر یہ پھل خاصا گرا لیا اور وہیں بیٹھ کر اس سے پیٹ میں کچھ گنجائش اگر جھاڑی بیروں نے جو چھوڑی تھی وہ پڑ کر لی۔

میں یہ سفر ذرا مختصر کر کے سناؤں گا کیونکہ یہ میری داستان کا ایسا حصہ ہے جس میں پڑھنے والوں کے لئے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی۔ میں ایک عجیب و غریب واقعہ سنانا چاہتا ہوں جو اس سفر کے تیسرے یا غالباً چوتھے روز پیش آیا تھا۔ میں میدان جنگ سے دور نکل گیا تھا۔ یہ انداز اس طرح ہوتا تھا کہ توپ خانے کے دھماکے، مشین گولوں اور رائفلوں کے فائر کی آوازیں مدھم ہو گئی تھیں۔ میں نے وہ دن چلتے ہی گزرا اور رات آگئی۔ ایک ذرا اچھی جگہ دیکھ کر میں لیٹا اور سو گیا۔ یہ رات بھی گزر گئی۔ اگلے روز میں پھر پہاڑی علاقے میں پھنس گیا۔ دو ندیاں بارگنی پڑیں اور پھر مجھے جھاڑی بیر مل گئے جن سے میں نے پیٹ کی آگ بجھائی۔ بالائی کوئی کمی نہیں تھی۔

میں اچھی طرح بتا نہیں سکتا کہ یہ میرے سفر کا تیسرا دن تھا یا چوتھا دن، وقت بلا بے لگ بھگ کا تھا۔ اس علاقے میں اونچی نیچی ٹیکریاں تھیں۔ پہاڑیاں ذرا پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ جھاڑیاں اور گھاس تھی جو ذرا اونچی تھی۔ اس علاقے میں دور دور تک پانی کا نام و نشان نہ تھا۔

میں چلا جا رہا تھا۔ اپنے پیچھے اس طرح آوازیں انھیں جیسے کتے غرار ہے ہوں۔ میں نے گوم کے دیکھا۔ وہ بھیڑیے تھے۔ بھیڑیا اکیلا نہیں ہوتا یہ درندہ گروہوں کی

شکل میں گھومتا پھرتا رہتا ہے اور شکار پر گردہ کی صورت میں حملہ کرتا ہے۔ ان درندوں کا انداز دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ پر حملہ کریں گے۔ وہ دانت نکال کر آہستہ آہستہ غرارہے تھے اور دائیں بائیں اس طرح پھیلتے جا رہے تھے جیسے مجھے محاصرے میں لے رہے ہوں۔ ساتھ ساتھ وہ میری طرف بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ میں نے رائفل کندھے سے لگائی۔ میگنیزین میں دس راؤنڈ موجود تھے۔ میں نے بولٹ پیچھے کھینچ کر آگے کیا اور ایک راؤنڈ چیمبر میں چلا گیا۔ نیلنگ پوزیشن میں بیٹھ کر یعنی ایک گھٹنا زمین پر نکالیا اور دوسرے گھٹنے پر کہنی رکھ کر رائفل کندھے سے لگائی۔ ایک بھیڑیے کو شست میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ وہ بھیڑیا بڑے زور سے بھونک کر اوپر کو اچھلا اور گر پڑا پھر فوراً اٹھا اور پیچھے کو چلا۔

میں نے بڑی تیزی سے بولٹ پیچھے کر کے ایک اور راؤنڈ چیمبر میں دھکیل کر ایک اور بھیڑیے کو شست میں لیا۔ پہلے دھماکے سے بھیڑیے چوکنے ہو کر پیچھے ہٹے تھے۔ جب میں نے دوسرا راؤنڈ فائر کر کے ایک اور بھیڑیے کو گرا دیا تو باقی بھیڑیے اس طرح بھاگے جس طرح میری رائفل سے گولی نکلی تھی۔ وہ دو بھیڑیے اچھلتے کودتے رہے اور ایسے گرے کہ پھر اٹھ نہ سکے۔

اب تو میں اور زیادہ چوکنا ہو گیا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جس علاقے میں جنگ ہو رہی ہے وہاں کے تمام درندے بھاگ کر ادھر آگئے ہوں گے۔ یہ میرے لئے ایک ہولناک خطرہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رات کو بھی مجھے چوکنا رہنا تھا۔ میں آگے کو چل پڑا۔

شاید ایک اور رات آئی تھی۔ اگلے روز سمجھ لیں یا شاید اس سے اگلے روز کہ میں ایک اور علاقے میں جا رہا تھا۔ وہ علاقہ بھی اسی جیسا تھا اور پرسکون تھا۔ پرسکون کا مطلب یہ تھا کہ وہاں کوئی لڑائی نہیں ہو رہی تھی اور نہ کوئی ایسے آثار تھے کہ یہاں کبھی لڑائی ہوئی تھی البتہ جنگ کے آثار صرف یہ نظر آتے تھے کہ چند ہولناک جہاز اوپر سے گزر جاتے تھے۔ یہ جہازوں کے لڑاکا بمبار جہاز تھے۔ میں ان جہازوں کو پہچانتا نہیں تھا۔ انہیں میں اس لئے جاپانی کہہ رہا ہوں کہ یہ دوسری طرف سے آئے تھے۔ مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

میں صبح اٹھ کر آگے کہ چل پڑا تھا اور خاصا آگے نکل گیا تھا۔ ایک ٹیکری گھوما تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں گوجرہ دیکھ رہا ہوں یہ حقیقت نہیں بلکہ یہ خواب ہے یا خیال ہے۔ ایک درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھ لگائے ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے پندرہ بیس قدم دور تھا۔ میں اسے دیکھ کر رک گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ زندہ نہیں لیکن اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھل رہی تھیں۔ اسے شاید میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ بری نہیں تھا۔ برمیوں کی شکل و شبہات بالکل مختلف ہوتی ہے۔ آپ نے چینی اور جاپانی دیکھے ہوں گے۔ برمیوں کے چہرے ان سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ آدمی ہندوستان کے کسی علاقے کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ یقیناً ”فوجی تھا کیونکہ اُس نے خاکی پتلون اور خاکی بٹرنٹ پنی ہوئی تھی لیکن اس کے پاؤں میں فوجی بوٹ نہیں تھے۔ وہ لاش لگتا تھا۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ اسے میں اپنے جیسا فوجی سمجھا جو جنگ سے بھگڑا ہوا آیا تھا اور راستہ بھول گیا تھا۔ بہر حال وہ ہندوستانی تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے بیٹھے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اُس کے قریب بیٹھا تو دیکھا کہ اس کے پیچھے رومال کی طرح کا ایک کپڑا پڑا ہوا تھا جس میں وہی یا اسی قسم کے پہاڑی بیریا وہ پھل تھا جسے میں نے انجیر کہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اسی پھل پر اب تک زندہ ہے۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گا۔

”کون ہو تم؟“ — میں نے پوچھا — ”بول سکتے ہو؟..... میری زبان سمجھتے ہو؟“

اُس نے سر ہلایا یعنی وہ بول بھی سکتا تھا اور میری زبان بھی سمجھتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس نے امرتسر کا نام لیا۔ پھر اس نے میری واٹر پائل کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اپنی پانی کی بوتل نکال کر اس کا کاک نکالا اور بوتل اس کے ہاتھوں میں دے دی۔ اس نے کم و بیش آدمی بوتل پانی پی لیا اور مجھے دے دی۔ اس نے سکون کا بڑا لمبا سانس لیا۔ پھر وہ بولنے لگا۔

”اب کچھ دیر اور زندہ رہ سکوں گا“ — اُس نے پنجابی زبان میں کہا۔ اُس کی آواز مدھم اور کمزور تھی اور وہ بولنے میں کچھ دقت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا

—”بس پانی کی ضرورت تھی۔ اب چلا نہیں جاتا۔“

اُس نے اپنی دائیں ٹانگ سے جو اس نے آگے کو کر رکھی تھی، چٹون اوپر گھٹنے تک کھینچی۔ جب میں نے اس کی پنڈلی دیکھی تب مجھے پتہ چلا کہ اس شخص سے اتنی بدبو کیوں آرہی ہے۔ اس کی پنڈلی سوچی ہوئی تھی، اتنی زیادہ کہ اس کی ران سے پنڈلی زیادہ موٹی ہو گئی تھی۔ پنڈلی صرف سوچی ہوئی نہیں تھی بلکہ اس میں ایسا زخم کہ پوری کی پوری پنڈلی کا گوشت ننگا ہو گیا تھا اور اس میں پیپ پڑی ہوئی تھی اور شاید میں نے اس پر چھوٹے چھوٹے کیرے ریگلتے ہوئے بھی دیکھے تھے۔ اس نے مجھے یہ دکھا کر چٹون پھر نیچے کر دی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہوا ہے..... اب وہ بولا تو اس کی آواز پہلے کی نسبت اچھی خاصی جان دار تھی۔ وہ اونچی آواز میں بول سکتا تھا۔

”میرے دوست!“ — اس نے کہا — ”معلوم ہوتا ہے تم انسان نہیں فرشتے ہو جو میرے پاس پہنچ گئے ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں تم ہندوستانی فوج کے حوالدار ہو۔“
اب مجھے یہی توقع تھی کہ یہ کسے گاکہ مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لو اور ایسی جگہ لے چلو جہاں میری مرہم پٹی ہو جائے اور میں زندہ رہ سکوں۔ میں نے سوچا کہ میں اسے صاف صاف بتا دوں گا کہ مجھے خود بھی علم نہیں کہ میں کہاں ہوں۔
”دیکھو میرے دوست!“ — وہ کہہ رہا تھا — ”تمہارے پاس رائفل بھی ہے، ایمونیشن بھی ہے، صرف ایک گولی کی ضرورت ہے۔ خدا کے واسطے میرے سر میں گولی مار دو اور مجھے اس اذیت سے بچا لو۔ میں نے مرنا ہی ہے لیکن موت کی اذیت بردھتی جا رہی ہے اور موت آتی نہیں۔ مجھے موت دے دو اور یہ میرے لئے بہت بڑا تحفہ ہو گا۔“

”نہیں میرے بھائی!“ — میں نے کہا — ”میں یہ کام نہیں کر سکوں گا۔ یہ تو بتاؤ کہ تم فوجی ہو یا سیوہیلن اور جو کچھ بھی ہو، یہاں تک کس طرح پہنچے ہو؟“
اس نے لمبی آہ بھری اور اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں خوش یا مسرت کی ذرا سی بھی جھلک نہیں تھی بلکہ اس میں اداسی تھی، شکست تھی اور غالباً اس میں طنز بھی تھی۔
”ہاں!“ — اُس نے کہا — ”تم نے یہ ٹھیک پوچھا ہے کہ میں کون ہوں اور

یہاں تک کس طرح پہنچا ہوں..... مجھے یہ کہانی تمہارے سپرد کر دینی چاہئے۔ میرے بھائی، میری اس کہانی کو تم امانت سمجھنا اور تم کبھی اپنے وطن کو واپس چلے گئے تو یہ لوگوں کو سناؤ۔ اس کہانی میں عبرت ہے۔ میں تعلیم یافتہ آدمی ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ لوگوں کو قرآن اور حدیثیں سناؤ تو وہ کچھ بھی نہیں سمجھیں گے۔ تم انہیں میری کہانی سناؤ گے تو وہ سمجھ جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس سے کوئی شخص سبق حاصل کر لے اور راہ راست پر آجائے۔ کوئی بات غلط یا جھوٹ نہیں کہوں گا۔ میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اللہ کی ذات جو گناہ بخشے والی ہے، مرتے وقت ہی میرے گناہ بخش دے اور میں اگلے جہان کی اذیت سے بچ جاؤں۔ میرے دوست! جو اذیت میں نے اس دنیا میں ہی دیکھ لی ہے جہنم کی اذیت اور کیا ہو گی۔“

اس نے اپنی داستان سنائی شروع کی تو میں نے دیکھا کہ اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ جان اور چٹنگی آتی چلی گئی تھی۔ شاید یہ اقبال جرم کر لینے کا سکون تھا۔ اس کے ضمیر کا بوجھ اترتا چلا گیا اور وہ کچھ اطمینان سا محسوس کرنے لگا تھا۔ میں اس کی یہ کہانی اپنے الفاظ میں سناؤں گا۔



کئی برسوں سے ”حکایت“ باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ میں نے ”حکایت“ میں اسی پس منظر میں غالباً تین یا چار سچی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ان کہانیوں کے کردار برا کے دارالحکومت رنگون میں تھے اور وہاں سے ہندوستان کو روانہ ہوئے تھے۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے اسی پس منظر میں ”حکایت“ میں ایک اور سچی کہانی پڑھی ہے۔ چونکہ میں اس پس منظر میں رہا ہوں اور اس کا میں یعنی شاہد ہوں اس لئے میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں یہ کہانیاں سو فیصد سچی ہیں۔

اس کی کہانی بھی کچھ ویسی ہی ہے لیکن آگے چل کر اس کے ساتھ جو واقعات پیش آئے وہ ذرا مختلف ہیں۔ یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ ایسی بہت سی کہانیاں برا کے جنگوں میں گم ہو گئی ہیں۔ میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ یا شہادت نہیں کہ میں آپ کو یقین دلا سکوں کہ میں آپ کو اس آدمی کی جو کہانی سنائے لگا ہوں کہ یہ بالکل سچ ہے۔ اس میں عجیب چیز یہ ہے کہ یہ شخص مجھے ملا کیسے اور ملا کہاں!

میں ذرا اس کا تھوڑا سا پس منظر بیان کر دوں۔ رنگون برا کا دارالحکومت تھا۔ بہت ہی بڑا اور خوبصورت شہر تھا۔ اس شہر میں بدھ مت کے پیرو کاروں کے عبادت خانے بنے ہوئے تھے جو اب بھی ہیں۔ میں وہاں گیا تھا۔ بہت خوبصورت عمارتیں ہیں جو تعمیراتی آرٹ کے بہترین نمونے ہیں۔ وہاں کچھ گرجے بھی تھے اور مسجدیں بھی تھیں۔ میں نے رنگون تباہی کی حالت میں دیکھا تھا۔ یہ بہت عرصہ بعد کی بات ہے جب جنگ ختم ہو چکی تھی اور جاپانیوں کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا۔ تباہی کی حالت میں بھی اس شہر کی خوبصورتی صاف نظر آرہی تھی۔

تباہی کچھ یوں تھی کہ شہر میں ٹرائیں چلتی تھیں۔ میں نے دو ٹرائیں دیکھیں جو اپنی پسندوں کے قریب الٹی پڑی تھیں۔ بڑی خوبصورت عمارتیں بمباری سے کھنڈر بنی ہوئی تھیں۔ کئی سڑکیں اس لئے بند تھیں کہ بموں نے وہاں بہت بڑے بڑے گڑھے بنا دیے تھے۔ ریلوے اسٹیشن بھی خاصا خوبصورت لگتا تھا۔ اس کی عمارت بھی بغیر چھت کے تھی کیونکہ اس پر بھی بم گرے تھے۔ میں نے ایک ریلوے انجن، پلیٹ فارم پر پہلو کے بل پڑا دیکھا۔

مجھے ایک عجیب چیز نظر آئی۔ وہ یہ کہ بدھوں کے پیگوڈا یعنی ان کی عبادت گاہیں، گرجے اور مسجدیں بالکل محفوظ تھیں لیکن ان کے ارد گرد جو آبادی تھی اور جو کئی کئی منزلہ عمارتیں تھیں وہ بمباری سے کھنڈر بنی ہوئی تھیں۔ کیا بم پھینکنے والے ہوا بازوں نے اچھی طرح دیکھ بھال کر بمباری کی تھی کہ کوئی عبادت گاہ تباہ نہ ہو؟ یا کیا یہ خداوند تعالیٰ کا کرشمہ تھا کہ کسی عبادت گاہ کا بال بھی رہنما نہ ہو؟ ہر حال میں نے یہ عجیب چیز دیکھی اور اللہ کو یاد کیا کہ تیری ذات ہر معجزہ کر سکتی ہے۔

یہ بمباری انگریزوں نے جولائی حملے میں کی تھی۔ ہندوستان کی طرح براہ بھی انگریزوں کی حکومت تھی۔ جاپانی فوجیوں نے حملہ کیا تو سنگاپور، ملایا اور تمام جزائر کو ختم کرتی ہوئی براہ آن پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے جزیرے قبضہ کر لیا۔ معلوم ہوا کہ جاپانی بمبار طیاروں نے رنگون پر یا کسی اور شہر پر ایک بم بھی نہیں گرایا تھا۔ ان کی فوجیں آرام سے رنگون میں داخل ہو گئی تھیں۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ جاپان کے جاسوس اور ایجنٹ ان علاقوں میں موجود تھے۔ انہوں نے جاپان کی فتح کے لئے زمین

دار کر رکھی تھی۔ معلوم ہوا کہ براہ کے لوگوں نے جاپان کی فوج کا استقبال کیا تھا۔ لوگ انگریزوں سے اس قدر متنفر تھے کہ انہوں نے جاپانیوں کا خیر مقدم کیا۔ ریزوں کو شاید برمیوں پر اعتبار تھا ہی نہیں۔ وہاں کی پولیس میں شاید ہی کوئی بری کچھ پولیس کی اکثریت ہندوستان کے لوگوں کی تھی جن میں زیادہ تر پنجاب اور بہار کے لوگ تھے۔ یہ تو اکثر سننے میں آتا تھا کہ کسی شخص کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہے تو جواب ملا کہ وہ براہ پولیس میں ہے۔ براہ کے لوگوں کو یہ بھی اچھا نہ لگا گا کہ ان پر پنجاب اور سرحد کے جوانوں کو پولیس میں بھرتی کر کے ان پر مسلط کر دیا گیا تھا۔

اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ براہ کے ڈاکو مشہور تھے۔ رنگون شہر کے اردوں میں اگر کسی بری کی کوئی دکان تھی تو وہ چھوٹی سی دکان ہی ہوگی۔ تمام روپا ہندوستان کے لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ ہندوستان کے صوبہ مدراس کے لوگ یا رنگون میں آباد تھے۔ درمیانے درجے کے اور بڑے ہوٹل مدراسی چلاتے تھے یہ ان کی ہی ملکیت تھے۔ جنرل سٹور اور کپڑے کا کاروبار اور کپڑے کی دکانیں یا ہندوستانیوں کی ملکیت تھیں۔ مختصراً یہ سمجھ لیں کہ رنگون میں ہر طرح کا روپا ہندوستان کے لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان میں بھی پنجاب کے لوگ خاصی دلاؤ میں تھے۔ تمام دولت ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ ظاہر ہے کہ برمیوں کو یہ سورت حال اچھی نہیں لگتی تھی۔ یہ بنیادی وجہ تھی کہ غیر برمیوں کو بری اچھی نظر نہ نہیں دیکھتے تھے بلکہ انہیں بھی وہ اسی طرح ناپسند کرتے تھے جس طرح انگریزوں نے اچانک براہ میں خبر پہنچی کہ جاپان کو فوجوں نے سنگاپور ملایا وغیرہ پر یلغار کر دی ہے۔ برمیوں کو موقع مل گیا۔ یہ میں چکا ہوں کہ براہ میں جاپان کے جاسوسوں اور ہٹلر نے کیا کام کیا تھا۔ برمیوں کے تیور دیکھ کر غیر بری تاجر، دکاندار اور دوسرے روپاری لوگ وہاں سے بھاگنے لگے۔ انہوں نے بے تحاشا دولت کمائی تھی۔ بڑے لیٹن مکان بھی بنائے تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ برمیوں نے ان غیر بری تاجروں وغیرہ سے کہہ دیا تھا کہ بہتر ہے کہ وہ یہاں سے نکل جائیں ورنہ قتل کر دیے جائیں گے۔ ان بڑی پیاری چیز ہوتی ہے۔ پھر کون یہ خطرہ مول لیتا ہے کہ اس کے چھوٹے موٹے معصوم اور دودھ پیتے بچے قتل کر دیے جائیں۔ زیادہ فکر مند وہ لوگ تھے

برمیوں کی بہت زیادہ تعداد اپنے ساتھ قیمتی اشیاء باندھ کر رنگون سے خشکی کے راستے چل پڑی۔

ان کا راستہ میں جو حال ہوا وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ کچھ قسمت والے لوگ ہی بنگال تک پہنچے تھے۔ لوگ قافلوں کی یا کئی کئی خاندانوں کی صورت میں آئے تھے۔ ایسے بھی تھے جو تنہا چل پڑے تھے۔

موجودہ صدی کی یہ ایک ایسی ہجرت ہے جس کے متعلق ہندوستان میں بہت کم سنا گیا تھا۔ کسی کو تفصیل سے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ رنگون اور برما کے دوسرے بڑے شہر مانڈلے سے غیر برمی کس طرح نکل کر آئے اور ان پر کیا جیتی تھی۔ دوسری ہجرت مسلمانوں کی مشرقی پنجاب سے پاکستان تک تھی جو بڑی ہی ہولناک اور درد ناک تھی۔ رنگون سے ہندوستانیوں کی ہجرت نے کئی ایک عبرتناک اور خوفناک کہانیوں کو جنم دیا تھا لیکن یہ کہانیاں کم ہی سنی اور سنائی گئیں۔ میں نے <حکایت> میں اس کی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں اور اب میں آپ کو ایک اور کہانی سنا رہا ہوں۔

○

وہ شخص جو مجھے ایک درخت کے تنے کے ساتھ لگا بیٹھا موت کا انتظار کرتا ملا تھا، اُس کا نام صدیق تھا۔ اُس کا باپ خاصے عرصے سے رنگون میں کاروبار کرتا تھا۔ اگر مجھے ٹھیک یاد رہ گیا ہے تو اس کا باپ گورنمنٹ کنزیکٹر تھا اور صدیق نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دولت مند لوگ تھے۔ ان کا اپنا مکان تھا۔ اُس کا باپ رنگون میں بہت عرصہ پہلے چلا گیا تھا اور جب ٹھیکداری میں اُس کے قدم جم گئے اور دولت آنے لگی تو وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی وہاں لے گیا۔ صدیق نے مجھے سنایا کہ باپ نے اُسے وہاں ایک کالج میں داخل کرا دیا تھا۔

صدیق ماں باپ کا اکلوتہ بیٹا تھا، باقی تین بہنیں تھیں اور ان کے بعد ایک چھوٹا بھائی تھا۔ صدیق کے گھر کے پیچھے شیخوں کی ایک مسلمان فیملی رہتی تھی۔ اس فیملی کا سربراہ کپڑے کی دکان کرتا تھا اور اچھی خاصی دکان تھی۔ صدیق نے بتایا کہ وہ شریف لوگ تھے۔

صدیق کا مکان دو منزلہ تھا۔ اس کی کھڑکیاں پچھواڑے کی طرف بھی تھیں۔ ان کھڑکیوں میں سے پچھلی فیملی کا پورا گھر اندر سے نظر آتا تھا۔ صحن تھا، برآمدہ تھا اور

جن کے گھروں میں نوجوان لڑکیاں تھیں۔ برمی کوئی شریف لوگ نہیں تھے۔ ظلم، تشدد اور حق تلفی سے تنگ آیا ہوا آدمی ویسے بھی شریف نہیں رہتا۔ وہ اپنی مظلومیت کا انتقام لیتا ہے۔ بعض برمی ایسے تھے جن کے غیر برمیوں کے ساتھ بڑے اچھے مراسم تھے۔ انہوں نے اپنے غیر برمی دوستوں اور تعلق داروں کو مخلصانہ مشورہ دیا کہ وہ یہاں سے نکل جائیں پھر اس کے کہ جاپان کی فوج یہاں پہنچ جائے۔

جاپان کی فوج کے متعلق ایک بات مشہور ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ جاپانی فوج جہاز بھی جاتی اور قبضہ کرتی ہے وہاں سے تمام نوجوان لڑکیوں کو اکٹھا کر کے اپنے ساتھ مورچوں میں رکھ لیتی ہے۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان لڑکیوں کو فوجی اپنے پاس کیوں رکھتے تھے۔ برمیوں نے جب جاپانی فوج کی یہ شہرت سنی تو ان کے سامنے یہی ایک راستہ تھا کہ یہاں سے بھاگ جائیں۔

بھاگنے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو سمندری تھا اور دوسرا راستہ خشکی تھا۔ خشکی کا راستہ مسدود تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خشکی کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ بندرگاہ پر بحری جہاز اور لانچیں وغیرہ موجود تھیں۔ روپے پیسے والے جو لوگ سمندری راستے سے نکل سکے، نکل آئے۔ پھر پرائیوٹ بحری جہاز رانوں نے او لانچوں کے مالکوں نے کرایہ اس قدر بڑھا دیا جو کوئی کوئی ہی ادا ہی کر سکتا تھا۔ یو سمجھ لیں کہ بحری راستہ بھی مسدود ہو گیا۔ ایسے واقعات بھی سنائی دیئے کہ بحر جہازوں اور لانچوں میں جانے والوں کو جہاز ران راستے میں ٹوٹ لیتے تھے اور ان عورتوں کو خراب کرتے تھے۔

ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ لوگوں نے بالکل اسی قسم کی ہجرت شروع کر دی جس طرح 1947ء میں مشرقی پنجاب سے مسلمانوں نے پاکستان کو کی تھی۔ کچھ تو تک تو نیکیاں اور بیس جاتی تھیں۔ اس سے آگے کوئی راستہ نہیں تھا۔ جنگل تھے پہاڑ تھے۔ نقشے پر دیکھ لیں۔ رنگون سے چلیں تو سب سے قریبی شہر بنگال کا چٹاگانگ ہے جو وہاں سے پانچ سو میل سے زیادہ دور ہے۔ یہ پانچ سو میل کا فاصلہ ہوائی سفر ہے۔ جنگل میں درندے مل سکتے تھے یا ڈاکو..... جاپانیوں کے لڑاکا بمبار طیارے پر پرواز کر جاتے تھے اور لڑاکا بم پھینک جاتے تھے۔ انہوں نے سنگاپور اور ملایا فتح لیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے برما کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس صورت حال میں

کچھ کمرے تھے۔ ان کی ایک نوجوان لڑکی تھی جو خاصی خوبصورت تھی۔ وہ پردہ نشین تھی۔ صدیق نے اپنے متعلق بڑی بے تکلفی سے بتایا کہ اُس کا باپ امیر کبیر تھا اور وہ اس کا اکلوتہ بیٹا تھا اس لئے وہ شرافت سے بہت دُور نکل گیا تھا۔ باپ سے وہ جتنے پیسے مانگتا باپ دے دیا کرتا تھا۔ ماں سے مانگتا تو ماں اس کی جیب بھر دیتی۔ باہر اُس نے اپنے جیسے بدکردار لڑکوں کے ساتھ دوستی کر لی۔ کالج تو وہ نام کو ہی جاتا تھا۔ غور کریں کہ اسی عمر میں صدیق نے عصمت فروشوں کے ہاں جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ شوقیہ جو ابھی کھیلتا تھا اور شاید ہی کوئی بدی ہو جو اُس میں نہ تھی۔ وہ گھر میں ہوتا تو پچھواڑے کی کھڑکی کھول کر پیچھے رہنے والی فیملی کے گھر تک جھانک شروع کر دیتا۔ اُس نے ان کی لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ کوئی شیخ فیملی تھی۔ ایک روز اُس نے ایک رقعہ لڑکی کے نام لکھا اور یہ رقعہ تمہ کر کے ایک کنکری کے ساتھ باندھا اور شیخوں کے صحن میں پھینک دیا۔ رقعہ لڑکی کی ماں نے اٹھایا اور پڑھا۔ اُس نے اوپر دیکھا تو کھڑکی میں صدیق کھڑا مسکرا رہا تھا۔

لڑکی کی ماں یہ رقعہ اور کنکری اٹھائے صدیق کے گھر آئی اور صدیق کی ماں کو یہ رقعہ دکھایا۔ ماں نے صدیق سے باز پرس کی تو صدیق نے ماں سے یہ جھوٹ بولا کہ لڑکی خود اسے اشارے کرتی ہے۔ لڑکی کی ماں کو اپنی لڑکی پر بھروسہ تھا۔ اس نے غصے کا اظہار کیا تو صدیق نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر گھر سے نکال دیا۔ اس کی ماں اسے اس بدتمیزی سے نہ روک سکی نہ اس نے روکنے کی کوشش کی۔

لڑکی کی ماں نے لڑکی کے باپ کو بتایا اور رقعہ دکھایا۔ لڑکی کا باپ صدیق کے باپ سے ملا اور شکایت کی۔ باپ نے صدیق کو بُرا بھلا کہا اور یہ بھی کہا کہ آئندہ اس نے ایسی حرکت کی تو اسے گھر سے کوئی پیسہ نہیں ملے گا۔ یہ تو زبانی بات تھی، عملاً باپ نے بیٹے کو اس بداخلاقی سے نہ روکا۔

صدیق نے مجھے سنایا کہ بد معاشی تو ایک طرف رہی، یہ لڑکی اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے سوچا کہ اس لڑکی کو یوں تنگ نہ کیا جائے بلکہ کسی طرح اس سے ملاقات کر کے کہا جائے کہ میرے دل میں تمہاری محبت پیدا ہو گئی ہے جس کا بد معاشی کے ساتھ یا بدتمیزی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یوں سوچ کر اس نے یہ حرکت کی کہ کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے تو صحن میں نکلنا ہی تھا۔ وہ

نالی تو صدیق نے ہاتھ جوڑے اور اشارے کئے۔ لڑکی نے منہ پھیر لیا اور کمرے میں چلی گئی۔

صدیق نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اُس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ ماں نے اس کے باپ کو بتایا۔ باپ نے اسے کہا کہ وہ پہلے بی اے کر لے اور پھر اسے باپ اپنے ساتھ کام میں لگائے گا اور جب وہ اس کام میں چل نکلے گا تب وہ اس کی شادی کرے گا۔ صدیق نے باپ سے کہا کہ وہ ابھی اس کی مکتبی اس لڑکی کے ساتھ کراویں پھر شادی جب چاہیں کرائیں۔ ماں باپ ٹال منول کرتے رہے اور وقت گزرتا رہا۔ لڑکی کی عمر پندرہ سولہ سال تھی۔ اس کے والدین کو اس کی شادی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

صدیق نے اپنے ماں باپ کو اتنا مجبور اور پریشان کر دیا کہ ایک روز صدیق کی ماں اُس لڑکی کی ماں کے پاس اُس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے چلی گئی۔ لڑکی کی ماں نے اُسے نکاسا جواب دے دیا۔ صدیق کی ماں نے اسے کہا کہ ان کی لڑکی کو شہزادیوں کی طرح رکھا جائے گا۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنی دولت کا گھمنڈ ظاہر کیا۔ لڑکی کی ماں نے اسے کہا کہ انہیں اخلاق، کردار اور شرافت چاہئے، دولت کوئی چیز نہیں اور وہ خود بھوکے ننگے بھی نہیں۔ صدیق کی ماں نے ذرا دبے سے بات کی تو لڑکی بول پڑی۔ اس نے جہاں اور بہت سی باتیں کیں وہاں یہ بھی کہہ دیا کہ میں کسی نافر لنگے اور اوچھے اور گھٹیا شخص کو قبول نہیں کروں گی۔

ماں نے گھر آکر صدیق کو یہ ساری باتیں سنائیں۔ صدیق بھڑک اٹھا۔ اس نے لڑکی سے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے اپنے جیسی ایک جوان لڑکی کے ساتھ تعلقات پیدا کئے اور اُسے کہا کہ وہ شیخوں کی بیٹی کے ساتھ دوستی کرے اور اُسے کسی طرح اپنے ساتھ باہر لائے۔ صدیق کی اس دوست نے ایسے ہی کیا۔ وہ شیخوں کے گھر جانے لگی لیکن اس گھرانے نے اسے قبول نہ کیا۔ اُس طرح صدیق کو ناگاہی ہوئی۔

شیخوں کی یہ کسم پٹی تیسرے چوتھے روز اپنے عزیزوں کے ہاں جلیا کرتی تھی۔ ”برقع پہنتی تھی۔ صدیق نے دو مرتبہ اس کا پیچھا کیا اور انتہائی گھٹیا الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے پریشان کیا۔ اس لڑکی کا کوئی بھائی جوان نہیں تھا۔ دو چھوٹے بھائی

تھے۔ اُس نے اپنے عزیزوں کو بتایا کہ فلاں لڑکا اسے یوں پریشان کرتا ہے۔
عزیزوں کے ہاں جوان لڑکے تھے۔ ایک روز انہوں نے صدیق کو پکڑ لیا اور اسے ہلا
پینا۔ یہ بات پولیس تک پہنچی۔ اس وقت کی اور وہاں کی پولیس ہماری آج کی پاکستان
پولیس سے بہت مختلف تھی۔ تھانیدار پنجابی تھا اور اس کے شاف میں زیادہ تر
پنجاب اور سرحد کے رہنے والے آدمی تھے۔ لڑکی کا باپ بھی تھانے پہنچ گیا۔ اس نے
صدیق کی تمام حرکتیں بتائیں اور تھانیدار سے کہا کہ وہ چل کر دونوں مکان دیکھے
کہ اسے پتہ چلے کہ لڑکا کس طرح کھڑکی کھول کر ان کی بے پردگی کرتا ہے۔

تھانیدار موقع پر چلا گیا اور اس نے دونوں مکان دیکھے۔ وہ ساری بات سمجھ گیا
اور اس نے صدیق کے باپ سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے کنٹرول میں رکھے ورنہ
اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔

صدیق کی یارلی لوفروں لفتوں کے ساتھ تھی۔ اُس نے اپنی بد معاشی جاری
رکھی۔ یہاں تک کیا کہ لڑکی کے باپ کی دکان میں رات کے وقت چوری کی واردات
کروائی۔ وہ اس طرح کہ لڑکی کا باپ صبح دکان پر گیا تو تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ ریشمی کپڑوں
کے کئی ایک تھان غائب تھے اور گلے سے پیسے بھی غائب تھے۔ شیخ نے تھانے
رپورٹ کی اور صدیق پر شک کا اظہار کیا۔ تھانیدار نے صدیق کو پکڑا اور تھانے بٹھا
لیا لیکن صدیق نے واردات سے لافعلی اور لاعلمی کا اظہار کیا۔ تھانیدار نے اسے
مارا پیٹا بھی لیکن وہ نہ ماتا۔ اصل چور نہ مل سکے۔ تھانیدار نے صدیق کو چھوڑ دیا
کیونکہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی اور کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔

صدیق نے اپنی بد معاشیاں جاری رکھیں۔ یہ شیخ فیملی صدیق سے اس قدر شک
آگئی کہ انہوں نے وہ مکان چھوڑ دیا اور شہر میں کہیں اور مکان لے لیا۔ تین چار
مہینے گزر گئے۔ صدیق نے اس لڑکی کو ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ان کا مکان دیکھ لیا تھا اور
پھر ایک بار اس نے لڑکی کو ٹرام میں اپنے عزیزوں کے گھر جاتے دیکھ لیا۔ راستے میں
اس نے لڑکی کو چھیڑا۔ لڑکی نے شور شرابہ کیا تو لوگ اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے
صدیق کو لٹن طعن کی۔

صدیق نے دو اڑھائی سال اس لڑکی کا ناک میں دم کئے رکھا۔ اب لڑکی اٹھارہ
سال کی ہو گئی تھی۔ صدیق نے ایک عورت کو بھی لڑکی کے پیچھے ڈالا جو اسے اس

دعوت میں وہ خبریں پہنچنے لگیں جو میں بیان کر چکا ہوں۔ برمیوں نے جہاں غیر
برمیوں کو بھاگ جانے کو کہا تھا وہاں انہوں نے اس لڑکی کے باپ اور صدیق کے
باپ کو بھی دوستانہ اور برادرانہ انداز سے کہا کہ وہ بہت جلدی یہاں سے نکل
جائیں۔ صدیق کے باپ کے پاس دولت تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ انگریز گئے اور جاپانی
آئے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ اُس نے وہاں سے نکلنے میں بہت وقت لگا دیا۔ وہ اپنے
بری دوستوں کی یہ بات نہیں سمجھ رہا تھا کہ یہاں بات انگریزوں کی اور جاپانیوں کی
نہیں بلکہ برمیوں کی ہے۔ بری جاپانیوں کے پہنچتے ہی شہر میں لوٹ مار کریں گے اور
غیر برمیوں کو ٹوٹیں گے بھی، انہیں قتل بھی کریں گے اور ان کی لڑکیوں کو بھی اغوا کر
لیں گے۔

اب ٹھیکیدار کو مصیبت پڑی۔ صدیق نے مجھے بتایا کہ بندرگاہ پر گئے تو وہاں کوئی
جہاز اور کوئی لالچ نہیں تھی۔ لالچ تو اتنی دور کا سفر کر بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر بھی
بعض لالچیں جہاز کا لالچ تک چلی گئی تھیں لیکن یہ ایک خطرہ تھا۔ آخر ٹھیکیدار کو خشکی
کے راستے جانے کا انتظام کرنا پڑا۔ اُس نے ایک بس کرائے پر لے لی لیکن بس جنگل
میں تو نہیں جاسکتی تھی۔ پھر بھی پوری فیملی اس بس میں بیٹھی اور جہاں تک بس ان
کو لے جاسکتی تھی وہاں تک پہنچا کر واپس آگئی۔ یہ لوگ وہاں سے اپنی جانیں
نیورات اور نقدی لے کر نکلے تھے۔ نقدی کوئی تھوڑی سی نہیں تھی۔ پھر انہیں
کرائے کی فحشیں مل گئیں۔ فحشوں والوں نے بھی ان کو کچھ دور تک ہی پہنچایا آخر
وہ بھی منہ موڑ گئے۔ پھر جس طرح دوسرے لوگ پاپادہ چلے جا رہے تھے اسی طرح
یہ فیملی بھی چل پڑی۔

یہ لوگ دریائے اریاوتی تک پہنچ گئے۔ وہاں کوئی روکنے والا تو نہیں تھا۔ بہت

رک مئی۔ صدیق ویسے ہی ایک طرف نکل گیا۔ وہ دیکھنے گیا تھا کہ ہو سکتا ہے کوئی ہتھیار راستہ نظر آجائے۔ اُسے کچھ دور جا کر راستہ تو نظر نہ آیا البتہ ایک ایسی چیز نظر آئی جس نے اسے حیرت زدہ کر دیا اور اس کے اندر کوئی اور ہی جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک جگہ شیخ فیملی رکی ہوئی ہے اور ان کے ساتھ شیخ کی وہ بیٹی بھی ہے جس کی پیچھے وہ پڑا رہتا تھا۔

ان لوگوں کو وہاں دیکھ لینا کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔ جس طرح وہ خود جا رہے تھے اسی طرح یہ شیخ فیملی بھی جا رہی تھی۔ اس مصیبت کے وقت میں بھی جب کوئی امید نہیں تھی کہ یہ لوگ منزل پر پہنچ جائیں گے یا راستے میں مرجائیں گے یا کہیں سے کوئی درندہ آکر انہیں چیر پھاڑ دے گا، صدیق کے دل میں شیطان نے اُگرائی لی۔

اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ پتہ نہیں مرنے یا زندہ رہنے یا نہ جانے کیا ہو جائے، اس لڑکی سے میں انتقام ضرور لوں گا۔ اس نے انتقام لینے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ رات کو جب اس کی فیملی سو گئی تھی، وہ اٹھا اور اس طرف چل پڑا جہر شیخ فیملی جا رہی تھی۔ اس شخص نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے والدین اور اس کی بہنیں اسے غیر حاضری میں گئے تو وہ سب کس طرح پریشان ہوں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سفر ملتوی کر کے اسے ڈھونڈنے کے لیے اوھر اوھر چل پڑیں۔

یہ صدیق کا کردار تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ روپے پیسے کے نشے نے اس میں گھنیا پن پیدا کر دیا تھا۔ اس نے مجھے سنایا کہ وہ رات بھر مارا مارا پھرتا رہا لیکن اسے شیخ فیملی نظر نہ آئی۔ صبح طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے نیند نے اس پر ایسا غلبہ کیا کہ وہ گر پڑا اور گہری نیند سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دن کے تین بج رہے تھے۔ اسے اپنی فیملی کا خیال آیا تو اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ کس طرف سے آیا تھا۔ اگر میدان ہوتا تو وہ سیدھا آتا اور سیدھا واپس چلا جاتا۔ وہاں تو ٹیکریاں، ٹیلے اور چٹانیں تھیں اور کچھ کھڈ بھی تھے۔ وہ ان میں سے گزر کر آیا تھا۔

وہ اٹھا اور ایک اور طرف چل پڑا۔ سورج غروب ہونے کو تھا جب اسے شیخ

سے لوگ دریا کے پل سے گذر رہے تھے۔ یہ بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے۔ جن جوں یہ لوگ آگے بڑھتے جا رہے تھے، بکھرتے جا رہے تھے۔ صدیق نے مجھے سنایا کہ اس کی حالت بہت بری ہوئی جا رہی تھی۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ روپے پیسے سے دنیا کی ہر چیز میاں تک کہ انسان بھی خریدے جاسکتے ہیں لیکن برما کے ان جنگلوں میں اور پہاڑی علاقوں میں اسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ روپیہ پیسہ کچھ بھی نہیں۔ جو کچھ ہے وہ اللہ کی ذات ہے لیکن صدیق نے اللہ کو تو کبھی یاد ہی نہیں کیا تھا۔ بار بار پیچھے دیکھتا تھا جیسے اسے توقع تھی کہ کوئی نہ کوئی اس کے پیچھے دوڑ آئے گا اور اسے کئے گا صدیق واپس آجاؤ رنگوں میں کوئی خطرہ نہیں۔ وہاں کس نے اتنا تو اسے واپس لے جانے کے لیے کوئی بھی نہ آیا۔

ان کے پاس کھانے پینے کا کچھ سامان تھا۔ دو تین دن گذر گئے تھے۔ مزید تر چار دن گزرے تو کھانے کا سامان ختم ہو گیا اور ایک صبح انہوں نے دیکھا کہ ان کی فیملی اکیلی رہ گئی ہے اور دوسرے لوگ بکھر کر اپنی اپنی راہ لگ گئے ہیں۔

صدیق نے مجھے اتنی زیادہ تفصیلات نہیں سنائی تھیں۔ وہ سنا بھی نہیں سکتا کیونکہ بولتے بولتے اس کی زبان رک جاتی تھی۔ کچھ دیر وہ اپنی سانسوں کو سنبھالتا تھا، ایک دو لمبی سانسیں لیتا پھر بات آگے سناٹا تھا۔ اس نے یہ نہ بتایا کہ وہ اکیلے کس طرح رہ گئے تھے۔

اس کے باپ کے پاس بے شمار رقم تھی لیکن وہ محض بے کار تھی۔ ایک رات وہ سونے کے لیے زمین پر لیٹے تو چار بری آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی کھواری تھی جن کے بلیڈ عام کھواریوں جیسے نہیں بلکہ آگے سے چوڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ انہوں نے اپنی زبان میں کہا کہ ہم تمہاری ان جوان لڑکیوں کا کچھ بھی نہیں کہیں گے، تم لوگ رقم اور زیور ہمارے حوالے کر دو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے اور رقم اور زیور کے ساتھ ان لڑکیوں کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ ٹھیکیدار نے بڑے آرام سے زیورات کی پوٹلی اور نقد رقم ان کے حوالے کر دی اور اس طرح اپنی بیٹیوں کی عصمتیں اور جانیں بچالیں۔

○
شاید دو تین یا چار پانچ دن گزرے ہوں گے کہ یہ فیملی دن کے وقت ایک جگہ

فیملی نظر آئی۔ وہ فیملی جا رہی تھی اور جب سورج غروب ہو گیا تو وہ لوگ رک گئے۔
صدیق بھی رک گیا۔ ان لوگوں نے صدیق کو نہیں دیکھا تھا۔ صدیق وہیں لیٹ گیا
اُس نے رات کو اس فیملی پر حملہ کرنا تھا۔ اُس کے پاس لمبا چاقو تھا۔

اُس کے اندازے کے مطابق رات کے دس ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ اُسے
یقین تھا کہ شیخ فیملی گمری نیند سو رہی ہوگی۔ اُس فیملی میں ایک تو شیخ خود تھا اور اُس
کی بیٹی کے بعد دو بیٹے تھے جو چھوٹے تھے۔ فیملی میں یہی مرد تھے اور یہ صدیق سے
مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

چاند پورا تھا۔ جنگل کی چاندنی بڑی شفاف ہوا کرتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس
فیملی کی طرف گیا اور ان تک پہنچ گیا۔ وہ تھکے ماندے بہت ہی گمری نیند سوئے ہوئے
تھے۔ صدیق نے چاندنی میں لڑکی کو پہچانا۔ وہ درمیان میں نہیں بلکہ ایک طرف سوئی
ہوئی تھی۔

صدیق نے آہستہ سے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے ہلایا۔ لڑکی
کروٹ بدل کر جاگ اٹھی۔ صدیق اُس کے پان بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی کی آنکھ کھلی تو
صدیق نے کھلا ہوا چاقو اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا اور سرگوشی میں کہا کہ آواز
نہ نکالنا ورنہ شہ رگ کاٹ دوں گا، اٹھو۔

وہ پردہ نشین لڑکی تھی۔ اُس پر تو سکتہ طاری ہو گیا ہو گا۔ صدیق نے مجھے سنایا
کہ وہ اس طرح اٹھی جیسے اُس پر جادو کا اثر ہو گیا تھا۔ چاندنی میں اُس کی آنکھیں
یوں نظر آتی تھیں جیسے ٹھہر گئی ہوں۔ صدیق اُسے ایک طرف لے گیا اور اُسے
کپڑے اتارنے کو کہا۔ لڑکی سکتے سکتے اُٹھ گئی اور اُس کے ساتھ ہی اُس نے صدیق
سے دُور ہٹنے کی کوشش بھی کی۔ صدیق نے چاقو کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ دی
اور اپنا حکم دوہرایا لیکن لڑکی نہ مانی۔ صدیق نے اُسے بہت دُرازا دھکایا لیکن لڑکی
نے پھر بھی سوائے رونے کے اور کچھ نہ کیا۔ صدیق نے اسے اپنے بازوؤں میں بکڑ
کر گرا لیا اور اُسے برہنہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پوزیشن ایسی ہو گئی تھی کہ لڑکی
پینے کے بل زمین پر پڑی تھی اور صدیق اُس کے اوپر تھا۔

صدیق ذرا سیدھا ہوا تو لڑکی نے اپنے دونوں پاؤں صدیق کے سینے پر رکھے اور
اتنی زور سے پاؤں سے اُسے دھکا دیا کہ صدیق پیچھے جا گرا۔

یہاں سے صدیق کی اصل سزا شروع ہوئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جہاں اس
نے لڑکی کو گرا لیا تھا وہ ایک گمرے پتھر سے گڑھے کا کنارہ تھا یا جو میں سمجھا وہ یہ تھا کہ
وہ ایک سیدھی کھڑی چٹان تھی جو دس بارہ فٹ یا شاید اس سے بھی زیادہ گمری تھی۔
بچے جو زمین تھی وہ پتھر کی تھی یا وہ چٹان کا حصہ تھا اور وہ بڑی ہی سخت تھی۔ صدیق
کو اتنا یاد رہا کہ وہ لڑکی کے دھکے سے پیچھے گرا تو وہ اوپر سے پتھر کی طرح نیچے گیا۔
مگر وہ پیٹھ کے بل لیکن اس کے سر کا پچھلا حصہ کسی بڑے پتھر پر لگا اور اس کے
بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ لڑکی کی نہ صرف عصمت محفوظ رہی بلکہ اسے تو صدیق
برہنہ بھی نہیں کر سکا تھا۔ اس کا خدا حالی اور مددگار تھا۔

○

اس سے آگے صدیق نے مجھے جو بات سنائی، اس سے میں نے اندازہ کیا اور یہ
رائے قائم کی کہ یہ بلندی سے گرا اور اس کے سر کا پچھلا حصہ پتھر سے ٹکرایا تو یہ
بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو یہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اسے بالکل یاد نہیں
تھا نہ کچھ اندازہ تھا کہ وہ کتنے دن وہیں بھٹکتا پھرا اور وہ کتنا تھا کہ اسے خواب کی طرح
یاد ہے کہ اس نے ایک ندی سے پانی پیا اور میری طرح درختوں سے کچھ توڑ کر کھلایا
تھا۔ ہر حال وہ زندہ رہا لیکن اسے یہ یاد نہیں تھا کہ وہ کس سمت کو چل رہا، کہاں گھومتا
پھرتا رہا اور کہاں کہاں سوتا رہا۔ ہوا یہ کہ اُس کی یادداشت آہستہ آہستہ واپس آنے
لگی۔ پھر اسے سب کچھ یاد آگیا لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں
جا رہا تھا۔

ایک روز اسے کچھ آوازیں سی سنائی دیں۔ وہ رک گیا۔ ڈرنے کی کوئی وجہ
نہیں تھی۔ آوازیں انسانوں کی لگتی تھیں۔ اسے خوشی سی ہوئی کہ یہ جو کوئی بھی
ہوئے انسان ہی ہوں گے اور اس کی کچھ نہ کچھ تو مدد کریں گے یا یہی بتا دیں گے کہ
بنگل کو جانا ہے تو فلاں سمت جاؤ۔

آوازیں ایک اونچی ٹیکری کے پیچھے سے آرہی تھیں۔ وہ ادھر چلا گیا۔ اُس نے
کبھی چلبلی نہیں دیکھے تھے۔ اس کے سامنے بیس پچیس فوٹی ادھر ادھر بکھرے ہوئے
کچھ کر رہے تھے۔ ان کی شکلیں بتاتی تھیں کہ یہ انگریز نہیں اور چلبلی ہی ہو سکتے
ہیں۔

صدیق نے جس طرح مجھے سنایا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جلیانیوں کی فوجی سیکشن تھی۔ ایک جلیانی نے اسے دیکھ لیا اور اپنی طرف بلایا۔ تب اس نے دیکھا کہ ان کے ساتھ چار پانچ سولہ تھے جو بری ہی لگتے تھے لیکن کسی اور علاقے کے رہنے والے تھے۔ جلیانیوں نے انہیں اپنے ساتھ سلمان وغیرہ اٹھانے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے صدیق کو دیکھا تو اسے بھی اپنے پاس بلا لیا۔ وہ ڈرنا ڈرنا کیا کہ جلیانی اسے مار ڈالیں گے یا قیدی بنا کر پیچھے بھیج دیں گے لیکن جلیانیوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ دشمنوں والا نہیں تھا۔

جلیانی فوجیوں کے ساتھ جو چار پانچ آدمی تھے وہ برا کی زبان بولتے تھے اور صدیق برا کی زبان بڑی اچھی طرح بول اور سمجھ سکتا تھا۔ جلیانیوں نے ان برمیوں کے ذریعے صدیق سے پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ صدیق نے انہیں بتایا کہ وہ رنگون سے اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان کی طرف جا رہا تھا لیکن اپنے خاندان سے ہجڑ گیا ہے۔ میں یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ جلیانیوں کو برمیوں نے بتا دیا ہو گا کہ غیر برمی لوگ ہندوستان کو بھاگ گئے ہیں۔

ان جلیانیوں نے صدیق کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اس سے وہ مزدوروں اور نوکروں کا کام لینا چاہتے تھے۔ صدیق نے انہیں رحمت کے فرشتے سمجھتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا اور ان سے کھانے کو کچھ مانگا۔ اس نے بتایا کہ وہ کتنے دنوں سے جنگل کی چیزیں کھا کر زندہ تھا۔ جلیانیوں نے اسے کھانے کو دیا۔ معلوم نہیں کتنے عرصے بعد اسے ذرا ڈھنک کا کچھ کھانے کو ملا۔

صدیق فوجی نہیں تھا اس لئے وہ نہیں بتا سکتا تھا کہ جلیانیوں نے وہاں کیا بنایا ہوا تھا۔ اس نے جو بیان کیا، اس سے میں نے اندازہ کیا کہ انہوں نے وہاں سنگل پوسٹ بنائی تھی۔ وہاں سے وہ برا فرنٹ پر لڑنے والی فوجوں کا رابطہ پیچھے اپنے ہیڈ کوارٹر یا اپنی ہائی کمان سے کراتے تھے اور وہ ہوائی جہازوں کے ساتھ بھی باتیں کر سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ ان کی ایک وائرلیس پوسٹ تھی جسے آپ سنگل پوسٹ کہہ لیں یا کچھ کہہ لیں۔ وہاں انہوں نے اپنا باورچی خانہ بھی بنا لیا۔ صدیق کا اور دوسرے تین چار برمیوں کا یہ کام تھا کہ وہ جلیانیوں کے برتن قریبی ندی پر دھوتے تھے۔ باورچی خانے میں آگ جلیاتے اور جو کام ان کے ذمے ہوتا وہ کرتے تھے۔ کھانا جلیانی خود پکاتے

تھے۔ ان کے بوٹ بھی یہی لوگ صاف کرتے تھے اور ندی سے پانی بھی لاتے تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ انہیں جلیانیوں نے روٹی پر نوکر رکھ لیا تھا۔ برمیوں نے صدیق کو بتا دیا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ وہ کہیں بھی نہیں جاسکے گا اور جلیانی اسے پکڑ لائیں گے اور گولی مار دیں گے۔

○

یہ پوسٹ کئی مہینے وہاں رہی اور اس کے بعد یہ پوسٹ یہاں سے اٹھائی گئی اور ڈیڑھ دو میل پیچھے ایک اور زیادہ بلند ٹیکری پر بنائی گئی۔ صدیق ان کے ساتھ رہا۔ اسے بہت ہی کام کرنا پڑا لیکن اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ مرے گا نہیں یا کم از کم بھوکا نہیں مرے گا۔ جلیانی اسے بڑی اچھی خوراک کھلا رہے تھے۔ جلیانی جو کچھ خود کھاتے تھے وہ ان سولہ آدمیوں کو بھی کھلاتے تھے۔ وہ ایسا نہیں کرتے تھے کہ بچا کھچا کھانا ان کے آگے پھینک دیتے۔

صدیق نے مجھے سنایا کہ اس کے ذہن سے عیش و عشرت کی وہ زندگی جو اس نے اپنے باپ کی دولت پر گزاری تھی، اتر گئی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس زندگی کو بھول گیا تھا، مطلب یہ تھا کہ اس اچھے وقت کی یاد اسے تنگ نہیں کرتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو یہ یقین دلادیا تھا کہ اسے اپنے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ وہ اس میں خوش تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی سزا نہ صرف ابھی باقی ہے بلکہ بڑی اذیت ناک سزا اسے ملنے والی ہے۔

تین یا چار مہینے پوسٹ وہاں رہی۔ ایک روز ہوائی جہاز آئے اور انہوں نے اس پوسٹ پر دو بم گرائے جو پوسٹ کے دائیں اور بائیں گرے اور ایسے دھماکوں سے پھٹے کہ صدیق کا دماغ ٹوٹ ہو گیا۔ اس وقت وہ ندی پر پانی لینے گیا تھا۔ پوسٹ سے وہ بہت دور نہیں تھا۔ وہ وہیں رک گیا۔ پیچھے ایک اور ہوائی جہاز آیا جو پوسٹ پر مشین گنیں فائر کرتا نظر آیا۔ اس کے پیچھے ایک اور ہوائی جہاز آیا جس نے بم گرائے اور یہ بم پوسٹ کے اوپر گرے اور جب یہ پھٹے تو اس نے دو جلیانیوں کو ہوا میں اوپر جلاتے اور گرتے دیکھا۔

میں صدیق کی یہ بات سمجھ گیا۔ اس وقت تک براہ جہانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور جنگ ہندوستان کے دروازے پر چلی آ رہی تھی۔ انگریزوں کی فوج جس میں

انڈین آرمی زیادہ تھی اور گورا فوج بھی تھی، بری طرح برا سے پسپا ہوئی تھی۔ اب انگریزوں نے امریکہ کی مدد سے برا پر جوابی حملہ شروع کر دیا تھا۔ اب جاپانی فوج پسپا ہو رہی تھی۔

میں نے رنگون کی تباہی کا حال بیان کیا ہے۔ جاپانیوں نے رنگون پر کوئی بمباری نہیں کی تھی نہ ہی انہیں بمباری کی ضرورت پڑی تھی۔ برمیوں نے جاپانیوں کا ساتھ دیا تھا اور انگریزوں کی فوج اور پولیس رنگون سے بُری طرح بھاگی تھیں۔ مجھے بعد میں سنایا گیا تھا کہ جاپانی فوج بحری جہازوں کے ذریعے آئی تھی اور ان کے جہاز بندرگاہ سے کچھ دور رک گئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے کشتیوں پر رنگون تک آنا تھا۔ ان کے پاس کشتیاں بحری جہازوں میں موجود تھیں لیکن برا کے مافی گیر اپنی کشتیاں لے کر جاپانیوں کے بحری جہازوں تک جا پہنچے اور ان کشتیوں پر جاپانیوں کو بھاکر رنگون کے ساحل پر لے آئے تھے۔

انگریزوں نے جب جوابی حملہ کیا تو ان کے بمبار طیاروں نے رنگون پر بے پناہ بمباری کی تھی۔ رنگون انگریزوں کی بمباری سے تباہ ہوا تھا۔ یہ انگریزوں کا اپنا شہر تھا۔ انہوں نے اس شہر میں تباہی مچادی تھی۔

صدیق نے جب دیکھا کہ ہوائی جہاز چلے گئے ہیں تو وہ واپس پوسٹ پر آیا۔ وہاں اب بمبوں کے بنائے ہوئے گڑھے تھے اور جاپانیوں کی لاشیں تھیں اور پوسٹ کا سامان دور دور بکھر گیا تھا اور کوئی بھی چیز سلامت نہیں رہی تھی۔ ان کے ساتھ جو چار پانچ سو ملین بری تھے وہ بھی مارے گئے تھے۔ کوئی لاش پوری کی پوری نہیں تھی۔ لاشوں کے ٹکڑے اوھر اوھر پڑے ہوئے تھے۔

صدیق پر ایسی ہیبت اور دہشت طاری ہوئی کہ اس کا دماغ ٹاؤف اور جسم سن ہو گیا۔ وہ تو سمجھ بیٹھا تھا کہ ابھی اُس کی سانسیں رک جائیں گی اور وہ ہمیں مرجائے گا لیکن وہ زندہ رہا۔

اب اُسے وہاں سے کسی طرف چلے جانا تھا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہندوستان کس طرف ہے۔ اس نے اوھر اوھر دیکھا۔ بکھری ہوئی چیزوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ وہ کھانے پینے کا کچھ سامان اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اسے دو ڈبل روٹیاں، جام کی ایک ٹوٹی ہوئی شیشی اور اس طرح کی کچھ اور چیزیں مل گئیں۔

انہیں ایک کپڑے میں سمیٹ کر وہ جدھر کو منہ آیا اوھر کو چل پڑا۔

اُس نے مجھے بتایا کہ اسے اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ کتنے دن بھٹکتا رہا اور کہاں کہاں گھومتا پھرتا رہا تھا۔ کبھی پہاڑیوں کے اندر، کبھی کسی میدان اور کبھی ندی کے کنارے کنارے وہ چلتا رہا، کیسے تھک کر گر پڑا اور سو گیا اور اس طرح اس نے نہ جانے کتنی راتیں اور کتنے دن گزار دیے۔

ایک رات وہ سویا ہوا تھا۔ پنڈلی میں اسے اس طرح درد ہوا جیسے کسی نے چاقو اس کی پنڈلی میں اتار دیا ہو۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ پنڈلی پر ہاتھ پھیرا۔ اسے توقع تھی کہ وہاں زخم ہو گا لیکن وہاں کوئی زخم نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ گیلا ہو گیا۔ اب راتیں اندھری تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے کسی زہریلے کیڑے نے یا بچھو نے ڈس لیا ہے۔ یہ سانپ بھی ہو سکتا تھا۔ اندھیرے میں اسے کچھ نظر تو آتا نہیں تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ پنڈلی میں زخم ہو گا۔ پتلون اوپر کر کے پنڈلی پر ہاتھ پھیرا تو وہاں دیرا زخم نہیں تھا جیسا وہ سمجھا تھا، البتہ اس کا ہاتھ پھر گیلا ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ اس کا خون ہے۔ وہ ایک طرف چل پڑا۔

درد کی شدت اُس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگا۔ اس نے صرف یہ علاج کیا کہ کپڑے میں وہ کھانے کی کچھ چیزیں باندھ کر لایا تھا۔ اس کپڑے کو پھاڑا اوز یہ پٹی اس جگہ باندھ دی جہاں کسی چیز نے کاٹا تھا۔ جب درد کی شدید ٹیسس اٹھنے لگیں تو صدیق کو یاد آئے لگا کہ اس نے ایک شریف گھرانے کی پردہ نشین لڑکی کے لئے جینا حرام کر دیا تھا اور اسے انتہائی یہودہ طریقوں اور بے حیائی کے الفاظ سے پریشان کرتا رہا تھا۔ اسے وہ رات بھی یاد آئی جب اس نے لڑکی کی عزت پر حملہ کیا تھا۔ وہ ناکام تو رہا تھا لیکن اس کا ارادہ اور نیت گناہ ہی کی تھی۔ اسے اب احساس ہونے لگا کہ خدا اسے اسی دنیا میں سزا دینے لگا ہے۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ شیخوں کی بیٹی اسے کہیں مل جائے تو وہ اس کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ویسے ہی ایک طرف چل پڑا۔ اس کا دماغ بیکار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ درد کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ خدا سے گناہوں کی بخشش اور فوری موت مانگنے لگا۔ اسے امید یہی تھی کہ یہ زہر اس کے جسم میں پھیل جائے گا تو وہ مرجائے گا۔ اس وقت وہ مرنا ہی چاہتا تھا۔

یہاں پھر وہ بھول گیا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا یا سو گیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کتنے دن چلا، کتنی راتیں سویا یا یہ شاید ایک دو دن پہلے کی بات ہے۔ یوں ہی چلے اور درد کو برداشت کرتے وقت گزرنا گیا اور اس کی پنڈلی سو جتی چلی گئی اور کھال اکھڑتی گئی اور اس طرح پنڈلی پر ایسے زخم بن گئے جیسے کسی نے ہاتھ سے اس کی کھال چھیل دی ہو۔ زخم میں پیپ پڑ گئی تھی۔

میرا خیال یہ ہے کہ اُسے نہ سانپ نے کانا تھا نہ بچھو نے، کسی کینڑے نے کانا تھا۔ مگر سانپ یا بچھو اسے ڈستا تو وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ زہر خون میں شامل ہو کر دماغ میں چلا جاتا اور وہ کبھی کامرچکا ہوتا۔

وہ چند دنوں سے اس علاقے میں گھوم پھر رہا تھا اور درختوں کے وہی پھل کھا رہا تھا جو میں نے کھائے تھے۔ پانی ندی میں سے پی لیتا تھا۔ دو روز سے وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اٹھتا تھا تو زخمی پنڈلی والی ٹانگ جسم کے نیچے کھڑی نہیں ہوتی تھی۔ ذرا دباؤ پڑتا تھا تو زخم سے درد اٹھتا تھا۔ اس کا جسم اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ وہ ٹانگ کی خرابی کے علاوہ بھی چل پھر نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھے بار بار کہا کہ تم زندہ واپس اپنے وطن چلے گئے تو لوگوں کو میری کہانی سنانا ہو سکتا ہے مجھ جیسے لوگ عبرت حاصل کریں۔ وہ کہتا تھا کہ دولت کے نشے سے بچو اور کسی شریف لڑکی پر بری نظر نہ رکھو۔

”میرے دوست!“ — اس نے مری مری آواز میں کہا — ”مجھ پر ایک احسان کرو۔ تمہارے پاس رانقل ہے۔ میرے سر میں گولی مار دو تاکہ یہ اذیت ختم ہو۔ مجھے خدا کے واسطے اس اذیت سے نجات دلا دو۔“

”نہیں بھائی!“ — میں نے کہا — ”زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ میں تمہیں گولی مار دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اللہ کے حکم کے خلاف ایک انسان کی جان لی ہے۔ مجھ سے یہ گناہ نہ کراؤ۔“

اُس نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ پھر وہی منت و ساجت اور اُس کے ساتھ آدو زاری جیسے وہ موت کی بھیک مانگ رہا ہو۔ میں اُس کی ذرا سی بھی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پانی مانگا تھا وہ میں نے دے دیا تھا۔ میں نے نہ جانے ابھی کتنی دور آگے جانا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں ندی سے اپنی بوتل پانی سے بھر لاتا ہوں اور یہ اس

کے پاس چھوڑ جاؤں گا۔

”نہیں میرے بھائی!“ — اس نے پُرسنت کی — ”مجھے بوتل نہ دو۔ ایک دن کے لئے مجھے رانقل دے دو۔ میں اپنے ہاتھوں اس اذیت سے نجات پا لوں گا۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے جھوٹی تسلیاں دیں اور میں چل پڑا۔ وہ بلند آواز سے رونے لگا۔ میں اور تیز چل پڑا۔

”خدا کے لئے رک جاؤ۔“ — اس کی آواز سنائی دی — ”یہ بھی گناہ ہے کہ تم مجھے اس اذیت میں چھوڑے جا رہے ہو۔“

میں نہیں رکا۔ میں چلتا گیا۔

”تم کافر ہو کر مرو گے۔“ — اُس نے بڑی ہی بلند آواز میں کہا۔

معلوم نہیں وہ کیا خیال تھا یا کیسا احساس تھا کہ میرے قدم میری مرضی کے خلاف رکنے لگے۔ اس کی دھاڑیں اور فریادیں اور زیادہ بلند ہو گئیں۔ میں پیچھے کو ہٹا اور اُس کی طرف دیکھا۔ اس نے مایوس ہو کر سر جھکا لیا تھا۔ اُس کی ٹھوڑی اُس کے سینے کے ساتھ لگ گئی تھی۔ میری طرف اس کا بایاں پہلو تھا۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ کتنی شدید اذیت اور درد کی ظالم ٹیسوں میں مبتلا ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ وہ برداشت کرتا چلا جائے اور موت کا انتظار کرتا رہے۔

مجھے اُس پر ایسا ترس اور ایسا رحم آیا کہ میں نے رانقل کا بولٹ پیچھے کر کے آگے کیا، ایک راؤنڈ چیبر میں چلا گیا۔ میں نے رانقل کندھے سے لگائی۔ وہ مجھ سے تیس چالیس قدم دور تھا۔ میں نے اس کے بائیں طرف سر کو ہٹ میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ برنا کا جنگل دھماکے سے ذرا سا لرزا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ صدیق ایک پہلو کی طرف گرا اور اُس کا جسم ساکن ہو گیا۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ میں نے یہ نیکی کی تھی یا ایک انسان کو قتل کیا تھا۔ میں شاید برنا کے جنگلوں کو، ہر وہ جگہ جہاں میں گیا تھا، بھول جاؤں گا لیکن صدیق کو نہیں بھولوں گا جو میری گولی سے مر گیا تھا یا جسے میں نے اذیت سے نجات دلائی تھی۔

ذہور رسولؐ کو بھول جاتے ہیں، اور ہم توبہ اُس وقت کرتے ہیں جب ہم پر عذاب الہی مل جاتا ہے۔

مجھے واجدہ یاد آئی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ساتھ میری محبت پاک تھی لیکن مانے یہ تو نہ سوچا کہ وہ کسی اور کی بیوی بن چکی تھی۔ واجدہ کا یاد آتا تھا کہ مجھے اُس کا دہ آمف یاد آیا۔ میں اُسے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن جب اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرنے لگا تو میں نے دل سے ساری کدورت نکال کر اس کی جان بچا لی.....

مف کو یاد کیا تو میں نے اپنے آپ میں روحانی سانسوں محسوس کیا۔ یوں لگا جیسے مجھے بے غمی اشارہ ملا ہو کہ تمہاری اس ایک نیکی کے بدلے اللہ نے تمہارے گناہ بخش دیے۔

میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں توبہ نہیں کروں گا کیونکہ مصیبت کے وقت توبہ رب اللہ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ میں نے دل میں ایک عزم پیدا کر لیا کہ آئندہ کوئی گناہ نہیں کروں گا۔

میں نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور آسمان کی طرف دیکھا۔ میں نے بلند دوازے کہا۔ ”اے پروردگار! مجھے گناہ کرنے کے لئے زندہ نہ رکھنا۔ اگر میری موت میں کچھ نیکیاں لکھی ہوئی ہیں تو مجھے آگے بڑھنے کی ہمت عطا کر دے۔ اگر آگے بڑھنے کے لئے گناہ ہیں تو یا اللہ، مجھے ہمیں فناء کر دے۔“

یہ بالکل سچ ہے کہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے..... میں کون سی قسم کھا کر آپ کو یقین دلاؤں کہ مجھے عجیب و غریب سانسوں محسوس ہوئے۔ مجھے ایک دکھ ضرور ملا وہ یہ کہ میرے ماں باپ میرے لئے بہت ہی پریشان ہوں گے اور جب انہیں یہ اطلاع سرکاری طور پر جائے گی کہ آپ کا بیٹا محاذ پر لاپتہ ہو گیا ہے تو میری ماں کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ سکون محسوس ہوا کہ اگر انہیں فوج کی طرف سے یہ اطلاع ملے گی کہ میں لاپتہ ہوں تو میرے گھر والے میری سلامتی کی دعائیں کریں گے۔

میں کی دعا تو عرش کے کنگزے ہلا دیا کرتی ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ بیٹا کسی نیک کام میں لگم ہو گیا ہو۔ یہ نہیں کہ بیٹا کسی کی بیٹی کو اغوا کر کے لاپتہ ہو جائے یا چوری ڈکیتی کی واردات کر کے مفروز ہو جائے تو ماں بس کی سلامتی کی اور پکڑے نہ جانے کی دعائیں مانگے تو میرا خیال ہے کہ ایسی دعائیں قبول نہیں ہوا کرتیں۔ اس خیال سے ایک اور

صدیق کو یوں جان سے مار کر میں نے اگر نیکی ہی کی تھی تو بھی اس کا مجھ پر کوئی اچھا اثر نہ ہوا۔ میں کچھ دیر وہیں گم مضم کھڑا رہا دیکھتا رہا۔ خیالوں کا ایک ریلا میرے ذہن میں آگیا۔

مجھے صدیق کے ماں باپ کا خیال آیا جن کا وہ لاڈلا اور نوجوان بیٹا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ صدیق کی یہ فیملی زندہ و سلامت برما سے نکل بھی سکی تھی یا نہیں۔ مجھے شیوں کی فیملی کا بھی خیال آیا۔ ان کی لڑکی کی آبرو تو بچ گئی تھی لیکن مجھے ایسی کوئی امید نہیں تھی کہ ان کی جانیں بھی بچ گئی ہوں گی۔ یہ دونوں خاندان راستے میں بھوک سے ہی اور تھکن سے بھی مر گئے ہوں گے۔

مجھے جب لڑکی کا خیال آیا تو یقین جانیں کہ میرے دل سے دعا نکلی کہ وہ ہمیں کہیں مر جائے تو یہی اس کے لئے بہتر ہو گا۔ جاپانی فوجی کوئی اچھے لوگ نہیں تھے۔ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ جاپانی جس علاقے پر قبضہ کرتے تھے وہاں سے جوان لڑکیوں کو اکٹھا کر کے اپنے ساتھ موہ جوں میں رکھتے تھے۔ اس لڑکی نے آگے جا کر جاپانی فوجیوں کے ہاتھ چڑھ جانا تھا۔ اس کے بعد اس کی زندگی بڑی ہی اذیت میں گزرتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر صدیق کی لاش کو بڑے غور سے دیکھا اور اُس نے اپنے گناہوں کی جو داستان سنائی تھی وہ میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ اُسے اسی دنیا میں گناہوں کی سزا مل گئی تھی۔ میرے لئے وہ عبرت کا نشان تھا۔

جب مجھے یہ خیال آیا کہ اسے اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی سزا دی ہے اور اسے بڑی ہی اذیت میں جلا کر کے مارا ہے تو میرا جسم کانپ اٹھا۔ مجھے اپنے گناہ یاد آ گئے۔ تب مجھے خوف آنے لگا کہ اللہ مجھے بھی یہاں میرے گناہوں کی سزا دینے کے لئے لے آیا ہے۔

میں نے سوچا کہ کہیں پانی دیکھوں، نہا کر اپنے جسم کو پاک کروں، چند ایک نفل پڑھوں اور پھر اللہ کے حضور توبہ کروں اور گناہوں کی بخشش مانگوں لیکن یہ سوچ بھی اتنی کہ اس وقت توبہ قبول نہیں ہوگی جب سزا شروع ہو چکی ہے۔ ہم لوگ کرتے بھی یوں ہی ہیں۔ جب دن اچھے ہوتے ہیں، خوشحالی اور ہر طرح کی خوشیاں میسر ہوتی ہیں تو ہم

خیال نے جنم لیا۔ وہ یہ کہ میں اگر زندہ اور سلامت انسانوں میں پہنچ گیا تو میں کوئی بڑی نہیں کروں گا۔

اگر میں اپنے اُس وقت کے تاثرات بیان کرنے لگوں تو یہ تفصیلات کم از کم ایک سو صفحے سیاہ کر دیں گی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ پڑھنے والوں کے لئے اس تحریر میں کوئی دلچسپی ہوگی۔ پڑھنے اور سننے والے تو اس انتظار میں ہوں گے کہ میں ایسی خوفناک اور دور افتادہ جگہ پہنچ گیا تھا جہاں زندگی کی نسبت موت زیادہ قریب تھی وہاں مجھ پر کیا جہم اور کیا واقعات پیش آئے۔ میں بہتر یہی سمجھتا ہوں کہ واقعات سناؤں۔ میں انشاء اللہ آپ کو باپوس نہیں کروں گا۔ واقعات تو اپنے آپ ہی ظہور پذیر ہوتے چلے گئے۔ میں اپنی زندگی کی یہ داستان سناتے ہوئے پوری کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی روکمی پمکی بات نہ آئے۔ میں یہ کوشش بھی کر رہا ہوں کہ ہندو نصیحت یا واعظ شروع نہ کر دوں۔ بڑھاپے میں یہ بہت بڑی خامی ہے کہ انسان خود جوانی میں گناہ کرتا رہے اور ایک سے ایک بڑھ کر ذلیل حرکت کرے لیکن بوڑھا ہو کر وہ نوجوانوں کو اس طرح ہندو نصیحت کرتا ہے جیسے وہ بہت بڑا درویش ہے اور اُس نے اپنی جوانی درویشی اور فقیری میں ہی گزار دی تھی۔ بڑھاپے میں دوسری خامی یہ ہے کہ بوڑھا آدمی بولنا شروع کر دے تو اُسے یاد ہی نہیں رہتا کہ اُس نے چپ بھی ہوتا ہے۔

میں آپ کو فضول باتیں اور بلاوجہ نصیحتیں کر کے بور نہیں کروں گا لیکن ایک بات ضرور کہوں گا۔ میں کوئی عالم فاضل یا فلاسفر تو ہوں نہیں کہ تجزیہ یا تفسیر پیش کروں، میں ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ خدا نے اپنا طریقہ کار کیوں بدل لیا ہے؟ میرا یہ سوال پڑھ کر مولوی صاحبان کے ہاتھوں پر شکنیں پڑ گئی ہوں گی اور بعض کے منہ سے لاجوں بھی نکلی ہوگی لیکن مجھ پر فتویٰ دائر کرنے سے پہلے میری بات سن لیں۔ بات یہ ہے کہ میری نوجوانی کے وقتوں میں یہ دیکھا جاتا تھا کہ کسی نے کسی کا حق مارا یا کوئی ایسا گناہ کیا جس سے دوسرے کو بہت ہی اذیت پہنچی تو گناہگار کو لوگوں کے سامنے سزا ملی۔ ایسے تین چار بندوں کو تو میں بھی جانتا ہوں اور ایسے کئی واقعات اُس وقت نے بھی تھے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ بات ذرا لمبی ہو جائے گی لیکن ذرا غور کریں سوچیں، تفسیریں پڑھیں، علماء سے بھی پوچھیں اور مجھے بھی بتائیں کہ یہ کیا ہے اور اس کے پیچھے خداوند تعالیٰ کی کیا قدرت ہے۔

میں اس وقت لڑکا تھا۔ غالباً ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے بے کے قہانے میں ایک تھانیدار آیا۔ ہمارے علاقے میں خاندانی دشمنیوں کی بنا پر قتل لانا اتنی زیادہ وارداتیں ہوا کرتی تھیں کہ قصبے کے سول ہسپتال میں تقریباً ہر روز ایک لاش یا اور بعض اوقات تین تین چار چار لاشیں ایک ہی گھر کی پوسٹ مارٹم کے لئے آیا لیتی تھیں۔ یہ دیہاتی علاقے کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ جونہی کسی واردات کی رپورٹ ملنے میں آتی تو تھانیدار گھوڑے پر سوار ہو کر اور اپنے عملے کو ساتھ لے کر فوراً دروات والے گاؤں پہنچتا تھا۔ تھانیدار تفتیش کیا کرتے ہیں لیکن میں جس تھانیدار کی بات کر رہا ہوں، اس کا وطیرہ یہ تھا کہ مقتول کے گھر جا کر پہلے یہ دیکھتا تھا کہ یہاں سے کیا ہوا تھا کہ لے جا سکتا ہے۔ مثلاً اس گھر میں اس نے بھینس دیکھی تو پوچھا کہ یہ کتنا وہ دیتی ہے۔ اگر دودھ زیادہ بتایا گیا تو یقین کریں وہ بھینس کھول کر ساتھ لے جاتا تھا۔ اس کے گھر میں ایک بھینس یا گائے دودھ والی موجود رہتی تھی۔ وہ پہلی گائے یا بھینس بیچ دیتا تھا۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں کہ وہ کس طرح حرام خوری کرتا تھا۔ اس کی شش یہ ہوتی تھی کہ تفتیش میں زیادہ سے زیادہ عورتوں کو شامل کر لیتا اور انہیں ڈرا کر بٹاک کر دیتا تھا۔

وہ انگریزوں کا دور تھا۔ رشوت چلتی تھی لیکن یوں نہیں جس طرح آج کل پاکستان ماہور رہا ہے کہ قتل بھی ہضم اور ڈاکے بھی ہضم۔ رشوت چھوٹی موٹی وارداتوں میں لاجاتی تھی لیکن قتل جیسے سنگین کیسوں میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ تھانیدار رشوت دے کر چھوٹ جائے گا لیکن یہ تھانیدار مقتول کے گھر سے بھی اور جب قاتل ڈاجاتا تھا تو اُس کے گھر سے بھی بے پناہ رشوت لیتا تھا اور ان کے ہاں کوئی چیز اچھی لگتی وہ اٹھواتا تھا۔ اس کی حرام خوری اور ڈھیت پن سارے ضلع میں مشہور ہو گیا تھا۔

اس کے چار بیٹے تھے، بیٹی ایک بھی نہیں تھی۔ اس لحاظ سے لوگ اسے بڑا ہی شریف سمجھتے تھے۔ لوگ اسے بھی اس کی خوش نصیبی کہتے تھے کہ اس قدر حرام دہی کر کے بھی وہ پکڑا نہیں جاتا تھا۔ وہ اپنے علاقے کا فرعون بن گیا تھا۔ اس کے اہل خانہ بیٹے بڑے ہی خوبصورت تھے۔ غالباً اس کی نسل کشمیر سے چلی تھی۔ بڑا بیٹا دن کا لیکن آوارہ۔ میٹرک بھی نہ کر سکا تھا۔ باپ نے اس کی شادی طے کر دی۔ ابھی کوئی گاؤں مقرر نہیں ہوا تھا کہ بیٹے کو ٹائی فائیڈ ہو گیا اور جب ٹائی فائیڈ کیا تو بیٹے کی

نہیں بلکہ یہ شخص ہو۔ پنشن مل گئی تو ہمارے ہی شرمیں یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ لوگوں کو سلام کرتا تھا تو لوگ منہ پھیر لیتے تھے۔

میں ایسے کئی اور واقعات سنا سکتا ہوں۔ مثلاً "میرے شہر کے قریب ہی ایک گاؤں میں ایک لوہی ذات یعنی ایک راجہ صاحب نے ایک غریب آدمی کی نوجوان بیٹی کو پکڑ لیا اور فصل میں لے جا کر اسے خراب کیا۔ لڑکی نے شور شرابہ کیا۔ وہ اس کی دھمکیوں میں نہ آئی۔ اس شخص نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور چونکہ وہ نمبردار کے خاندان کا لڑکا تھا اس لئے اس نے دو تین آدمیوں پر شبہ کر کے ان کو شامل تفتیش کرادیا۔ تھانیدار نے انہیں اس قدر اذیتیں دیں اور اتنا مارا پیٹا کہ ایک ایک مہینہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ آخر یہ خود پکڑا گیا۔

پکڑا تو گیا لیکن شہادت بڑی کمزور تھی۔ کیس چلا لیکن شہادت کمزور ہونے کی وجہ سے سیشن جج نے اسے شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔ لوگ جانتے تھے کہ قاتل یہی ہے درپوش سمارٹ میں یہ پتہ چل گیا تھا کہ اس نے قتل سے پہلے لڑکی کی آبروریزی کی تھی۔ سیشن جج نے اسے بری کر دیا۔ وہ ہنسی خوشی اپنے باپ اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ لہن اپنے گاؤں آ رہا تھا کہ راستے میں بارش شروع ہو گئی۔ یہ ایک گھنے درخت کے نیچے رک گئے۔ آسمانی بجلی گری اور گری بھی اسی درخت کے ایک ٹن پر۔ ٹن گر اور ٹن گرنے سے پہلے بجلی اس شخص پر گری۔ اس کے قریب اس کا ایک بھائی کھڑا تھا وہ می بجلی کی زد میں آیا اور پھر اوپر سے اتنا بڑا ٹن ان پر گر گیا۔ جن لوگوں نے ان دونوں ماؤں کی لاشیں دیکھی تھیں وہ بتاتے تھے کہ لاشیں اس طرح جل کر کالی ہو گئی تھیں بے جلمے ہوئے شہتیر ہوں۔

اب میں نے آپ کو صدیق کا واقعہ سنایا ہے۔ اس نے اپنے سارے گناہ مجھے سنائے۔ وہ مجھ میں نے دیکھا کہ خداوند تعالیٰ نے اور خدا کے قانون نے کس طرح حرکت میں آ کر اسے کیسی سزا دی۔ اس کے ٹھیکیدار باپ کو جو سزا ملی وہ بھی میں نے سنائی ہے۔ اس کے پاس حرام کی دولت تھی۔ وہ ڈاکو لے گئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اب اپنے ملک میں کیسے لیں۔ کون سا وہ گناہ ہے جو ہمارے ملک میں نہیں ہو سکتا۔ قتل اور ڈاکہ زنی کی سزا تو ہم دیکھ لیں۔ جبری آبروریزی کے واقعات آپ سے ڈھکے چھپے نہیں لیکن یہ بھی سمجھا گیا ہے اور آپ یقیناً "مجھ سے اتفاق کریں گے کہ شریف آدمی کا جینا حرام ہو گیا ہے

ٹانگیں بھی ساتھ ہی لے گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں پوری طرح مفلوج تو نہ ہوئیں نہ چلتا تھا لیکن بڑی مشکل سے ایک کے پیچھے دوسرا قدم اٹھاتا تھا اور اس کے گھٹنے کھراے تھے۔ وہ بیکار ہو گیا اور لڑکی والوں نے اسے جواب دے دیا۔

اس کے بعد جو بیٹا تھا وہ اُس وقت سترہ اٹھارہ سال کا تھا۔ پڑھنے میں وہ بھی ناکام تھا۔ سکول جاتا تھا۔ میں اسی سکول میں پڑھتا تھا۔ کوئی ماسٹر اس سے کسی بھی شرارت اور کسی بھی بد معاشی کی باز پرس کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے گھر کو ٹھے پر چڑھا ہوا تھا۔ پکی سیڑھیوں سے اترنے کی بجائے وہ بانس کی سیڑھی سے اترنے لگا تو اوپر کے ڈنڈے سے ہی اس کا پاؤں پھسل گیا۔ سیڑھی کے نیچے والے ڈنڈے کا کیل اس طرح ٹکرا ہوا تھا کہ اس کی نوک اوپر کو تھی۔ یہ لڑکا اس طرح گرا کہ اس کا ایک گھٹنا اس کیل پر پڑا۔ کیل کی نوک تیز تھی اور کیل موٹا تھا۔ یہ کیل اس کے گھٹنے میں اتر گیا اور گھٹنا اس طرح بیکار ہو گیا کہ اس کی وہ ٹانگ علاج معالجے کے بعد ٹیڑھی ہو گئی اور وہیں اکر گئی۔ اسے ایک طرف بیساکھی کا سارا لیتا پڑا اور وہ اس بیساکھی پر ہی چلتا تھا۔

اس سے چھوٹا بیٹا سب سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اس کی خوبصورتی اور نقش و نگار لڑکیوں جیسے تھے اور اس کی چال ڈھال اور اس کے انداز لڑکیوں جیسے تھے۔ اسے بدکردار قسم کے دوست مل گئے۔ ان دوستوں نے اسے خوب خراب کیا۔ پھر اس کی دوستی ہمارے شہر کے ایک امیر زادے کے ساتھ ہو گئی۔ میں کن الفاظ میں آپ کو بتاؤں کہ یہ دوستی کیسی تھی۔ آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ یہ شخص شادی شدہ تھا اور اس کی بیوی اپنے میکے جا بیٹھی تھی اور اس نے طلاق کا کیس کر دیا تھا۔

پیچھے چوٹا بیٹا رہ گیا۔ وہ دس گیارہ سال کا تھا۔ ایک روز کوٹھے پر کھیل رہا تھا۔ بھاگتے دوڑتے منڈیر پر چڑھ گیا اور وہاں سے جو اس کا پیر پھسلتا تو سر کے بل نیچے آتا اور جب تک اسے اٹھاتے وہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ تھانیدار ہمارے تھانے میں ہی تھا جب اس کی ریٹائرمنٹ کے آرڈر آئے اور وہیں سے وہ سروس سے فارغ ہوا اور اس پر بھی غور کریں کہ اتنی لمبی سروس کر کے وہ انسپکٹر بھی نہ بن سکا، سب انسپکٹری میں اسے پنشن دے دی گئی۔ اس کے بعد اڑھائی تین سال وہ ہمارے قصبے میں ہی کرائے دار کی حیثیت سے رہا۔ مجھے وجہ معلوم نہیں کہ وہ اپنے گھر کیوں نہیں گیا تھا۔ ہمارے قصبے میں جب "تھانیدار تھا تو لوگ اس طرح اسے حکم کر سلام کرتے تھے جیسے ہندوستان کا بلاشا انگریز

اور ہر شریف آدمی اپنی عزت، اپنی جان اور اپنے مال کو غیر محفوظ سمجھتا ہے اور جو بھی سرکاری اہلکار شریف ہے اور لوگوں کے کام رشوت کے بغیر کر دیتا ہے وہ سب سے بڑے ایمان سمجھا جاتا ہے۔ حراخوڑ اپنی حرام خوری پر پردہ بھی نہیں ڈالتے، کھلے بندوں لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں اور اس کا ذکر فخر سے کرتے ہیں اور عیش و سحر کی قسمت میں جیسے لکھ دی گئی ہو۔ نہ انہیں دنیا کا قانون پکڑتا ہے نہ اللہ کا قانون..... لہذا کیوں ہے؟

میں وہاں سے چل پڑا۔ میں تو ایک جذبہ لے کر جا رہا تھا۔ جذبہ یہ تھا کہ انگریزوں کی بادشاہی میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میری منزل آئی این اے کا ہیڈ کوارٹر تھا جس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہاں ہے اور کتنی دور ہے۔ میں اب یہ دیکھ رہا تھا کہ کوئی جاپانی فوجی یا جاپانیوں کی کوئی پوسٹ نظر آئے تو میں ان کے پاس چلا جاؤں اور انہیں کہوں کہ میں آئی این اے میں شامل ہونے کے لئے آیا ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس انڈین نیشنل آرمی کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے متعلق جو باتیں سنیں تھیں وہ میرے دل میں بیٹھ گئی تھیں اور جب انگریزوں کی طرف سے آئی این اے کے خلاف حکم اور ہدایات سنیں تو مجھے آئی این اے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔

یہ تھا میرا وہ جذبہ جو مجھے اس خوفناک، پراسرار اور عجیب و غریب علاقے میں لے گیا تھا اور میں ہلکا پھلکا ہو کر اور خوش و خرم جا رہا تھا لیکن صدیق میری گولی سے مرا تو میرے ذہن میں اور میری جذباتی دنیا میں کچھ اور ہی تبدیلی آگئی۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کا خون ہضم نہیں ہوتا اور انسانی ضمیر قتل کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ صدیق مجھ جیسا جوان تھا۔ اسے مار کر میرے دل پر اور میرے ضمیر پر ایسا بوجھ آپڑا کہ میں حتمی اور کچھ مایوسی محسوس کرنے لگا۔ اپنے آپ کو بھلانے اور اس بوجھ سے آزاد ہونے کی کوشش شروع کر دی لیکن میں ناکام ہو رہا تھا۔

میں ایسے علاقے میں جا پہنچا تھا جہاں جنگ کا نام و نشان نہ تھا۔ البتہ دور بہت دور لڑاکا بمبار طیارے آتے جاتے نظر آتے تھے لیکن میں اتنی دور آپہنچا تھا جہاں توپوں کے دھماکے کسی کسی وقت سنائی دیتے تھے لیکن یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ توپوں کے دھماکے تھے کہ میں فوجی تھا اور ان دھماکوں کو سمجھ سکتا تھا ورنہ یہ ایسے ہی قہاچے

کئی چھ نہایت آہستہ آہستہ کسی نرم چیز پر ہاتھ مار رہا ہو۔ اگر یہ توپوں کی ہی آوازیں تھیں تو ایک سو میل دور ہوں گی۔ راستے میں بڑے اونچے پہاڑ اور کھٹے جنگل حائل تھے۔

جب یہ دیکھا کہ جنگ تو مجھ سے ایک سو میل سے زیادہ دور ہے تو مجھے پریشانی لگ گئی کہ میں جاپانیوں تک کس طرح پہنچوں گا۔ مجھے بہر حال آگے ہی جانا تھا۔ پیچھے آنا خطرناک تھا۔ میں اب بھگوڑا ہو چکا تھا۔ میں اگر واپس چلا جاتا تو کہہ سکتا تھا کہ گھمسان کی ایک لڑائی میں میں راستہ بھول گیا تھا لیکن میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں آگے چل پڑا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں کہاں تھا۔ آج بھی اس عمر میں کبھی کبھی پھول کی اٹلس کھول کر برما کا نقشہ دیکھا کرتا ہوں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ میں کہاں بھٹکتا رہا تھا۔ آخر چھوٹی لے ان باتوں کو، آئیے میں آپ کو اپنے ساتھ آگے لے چلتا ہوں۔

اب جو علاقہ میرے سامنے آیا وہ ڈراؤنا تھا۔ جنگل تو ویسا ہی تھا جس میں اب لمبے در پھلے ہوئے درخت تھے اور برما کے مخصوص چھوٹے درخت کچھ کم ہو گئے تھے۔ میں اس علاقے کو ڈراؤنا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہاں جو پہاڑیاں تھیں وہ عام پہاڑیوں جیسی نہیں تھیں، بعض پہاڑیاں دیوار جیسی سیدھی کھڑی اور ان کا رنگ کالا تھا۔ ان پر کوئی ہڈیاں نہیں تھیں۔ ان کے آگے سرسبز ٹیکریاں تھیں اور ان پر درخت بھی تھے۔

کس تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں ایک وسیع قلعے کی دیواروں کے زرخے میں چلا جا رہا ہوں۔ زمین ایسی کہ قدم قدم پر کھڑے تھے اور کہیں زمین ذرا اونچی اور کہیں بالکل نیچے چلی جاتی تھی۔ کچھ دور آگے جا کر میں نے محسوس کیا کہ آگے کھڑ زیادہ ہیں اور میں ٹھیک طرح چل نہیں سکوں گا۔ ایک طرف سرسبز ٹیکری تھی۔ میں اس کے ایک طرف سے گھوم کر دوسری طرف چلا گیا۔ توقع تھی کہ اوپر راستہ صاف مل جائے گا۔

ٹیکری کے اس طرف ایسی پہاڑی تھی یا اسے بلند چٹان کہہ لیں جو دیوار کی طرح بالکل سیدھی تھی اور یہ بڑی بڑی سلوں والی یعنی چوڑے پتھروں والی چٹان یا پہاڑی تھی۔ اس کا رنگ اور اس کی شکل و صورت مجھے ڈراؤنی لگی۔ میں اس پہاڑی اور ٹیکری کے درمیان جا رہا تھا تو پہاڑی میں ایک غار نظر آیا۔ میں رک گیا اور معلوم نہیں کیوں غار کے دہانے میں جا کھڑا ہوا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس غار کے اندر ہلکی ہلکی روشنی موجود ہے۔ میں نے غور کیا

بت ہی لمی مدت تک صحیح رہتے ہیں۔

میرا ذہن ان میں الجھ گیا۔ ایک کہانی میرے ذہن میں ابھرنے لگی۔ یہ محبت کی داستان کے کردار تھے۔ یہ یہاں آئے اور دیکھ لئے گئے اور انہیں بیس قتل کر دیا گیا یا کہیں باہر انہیں قتل کر کے ان کی لاشیں یہاں پھینک دی گئیں۔ یہ خیال بھی آیا کہ یہ یہاں پہنچے اور سانپ یا کسی ایسے ہی زہریلے کیڑے نے انہیں ڈس لیا۔ بہر حال میرے ذہن میں ایک ناول کا جملہ آیا۔ ”انہیں موت بھی جدا نہ کر سکی۔“

میری ذہنی حالت پہلے ہی بگڑ رہی تھی، ہڈیوں کے ان ڈھانچوں کو دیکھ کر ذہن بھٹک گیا۔ مجھے عاتشہ یاد آئی اور پھر واجدہ یاد آئی اور میرے آنسو نکل آئے۔ میرے ذہن میں ایک سوچ یہ بھی آئی کہ ایک روز کوئی اس علاقے سے گزرے گا تو اُسے میری ہڈیوں کا پتھر نظر آئے گا اور میری طرح رک کر وہ سوچے گا کہ یہ کون تھا اور یہاں آکر کیوں مرا! میں نے محسوس کیا کہ غار میں جو روشنی آ رہی تھی وہ بجھتی جا رہی ہے۔ میں نے آگے اُس طرف دیکھا جس طرف دو سرا دہانہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے غار تاریک ہو گیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ سورج غروب ہونے میں ابھی خاصا وقت تھا۔ اگر یہ رات کا اندھیرا تھا تو روشنی کو آہستہ آہستہ بجھنا چاہئے تھا یہ تو یک لخت تاریکی چھا گئی تھی۔

اچانک چیخیں سی سنائی دیں اور اس کے بعد یوں آوازیں آنے لگیں جیسے اس سرنگ یا غار کے باہر عورتیں بین کر رہی ہوں اور اونچی آوازوں میں رو رہی ہوں۔ کبھی ان کا رونابند ہو جاتا اور کبھی مدہم پڑ جاتا اور فوراً ”ہی ان کی چیخ نما آوازیں بہت ہی بلند ہو جاتیں۔ اس کے ساتھ ہی غار میں سردی کی ایک لہر آئی کہ میرا وجود کانپ گیا۔“

میں نے ایک آسیب زدہ مکان کی کہانی پڑھی تھی۔ رات کو اس مکان میں بدروحیں آتی تھیں۔ وہ نظروں سے نہیں آتی تھیں، ان کی آمد اور موجودگی کا احساس اس مکان میں رہنے والوں کو یوں ہوتا تھا کہ انہیں گرمیوں میں بھی سخت ٹھنڈ محسوس ہونے لگتی تھی اور پھر دروازے کھلنے اور بند ہونے کی اور پھر ان کے رونے کی آوازیں آتی تھیں۔

وہ کہانی یاد آئی تو میں جو ایک بڈر اور دلیر جوان تھا خوف سے کانپنے لگا۔ میں نے جین کر لیا کہ یہ ان دونوں کی روحیں یا بدروحیں ہیں اور وہ وہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اور بھی بدروحیں آتی ہیں۔ میں نے یہ سنا تھا کہ کسی مظلوم کی موت ظلم و تشدد اور بے فصلی سے ہو جائے تو اُس کی روح اسی طرح بھٹکتی اور راتوں کو روتی پھرتی ہے اور لوگ

تو پتہ چلا کہ روشنی اس دہانے سے اندر نہیں جا رہی جس دہانے میں کھڑا تھا۔ غار اندر سے خاصا کشادہ ہو گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا اندر چلا گیا۔ مجھے یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہئے تھا۔ اندر کوئی درندہ بھی ہو سکتا تھا۔ بھیڑیے ہو سکتے تھے اور سانپ بھی ہو سکتے تھے لیکن میری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں آگے ہی آگے چلا گیا۔ کچھ دور آگے گیا تو مجھے نظر آیا کہ جو روشنی میں نے پہلے محسوس کی تھی وہ غار کی دوسری طرف سے آ رہی تھی جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ غار کا ایک دہانہ دوسری طرف بھی ہے۔ اسے غار کہہ لیں یا سرنگ کہہ لیں۔ ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے پہاڑی علاقے میں آپ نے ایسی سرنگیں دیکھی ہوں گی جن میں سے ریل گاڑی گزرتی ہے۔ روشنی سے پتہ چلتا تھا کہ اگلا دہانہ بہت دور ہے اور یہ سرنگ آگے جا کر کسی طرف مڑ جاتی ہے۔ میں پتہ چلا گیا۔ غار یا سرنگ کی چھت اتنی اونچی تھی کہ میں سیدھا چل رہا تھا یعنی ٹھکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق میں سرنگ کے وسط تک پہنچ گیا تھا اور آگے سرنگ فراخ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دونوں طرفوں کے دہانوں سے جو روشنی آ رہی تھی وہ اتنی کافی تھی کہ اندر سب کچھ نظر آتا تھا۔

میں خاصا آگے چلا گیا تو اگلا دہانہ نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن اُدھر سے آتی ہوئی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ دور آگے یہ سرنگ اور زیادہ فراخ ہو گئی۔ مجھے دور سے ہی کچھ ہڈیاں سی پڑی نظر آئیں۔ میں آگے گیا تو یہ دو انسانی ڈھانچے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ پہلے تو یہ خیال آیا کہ یہاں سے بھاگ نکلوں لیکن تجسس ایسا کہ میں رک گیا اور انسان کے انعام کو دیکھنے لگا۔ معلوم نہیں یہ دونوں کب اور کس عمر میں یہاں آئے تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ یہاں تک خود چل کر پہنچے تھے یا انہیں مار کر یہاں پہنچایا گیا تھا، کسی صورت میں قتل ہوئے تھے۔

دہان کوئی کپڑا نہیں تھا۔ ایک دو چیزیں نظر آئیں جن سے یہ ثبوت مل گیا کہ وہاں خاندی عورت کا ہے۔ خاندی کے دو رنگ پڑے ہوئے تھے اور چاندی کا ہی ایک کڑا پٹا ہوا تھا اور کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں یہاں پہنچے ہوئے اتنا زمانہ گزر گیا تھا کہ عورت کے یا مرد کے بال بھی غائب ہو چکے تھے۔ شاہد

اس کی آوازیں سنتے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا اور کمانیوں میں پڑھا بھی تھا کہ کوئی زندہ آدمی ان بدروحوں کے ہاتھ چڑھ جائے تو اُسے وہ بہت بُری موت مارتی ہیں۔
میں بدروحوں کے ہاتھوں مرنے کیلئے تیار ہو گیا۔ رانقل محض بیکار تھی۔ روح یا بدروح کو گولی سے نہیں مارا جاسکتا تھا۔

غار میں سفید روشنی دو تین بار چمکی اور پھر تاریکی چھا گئی۔ اس کے فوراً بعد گڑ گڑاہٹ اور ایک دو دھماکے سنائی دیے۔ میرا دھیان جنگ کی طرف چلا گیا لیکن جنگ اتنی تیزی سے اس طرف نہیں آسکتی تھی۔ چچیں اور عورتوں کا رونا پیلے جیسا تھا اور اب غار میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے روشنی اس طرح چمک کر آتی جس طرح بجلی چمکتی اور بجھ جاتی ہے۔ یہ چمک دونوں دہانوں کی طرف سے آتی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ جدھر سے آیا ہوں اُدھر کو ہی بھاگ جاؤں۔ میں نے ان ڈھانچوں کی توہن یا بے ادبی تو نہیں کی تھی۔ اس خیال سے میری دھارس بندھ جاتی تھی کہ یہ بدروحیں مجھے کچھ نہیں کیں گی۔ میں یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا کہ وہیں رکا رہوں یا وہاں سے نکل جاؤں۔ پھر اس خیال سے میں واپس چل پڑا کہ بدروحوں کو میرا وہاں کھڑے رہنا اچھا نہیں لگتا ہو گا۔
رونے اور چیخنے کی آوازیں اگلے دہانے سے آرہی تھیں۔ میں اُس طرف چل پڑا جدھر سے داخل ہوا تھا۔ اس رستے کو تو میں اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ اُدھر سے ہی آیا تھا۔

میں جب دہانے پر پہنچا تو پتہ چلا کہ بہت ہی تیز اور موسلا دھار مینہ برس رہا ہے اور اس کے ساتھ بڑا ہی تیز طوفان چل پڑا ہے۔ یہ طوفان بادو باراں تھا۔ دہانے پر جا کر چچیں اور زیادہ صاف سنائی دینے لگیں۔ میں نے دہانے سے ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ بجلی بار بار چمکتی تھی جس کی چمک میں مجھے درخت نظر آ جاتے تھے۔ طوفان اس قدر تیز و تند تھا کہ درخت دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ تب میں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ چچیں اور یہ رونا تیز طوفان کا تھا۔ ہوا اس چٹائی پہاڑ کے ساتھ ٹکراتی ہوئی گزرتی تھی تو یہ چچیں پیدا ہوتی تھیں۔

میں دہانے میں بیٹھ گیا۔ قدرت کا یہ کھیل سمجھ جانے کے باوجود میرے دل پر خوف طاری رہا۔ اچانک تیز دھڑکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں میرے قریب سے دہانے میں سے گزر کر اندر آنے لگیں۔ اُس وقت بجلی چمکی تو میں ایک بار پھر دہشت میں

چلا ہو گیا۔ یہ تو بھیڑیے تھے جو طوفان بادو باراں سے بھاگ کر اس غار یا سرنگ میں پناہ لینے آئے تھے۔ بھیڑیوں سے میرا ایک مقابلہ ہو چکا تھا۔ اب میں بھیڑیوں کو اس پناہ گاہ میں خوش آمدید کہنے کو تیار نہیں تھا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ درندے اگر بھوکے ہوئے تو پھر میری خیر نہیں۔ انہیں تو پناہ کے ساتھ ساتھ پیٹ بھرنے کو خوراک بھی مل جائے گی۔ میں نے رانقل کا سیٹھی کیچ آگے کیا۔ بولٹ پیچھے کر کے آگے کیا اور ایک راؤنڈ چیمبر میں چلا گیا، پھر میں سرنگ کے اندر دیکھنے لگا تاکہ جو نمی بھیڑیے میری طرف آئیں میں گولی چلا سکوں۔ اندھیرا اتنا سیاہ تھا کہ اپنا آپ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

باہر اتنا زبردست طوفان اور اندر اتنے بھیڑیے جو میں گن نہیں سکا تھا۔ سات آٹھ تو ضرور ہوں گے۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ سورج ابھی ابھی غروب ہوا ہو گا۔ اس حساب سے مجھے پوری رات ان بھیڑیوں اور دو انسانی ڈھانچوں کے ساتھ گزاری تھی۔ یہ تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ رونے کی آوازیں اور چچیں بدروحوں کی نہیں تھیں بلکہ تیز و تند طوفان کی تھیں لیکن بھیڑیوں کا میں کیا کرتا۔ ہڈیوں کے ڈھانچوں نے تو مجھ پر حملہ نہیں کرنا تھا۔ مجھے پوری رات رانقل ہاتھ میں لئے تیار رہنا تھا۔

مجھے بھیڑیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے وہ غرغر کی زبان میں آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ یا خدا! یہ میرے متعلق گفت و شنید نہ کر رہے ہوں۔ میں نے ادھر ادھر زمین پر ہاتھ پھیرا تو مجھے پتھر مل گئے۔ میں نے ایمو نیشن پجانے کے خیال سے اندھیرے میں ہاتھ مار مار کر چھوئے بڑے کئی ایک پتھر اپنے سامنے اکٹھے کر لئے۔ سوچا یہ کہ بھیڑیے میری طرف آئے تو پہلے تو انہیں پتھروں سے بھگا دوں گا۔ اگر وہ پتھروں سے نہ ڈرے تو گولی چلاؤں گا۔



میرے کان غار کے اندر لگے ہوئے تھے اور جب بجلی چمکتی تھی تو میں وہاں تک دیکھ لیتا تھا جہاں تک اس کی روشنی پہنچتی تھی۔ طوفان بادو باراں جاری رہا۔ شاید ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ کم یا زیادہ وقت گزرا ہو گا تو طوفان کا شدت میں کمی آنے لگی اور اس کے ساتھ ہی تاریکی بھی کم ہونے لگی اور یہ دیکھ کر مجھے کچھ سکون ملا کہ ابھی دن کی یا شام کی کچھ روشنی باقی تھی۔ بجلیوں سے لدی ہوئی گھٹائیں آگے چلی گئیں تو روشنی ہو گئی لیکن

یہ روشنی دلیسی تھی جیسی سورج غروب ہونے کے بعد کچھ دیر رہتی ہے۔

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت ہی مشکل تھا کہ میں بیٹھا رہوں یا نکل جاؤں لیکن وہاں سے نکل کر جانا کہاں؟ میرے لئے کوئی اور پناہ نہیں تھی۔ اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو میں باہر کہیں درخت کے نیچے سو جاتا۔ اس غار میں سو جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کچھ بھیڑیے تو آگئے تھے، مجھے یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ رات کو نہ جانے کتنے درندے اس پتہ میں آجائیں۔ ان میں شیر بھی ہو سکتا تھا۔ سانپ بھی ہو سکتے تھے اور یہ تو میں نے پہلے بھی سنا تھا کہ برما کے کالے بچھو بڑے ہی زہریلے اور سانپوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

میرے لئے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ مجھے رات وہیں گزارنی تھی۔ باہر نکلنے پر غور کیا تو وہاں یہ خطرہ تھا کہ زمین کھدوں والی تھی اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کھدے جو پانی سے بھر گئے ہیں، ان میں کون سا گہرا اور کون سا کم گہرا ہے۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ باہر کس طرح جل تھل ہو چکا ہو گا۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ میں بیٹھا رہوں، آنکھ بھی نہ جھپکوں اور رات ایسے ہی گزار دوں۔

شام کا دھند لکا تاریک ہونے لگا اور بارش تھم گئی، ذرا ذرا پھوار سی پڑ رہی تھی اور ہوا کی تیزی بھی کم ہو گئی تھی۔

بھوک نے الگ پریشان کرنا شروع کر دیا لیکن وہاں تو جان کا خطرہ تھا اس لئے بھوک پر قابو پانا کوئی مشکل نہ تھا۔ ذرا ہی دیر بعد طوفان بالکل ہی تھم گیا اور باہر خاموشی چھا گئی۔ تاریکی کچھ زیادہ ہو گئی۔ مجھے اپنے قریب ہلکی ہلکی غراہٹ سنائی دی۔ میں اتنا جانتا تھا کہ ہر درندے کی اپنی اپنی کھچار ہوتی ہے جہاں وہ رات بسر کرتا ہے اور اپنے بچوں کو وہیں رکھتا ہے۔ بھیڑیے عموماً ایک سے زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی ایک کھچار ہوتی ہے۔ مجھے اپنے قریب غراہٹ سی سنائی دی تو خیال آیا کہ یہ بھیڑیے طوفان سے پناہ لینے کے لئے یہاں آئے تھے اور اب یہ اپنی کھچار میں جانا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں چونکا نہ ہوا تو یہ مجھے بھی زندہ یا مردہ اپنی کھچار میں لے جائیں گے اور اس طرح ان کے رات کے کھانے کا بندوبست ہو جائے گا۔

میں نے ایک پتھر اٹھایا اور زور سے بھیڑیوں کی طرف پھینکا۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک بھیڑیے کی چیخ سنائی دیں جو اس کٹے جیسی تھیں جسے پتھر لگتا ہے۔

میں نے ایک پتھر اور مارا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ان کے دوڑتے قدموں کی ہلکی ہلکی آہٹ سنائی دیں۔ میں نے ایک پتھر اور ان کے پیچھے پھینکا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ دوسرے راستے سے بھاگ گئے ہیں لیکن میں اپنے آپ کو پھر بھی محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ میں چونکا اور بالکل بیدار رہا۔ سوچتے سوچتے ایک بات یہ بھی میرے ذہن میں آئی کہ اس ملک کے ایک بڑے حصے میں جنگ لڑی جا رہی ہے۔ وہاں کے تمام درندے اُدھر سے بھاگ کر اس طرف آگئے ہوں گے۔ بھیڑیوں کو تو میں دوبارہ دیکھ چکا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اپنے کسی ساتھی نے بتایا تھا کہ برما کے جنگلوں میں دھاری دار شیر بھی ہوتا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ جنگلوں میں شیر خاصی تعداد میں پایا جاتا ہے اور اسے بنگال ہائیکر کا نام دیا گیا ہے۔

میں خدا سے مدد مانگنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بیٹھ بیٹھ کر میں تنگ آ گیا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ پھرا اور پھر بیٹھ گیا۔ رات اسی طرح گزرتی چلی گئی لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ رات گزر نہیں رہی اور وقت اس غار کے اس دہانے پر آکر رک گیا ہے اور یہ رات کبھی نہیں گزرے گی۔

○

رات گزر گئی..... اور یوں گزری جیسے عمر ہی گزر گئی ہو۔

میں نے ساری رات بیدار رہنے کی کوشش کی لیکن جوانی کی عمر تھی اور آپ جانتے ہیں کہ جوانی کی نیند پر قابو پانا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ دو مرتبہ یوں ہوا کہ بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں کتنی دیر سویا رہا، یہ بتا سکتا ہوں کہ آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اٹھا، دل پر خوف کی گرفت تھی۔ میں نے غار کے اندر اور باہر دیکھا۔ تدریک تھی، کچھ نظر نہ آیا۔ تیسری بار میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ رات گزر گئی ہے اور نیریت سے گزر گئی ہے۔

میں اٹھا اور پھر اس غار یا سرنگ کے اندر چلا گیا۔ ہڈیوں کے ڈھانچے اسی طرح پڑے تھے۔ میں ان کے قریب سے گزر گیا۔ آگے سرنگ دائیں کر جاتی تھی اور مزید کٹھن ہو گئی تھی۔ اگلے دہانے سے بھی روشنی آرہی تھی۔ میں اس راستے سے باہر نکل گیا۔ میں آگے نہ چل سکا کیونکہ آگے کوئی پتھر نہیں گزرا اور ایسی ہی ایک سیاہ چٹان قلعے کی دیوار کی طرح کھڑی دور تک چلی گئی تھی اور آگے جا کا یہ دونوں چٹانیں ملی ہوئی

تھیں۔ ان کے درمیان ایک جھیل بنی ہوئی تھی۔ یہ رات کی بارش کا پانی تھا۔ میرے دائیں طرف چٹانیں کھٹکتی جاتی تھیں اور آگے علاقہ صاف تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں ان چٹانوں کی ساخت اور ہیئت بیان نہیں کر سکا۔ یہ کسی بڑے ہی قدیم قلعے کے کھنڈرات کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ میں پانی سے بچتا ہوا ایک چٹان کے ساتھ ساتھ چلتا آگے نکل گیا۔

کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں اس سرنگ میں سے کیوں گزرا تھا تو میں کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکوں گا۔ بعض اوقات انسان کسی ایسی صورتِ حل میں آجاتا ہے کہ اس کی سوچنے کی صلاحیت دب جاتی ہے یا وقتی طور پر مر جاتی ہے اور وہ اپنے ذہن کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں ایڈوینچر کی خاطر اس سرنگ میں سے گزرا تھا۔ ہو سکتا ہے میں نے شارٹ کٹ کیا ہو۔ بہر حال جو ہوا وہ یہ تھا کہ میں اس سرنگ میں سے گزرا تو ایسی دنیا میں داخل ہو گیا جس کے خدو خال بالکل ہی مختلف تھے۔

تھا تو وہ ہر ابھرا جنگل ہی، اونچے نیچے درخت بھی تھے اور ہری بھری گھاس بھی تھی لیکن اس ہریالی میں سے چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ کوئی بست اونچی، کوئی کم اونچی کوئی گڑ ڈیڑھ گز ہی اونچی تھی۔ ان میں کوئی کچھ دور تک چلی گئی تھیں اور کچھ ایسی تھیں جو اطراف کو پھیلنے کی بجائے اوپر کو چلی گئی تھیں اور ان کی شکلیں عجیب و غریب تھیں، مثلاً ایک چٹان اس شکل کی تھی جیسے کوئی بوڑھا آدمی کمر دوہری کئے کھڑا ہو۔ چٹانوں کا یہ سلسلہ دور دور تک چلا گیا تھا۔ ان میں بعض سیلیٹی رنگ کی تھیں اور بعض کارنگ سیاہی مائل تھا۔ یہ ڈراؤنے سے رنگ تھے۔ میں جب ان کے درمیان میں سے گزرا رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں چلتے چلتے سو گیا ہوں خواب دیکھ رہا ہوں۔

میں جب ان میں سے گزرا رہا تھا تو بار بار یہ سوال میرے ذہن میں اٹھتا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟..... میرے ذہن سے صرف سوال اٹھتا تھا جواب نہیں ملتا تھا۔ میرا دماغ میری اتنی سی راہنمائی کر رہا تھا کہ مسافر، رکنا نہیں، پیچھے کو نہیں مڑنا، آگے اور آگے چلتے چلو۔

میں حیران اس پر ہو رہا تھا کہ میں کتنے ہی دنوں سے اس علاقے میں چل رہا تھا لیکن کوئی ایک بھی گاؤں یا کوئی دو چار گھر کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ اب وہاں کی زمین نے مجھے دھوکے دینے شروع کر دیے۔ میں نے بیان کیا ہے کہ اس علاقے میں کس قسم کی

چٹانیں کھڑی تھیں۔ چٹانوں کا یہ سلسلہ دور دور تک بلکہ جہاں تک میری نظر جاتی تھی، پہلا ہوا تھا۔ میں ناک کی سیدھ جانا چاہتا تھا۔ میں نے بتایا ہے کہ بعض چٹانیں خاصی لمبی تھیں۔ میں ان کے درمیان سے گذرنا گیا اور مجھے بہت سے موڑ مڑنے پڑے۔ کہیں دائیں اور کہیں بائیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے، میں مسلسل دو گھنٹے چلتا رہا۔ ایک جگہ میں نے رک کر دیکھا تو مجھے وہی چٹان اپنے سامنے، خاصی قریب نظر آئی جو میں نے پہلے بتایا ہے کہ ایک بوڑھے آدمی کی شکل کی تھی جس کی کمر دوہری تھی۔ یہ محسوس کر کے میرا دل ڈوبنے لگا کہ دو گھنٹے چل چل کر میں اُسی جگہ پہنچ گیا ہوں جہاں سے چلا تھا۔ میں اس طرح بیٹھ گیا جیسے تھک ہار کر گر پڑا ہوں۔

وہاں میرے دائیں ہاتھ ایک چٹان اس شکل کی تھی کہ ذرا اوپر جا کر اس کی سلیں آگے کو نکل آئی تھیں جیسے برآمدے کی چھت ہوتی ہے۔ نیچے اس کا فرش پتھر ملا تھا اور ذرا ہموار بھی تھا۔ میں وہاں چلا گیا اور اس قدر ترقی فرش پر لیٹ گیا۔ وہ جگہ خشک تھی۔ لیٹنے کے لئے بہترین تو گھاس تھی لیکن بارش نے گھاس کو اتنا گلیا کر ڈالا تھا کہ اس پر بیٹھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

میں رات بھر کا جاگا اور ڈرا ہوا تھا۔ رات میرے اعصاب کچھ تڑپ رہے تھے۔ میں سر میں گرانی محسوس کر رہا تھا۔ میں جوں ہی لیٹا، میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب دیکھے لیکن ڈراؤنے۔ کچھ تو یاد ہی نہیں رہے۔ آج نہیں، یہ تو مجھے اگلی صبح بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں نے کیا دیکھا سوائے اس احساس کے کہ رات جو بھی خواب دیکھا وہ ڈرانے والا اور پریشانیوں سے بھرپور تھا۔ اسے آپ ذہنی انتشار کہہ لیں۔ صرف ایک خواب اگلی صبح بھی یاد تھا اور وہ آج بھی یاد ہے۔

خواب یہ تھا کہ آصف اور واجدہ آگے آگے اکٹھے جا رہے ہیں اور میں بہت مارے قدم دور ان کے پیچھے جا رہا ہوں۔ ایک بار آصف پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور واجدہ سے کچھ کہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد واجدہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے تو میں اُس کے چہرے پر نفرت اور حقارت کے تاثرات دیکھتا ہوں۔ آصف نے میری طرف دیکھا تھا تو اس کے چہرے پر بھی ایسے ہی تاثرات تھے۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ دونوں مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے ہاتھوں کے ناخن بڑھ آئے ہیں اور میرے ہاتھ بھیڑیوں

جیسے درندوں کے ہاتھ بن گئے ہیں۔ مجھ میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں انسان نہیں بھڑپا ہوں۔

میں تیز دوڑتا ہوں اور ان دونوں پر اس طرح جھپٹا مارتا ہوں کہ میرے ایک ہاتھ میں آصف کی گردن اور دوسرے ہاتھ میں واجدہ کی گردن آجاتی ہے۔ وہ ترپتے ہیں اور میرے ناخن ان کی گردنوں میں اترتے جاتے ہیں۔ میں انہیں گھسیٹ کر ایک عالم میں پھینک دیتا ہوں اور آصف کو بھیڑیوں کی طرح کھانا شروع کر دیتا ہوں۔ یہاں آکر خواب اتنا دھم سا ہو جاتا ہے جیسے یہ منظر الجھ گیا ہو۔ جب میں اپنے آپ میں آتا ہوں تو میرے سامنے ہڈیوں کے دو پتھر پڑے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ دل پر خوف کی ایسی گرفت کہ میں نے اپنی پیشانی پر پسینے کے قطرے محسوس کئے۔ اتنی گہری نیند سو کر مجھے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تروتازہ ہو جانا چاہئے تھا لیکن یہ خواب بیداری میں بھی میرے سامنے اس طرح موجود رہا جیسے یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہو۔ میرا دل بیٹھتا اور ڈوبتا ہی چلا گیا۔

میں اتنا زیادہ سویا تھا کہ سورج غروب ہونے کے لئے مغرب کی طرف اٹنے کے قریب چلا گیا تھا۔ میں نے بہتر یہ سمجھا کہ رات یہی گزاری جائے۔ میں نے دو گھنٹے چل کر دیکھ لیا تھا۔ پہلے سنایا ہے کہ دو گھنٹوں کی مسافت کے بعد میں اُسی جگہ آگیا تھا جہاں سے چلا تھا۔ اب ایک اور رات آرہی تھی۔ میں جو دن کے وقت بھٹک گیا تھا رات کو بھی بھٹک جاتا اور صبح تک نہ جانے کہاں جا نکلتا اور کس وقت یا کس دن مجھ پر یہ انکشاف ہوتا کہ میں تو آگے جانے کی بجائے بہت ہی پیچھے آگیا ہوں۔

اب بھوک قابل برداشت نہیں رہی تھی۔ میں اس علاقے کے درختوں کو دیکھنے لگا، شاید کوئی درخت پھل دار ہو۔ کچھ دور تک چلا گیا۔ کوئی ایک بھی درخت ایسا نظر نہ آیا جو میری بھوک کی تسکین کر سکتا۔ جھاڑی بیر بھی نہیں تھے۔ میں نے قوت ارادی سے کام لینے کی کوشش اس طرح کی کہ عہد کر لیا کہ بھوک کو مرتے دم تک برداشت کروں گا اور جب دیکھوں گا کہ اب بھوک نے نزع کے عالم تک پہنچا دیا ہے تو درختوں کے پتے اور گھاس کھاؤں گا۔

میں واپس اپنی جگہ کی طرف چل پڑا تو اُس وقت مجھے پرندوں کا خیال آیا۔ وہاں پرندوں کی تو کوئی کمی نہیں تھی لیکن میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا کہ

پرندہ کھایا جاسکتا ہے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ پرندوں کو درختوں میں چھماتے سنا تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں کیسا احمق ہوں کہ اللہ نے یہ خوراک میرے لئے درختوں پر بٹھا رکھی ہے اور میں ادھر توجہ ہی نہیں دے رہا۔ میری اصل حماقت تو یہ تھی کہ میں خوش تو ہو گیا کہ پرندے میرے پیٹ کی آگ بجھا سکتے ہیں لیکن میں انہیں کھاؤں گا کیسے؟ میرے پاس ماچس نہیں تھی۔ میں سگریٹ پیتا ہی نہیں تھا۔ بہر حال اُس وقت ایک ہی خیال تھا کہ کوئی موٹا تازہ پرندہ مارو اور کھا جاؤ۔

میں نے درختوں میں منہ اوپر کر کے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہاں چھوٹی چھوٹی چڑیاں تھیں۔ ان میں کچھ رنگ برنگی بھی تھیں۔ ایک چڑیا پر ایک راؤنڈ ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کوئی موٹا پرندہ نظر آجائے۔ ایک درخت پر ایک پرندہ آ بیٹھا۔ معلوم نہیں وہ کبوتر تھا، فاختہ تھی یا ہلکے رنگ کا کوا تھا یا آپ یوں کہہ لیں کہ وہ کوا بھی تھا، فاختہ بھی اور کبوتر بھی تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی اور اس پر گولی چلا دی۔ پرندہ پتھر کی طرح نیچے آ پڑا۔ میں نے دو ڈکرا سے اٹھالیا۔

میں نے بڑی تیزی سے اس کے پر نوچنے شروع کر دیے۔ تب میرے دماغ میں آئی کہ میں اسے کھاؤں گا کیسے؟ آگ تو ہے نہیں۔ میرے ہاتھ رک گئے اور تیز اور تکلیف دہ ہو گئی تھی۔

میں نے اس کے پر نوچنے کی بجائے اس کی کھال اتارنی شروع کر دی۔ کھال اتر گئی تو میں نے اس کے سینے پر دانت گاڑ دیے۔ زیادہ گوشت پرندے کے اسی جگہ ہوتا ہے۔ اس کا گوشت ابھی کچھ گرم تھا کیونکہ یہ تازہ تازہ مرا تھا۔ دانت گاڑنے میں مجھے جبرؤں کا پورا زور لگانا پڑا۔ لیکن میں انسان تھا، درندہ تو نہیں تھا کہ آسانی سے گوشت نوچ کر کھا لیک۔ میرے دانت گوشت میں اتر تو گئے لیکن بونی نوچ نہ سکے۔ میں نے جھولے میں سے چاقو نکالا اور اس سے پرندے کے سینے کی ایک چھوٹی سی بونی کاٹی اور منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ چبائی نہیں جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ذائقہ بُرا لگا۔ ابکاٹی آگئی۔ میں نے بونی منہ سے نکال لی اور سوچنے لگا کہ یہ کھاؤں یا پھینک دوں۔ کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ منہ نے چاقو سے اس بونی کا اتنا سا ٹکڑا کاٹا جتنا قیے کا ایک ذرہ ہوتا ہے۔

یہ ذرا جتنا گوشت منہ میں ڈالا اور تھوڑا سا چبا کر نگل لیا۔ پھر اس بونی کے اسی طرح کے ٹکڑے کرتے کرتے منہ میں ڈالتا گیا اور چبا چبا کر نگلتا گیا۔ میں اب انسان کم اور

دورندہ زیادہ بن گیا تھا۔ جی کڑا کر کے اس کچے گوشت کا ذائقہ برداشت کرتا رہا اور کھانا رہا۔ میں یہ بھی سوچتا رہا کہ ایسے ہی کروں گا اور آہستہ آہستہ کچے گوشت کا مادی ہو جاؤں گا۔

میں نے پرندے کے ایک طرف کے سینے کا پورا گوشت کھالیا اور اس طرف کی ٹانگ کا گوشت بھی حلق سے اتار لیا۔ باقی جو پرندہ بچا تھا وہ جھولے میں ڈال لیا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ کچے گوشت کو اور اس کے ذائقے کو میں نے کس طرح برداشت کیا تھا۔

میری بھوک پوری طرح تونہ مٹی لیکن اس کی شدت میں خاصی کمی آگئی۔ یوں کہہ لیں کہ میرا معدہ مجھے پریشان کرنے کی بجائے یہ گوشت ہضم کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے غنوغی محسوس ہونے لگی۔ سو جانے کو جی چاہتا تھا لیکن یہ خیال آگیا کہ میں نے کچا گوشت کھایا ہے، اگر میں سو گیا تو معدہ اسے ہضم نہیں کر سکے گا۔ میں نے جرم کو متحرک رکھنا ضروری جانا۔ میں نے رانقل وہاں رکھی جہاں میں دن بھر سویا رہا تھا اور فوجیوں کی طرح تیز چلنا شروع کر دیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ٹانگیں تھکنے لگیں اور اوج سورج غریب ہو گیا تو میں سونے والی جگہ آگیا اور بیٹھ گیا آپ نے فوجیوں کو کیوس کی بنی ہوئی بیٹل، ایمونیشن کے پوچ، جھولا اور بوتل وغیرہ پینے ہوئے دیکھا ہو گا۔ اسے ہم فوجی زبان میں چڑا کہا کرتا تھے۔ یہ ساری چیزیں ایک دوسری سے ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ میں نے یہ چڑا اتار کر رکھ دیا اور لیٹ گیا۔ تھکن کا یہ حال کہ لینا اور سو گیا۔

معلوم نہیں رات کتنی گزری تھی کہ مجھے اپنے قریب کچھ آوازیں اور آہٹیں سی سنائی دیں جن سے میں جاگ اٹھا۔ ان دنوں راتیں تاریک ہوتی تھیں، چاند رات کے پچھلے پہر اوپر آتا تھا۔

چاند اتر سے اٹھ رہا تھا۔ اتنی سی روشنی ہو گئی تھی کہ چند قدموں تک دکھائی دیتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دو بھیڑیے یا گیدڑ کچھ گھسٹ کر لے جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں دیکھا جہاں اپنا چڑا رکھا تھا۔ چڑا وہاں نہیں تھا۔ اچانک خیال آیا کہ جھولے میں میں نے آدھا پرندہ رکھا تھا۔ انہوں نے اس کی بو سونگھی اور آکر دیکھا کہ یہاں گوشت ہے۔ گوشت جہاں تھا وہاں سے تو وہ نکال نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے پورے کا پورا چڑا ان میں لیا اور گھسٹ کر لے جا رہے تھے۔ وہ مجھ سے پندرہ بیس قدم دور چلے گئے تھے۔

میں نے ان پر راونڈ ضائع نہ کیا بلکہ رانقل اٹھا کر ان کی طرف دوڑ پڑا۔ یہ میری حماقت تھی۔ اگر وہ بھیڑیے ہوتے تو مجھے اپنے شکار کے قریب نہ آنے دیتے، مجھ پر حملہ کر دیتے لیکن انہوں نے چڑا وہیں پھینکا اور بڑی ہی تیزی سے بھاگ اٹھے۔ تب میں سمجھا کہ یہ بھیڑیے نہیں گیدڑ تھے اور گیدڑ میں ایک ہی وصف کام کا ہوتا ہے کہ وہ بھاگ اٹھنے میں براہی تیز ہوتا ہے۔ سلطان ٹیپو شہید نے ویسے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ گیدڑ کی سو ملہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہوتی ہے۔

مجھے ان گیدڑوں پر غصہ آنا چاہئے تھا۔ غصہ نہیں تو جھنجھلاہٹ تو لازمی تھی، لیکن میری ہنسی نکل گئی اور پھر میں نے جو ہنسا شروع کیا تو ہنستا ہی چلا گیا اور پھر اپنے آپ ہی میرے قہقہے گونجنے لگے۔ ایسا کیوں ہوا، کیسے ہوا، میں بتا نہیں سکتا سوائے اس کے کہ میں قہقہے ہی لگا تا رہا اور میں نے عجیب و غریب قسم کا سکون محسوس کیا اور یہ بھی محسوس کیا کہ میرا پیٹ بھر گیا ہے اور اب بھوک مجھے پریشان نہیں کرے گی۔

میں نے پہلے یہ بات کہی تھی کہ میں کوئی عالم فاضل اور فلاسفر نہیں کہ یہ کہانی پڑھنے اور سننے والوں کو پسند و نصیحت کروں لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ وہ یہ ہے کہ کتنی ہی مشکل اور مصیبت کیوں نہ آجائے، اس کی ہنسی اڑائیں اور منہ بسور کر اور ذہن اور دل پر دکھ اور درد کا بوجھ ڈال کر ماتم کی تصویر نہ بن جائیں بلکہ اس مشکل اور مصیبت کا سامنا کریں، تجزیہ کریں، یہ دیکھیں کہ یہ حالات کیوں پیدا ہوئے ہیں پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کو کوئی نہ کوئی حل مل ہی جائے گا، کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔ بھلا وہ کوئی جگہ تھی جہاں میں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے تھے؟ اگر کوئی اس حالت میں مجھے وہاں دیکھتا تو وہ دور سے ہی پرے چلا جاتا اور کہتا کہ یہ کوئی فوجی پاگل ہو گیا ہے، اس کے قریب نہ جاؤ ورنہ یہ مار ڈالے گا۔ میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ اس ہنسی اور ان قہقہوں نے مجھے اگلے دن کے سفر کے لئے تروتازہ کر دیا۔

میں نے اپنا چڑا فولڈ کر کے اپنے نیچے رکھ لیا تاکہ اب گیدڑ اسے گھسٹ کر نہ لے جاسکیں۔ میں پھر سو گیا۔

○

مجھے سورج کی کرنوں نے جگایا۔ میں اٹھ بیٹھا اور سب سے پہلے یہ جائزہ لیا کہ رات کو میں نے جو کچا گوشت کھایا تھا، اس کا کیا بنا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ

گوشت ہضم نہ ہوا ہوتا تو میرے معدے میں درد اٹھتا یا کوئی اور علامت ظاہر ہوتی لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

میں نے باقی آدھا پرندہ جھولے سے نکالا۔ چاقو بھی نکالا اور کل کی طرح تپے جیسی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کاٹ کر منہ میں ڈالتا چباتا اور نگھٹا گیا۔ انسان اپنے آپ کو جیسا فریب بھی دینا چاہے دے سکتا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو یہ دھوکہ دیا یا اپنے آپ کو قائل کیا کہ یہ تو بڑا ہی مزے دار گوشت ہے اور میں کبھی انسانوں میں یا گھر میں پہنچ گیا تو وہاں بھی کچا گوشت ہی کھایا کروں گا۔ اس سوچ نے یا اس خود فریبی نے مجھے بہت فائدہ دیا۔ میرے معدے نے سارے کا سارا گوشت بخوشی قبول کر لیا۔

اس پرندے کی ہڈیاں گیدڑوں کے لئے وہیں پھینک کر میں چل پڑا۔ میں وہ مسافر تھا جسے صرف یہ علم تھا کہ اس کے سفر کا مقصد کیا ہے لیکن منزل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ کیا تھی اس مسافر کی منزل؟ کتنی دور؟ کس سمت؟..... کچھ علم نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر ان بکھری ہوئی چٹانوں میں سے گزر رہا تھا۔

میں کسی بستی یا کسی اکیلے وکیلے انسان کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ میں کسی کو یہ بتا کر کہ میں کہاں جانا چاہتا ہوں، راستہ معلوم کرنا چاہتا تھا، لیکن نہ کوئی اللہ کا بندہ نظر آتا تھا نہ کوئی گاؤں۔

اب کے میں ان چٹانوں کی بھول خلیوں میں بھٹکا نہیں، آگے نکل گیا۔ یہ علاقہ بھی عجیب و غریب تھا۔ میں ایسے علاقے کا رہنے والا ہوں جہاں صرف کھیتیاں ہموار ملتی ہیں لیکن وہ بھی کوئی ٹکڑا نیچے کوئی ٹکڑا اوپر لیکن باقی علاقہ ہموار نہیں۔ کھڈ، ٹالے، گھائیاں اور ٹیلے اور کہیں سلوں والی چٹانیں۔ یہ ہے میرا علاقہ لیکن میں برا کے جس علاقے میں جا رہا تھا وہ پراسرار سا اور خوابوں جیسا علاقہ تھا۔

میں اب ایک ایک دن کی روداد نہیں سناؤں گا، اب میں تین چار دن آگے آپ کو لے چلتا ہوں۔ یہ تین دن یا چار دن، شاید پانچ دن گزر گئے ہوں، ایسے ہی گزرے کہ میں چلتا رہا رکتا رہا اور راتوں کو سوتا رہا اور ایک آدھ پرندہ مار کر کھاتا رہا اور پانی پیتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں کتنے دن اور کتنی راتیں چلتا رہا تھا۔ میں گھوڑا نہیں تھا اور میں موٹر کار بھی نہیں تھا کہ میں اتنے سارے دنوں میں میل با میل مسافت طے کر جاتا۔ میں آگے دیکھتا تھا پھر چلتا تھا اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا

تھیں باتیں گھسیٹتا تھا اور اس طرح تھکن کی وجہ سے میری رفتار کم ہوتی جا رہی تھی۔ لمبے بھی ہوا کہ میں چلا کم اور آرام زیادہ کیا۔ اپنے دل کو یہ کہہ کر بسایا کہ آئی این اے کے ہیڈ کوارٹر تک نہ پہنچ سکا تو یہی کافی ہے کہ میں جنگ سے نکل آیا ہوں اور اب یہ کہنے کے قابل ہو گیا ہوں کہ میں انگریزوں کی خاطر نہیں لڑا تھا۔

اُس وقت تو خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ ایک دن ہم آزاد ہوں گے اور آزاد بھی یوں کہ اپنی اسلامی مملکت بنالیں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے وہ دن بھی دکھادیا کہ میں فخر سے کہہ رہا ہوں کہ میں انگریزوں کے لئے نہیں لڑا تھا اور جب میں لڑا تو اپنے مسلمان بھائیوں کی آزادی کے لئے لڑا اور اپنی جان کی بازی لگا کر لڑا۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کون سے مسلمان بھائیوں کی بات کر رہا ہوں؟..... وہ انڈونیشیا کے مسلمان تھے جو اُس وقت ولندیزیوں کے غلام تھے۔ ان مسلمانوں نے جو جنگ آزادی لڑی، الحمد للہ، اس میں میں بھی شریک تھا..... یہ ولولہ انگیز داستان آگے چل کر سناؤں گا۔

میں ایک صبح جاگا۔ وہ رات بڑی قسم کے ایک درخت کے نیچے گذاری تھی۔ میں اٹھا اور حسب معمول سمت کا اندازہ کر کے چل پڑا۔ دو روز پہلے ایک خاص قسم کے درخت مل گئے تھے جو پہلے بھی ملے تھے۔ ان کے ساتھ انجیر کی قسم کا پھل لگتا تھا اور اس کا ذائقہ ذرا میٹھا اور ٹھیک ٹھاک تھا۔ میں نے اس پھل سے اپنا جھولا بھر لیا تھا۔ چلتے چلتے یہ پھل کھاتا رہا۔ اب میں خاصی اونچی زمین پر چل رہا تھا جو ڈھلان کی شکل میں دور تک چلی گئی تھی اور مجھے یوں نظر آ رہا تھا کہ جیسے یہ زمین جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے دریا شروع ہوتا ہے یعنی وہاں دریا کا کنارہ تھا۔ درخت اور دیگر سبز اتنا زیادہ تھا کہ وہاں سے اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا کہ وہ دریا یہ ہے یا ویسے ہی تھوڑا سا پانی اکٹھا ہو گیا ہے۔

میں وہاں سے خاصا دور تھا اور میں جس راستے پر جا رہا تھا وہ پھر چھوٹی بڑی چند ایک جگہوں میں چلا گیا تھا۔ میں اسی طرف سے دریا تک پہنچ سکتا تھا، اگر وہ واقعی وہی دریا تھا۔ میں نے جس سمت جانا تھا اس سمت دریا کا آ جانا میرے لئے اچھا شگون نہیں تھا۔ میں دریا کو عبور نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال میں چلتا گیا اور آگے زمین کی ڈھلان تو ختم ہو گئی لیکن مجھے قدرتی تلاب نظر آنے لگے۔ آگے پھر ایک اونچی ٹیکری آگئی۔ یہ ٹیکری میرے راستے میں آئی تھی۔ میں اس کے دامن کے ساتھ ساتھ دائیں طرف چل پڑا۔ میں

ہل چبھے اور آگے کر کے دوسری گولی چلا دی۔ اڑوہا کا منہ کھل گیا اور وہ پانی میں چلا

عید عورت بڑی تیزی سے اٹھی اور چند قدم دوڑ کر بیٹھ گئی اور اپنا دایاں پاؤں دیکھنے لگی۔ اڑوہا کے اگلے اور لمبوترے دو دانت اس کی ٹانگ میں اتر گئے تھے۔

زخمی اڑوہا نے پانی میں جو اودھم مچایا وہ دیکھنے والا تھا۔ کبھی تو سر کی طرف سے اڑوہا پر آ جاتا اور وہاں سے گرتا اور کبھی دم کی طرف سے پانی کی سطح پر آتا اور گرتا۔ وہ رپ رہا تھا لیکن میں نے اس سے توجہ ہٹائی اور اس عورت کے پاس چلا گیا۔ اڑوہا نے زندہ نہیں رہتا تھا۔

اب اس عورت کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو چندرہ سولہ سال کی لڑکی ہے۔ اس کے خدوخال بتا رہے تھے کہ وہ بری ہے۔ رنگ گورا اور اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے ننھے کے اوپر ایک جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے کندھوں پر دو پتے تو نہیں، چوڑا سا ایک رومال تھا جو میں نے تہہ کر کے اس کے زخم پر باندھ دیا اور اس سے اردو میں پوچھا کہ وہ کہاں سے آتی ہے اور اُس کا گھر کہاں ہے۔ یقین جانئے، میں اُسے اس دیرانے میں اور اس پراسرار علاقے میں خواب و خیال کی کوئی چیز یا کسی مری ہوئی عورت کی بددعج سمجھتا تھا۔ وہاں آبادی تو کوئی تھی نہیں۔

اُس نے میرے منہ کی طرف دیکھا اور سر ہلایا جس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ وہ میری زبان نہیں سمجھتی۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا اور ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے ایک بار پھر پانی کی طرف دیکھا۔ وہاں اب خاموشی تھی۔ اڑوہا مریا ہو گیا۔ میں نے لڑکی کو بازو سے پکڑا تو میں نے اُس کے چہرے پر خوف کا تاثر دیکھا۔ ایک خوف تو صاف ظاہر تھا جو اس اڑوہا کا تھا لیکن اس کا بدلا ہوا تاثر صاف بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے ڈر رہی تھی کہ میں فوجی ہوں اور میں اُس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کروں گا۔ میں نے اسے تھپکی دی اور اس طرح کا اشارہ کیا کہ میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔

وہ اٹھ کر چل تو پڑی لیکن زخمی ٹانگ سے لنگڑا رہی تھی۔ میں نے اسے پوچھے بغیر اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ بولنا شروع کر دیا۔ شاید یہ کہہ رہی ہو گی کہ میں اڑوہا سے توجہ نکلی ہوں اور ایک فوجی درندے کے ہاتھ چڑھ گئی ہوں اور شاید وہ میری محنت ساجت کر رہی تھی کہ میں اُسے چھوڑ دوں۔ میں نے اُس کی ایک

پچیس گز جا کر اس ٹیکری میں اس طرح شکاف تھا جیسے اسے انسانی ہاتھوں نے توڑا یا کھودا ہے اور راستہ بنایا ہے لیکن یہ شکاف قدرتی تھا۔

میں اس شکاف تک پہنچا اور اس میں سے گزرنے لگا۔ ٹیکری اچھی خاص چوڑی تھی۔ میں شکاف کے وسط تک گیا ہوں گا کہ مجھے کسی بچے کی یا عورت کی چیخیں سنائی دیں جو قریب نہیں تھیں لیکن کوئی ایسی دور بھی نہیں تھیں۔ مجھے رک کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا اور کہیں چھپ کر دیکھنا چاہئے تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ میرے لئے خطرناک بھی ہو سکتا تھا لیکن انسانی فطرت کے مطابق یوں ہوا کہ یکے بعد دیگرے تین چار چیخیں سنائی دیں تو میں اُس طرف دوڑ پڑا۔

میں نے رانقل فائر کے لئے تیار کر لی اور اس شکاف میں سے نکل کر آگے گیا تو ادھر منظر ہی کچھ اور تھا۔ تھوڑی سی جگہ دائرے میں درخت تھے۔ بیلوں جیسے پودے بھی تھے اور ان کے درمیان پانی جمع تھا۔ یہ قدرتی تالاب تھا۔ ایک جگہ سے کنارہ اونچا نہیں بلکہ زمین کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اس تھوڑی سی جگہ کوئی پودا نہیں تھا بلکہ جگہ کچھ اس طرح خالی تھی جیسے انسانوں نے خود یہ جگہ کسی مقصد کے لئے بنائی ہو۔

اس خالی جگہ میں نے ایک عورت کو دیکھا جو پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی، اس کے بازو آگے کو تھے اور وہ گھاس کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے کو پانی کی طرف سرک رہی تھی اور اس کے منہ سے جگر پاش چیخیں نکل رہی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ اسے کوئی آبی جانور یا درندہ پانی میں کھینچ رہا ہے اس کی ایک ٹانگ کنارے پر تھی۔ میں جہاں تھا وہاں سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اسے کیا چیز گھسیٹ رہی ہے۔ مگر مجھ ہی ہو سکتا تھا لیکن مگر کچھ ہوتا تو اس کا منہ صاف نظر آتا اور پھر مگر کچھ اڑوہا طاقتور ہوتا ہے کہ گائے اور بیل تک کو ٹانگ سے پکڑ کر پانی میں گھسیٹ لیتا ہے یہ کمزور سی عورت تھی۔

میں جتنا تیز دوڑ سکتا تھا دوڑا اور عورت تک پہنچا۔ میں نے ایک عجیب چیز دیکھی۔ وہ اڑوہا تھا جس نے اس عورت کا ایک پاؤں ننھے سے اوپر تک منہ میں لے رکھا تھا اور اسے گھسیٹ رہا تھا۔ اڑوہا کا سر اور اس کے پیچھے تقریباً دو فٹ یا اڑوہائی فٹ جسم بڑا سے باہر تھا۔ میں نے رانقل سیدھی کی اور سر کے نیچے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ فاصلہ بہت تھوڑا تھا جسے فوجی زبان میں پوائنٹ لینک رینج کہتے ہیں۔ میں نے تیزی سے

ہے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جا رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہ میں
میں بیٹوں کا پہلے اس لڑکی کی مرہم پٹی کا کوئی بندوبست کرو۔ زخمی لڑکی کو ایک خوشی
اس کی تھی کہ وہ اڑدھا کے منہ سے نکل کر آئی تھی۔ اسے ایک خوشی اور بھی ملی
یہ کہ میں فوجی ہو کر اُس کے گاؤں میں لے آیا تھا اور اس کے ساتھ وہ
وہ نہیں کیا تھا جس کی اُسے توقع تھی۔

خوشی تو مجھے ملی تھی کہ میں اس جنگل بیابان میں انسانوں میں کھڑا تھا اور مجھے ایک
نئی مل گئی تھی۔ میرے پاس رائل تھی، ایمونیشن تھا اور میں طاقتور تھا اس لئے میں
لوگوں پر حکم چلا سکتا تھا جو میں نے نہیں چلا تھا۔ وہ تو میرے آگے بچھے جاتے تھے۔

میں بہت سے لوگوں کے زرخے میں کھڑا تھا۔ وہ سب مجھے حیرت زدگی کی کیفیت میں
بہ رہے تھے کہ میں اتنا بہادر ہوں کہ میں اس لڑکی کو اڑدھا کے منہ میں سے نکال لایا
۔ کسی کی آواز آئی جو میں نہ سمجھ سکا۔ اس آواز پر تمام لوگ پیچھے ہٹ گئے اور
وہ نے راستہ بنا دیا۔ میں نے پہلے تو یہ سمجھا کہ انہوں نے میرے لئے راستہ بنایا ہے
۔ میں ان کے جھونپڑوں میں چلوں لیکن میں نے دیکھا کہ ایک آدمی چلا آ رہا تھا جس
نے لمبا جھنڈا پہن رکھا تھا اس کے سر پر گھڑی تھی اور گھڑی پر رومال ڈالا ہوا تھا جو
بڑھوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اُس شخص کی چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی تھی اور وہ کوئی عالم
نہ لگتا تھا۔ میں نے دور سے ہی دیکھ لیا کہ یہ شخص بری نہیں بلکہ پنجابی یا پٹھان ہے
وہو سکتا ہے ہندوستان کے کسی اور شمالی صوبے کا ہو۔

میں اُس کی طرف بڑھا۔ اس کا احترام میرا فرض تھا۔ میں نے قریب جا کر دونوں
اُس کی طرف بڑھائے تو اُس نے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنا دایاں
دُڑا سا آگے کیا۔ میں نے اُس کا وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے
حاکم اس نے ذرا سی بھی گرجوٹی کا اظہار نہ کیا۔ اس کا ہاتھ یوں تھا جیسے میں نے کوئی
جان چیر پکڑی ہو۔

”کون ہو؟“ اس نے مجھے کوئی مشکوک آدمی سمجھ کر پوچھا۔ ”کہاں سے آئے“

”آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں فوجی ہوں“ میں نے کہا۔ ”اگر آپ مجھے کہیں بٹھائیں گے تو
ایک بات سناؤں گا..... آپ بولتے تو اردو ہیں لیکن لب و لہجہ پنجابی ہے۔ میں بھی

نہ سنی اور کچھ دور جا کر اس سے اشارے میں پوچھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔

وہاں کچھ اونچی ٹیکریاں تھیں۔ اُس نے اشارہ کیا کہ اس طرف چلنا ہے۔ میں نے
اُسے نیچے اتار دیا تھا۔ اُس کی مزاحمت کے باوجود میں نے اُسے پھر اٹھالیا۔ یہ نہ سمجھیں
کہ وہ نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی اس لئے میں اسے اٹھاتا پھرتا تھا وہ زخمی تھی اور
اس قدر دہشت کی ماری ہوئی کہ اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا اور اُس کی معذوری یہ کہ
اس کی ٹانگ زخمی تھی اور وہ چل نہیں سکتی تھی۔

کچھ آگے گئے تو وہاں ذرا بلند ایک ٹیکری تھی جو کچھ آگے جا کر ختم ہو جاتی تھی۔
ذرا آگے ایک اور ٹیکری شروع ہو جاتی تھی اور وہ بلندی پر جا کر اچھی خاصی اونچی ہو گئی
تھی۔ ان دونوں ٹیکریوں کے درمیان خاصا چوڑا راستہ تھا۔ میں جب وہاں پہنچا اور اس
راستے سے اندر دیکھا تو میری عقل دنگ رہ گئی۔

یہ دونوں ٹیکریاں نئے چاند کی شکل کی تھیں۔ ان کے دائیں اور بائیں خاصی دور
دور چٹانیں تھیں اور ان کے درمیان خاصا علاقہ ہموار تھا۔ وہاں میں نے جھونپڑوں کی
ایک بستی دیکھی۔ یہ تمام جھونپڑے بانسوں کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے فرش بھی
بانسوں اور لکڑی کے تھے اور ہر جھونپڑے کے نیچے موٹے بانسوں کے ستون تھے جس کا
مطلب یہ تھا کہ ہر جھونپڑا بانسوں کے ستونوں پر کھڑا تھا۔

براہ اور ارد گرد کے علاقوں میں دیہاتیوں کے جھونپڑے اسی طرح کے ہوا کرتے
تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی بلکہ اب بھی بائیں یہ وجہ ہے کہ بارشیں زیادہ ہوتی تھیں اور پانی
جمع ہو جاتا تھا۔ میں جھونپڑوں کی ساخت وغیرہ کو تو آگے چل کر بیان کروں گا۔ یہ میرے
لئے ایک عجیب چیز تھی، ابھی آپ اس لڑکی کی بات سن لیں۔

جھونپڑوں کے باہر کچھ عورتیں کچھ بچے اور کچھ آدمی گھوم پھر رہے تھے۔ ان میں
سے کسی نے میری طرف دیکھا اور سب کو بتایا۔ تمام لوگ دوڑے آئے اور میرے
ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ میں نے لڑکی کو اتار لڑکی نے انہیں اپنی زبان میں روتے ہوئے
بتایا کہ اس کے ساتھ کیا بیٹی ہے اور میں اُسے کس طرح بچا کر لے آیا ہوں۔

ایک عورت دوڑتی آگے آئی اور اس لڑکی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اس کی بل تھی۔
میں یہ سمجھتا تھا کہ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو میری زبان سمجھ سکے لیکن ایک بیا
نکل ہی آیا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا جس سے اس کا مطلب واضح ہو جاتا تھا۔ اس نے

پنجاب کا رہنے والا ہوں۔“

میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ یہ شخص مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوا اور یہ محسوس غالب آنا چاہتا ہے۔ میں آپ کو کچھ باتیں آگے چل کر بتاؤں گا، مثلاً یہ کہ پانی میں اڑوہا تھا یہ کیسا تھا اور یہ اڑوہا کیسے ہوتے ہیں اور پھر ان جھونپڑوں کی اور اس لڑکی کی کچھ باتیں سننے والی ہیں، یہ سب آگے چل کر سناؤں گا، اس وقت میں اس شخص کی صرف اتنی سی بات بتاؤں گا کہ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور سب سے الگ لے گیا۔

”میری بات غور سے سن لو فوجی بھائی!“ — اُس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے ہر ایک حکمرانی اسی شخص کے ہاتھ میں ہو — ”تم اگر بھگوان فوجی ہو تو ہوش میں رہنا میں تمہیں کسی بھی وقت اندر کر سکتا ہوں۔ اگر میرے اشاروں پر چلو گے تو عیش اور مہم کرو گے۔ میں آج رات تمہیں اپنے ہاں مسمان رکھوں گا اور ساری بات بتا دوں گا۔“

مجھے یہ شخص بہت ہی برا لگا۔ اُس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور گھور کر دیکھا۔

”میں نے آپ کا احترام کیا ہے“ — میں نے کہا — ”کو شش کریں کہ آپ کا احترام میرے دل میں قائم رہے۔ میں بڑی دور کی منزل کا مسافر ہوں۔ اگر آپ میرے راستے میں آئے تو میں بتا نہیں سکتا کہ میں کیا کر گزروں گا۔“

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی..... یہ مسکراہٹ سترت کی نہیں تھی اس مسکراہٹ کے معنی کچھ اور تھے۔ میں نے اُس کی مسکراہٹ کا پینچ قبول کر لیا۔

کے ارد گرد و گاؤں والوں کا جھوم بڑھتا جا رہا تھا۔

”اتنی گرمی نہ کھاؤ میرے دوست!“ — اُس نے کہا — ”ہم دونوں

پوئیں ہیں۔ کیوں نہ ہم دوستوں کی طرح رہیں..... میرے ساتھ آؤ، اس بے چاری لڑکی کا زخم دیکھ لیں اور اس کی مرہم پٹی کا بندوبست کر دیں۔“

اُس نے میرا ایک بازو پکڑا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ اسے کسی نے آتا دیکھ لیا تو اس نے جھوم کو بتایا۔ جھوم نے بڑی تیزی سے اسے راستہ دے دیا۔ لڑکی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اور اُس نے اپنا منحنہ پکڑا ہوا تھا۔ یہ عالم قسم کا آدمی اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی ٹانگ ذرا اٹھا کر زخم دیکھنے لگا۔ میں نے بھی پہلی بار اس کے زخم کو غور سے دیکھا۔

اڑوہا کے دانت چارپانچ جگہوں پر گہرے اتر گئے تھے اور وہاں سے خون نکل رہا تھا۔ اس عالم صورت آدمی نے بری زبان میں کچھ کہا۔ دو آدمی لڑکی کو اٹھا کر دوڑ پڑے۔ میں جان گیا کہ لڑکی کی مرہم پٹی ہوگی اور ان لوگوں کے پاس اس کا کچھ نہ کچھ انتظام ہوگا۔

میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ لوگ اس عالم کو یوں دیکھ رہے تھے کہ جیسے وہ کوئی پیر یا پیغمبر ہو اور آسمان سے اُترا ہو۔ اس نے ان لوگوں سے کچھ کہا پھر ان میں سے ایک آدمی کو بلا کر اس کے ساتھ کوئی بات کی اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

”آؤ چلیں“ — اُس نے مجھے کہا — ”تم نے کچھ کھلایا یا تو نہیں ہو گا..... میں جانتا ہوں کہ تم بھوکے ہو۔“

”خاک کھایا تھا!“ — میں نے کہا — ”مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ آخری بار ڈھنگ کا کھانا کب کھایا تھا۔“

وہ مجھے اپنے ساتھ ایک جھونپڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔

”میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا“ — اس نے کہا اور میرا نام پوچھا۔

میں نے اسے اپنا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔

”میرا نام مسیح اللہ ہے“ — اس نے کہا — ”لیکن تم مجھے یا حضرت کہہ کر پکارا کرو گے۔“

اس نے ایک قصبے کا نام بتایا جو پنجاب کا ایک قصبہ ہے۔ وہ اس قصبے کا رہنے والا تھا۔ میں نے اُس کا نام صحیح بتا دیا ہے لیکن اس قصبے کا نام نہیں لکھوں گا کیونکہ اُس میں ایک مصلحت ہے۔

”میں آپ کو یا حضرت کیوں کہوں گا؟“ — میں نے کہا — ”اگر میں آپ کو مسیح اللہ صاحب کہہ کر پکاروں تو اس میں کیا خرابی ہوگی؟“

”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں“ — اس نے جواب دیا — ”لیکن یہاں لوگ مجھے یا حضرت ہی کہتے ہیں۔“

ہم اس کے جھونپڑے تک پہنچ چکے تھے۔ یہ جھونپڑا بھی زمین سے کم و بیش ایک گز اونچے لکڑی کے پلیٹ فارم پر بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواریں اور چھتیں بانسوں اور لکڑی کی تھیں۔ چھتیں مخروطی تھیں۔ ان پر گھاس پھونس کے اوپر مٹی کا لپ کیا ہوا تھا۔ وہاں زیادہ تر جھونپڑے اسی قسم کے تھے یعنی سب کی ساخت ایسی ہی تھی۔ لکڑی کی سیڑھیاں تھیں۔ ہم دونوں ان سیڑھوں پر چڑھ کر کمرے میں داخل ہوئے۔

اندر سے جھونپڑا صاف ستھرا اور اس طرح سجایا تھا کہ دیواروں پر رنگ برنگے کپڑے یعنی چادریں لٹک رہی تھیں۔ اُن پر نیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ فرش پر کجور کے پتوں والی چٹائی چھبی ہوئی تھی۔ دو بان کی چارپائیاں رکھی تھیں۔ ایک ایک دیوار کے ساتھ اور دو سری دو سری دیوار کے ساتھ۔ ان پر بستر بچھے ہوئے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کمرے میں رہنے والا آدمی شائستہ ہے اور صاف ستھرا رہتا جانتا ہے۔

اس جھونپڑے کے دو کمرے تھے۔ میں نے خود ہی کواڑ کھول کر دوسرے کمرے میں جھانکا وہاں کوئی چارپائی نہیں تھی، دو بڑے ٹرنک پڑے ہوئے تھے اور ٹین کا ایک سوٹ کیس بھی رکھا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور پہلے کمرے میں آ گیا۔

”رائفل رکھ دو“ — اس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں اپنائیت اور دوستی کا رنگ تھا — ”یہ بوٹ اتار دو۔ میں تمہیں اپنے کپڑے دوں گا۔ ابھی ایک آدمی آتا ہے، میں تمہیں اُس کے ساتھ غسل کے لئے بھیجوں گا۔ پہلے غسل کر لو پھر کھانا کھا لیتا۔“

میں نے فوجی بوٹ اتار دیے، جرابیں بھی اتاریں اور اتنے میں ایک اوجھڑ عمری

اندر آیا۔ مسیح اللہ نے اسے بری زبان میں کچھ کہا۔ یہ ذرا لمبی ہدایت تھی جو وہ اس آدمی کو دے رہا تھا اور وہ آدمی ذرا سا جھکا ہوا سر ہلا رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ میں سمجھ رہا ہوں۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور میں مسیح اللہ کے کہنے پر اٹھا اور اس بری کے ساتھ باہر نکل گیا۔

وہ مجھے جھونپڑے کی دوسری طرف لے گیا جہاں جھونپڑے کے قریب ہی دو درخت تھے۔ درختوں کے ساتھ تریال سا بندھا ہوا تھا اور اُسی تریال کو چاروں طرف تان کر غسل خانہ بنایا گیا تھا۔ وہاں ایک کنستر رکھا تھا جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ صابن بھی رکھا تھا۔ میں نے تریال کی اوٹ میں یعنی اس غسل خانے کے اندر جا کر وردی اتاری اور نہانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس بری نے ہاتھ تریال کے اندر کر کے پانی سے بھرا ہوا ایک اور کنستر اندر رکھ دیا۔ میں جب نہا رہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری وردی میں سے اور میرے جسم سے بھی بدبو آ رہی ہے۔ اس سے پہلے میں نے یہ بدبو محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس بدبو کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔ قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ اب پانی ملا اور صابن بھی مل گیا تو میں نے اپنے جسم سے پسینہ مل کر دھویا اور میرا جسم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ وہ گرمیوں کا موسم تھا۔ اس علاقے میں جس زیادہ تھا۔

میں نماچکا تو ایک طرف دیکھا۔ تریال کی بنی ہوئی دیوار پر کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ یہ کپڑے بری نے رکھے تھے۔ ان کپڑوں میں تولنے کی قسم کا ایک کپڑا تھا جس سے میں نے جسم پونچھا اور کپڑے پہنے۔ ایک پاجامہ تھا اور ایک قمیض۔ غسل خانے سے نکلا تو باہر ایک چلی پڑی ہوئی تھی۔



مجھے آج تک یاد ہے کہ جب میں نے چلی پنی تو اپنی ایک حماقت کا خیال آ گیا۔ وہ یہ کہ میں اپنی رائفل بمعہ ایمونیشن کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ اس شخص مسیح اللہ نے مجھے دھکی دی تھی اور میں نے دھکی کا جواب دھکی سے دیا تھا۔ وہ تو ان لوگوں کا یا حضرت بنا ہوا تھا۔ اگر وہ میری رائفل اور ایمونیشن پر قبضہ کر لیتا تو میں تو لڑائی لڑا ہی گیا تھا۔ میں نہ کیا کر سکتا تھا۔ یہ سوچ آتے ہی میں بڑی تیزی سے اس کے

جھونپڑے میں جا پھنسا۔

یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ رانقل اسی جگہ پڑی تھی جہاں میں نے رکھی تھی اور میرا چڑا بھی فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے پانچ دیکھے، ایمنیشن ان کے اندر پڑا ہوا تھا پھر یہ دیکھ کر مجھے اور سکون ملا کہ سب اللہ لینا ہوا تھا۔

”نہا کر جسم کچھ ہلکا ہوا یا نہیں؟“ — سب اللہ نے دوستانہ سے لہجے میں کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ طبیعت ہلکی پھلکی اور بشارت ہو گئی ہے۔ اس نے کہا کہ کھانا آتا ہی ہو گا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کھانا آگیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ تہذیب و تمدن سے اتنی دور جنگل کے اس گاؤں میں میرے لئے جو کھانا آیا وہ بڑی اچھی پلیٹوں میں تھا اور پانی شیشے کے گلاس میں آیا تھا۔ کھانا لانے والے نے پلیٹیں چارپائی پر رکھ دیں۔ کھانا دیکھ کر میری بھوک اور تیز ہو گئی۔ اگر وہاں یا حضرت نہ ہوتا تو میں اس کھانے پر جانوروں کی طرح ٹوٹ پڑتا۔ میں نے اپنے اوپر جبر کر کے شائستگی کا مظاہرہ کیا۔ ایک پلیٹ میں اُلے ہوئے چاول تھے، دوسری میں تلی ہوئی مچھلی کے دو ٹکڑے تھے اور تیسری میں مچھلی کا سالن تھا۔

چچ نہیں تھا اس لئے میں نے ہاتھوں سے چاول کھانے شروع کر دیے۔ اس دوران میں سب اللہ نے کچھ باتیں کیں لیکن میں کھانے میں اس قدر محو تھا کہ اس کی بات کا خیال ہی نہ کیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے ایک مدت بعد ڈھنگ سیلیف کا کھانا ملا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے پلیٹیں صاف کر ڈالیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے غنودگی آنے لگی۔ سب اللہ نے آواز دی تو وہ بری جو کھانا لایا تھا دوڑتا ہوا کمرے میں آیا۔ سب اللہ کے اشارے پر وہ پلیٹیں اٹھا کر چلا گیا۔

”اب کچھ اپنے بارے میں بتاؤ“ — سب اللہ نے پوچھا — ”مجھے اپنا دشمن نہ سمجھتا اور کوشش کرتا کہ ہم دونوں دوست بن جائیں۔“

”میں اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤں گا“ — میں نے کہا — ”جو کچھ بتاؤں گا وہ سو فیصد سچ ہو گا، ذرا سا بھی جھوٹ نہیں ہو گا۔۔۔۔۔ آپ نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کے اشاروں پر ناپوں تو میں عیش موج کروں گا آپ نے یہ کہا تھا کہ آپ مجھے اندر کرا رہے ہیں۔۔۔۔۔ میں اپنے بارے میں ایک ضروری بات پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ میں نے بھی کسی

درب قبول نہیں کیا اور میں نتیجے کی پروا نہیں کیا کرتا۔ اگر آپ کو میری دوستی قبول ہے تو مجھ سے بہتر دوست آپ کو آج تک نہیں ملا ہو گا۔“

میں بول رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا جیسے میں فٹے میں ہوں یا مجھ میں بولنے کی طاقت نہیں رہی۔ میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ سونے کا وقت نہیں تھا ابھی ذرا سوچ بھی غروب نہیں ہوا تھا۔

”ابھی رہنے دو“ — سب اللہ نے کہا — ”سو جاؤ۔۔۔۔۔ بہت تھکے ہوئے ہو۔۔۔۔۔“

باگڑے تو باتیں کریں گے۔ تم اب میرے ساتھ رہو گے۔“

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس کی پوری بات نہیں سنی تھی، وہ بول ہی رہا تھا کہ میں مری نیند سو گیا۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ میری رانقل کمرے میں پڑی ہے۔ اگر سوچ بھی لیتا تو بھی بیکار تھا۔ میں رانقل کی کہاں چھپا سکتا تھا۔ بہر حال نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ مجھے اپنے نفع نقصان کا کچھ ہوش نہ رہا۔



آٹھ کھلی تو کمرے میں دیے کی روشنی تھی۔ یہ دیا میں کے ڈبے میں سے بتی نکال کر ہٹا گیا تھا۔ سب سے پہلی چیز جو میں نے دیکھی وہ ایک دو ٹالی بندوق تھی جو کمرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب دیوار کے ساتھ ایک بیٹ لنگ رہی تھی جس میں بندوق کے کارٹوس تھے۔ یہ بندوق میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ بندوق دیکھتے ہی مجھے اپنی رانقل کا خیال آیا۔ سب اللہ کمرے میں نہیں تھا۔ میں تیزی سے اٹھا اور اپنی رانقل دیکھی۔ رانقل وہیں پڑی تھی جہاں میں نے رکھی تھی۔

میں نے جب دیکھا کہ رانقل وہیں پڑی ہے تو مجھے یہ خیال آیا کہ سب اللہ اگر میرے ساتھ کوئی گڑبڑ یا ہیرا پھیری کرنا چاہتا تو وہ میری رانقل اور ایمنیشن غائب کر دیتا۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ میں جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ سارے گاؤں پر خاموشی طاری تھی۔ وقت کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اُس زمانے میں گھڑی کسی کسی فوجی کے پاس ہوا کرتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق رات آدھی گزر گئی تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ وہ آگیا۔

”جاگ اٹھے؟“ — اس نے پوچھا — ”اگر بھوک لگی ہے تو کھانا منگوا دیتا ہوں۔“

”نہیں!“ — میں نے کہا — ”بے وقت کھانا کھایا تھا۔ پیٹ اتنا بھرا ہوا ہے کہ میں اس میں اور کچھ نہیں ٹھونسا چاہتا۔۔۔۔۔ معلوم نہیں وقت کیا ہوا ہو گا!“
ہم کمرے میں چلے گئے۔ اس نے کلائی اوپر کر کے وقت دیکھا۔ اس کے پاس گھڑی تھی۔ رات کے ساڑھے دس کے گھگ بھگ وقت تھا۔
”اب بتاؤ تم یہاں تک کس طرح آن پہنچے ہو؟“ — اس نے اپنی چارپائی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

میں نے اسے ساری بات سنا دی۔ میں نے جس طرح آصف کو بچلایا تھا وہ بھی اسے سنایا اور یہ بھی کہا کہ آصف اس لڑکی کا خاوند ہے جس کی میرے ساتھ محبت تھی۔ یہ بھی بتایا کہ آصف نے مجھے قتل کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن میں نے اسے موت کے در سے نکال لیا اور زندگی کی طرف بھیج دیا۔
”لیکن اب تم جا کہاں رہے تھے؟“ — اس نے پوچھا۔

میں نے اسے وہی جواب دیا جو اب تک لکھ چکا ہوں اور آپ پڑھ چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے اُسے بتایا کہ میں انگریزوں کی غلامی سے نکل کر اُس جگہ جا رہا ہوں جہاں ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے ایک فوج تیار ہو رہی ہے۔
”وہ کیسی فوج ہے؟“ — اس نے پوچھا۔ ”اور وہ فوج کون تیار کر رہا ہے؟“
میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ فوج جاپانی تیار کر رہے ہیں اور اس فوج میں ہندوستان کی فوج کے جنگی قیدیوں کو شامل کر رہے ہیں۔ اس نے یہ تفصیل خیریت سے سنی۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ جاپانی انڈین نیشنل آرمی کی ایک فوج بنا رہے ہیں اور انڈین آرمی میں سے مجھ جیسے فوجی بھگوڑے ہو کر اس میں شامل ہو رہے ہیں۔

”ہوش کی بات کرو میرے بھائی!“ — سمجھ اللہ نے کہا — ”لوگ فوجیوں کو فوجی ہو قوف کہتے ہیں وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ تم جاپانیوں کو نہیں جانتے۔ تم وہاں جاؤ گے تو جاپانی تمہیں جنگی قیدی بنالیں گے اور پھر تمہیں محنت اور مشقت کا کام دے کر بھوکا ڈالیں گے۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ یہ بڑی فوج ہے کہاں؟ کیا تمہیں وہ جگہ معلوم ہے؟“

”وہ جگہ تو مجھے معلوم نہیں“ — میں نے جواب دیا — ”میں جاپانیوں کے کسی بھی مورچے میں پہنچ گیا تو انہیں بتاؤں گا کہ میں انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے کے لئے آیا ہوں، پھر وہ خود ہی مجھے وہاں تک پہنچا دیں گے۔“

”جہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم اس وقت کہاں ہو“ — سمجھ اللہ نے کہا۔
”جہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جاپانیوں کے مورچے کہاں ہیں۔ وہ یہاں سے بہت دُور ہیں۔ تم بآپادہ، بھوکے پیاسے وہاں تک زندہ پہنچ ہی نہیں سکو گے۔ یہی ایک خطہ جس میں ہم آرام اور سکون سے رہ رہے ہیں۔ یہ خطہ جنگ سے محفوظ ہے۔“
”پھر مجھے آپ ہی کچھ بتائیں“ — میں نے کہا — ”میری ذہنی حالت یہ ہو گئی ہے کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اپنی پلٹن سے نکلے ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ اگر میں ہی جاتا ہوں تو میرا کورٹ مارشل ہو سکتا ہے۔ لڑائی سے بھاگنا ایسا جرم ہے جس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے اور عمر قید تو ضرور ہی دیں گے۔“
”اگر تم میری بات مان لو تو زندہ رہ سکو گے“ — اس نے کہا — ”بات اتنی سی ہے کہ میرے پاس رک جاؤ اور جب جنگ ختم ہو جائے گی تو پھر دیکھیں گے کہ تم واپس واپس رہے یا نہیں رکے رہو۔“

”آپ کے پاس رک کر کیا کروں گا؟“ — میں نے کہا۔
”یہ وہ بات جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں“ — اس نے کہا — ”سب سے پہلے تو تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہئے تھا کہ میں کون ہوں اور میں ان لوگوں میں کس طرح لایا ہوں اور کس طرح ان لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہوں۔“

”میرے پوچھے بغیر ہی آپ بتا دیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہو گا؟“ — میں نے کہا۔
”یہ تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں“ — سمجھ اللہ نے کہا۔
”میں پندرہ سولہ سال سے رنگون میں رہ رہا تھا۔ وہاں میری اپنی دکان تھی جس میں اور توں کا سامان رکھا تھا۔ میری دکان کی چوڑیاں مشہور تھیں۔ اُس کے علاوہ عورتوں کی نئب و آرائش اور بناؤ سنگھار کی اشیاء بھی میری دکان سے ملتی تھیں۔ اب میں جو بات بتانے لگا ہوں اس پر یقین کرنا۔ میری بجائے اگر یہ بات تمہیں ان لوگوں میں سے کوئی مانتا تو زیادہ بہتر تھا۔ میں اپنی زبان سے یہ کہتا اچھا نہیں لگتا کہ میں خدا کا برگزیدہ آدمی ہوں اور خدا نے میرے ہاتھ میں ایسی طاقت دے دی ہے کہ میں سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر سکتا ہوں۔“

”آپ بات کریں“ — میں نے کہا — ”مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ کسی اور کو ایمان میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”بات یہ ہے میرے دوست!“ — اس نے کہا — ”سات ساڑھے سات سال گزر گئے ہیں۔ ایک رات ایک بزرگ صورت، سفید ریش خواب میں نظر آئے۔ ان کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو میں نے کبھی کسی انسان کی آنکھوں میں نہیں دیکھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دو ستارے چمک رہے ہوں۔ چہرے پر ایسا نور جو مجھے خواب میں بھی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خداوند تعالیٰ کا نور ہے۔ ان کی سفید داڑھی میں بھی کوئی ایسا بات تھی کہ مجھ پر طلسماتی سا اثر ہوا۔ داڑھی کیا تھی ریشم کے تار تھے۔ میں عجیب و غریب سے جنگل میں جا رہا تھا کہ وہ میرے راستے میں آئے اور مجھے روک کر پوچھا جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں نے کہا، ”نہیں محترم بزرگ، میں ایک اجنبی صورت کو کیسے جان سکتا ہوں۔“ غیب سے آواز آئی، ”اے خوش قسمت انسان! یہ حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام ہیں۔ میں ایسا مرعوب ہوا کہ ان کے آگے جھک گیا۔ انہوں نے مجھے کندھوں سے قہم کر اٹھایا اور فرمایا، ”خدا کی ذات کے سوا کسی کے آگے نہ جھک۔ ہم نے تمہیں اپنا خلیفہ منتخب کر لیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمام جنتات ہمارے مرید ہیں بلکہ ہمارے قبضے میں ہیں۔ ہم نے چار جنتات تمہارے غلام بنا دیے ہیں۔ تم اب لوگوں کی مشکلیں آسان کیا کرو گے لیکن کسی سے تم ایک دانہ بھی صلے کے طور پر قبول نہیں کرو گے۔۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام غائب ہو گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔“

”آنکھ کھلی تو میرا سارا وجود پسینے سے تر تھا اور میری زبان پر کلمہ طیبہ کا ورد تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں مجھے ایک دیوار پر چھت کے قریب ستارہ چمکتا نظر آیا جس کی کرنیں سیدھی چمکیلی لکیروں کی طرح کمرے میں ہر سانس پر جا رہی تھیں۔ میں فوراً ”اٹھا، جی جلائی“ وضو کیا اور دو رکعت نفل نماز پڑھی۔ اس کے بعد مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ میں نہیں ہوں۔ میرا وجود بدل گیا تھا یا اسی وجود میں جو روح تھی وہ بدل گئی تھی۔“

”گستاخی نہ ہو تو میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں“ — میں نے پوچھا — ”یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ خدا کو آپ کی کون سی نیکی اچھی لگی تھی جس کے صلے میں آپ کو خدا نے یہ بشارت دی تھی؟“

”یہ تو میں نہیں بتا سکتا“ — اس نے جواب دیا — ”خدا کے دل کے عہد کوئی نہیں بتا سکتا۔ میں اپنے متعلق اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ حتی الامکان گناہ نہیں کیا۔ میری

جان میں ایک سے ایک پردہ کر خوبصورت عورت آتی تھی۔ ان میں ہندو بھی ہوتی تھیں، سکھ بھی، عیسائی اور بدھ بھی۔ میری شکل و صورت اور جسم دیکھ لو۔ کیا تم مجھ میں مردانہ حسن اور کشش محسوس نہیں کرتے۔ بعض خوبصورت لڑکیاں مجھ میں ایک تو اس لئے دلچسپی لیتی تھیں کہ میں خوبصورت جوان ہوں اور دوسرے اس لئے کہ میرے پاس اردوں کی بی نیب و زبانش کا سلمان ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے مفت مال کی توقع رکھتی تھیں۔ میں ایسی لڑکیوں کے ساتھ دوستی لگا سکتا تھا لیکن میں نے اپنا دامن پاک رکھا۔ برا خیال ہے کہ یہی ایک وصف تھا جو خدا نے دیکھا اور مجھے یہ بشارت دی۔ اتنی زیادہ ذہنی اور اتنی زیادہ پُرکشش اور حسین اشتعال انگیزی سے بچنا ناممکن ہوتا ہے لیکن میں نے اپنے کردار اور ایمان کو قائم اور مستحکم رکھا۔“

”یہ میں تسلیم کرتا ہوں“ — میں نے کہا — ”اللہ کی دین ہے، جسے چاہے عطا کرے۔“

”تم میری ہر بات نہیں سمجھ سکو گے“ — اس نے کہا — ”حقیقت تو یہ ہے کہ میں خود اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتا جو خواب کے اگلے دن مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ میں بے آپ کے لئے ہی اجنبی ہو گیا تھا۔ میں صاف طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے نزدیک کوئی طاقت آگئی ہے۔ میری دکان میں ایک عورت آیا کرتی تھی۔ مسلمان تھی اور پنجاب کی رہنے والی تھی۔ اُس کی عمر 35 سال تھی اور ابھی تک بے اولاد تھی۔ امیر کبیر خانہ کی بیوی تھی۔ وہ چونکہ میری مستقل گاہک تھی اس لئے اُس کے ساتھ سلام دعا کی مدد تک بے تکلفی ہو گئی تھی۔ میں اس کے متعلق جانتا تھا کہ بے اولاد ہے۔ مجھے جس رات حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام نے اپنا خلیفہ مقرر کیا، اس سے تین چار روز بعد وہ میری دکان میں کچھ چیزیں لینے کے لئے آئی۔۔۔۔۔۔

”میں نے اسے یہ چیزیں دے کر اور پیسے لے کر پوچھا کہ اس نے اپنا ڈاکٹری معائنہ کر لیا ہے کہ نہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کا اپنا بھی اور اس کے خلود کا بھی میڈیکل سٹٹ ہو چکا ہے اور دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ میں کوشش کے بغیر ہی مراقبے میں چلا گیا۔ میں نے سنا تھا کہ مراقبہ کیا ہوتا ہے لیکن مراقبے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ سال اہل کے ریاض کے بعد انسان کو مراقبے کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے لیکن میں نے کوئی کوشش نہ کی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ دنیا سے میرا

پہم کر دیا ہے کہ مایوس اور نامراد انسانوں کا سہارا بنو اور ان کی مشکلات آسان کرو۔ اگر آپ نے اس سے منہ پھیرا تو خدا کی ناراضگی اور لعنت تمہارے ماتھے پر لکھ دی جائے گی اور ہم نے جو چار جنت تمہارے غلام بنائے ہیں، وہ تمہیں جہنم بھی نہیں دیں گے اور رہے بھی نہیں دیں گے..... میں نے اگلے روز عہد کر لیا کہ میرا کاروبار تباہ ہوتا ہے تو بدلے میں خدا کو اور حضرت شاہ سلیمانؑ کو ناراض نہیں کروں گا۔



اگر میں یہ ساری بات سیدنا محمدؐ کی زبان سے سنانے لگا تو کمائی بہت ہی لمبی ہو جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنے سفر پر آگے ذرا جلدی ملے چلوں۔ میں اس کے غلط بات اپنی زبان میں سناؤں گا۔ ایک تو یہ نوٹ کریں کہ اُس کے بولنے کا انداز اپنا تھا کہ مجھے ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہا ہے۔ اس نے اپنی ہی کرامت نہیں سنائی تھی کہ اس کے تعویذ نے ایک بے اولاد عورت کو اولاد دی۔ بلکہ اس نے اپنے کئی اور معجزے بھی سنائے تھے۔ ہر معجزہ نور ہر کرامت سنا کر وہ یہ درمنا تھا کہ یہ معجزہ خداوند تعالیٰ کا تھا جو خدا کی ذات باری نے حضرت شاہ سلیمانؑ کے چار جنت سے کروایا تھا جو اس کی غلامی میں دے دیے گئے تھے۔ اس کی اس..... میں پوری طرح متاثر ہو گیا تھا۔

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ میں کوئی عالم فاضل یا بہت ہی اونچی تعلیم والا آدمی نہیں۔ میں ایک پسماندہ علاقے کے ایک قصبے کا رہنے والا تھا۔ ہمارے علاقے میں پیر پرستی تیز تھی جو اب بھی ہے۔ لوگ ذرا ذرا سی بات پر پیر یا کسی عامل کے پاس جا پہنچتے۔ میں بھی مانتا تھا کہ روحانی عمل پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہے اور انسان کی ہر غلطی آسان ہو جاتی ہے۔ سیدنا محمدؐ نے ایسی بامعنی اور پراثر باتیں کیں کہ میں نے تسلیم کیا کہ یہ شخص روحانی علم کا عامل ہے اور اس کے قبضے میں جنت بھی ہیں۔ مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ یہ برگزیدہ شخصیت مجھے ایسے وقت مل گئی ہے کہ جب میں مارا مارا پھر اٹھ میں زمین پر تھانہ آسان پر۔ یہ شخص میری مدد کر سکتا تھا۔

رنگون میں اس کے اپنے بیان کے مطابق 'اسے بہت ہی شہرت ملی' یہاں تک کہ اس کے باقاعدہ مرید بن گئے۔ وہ اپنی شہرت کے عروج پر تھا جب رنگون سے غیر ملانے بھاگنا شروع کر دیا۔ یہ میں پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ وہاں ہے لوگ

تعلق کٹ گیا ہے اور میں ہوں اور یہ عورت ہے۔ مجھے اشارے سے ملے اور اس کے بعد میں اس دنیا میں واپس آگیا اور مجھے پتہ چلنے لگا کہ میں دکان میں ہوں اور یہ بازار ہے اور یہ عورت میری گاہک ہے.....

"میں نے اس عورت سے کہا کہ ایک سال بعد وہ بچے کو جنم دے گی۔ وہ مسکرائی اور بولی، آپ کی تسلی کا بہت شکریہ، دعا کریں۔ مجھے جو اشارہ ملا تھا وہ میں نے کھنڈ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر منتقل کر دیا۔ یہ خانے سے تھے اور معلوم نہیں وہ کیا طاقت تھی جو مجھ سے ہر خانے میں ایک حرف اور کسی خانے میں ایک لفظ لکھائی گئی۔ یہ ایک تعویذ یا نقش بن گیا۔ میں نے اس عورت سے کہا کہ یہ نقش ایک بوتل میں ڈال لے اور بوتل میں کم از کم ایک پیالی پانی ڈال لے۔ پھر ہر روز صبح نہار منہ بسم اللہ پڑھ کر صرف صرف ایک گھونٹ پانی اس بوتل میں سے ہر روز پیئے۔ وہ مجھ سے یہ کھنڈ لے گئی لیکن اُس کے چہرے سے بددلی اور مایوسی ٹپکتی تھی.....

"وہ تقریباً" ایک مہینے بعد آئی۔ اب اس کے چہرے پر حیرت تھی۔ اس نے کہا کہ اس میں ماں بننے کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ آتی رہی اور پھر اس کے جسم کو دیکھ کر ہی پتہ چل جاتا تھا کہ یہ ماں بننے والی ہے۔ وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی.....

"اس ایک سال کے دوران میں میں نے کچھ اور لوگوں کی مرادیں بھی پوری کیں اور بعض کی مشکلات آسان کر دیں۔ میں کسی سائل سے کچھ بھی نہیں لیتا تھا۔ میرے ذہن میں صرف خدا کی خوشنودی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں میری شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی۔ اتنے زیادہ سائل میرے پاس آنے لگے کہ میں ہر کسی کو وقت دے ہی نہیں سکتا تھا۔ میں دکان سے توجہ نہیں دیتا تھا۔ لوگوں سے کہا کہ وہ شام کے بعد میرے گھر آجایا کریں.....

"میں اس کام سے تنگ بھی آگیا۔ میں اپنا کاروبار نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میرے ماں باپ اور دو بہنیں پیچھے پنجاب میں تھیں۔ میں اپنی کمائی کا زیادہ حصہ انہیں باقاعدگی سے بھیجتا رہتا تھا۔ ایک بار ارادہ کر لیا کہ اپنا کاروبار نہ چھوڑوں جو مجھے روزی دے رہا ہے، یہ دوسرا کام یعنی روحانیت چھوڑ دوں۔ رات کو حضرت شاہ سلیمانؑ پھر خواب میں آئے اور بولے، کیا تمہیں ہماری خلافت اچھی نہیں لگتی؟ یاد رکھو تمہیں میرا خلیفہ خدا نے بنایا ہے، میں نے نہیں۔ خدا نے تمہارے ذہن

یہ میں نے خاص طور پر دیکھا تھا کہ جب زخمی لڑکی کے گرد بستی والوں کا جھوم اکٹھا ہوا تھا تو اس میں لڑکیوں اور جوان عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہی کو جلیانیوں سے چلنے کے لئے ان لوگوں نے اتنا لمبا سفر کیا تھا۔

یہاں میں آپ کی معلومات میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو جو یہ سنایا ہے کہ جلیانی متوجہ علاقوں میں سے جوان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے، ان لڑکیوں کو COMFORT GIRLS کہتے تھے۔ یہ اصطلاح جلیانی زبان کی تھی جو میں نے جانتا تھا، اس کا انگریزی میں ترجمہ یہی کیا گیا تھا۔ گذشتہ سال یعنی 1994ء کی آخری سہ ماہی میں میں نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ کچھ ملکوں نے اقوام متحدہ میں یہ زور دیا کہ جلیانی فوج نے جنگ کے دوران کوریا، جاوا، سماٹرا، بورنیو، سنگاپور، فلپائن، لیبیا اور برما وغیرہ کی ہزار ہا لڑکیوں کو اپنے قبضے میں لے کر اپنے ساتھ مورچوں میں رکھا تھا۔ لہذا جلیان اب اقوام متحدہ میں معافی مانگے اور ان ملکوں کو معاوضہ ادا کرے جن لوگوں کی لڑکیاں اس کی فوج نے اپنے قبضے میں لی تھیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ان میں زیادہ لڑکیاں کوریا کی تھیں اور اس کے بعد ان جزائر کی تھیں جو آج انڈونیشیا اور ملائیشیا ملاتے ہیں۔ جلیان نے معافی مانگنے اور معاوضہ دینے سے گریز کیا ہے لیکن یہ اعتراف ہی کیا ہے کہ نصف صدی پہلے اس کی فوج نے یہ زیادتی کی تھی جس کا حکومت جاپان کو در آج کے ہر جلیانی کو افسوس ہے۔

○

آئیے میں آپ کو آدھی صدی پہچھے برما کے جنگلوں میں ایک بار پھر لے جاتا ہوں جہاں لوگوں نے ایک بستی آباد کر لی تھی۔ میں ان تفصیلات کو نظر انداز کروں گا کہ یہ لوگ یہاں کس طرح آباد ہوئے، کس طرح ان لوگوں نے بانسوں کے جھونپڑوں کے ساتھ ساتھ پتھروں اور گارے کی جھونپڑیاں بھی بنالی تھیں اور ان لوگوں کو کھانے پینے کے لئے کہاں سے ملتا تھا۔ کچھ موٹی موٹی اور اہم باتیں بتا دیتا ہوں۔ وہاں سے غالباً ہمیں میل دور ایک قصبہ تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا، کچھ الٹا سا برمی زبان کا لفظ تھا۔ کچھ لوگ وہاں جاتے اور ضرورت کی اشیاء لے آتے تھے۔

ان کے پاس کوئی کرنسی نہیں تھی۔ جن پہاڑیوں کے بیچ یہ بستی گھری ہوئی تھی ان پہاڑیوں کے پیچھے چاول کے کھیت تھے۔ یہ لوگ چاول کاشت کرتے تھے اور جب فصل

جلیانیوں کے ڈر سے بلکہ برمیوں کے ڈر سے بھی بھاگ اٹھے تھے۔

برمیوں میں مسیح اللہ کے جو مرید تھے، ان میں ہر مذہب کے لوگ تھے مسلمان، ہندو، عیسائی ذرا کم تھے اور بدھ مت کے پیروکار برمی بھی تھے۔ ان میں اکثریت مسلمان کی تھی۔ یہ لوگ مسیح اللہ کو وہاں سے نہیں آنے دے رہے تھے۔ وہ اسے کہتے تھے کہ اسے رنگوں میں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ وہ سب کا پیر و مرشد اور مشکل کشا ہے۔

مسیح اللہ وہیں رکا رہا لیکن جلیانیوں کے متعلق کچھ اور خبریں بھی رنگوں پہنچ گئیں۔ ایک خبر کسی کے لئے بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ یہ کہ جلیانی جس علاقے پر قبضہ کر لیتے تھے، اس علاقے میں انہیں جہاں کہیں بھی کوئی خوبصورت اور جوان لڑکی نظر آئی، اسے اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور ان لڑکیوں کو وہ اپنے ساتھ مورچوں میں رکھتے تھے۔ میں نے سنایا ہے کہ برمیوں نے جلیانی فوجوں کے لئے جاسوسی بھی کی تھی اور جلیانیوں کا استقبال کیا تھا لیکن جلیانی فوج ابھی رنگوں تک نہیں پہنچی تھی جب یہ خبر پہنچ گئی کہ لڑکیوں کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ اس خبر نے کئی برمیوں کو پریشان کر دیا لیکن بھاگ کر جاتے کہاں۔ مسیح اللہ کے مریدوں نے اس سے پوچھا کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ مسیح اللہ نے مجھے یہ بات سناتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ جان کا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ وہاں سے نکلنا ہی بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے مراقبے میں جا کر اپنے غلام جنات سے پوچھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اسے حضرت شاہ سلیمانؒ کی طرف سے اشارہ ملا کہ کئی ایک نبیوں اور پیغمبروں نے بھی ہجرت کی تھی، بہتر ہے کہ مسیح اللہ بھی ہجرت کر جائے اور اس کے جتنے پیروکار اس کے ساتھ جانا چاہیں ساتھ لے جائے۔

جن برمیوں کے گھروں میں نوجوان لڑکیاں تھیں اور جو عزت دار برمی تھے، وہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے مسیح اللہ سے رہنمائی لی تو مسیح اللہ نے انہیں بتایا کہ اسے ہجرت کا اشارہ مل گیا ہے۔ اس طرح مسیح اللہ کم دیش ملت سوانہ کے ساتھ رنگوں سے نکل آیا۔

یہ ایک قافلہ تھا جس میں کچھ گھوڑے اور فخریں بھی تھیں۔ ان لوگوں نے مسلمان گھوڑوں اور فخریوں پر لادا، کچھ خود اٹھایا اور بہت ہی دنوں کی مسافت کے بعد یہاں پہنچ گئے۔ یہ دراصل ماہی گیروں کی بستی تھی۔ کچھ اور پیشوں کے لوگ بھی یہاں رہتے تھے لیکن جنگ کی خبریں پہنچیں تو بہت سے لوگ اس بستی سے بھاگ گئے۔

تیار ہو جاتی اور ان کے پاس چاول اکٹھے ہو جاتے تو تمام چاول اس قصبے میں لے جا کر ڈالتے اور اپنی ضرورت کی اشیاء لے آتے تھے۔ دو تین روز بعد جب مجھے کچھ راز باتیں معلوم ہوئیں تو یہ بھی پتہ چلا کہ ان میں چند ایک آدمی ذہنی اور چوری کے ماہر تھے۔ وہ بھی مسیح اللہ کے مریدوں میں سے تھے۔ کبھی کبھار وہ کئی کئی دنوں کے لئے ہر سے غائب ہو جاتے تھے اور جب واپس آتے تو ٹوٹ مار کا سارا سامان اور رقیں مسیح کے جھونپڑے میں حاضر کر دیتے تھے۔ مسیح اللہ اس رقم سے ضرورت کی اشیاء منگوا اور بستی کے ہر گھر کی ضرورت پوری کرتا تھا۔

ہو سکتا ہے میری یہ کہانی پڑھنے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اس شک انظار کریں کہ یہ افسانوی دنیا کی بستی ہوگی۔ میں ایسے حضرات کو بتا دیتا ہوں کہ اُس وقت اس خطے میں کسی کی حکومت نہیں تھی اور نہ کوئی قانون چلتا تھا۔ پہلے وہاں انگریزوں بادشاہی تھی۔ ہر علاقے کا ایک تھانہ تھا اور کہیں پولیس کی چوکی تھی۔ اس طرح یہ علاقہ تانوں کے تحت آتا تھا لیکن جاپان کی فوج اور اس کے بمبار ہوائی جہاز طوفان طرح آئے اور انگریز پسا ہو گئے۔ لڑائی کہیں اور لڑی جا رہی تھی لیکن جن علاقوں جنگ کا نام و نشان نہیں تھا وہاں بھی کسی کا قانون نہیں چلتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں نے شک رفع کر دیا ہے۔ میں اس کو شش میں ہوں کہ یہ داستان ان چھوٹی چھوٹی تفصیلات اور وضاحتوں میں لمبی نہ ہو۔ میں کچھ اور قسم واقعات سناتا چاہتا ہوں۔

مسیح اللہ میرے ساتھ جو باتیں کر رہا تھا وہ ویسی ہی تھیں جو آج کل کے عامل عملیات وغیرہ کرنے والے شاہ جی وغیرہ کیا کرتے ہیں اور میں اسے پہنچ والا آدمی سمجھتا تھا۔ لوگ تو پہلے ہی اس سے متاثر تھے اور اس کے مرید ہو گئے تھے۔ لوگ اپنی بیٹیاں اور دیگر عورتوں کو بخیر و خوبی رنگون سے اور ارد گرد کے دیہات سے نکال لائے تو انہوں نے یہ مان لیا کہ یہ یا حضرت مسیح اللہ کی برکت کا نتیجہ ہے۔ ان لوگوں کو تو موت بھوک نظر آ رہی تھی اور یہ بھی کہ ان کی لڑکیاں جاپانیوں کے ہاتھ چڑھ جائیں گی انہیں اچھی خاصی بستی مل گئی اور وہ زندگی کے راستے پر رواں ہو گئے۔

مسیح اللہ کی باتوں سے مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ان لوگوں کا بے تاج بادشاہ ہے۔ ان لوگوں کو اپنی مٹھی میں لے کر متحد رکھا اور بستی کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔

تم کا دلچسپ پیدا کر دیا۔

”میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ میرے ساتھ رہو۔“ مسیح اللہ نے کہا۔ ”میں نہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں رکھنا چاہتا ہوں۔ تم نے اگر نہیں دیکھا تو کچھ دن رہ کر دیکھ لو کہ یہ لوگ میری عبادت کرتے ہیں۔ میری شہرت ان میں دیکھا تو کچھ چلی گئی ہے۔ مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو میرا دایاں ہاتھ بن سکے اور میرے لئے قابل اعتماد ہو۔ تم سے بہتر اور کوئی ساتھی نہیں ہو سکتا۔“

”آپ کے ساتھ رہ کر میری حیثیت کیا ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا میں آپ کا ہڈی گاڑ دوں گا یا کوئی اور ڈیوٹی ہوگی۔“

”میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے تم اپنی آنکھوں دیکھ لیتا کہ تم میری اس بادشاہی سے متاثر ہوتے ہو یا نہیں پھر تم خود ہی کو گے کہ تم میری فلاں ڈیوٹی سنبھال لو گے۔ اگر تم میرے ہڈی گاڑ بیٹے ہو تو میں تمہیں ملازم باجوہ کار نہیں سمجھوں گا۔ تم نے پوچھا ہے کہ یہاں تمہاری حیثیت کیا ہوگی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہاں تمہاری حیثیت مجھ جیسی ہی ہوگی اور لوگ تمہاری منت بہت کر کے مجھ تک پہنچا کریں گے۔ میں صرف آج کی بات نہیں کر رہا۔ میں اُس وقت کو نظروں میں رکھے ہوئے ہوں جب جنگ ختم ہو جائے گی اور ہم واپس رنگون یا کی اور شہر چلے جائیں گے۔ یہ لوگ ہمارے ساتھ ہوں گے اور یہی لوگ مجھے دُور دُور تک مشورہ کر دیں گے پھر تم دیکھنا کہ تمہارے لئے جنت اسی دنیا میں بن جاتی ہے یا نہیں۔“

”میں ایک بات پوچھنے کی جرات کرتا ہوں۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا واقعی آپ کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے اور کیا میں مان لوں کہ حضرت شاہ سلیمان نے چار جنت کو آپ کا غلام بنا دیا ہے۔“

”کیا تم پانی پینا چاہو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں اُس وقت پیاس محسوس کر رہا تھا لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ بیتاب ہو جاتا۔ اس لئے مجھ سے پوچھا کہ میں پانی پینا چاہوں گا تو میں نے اپنے آپ میں حیرت محسوس کی کہ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں پانی پینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا کہ میں پانی پیوں گا۔“

اس نے اپنا خلی ہاتھ آگے کیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے ہاتھ میں بیڑے کا گلاس تھا جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور حیرت زدگی کے عالم میں پانی پی لیا۔ اس نے ہاتھ لبا کر کے میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور بولا — ”گلاس لے جاؤ اوئے“ — اس نے گلاس ہوا میں اچھالا تو گلاس غائب ہو گیا۔ ”تم کچھ منہ سے نکالو“ — اس نے کہا — ”میرے غلام جنت وہ چیز حاضر کر دو گے لیکن میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا کہ تمہاری ہر خواہش جنت پوری کر دیں۔ میں خود بھی ایسا نہیں کیا کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے خدا نے ان مظلوم لوگوں کی خدمت کے لئے حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام کا خلیفہ بنایا ہے۔ میں ایک بات تمہیں بے تکلفی سے بتا دیتا ہوں۔ تم اس بستی کی جس نوجوان یا بڑی عمر یا کسی بھی عمر کی عورت کو بلاؤ گے تو وہ تمہارے پاس آجائے گی پھر تمہیں یہ سہولت بھی ملے گی کہ جس طرح بے لوگ میرا کھانا الگ تیار کرتے ہیں اسی طرح تمہیں بھی خاص قسم کا کھانا ملا کرے گا۔ کبھی یہ لوگ میرے لئے پرندے مار کر یا جال میں پھنسا کر لے آتے اور پکا کر مجھے کھلاتے ہیں۔ پھلی کی تو یہاں کوئی کمی نہیں۔“

میں اس کے گلاس اور پانی والے کرشمے سے تو بہت ہی متاثر ہوا اور دل ہی دل میں اس کا مرید بن گیا۔ میرے ذہن میں فوراً ”واجبہ آگئی اور اس کے ساتھ ہی آصف بھی آیا۔ آگیا۔ میں نے سوچا کہ سمیع اللہ سے کہوں گا کہ وہ مجھے واجبہ و لاوے خواہ وہ آصف سے طلاق لے لے یا آصف اس دنیا سے ہی اٹھ جائے۔ پہلے تو ارادہ کیا کہ ابھی اس کے آگے اپنی یہ خواہش رکھ دوں لیکن اس نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں کہ میں خاموش رہا اور سوچا کہ اس کے ساتھ پوری طرح بے تکلفی پیدا ہو جائے تو میں اسے اپنی یہ خواہش بتاؤں گا۔

”میں آپ کے پاس رک جاؤں گا“ — میں نے کہا — ”آپ میرے ذمے کو کام اور جو فرض لگائیں گے وہ انشاء اللہ میں پورا کروں گا۔“

”کل تمہیں ایک الگ جھونپڑا مل جائے گا“ — اس نے کہا — ”میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ ان لوگوں میں گھومو پھرو لیکن اپنی سطح سے نیچے نہ آنا۔ میں تمہارے متعلق ان لوگوں کو یہ بتاؤں گا کہ تم میرے خلیفہ ہو۔“

”آپ مجھے ہر قسم کی صورت حال میں قابل اعتماد پائیں گے“ — میں نے کہا۔

مجھے صرف یہ بتادیں کہ یہاں کیا نہیں کرنا چاہئے اور کس قسم کی احتیاط کی ضرورت ہے۔“

”میں تمہیں کچھ ضروری باتیں ذرا بعد میں بتانا چاہتا تھا“ — سمیع اللہ نے کہا۔ لیکن مجھے خیال آیا ہے کہ ایک انتہائی ضروری بات ابھی بتا دوں۔ وہ یہ ہے کہ اس بستی میں دو تین آدمی میرے خلاف ہیں۔ ظاہری طور پر وہ میری وفاداری کرتے ہیں اندر سے وہ مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔“

”کوئی خاص وجہ؟“ — میں نے پوچھا۔

”وجہ صاف ہے“ — اس نے جواب دیا — ”میں مسلمان ہوں اور بڑا پکا مسلمان ہوں۔ اس بستی میں زیادہ تر لوگ مسلمان ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور بدھ بھی۔ میرے جو مخالفین ہیں وہ بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ میرے جاسوسوں نے مجھے بتایا ہے کہ ان لوگوں کو شک ہے کہ میں ہر کسی کو مسلمان بنانا چاہتا ہوں۔ یہ ہے بھی صحیح بات۔ میں نے خود کسی غیر مسلم کو نہیں کہا کہ وہ اسلام قبول کر لے لیکن یہاں سات آٹھ غیر مسلم میرے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکے ہیں۔ یہ ہے وجہ میری مخالفت کی۔ یہ تین چار آدمی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں چاہوں تو انہیں غائب کروا سکتا ہوں لیکن میں ایسا کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں ایک اور بات بھی بتا دوں تو بہتر ہو گا۔ تم نے جس لڑکی کو اڑوہا کے منہ سے نکالا ہے، میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ لڑکی مان نہیں رہی۔ اس کا باپ میرے پاس آتا ہے تو ایسی باتیں کرتا ہے کہ جیسے وہ مجھے اپنی بیٹی دے دے گا لیکن پتہ چلا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہے اور اپنی بیٹی مجھے نہیں دینا چاہتا۔ میں نے باپ بیٹی سے کہا تھا کہ یہ خدائی اشارہ ہے کہ میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کروں ورنہ میری اپنی ایسی کوئی خواہش نہیں، اگر انہوں نے انکار کیا تو میں بتا نہیں سکتا کہ ان پر کیسی آفت آپڑے گی۔ وہ آفت آج پڑی ہے جو ان سب لوگوں نے دیکھ لی ہے۔ تم نے اس لڑکی کو موت کے منہ سے جو نکالا ہے یہ تمہارا اپنا فعل نہیں تھا۔ تمہیں خدا نے اس طرف بھیج دیا تھا تاکہ تم اس لڑکی کو موت کے منہ سے نکالو اور یہ خدا کی ایک وارننگ تھی کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار نہ کرے ورنہ نتیجہ بڑا بھیاںک ہو گا۔“

”کیا آپ ان تین چار آدمیوں سے کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں؟“ — میں نے

پوچھا۔

”مجھے ان سے جان کا تو کوئی خطرہ نہیں“ — سمیع اللہ نے جواب دیا — ”خطرہ ہے کہ یہ لوگ غیر مسلموں کو میرے خلاف کر دیں گے۔ میری مخالفت کا مطلب اس کی مخالفت ہے۔“

”مجھے ایک بات بتادیں“ — میں نے پوچھا — ”ان لوگوں کے ساتھ میرا سلوک کیسا ہونا چاہئے؟“

”تم ان کی باتیں سنتے رہنا“ — سمیع اللہ نے کہا — ”اگر یہ کوئی خطرناک بار کریں تو مجھے بتانا پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کیا کرنا ہے۔“

اس مسئلے پر ہم دونوں کے درمیان کچھ اور باتیں ہوئیں۔ اس نے مجھے دوسرے کمرے میں لے جا کر کہا کہ اب سو جاؤ، باقی باتیں کل ہوں گی۔

○

میں اگلی صبح جاگا تو سمیع اللہ کے کمرے میں چلا گیا۔ ہم کچھ کھانسی چکے تو اس نے مجھے کہا کہ میں بستی میں گھوم پھر آؤں اور دریا تک بھی چلا جاؤں۔

میں بستی میں گھومنے پھرنے لگا۔ لوگ مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ نہ وہ میری زبان سمجھتے تھے نہ میں ان کی سمجھتا تھا۔ بعض مجھے دیکھ کر مسکرائے اور ہنسنے لگے جھک کر سلام کیا۔ میں نے دیکھا کہ بستی میں زیادہ تعداد جوان لڑکیوں کی تھی۔ بڑا ک عورتوں کے نقش و نگار اور جسم کی جلد ایسی ہوتی ہے کہ عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بہت دیر بعد بوڑھی ہوتی ہیں یا یوں کہہ لیں کہ بہت دیر بعد پتہ چلتا ہے کہ اس عورت کی جوانی ڈھل چکی ہے۔ ان کے رنگ بڑے صاف ہوتے ہیں۔ پیلاہٹ تو ہوتی ہے لیکن سفیدی مائل جس سے ان کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجھے خوشی سی محسوس ہو رہی تھی کہ یہ لڑکیاں چلائیں گے وحشی پن سے بچ کر بڑی اچھی پنہا میں بن جائیں گی۔ میں جھونپڑوں کی دوسری طرف چلا گیا۔ علاقہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ تھوڑی ہی دور اونچی ٹیکریاں تھیں جنہیں پہاڑیاں کہہ لیں۔ ان پر سبزہ خاصا زیادہ تھا اور درختوں کی بھی بہتات تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کئی ایک عورتیں جھونپڑوں سے نکل آئی تھیں اور ایک جگہ رک کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ مجھے بہت بہادر سمجھ رہی تھیں جس نے ایک اڑدھا کے منہ سے ایک لڑکی کو نکال لیا تھا۔

میرے جی میں آئی کہ اس قدر قی تالاب کی طرف چلوں جس میں میں نے اڑدھا کو لڑا تھا۔ میں جھونپڑوں کے باہر یا ہر سے اُس طرف چل پڑا۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو مجھے کل اس وقت ملا تھا جب میں اس لڑکی کو بستی میں لارہا تھا۔ یہ آدمی ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتا تھا۔ وہ لفظوں کو جوڑ جاڑ کر اپنی بات واضح کر لیتا تھا اور اُردو بڑی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔

اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور میرا حال احوال پوچھا۔ اس نے یہ بھی پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کہیں بھی نہیں جا رہا اور اب میں ان کے ساتھ ہی رہوں گا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ یا حضرت نے مجھے حکم دے کر روک لیا ہے۔

”اس لڑکی کا کیا حال ہے؟“ — میں نے پوچھا۔

”زخم اتنا گہرا نہیں“ — اس نے اپنی شکستہ سی اُردو میں جواب دیا — ”وہ اتنی زیادہ زخمی ہوئی ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھبرا کر بچوں کی طرح رونے لگ جاتی ہے اور اپنی ماں کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتی ہے۔ ماں اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیتی ہے تو اسے کچھ سکون آ جاتا ہے۔“

میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے اس کے گھر لے چلے۔ وہ میرے ساتھ چل پڑا اور ہم تھوڑی ہی دور ایک جھونپڑے کے دروازے پر جا کر کے۔ وہ آدمی اندر گیا اور فوراً ہی واپس آکر اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

میں نے اندر کمرے میں جا کر دیکھا۔ لڑکی فرش پر بچھے ہوئے بستر پر لیٹی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس کا باپ اور اس کی ماں ہاتھ جوڑ کر میرے آگے کھڑے ہو گئے۔ وہ اکٹھے ہی بول رہے تھے اور بار بار اپنے جڑے ہوئے ہاتھ اپنی پیشانی پر لگاتے اور میری طرف دیکھتے تھے۔ میں نے اس آدمی کی طرف دیکھا جس کے ساتھ میں وہاں گیا تھا۔

”آپ کا شکریہ ادا کر رہے ہیں“ — اس نے کہا — ”یہ کہتے ہیں کہ آپ دیوتا ہیں۔ کوئی انسان تو اڑدھا کو نہیں مار سکتا اور اس کے منہ سے اس کا شکار تو کوئی چھین ہی نہیں سکتا۔“

میں نے اسے کہا کہ انہیں سمجھاؤ کہ میں نے ایک انسانی فرض ادا کیا ہے۔ یہ میرے آگے جھک جھک کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ اس نے اپنی زبان میں انہیں کچھ کہا اور میں

لڑکی کے پاس اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ لڑکی اس طرح ذرا پرے سرک گئی جیسے میں آہن کی حلقوں ہوں۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں اسے اس کی زبان میں تسلی نہیں دے سکتا تھا۔

”اس لڑکی کو ایک بات سمجھا دو“ — میں نے اس آدمی سے کہا — ”اے کوکو میں اسی کی طرح کا ایک انسان ہوں اور جس طرح میں اڑدھا سے نہیں ڈرتا تھا اسی طرح یہ بھی نہ ڈرے۔ اسے یہ بھی بتاؤ کہ اسے خوش ہونا چاہئے کہ اس کی عمر بہت لمبی ہے اور اسے یہ بھی سمجھاؤ کہ اڑدھا کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی کہ جس سے ڈرا جائے۔“

اس آدمی نے اسے اس کی زبان میں سمجھایا۔ لڑکی میرے چہرے پر اس طرح نظریں گاڑے ہوئے تھی جیسے اس نے اس آدمی کی بات سنی ہی نہ ہو۔ میں نے اس وقت لڑکی کے چہرے کو اچھی طرح دیکھا۔ ایک تو اس کی عمر پندرہ سولہ سال تھی، اس کے علاوہ اس کے چہرے کے نقوش بہت ہی اچھے تھے اور رنگ سفیدی مائل تھا۔ وہ تو بہت ہی خوبصورت اور جاذب نظر لڑکی تھی۔ کبھی اس کی نظریں میرے سارے جسم پر گھومنے لگتیں اور پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر رک جاتیں۔ برمیوں کے قد چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس لڑکی کا بھی قد چھوٹا تھا اور وہ معصوم سی بچی لگتی تھی۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھی، بولتی کچھ نہیں تھی۔

مجھے مسیح اللہ کی رات والی بات یاد آگئی کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور لڑکی نہیں مانتی۔ یہ خیال آتے ہی میری نظروں کے سامنے مسیح اللہ آگیا۔ اس کی عمر چالیس سال سے میرا خیال ہے کہ تین چار سال کم تھی۔ وہ اس لڑکی سے دگنی عمر کا تھا۔ مسیح اللہ برگزیدہ شخصیت ہو سکتا تھا، یہ بھی میں نے مان لیا تھا کہ چار جنات اس کے غلام ہیں لیکن میرا دل یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ یہ لڑکی اس کے ساتھ بیاباں جائے۔

میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ ان لوگوں کا مذہب کیا ہے۔ اس نے بدھ مت بتایا۔ یہ آدمی بھی بدھ تھا اور لڑکی کا خاندان بھی بدھ تھا۔

میں نے دیکھا کہ لڑکی کے ماں باپ پھر ہاتھ جوڑ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ انہیں منع کر دو کہ اس طرح نہ کریں۔ میں نے اسے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان جب کسی کے ساتھ کوئی نیکی کرتا ہے تو اس سے کوئی صلہ یا اس قسم کی خوشامد قبول نہیں کیا کرتا بلکہ اسے ہمارے مذہب میں گناہ سمجھا جاتا ہے۔

”یہ پوچھ رہے ہیں کہ آپ کی کیا خدمت کی جائے؟“ — اس آدمی نے کہا۔
”میں منع کرو میرے بھائی!“ — میں نے کہا — ”مجھے پریشان نہ کریں“ —
میں جانے کے لئے اٹھا تو لڑکی نے اس آدمی سے کوئی بات کی۔ یہ پہلی بات تھی جو اس لڑکی کے منہ سے نکلی تھی۔

”یہ کہتی ہے کہ آپ پھر بھی ہمارے گھر ضرور آئیں“ — اس آدمی نے کہا —
”میں نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کو دیکھ کر اس کے دل سے اڑدھا کا خوف نکل گیا ہے۔“
میں نے اس آدمی سے کہا کہ میں اسے دیکھنے پھر بھی آؤں گا۔ پھر میں نے اس آدمی کو ساتھ لیا اور ہم جھونپڑے سے نکل آئے۔



ہم دونوں ٹہلتے ٹہلتے اس تالاب تک پہنچ گئے جہاں سے میں نے اس لڑکی کو موت کے منہ سے نکالا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اڑدھا کی دم ایک فٹ یا ڈیڑھ فٹ پانی سے باہر تھی۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اڑدھا مرا ہوا تھا۔ اس کی تھوڑی سی دم باہر تھی اور باقی جسم پانی میں تھا۔ میں نے اس کی دم پکڑی اور باہر کھینچنے لگا۔ وہ اتنا وزنی تھا کہ مجھے اکیلے نے کھینچنا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ بھی دم پکڑ کر کھینچے۔ وہ ڈرتے ڈرتے آگے آیا اور اڑدھا کی دم پکڑ لی۔ ہم دونوں نے زور لگا لگا کر اسے باہر نکال لیا۔ اس کے سر سے نیچے میری گولیوں کے بنائے ہوئے سوراخ تھے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار اڑدھا دیکھا تھا۔ ایسے اڑدھا کا اس جنگل میں ہونا کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ اڑدھا دراصل سانپ ہی ہوتا ہے لیکن بہت بڑا۔ اس مرے ہوئے اڑدھا کی لمبائی پندرہ اور بیس فٹ کے درمیان تھی۔ اس کی موٹائی ایک فٹ کے قریب تھی۔

اڑدھا بہت بڑا سانپ ہی ہوتا ہے لیکن اس میں زہر نہیں ہوتا۔ اپنے شکار کو کاٹ سکتا ہے لیکن زہر نہ ہونے کی وجہ سے اس کے کاٹنے کا اثر چھوٹے سانپوں جیسا نہیں ہوتا۔ اسے انگریزی میں Python کہتے ہیں اور اسے Boa Constrictor بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اپنے شکار کو نکل لیتا ہے۔ یہ باتیں مجھے بہت عرصہ بعد معلوم ہوئی تھیں۔ یہ اپنے شکار کو سالم لٹاتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جس جانور کو پکڑتا ہے سب سے پہلے اس کا سر اور منہ اپنے منہ میں لیتا ہے تاکہ شکار دم کھنسنے سے وہ مر جائے۔ میں نے

بہت عرصہ بعد ایک انگریزی رسالے میں پڑھا تھا اور پھر کچھ لوگوں سے پوچھا بھی تو اڑدھا بکرے کو، ہرن کو اور خنزیر کو بھی پکڑ لیتا ہے۔ یہ شکار کو نگل لیتا ہے چبانا نہیں ہی چبا سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ شکار کو نگل لیتا ہے۔ اس کی موٹائی نو سے بارہ انچ تک ہوتی ہے۔ اس سے کم بھی ہوتی ہے لیکن سالم انسان کو بکرے، ہرن اور خنزیر جیسے موٹے جانور کو نگل لیتا ہے اور جانور کے جسم کے مطابق اس کا جسم پھولتا جاتا ہے اور شکار اس کے پیٹ میں پہنچ جاتا ہے۔

پیٹ میں جب اتنا بڑا جانور جاتا ہے تو وہاں سے اس کی موٹائی اس جانور جتنی ہو جاتی ہے۔ ایک عجیب چیز بتائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر وہ ہرن یا سینگوں والے بکرے کو نگل لے تو سینگ اس کے جسم سے باہر نکل آتے ہیں اور اڑدھا کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتا وہ اپنی جگہ پر جہاں وہ رہتا ہے، جا کر سو جاتا ہے۔ عام طور پر ایک اڑدھا ایک مینے سے لے کر تین مینے تک سویا رہتا ہے۔ وہ اس وقت جاگتا ہے جب شکار اُس کے پیٹ میں ہضم ہو جاتا ہے اور اس کا جسم نارمل ہو جاتا ہے۔

اڑدھا کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم کے اڑدھا خشکی پر ہی رہتے ہیں۔ ایک قسم ایسی ہے جو کچھ وقت خشکی پر گزارتے ہیں، زیادہ تر ایسے اڑدھا پانی میں رہتے ہیں۔ پانی میں ہوں تو پھیلیوں اور کچھوں وغیرہ کو نگل لیتے ہیں۔ اگر انہیں خشکی پر یعنی پانی کے کنارے شکار نظر آجائے تو پانی سے سر نکال کر شکار پکڑ لیتے اور پانی میں گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ میں نے ایک تو یہ اڑدھا دیکھا تھا جو میری راکٹل سے مرا تھا اور دوسرا لاہور، چڑیا گھر میں دیکھا تھا۔ ستمبر 1965ء کی جنگ ختم ہوئی اور اعلانِ تاشقند کے بعد 1966ء میں فوجیں واپس بارکوں میں آئیں تو میں لاہور گیا تھا اور وہاں کا سارا امیدارن جنگ گھو پھر کر دیکھا تھا۔ لگے ہاتھوں چڑیا گھر بھی چلا گیا اور وہاں ایسا ہی اڑدھا دیکھا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کی خوراک ایک خرگوش روزانہ تھی۔ اس کے بچرے میں خرگوش چھوڑ دیتے تھے اور اڑدھا اسے پکڑ کر نگل لیتا تھا۔

میں اپنے ساتھی کے ساتھ دریا تک چلا گیا۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھا۔ ”میرا نام بودانگ ہے“۔ اُس نے کہا۔ ”آپ مجھے وانگ کہہ لیا کریں۔“

”اور اُس لڑکی کا نام کیا ہے؟“

”وی تان“۔ اس نے جواب دیا۔ ”ہم سب اسے تانی کہا کرتے ہیں۔“

”تانی یا حضرت تانی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں“۔ میں نے کہا۔ اُس نے چونک کر میرے منہ کی طرف دیکھا اور میں نے صاف نوٹ کیا کہ اس کے ہرے کارنگ بدل گیا تھا۔

”تمہیں شاید معلوم نہیں“۔ میں نے کہا۔ ”یہ بات پوچھنے سے میرا کوئی نہیں مطلب نہیں۔ میں ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔“

اب اس نے سر جھکا لیا اور خاموش رہا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“۔ میں نے پوچھا۔

اُس نے سر اٹھایا اور پھر میرے منہ پر نظرس جمالیں۔ مجھے کچھ شک سا ہوا۔ اس آدمی کی خاموشی بلاوجہ اور بے معنی نہیں تھی۔ میں اس کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ مجھے بتائے کہ وہ اتنا پریشان اور چُپ کیوں ہو گیا ہے۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے“۔ وانگ نے کہا۔ ”یا حضرت تانی کو اپنی بیوی بنانا چاہتے ہیں۔“

”لیکن تم تو بہت ہی پریشان ہو گئے ہو“۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے؟“

”میں آپ کو اپنا دوست تو ضرور سمجھتا ہوں“۔ وانگ نے دبی دبی سی آواز میں کہا۔ ”لیکن آپ بھی یا حضرت کے ملک کے رہنے والے ہیں اور ہو سکتا ہے آپ ایک ہی صوبے میں رہنے والے ہوں۔ قدرتی بات ہے کہ آپ وہ بات پسند نہیں کریں گے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہ آپ یہ بات یا حضرت کو بتا دیں گے۔“

”دیکھو وانگ!“۔ میں نے کہا۔ ”یہ صحیح ہے کہ میں اور یا حضرت ایک ہی صوبے کے رہنے والے ہیں لیکن میں مسافر ہوں۔ یہاں تک بھٹکتا ہوا پہنچ گیا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن مجھ پر کسی کی کوئی پابندی نہیں۔ میں جس وقت چاہوں یہاں سے جا سکتا ہوں۔ یا حضرت کے ساتھ میرا کوئی ایسا تعلق نہیں جیسا تم لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ میں انہیں کوئی بات نہیں بتاؤں گا۔“

”لیکن ہم نے انہی کے ساتھ رہنا ہے“۔ اس نے کہا۔ ”ہم کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جو یا حضرت کے خلاف جاتی ہو۔ کوئی آدمی ایسی جرأت کرے گا تو یا حضرت کے حکم سے اسے قتل کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔ یا حضرت تانی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں

لیکن تانی نہیں مانتی۔“

”اور تانی کے والدین کیا کہتے ہیں؟“ — میں نے پوچھا۔

”وہ یا حضرت کو بھی ناراض نہیں کر سکتے“ — وانگ نے کہا۔ ”اور وہ اپنی کس اور اتنی خوبصورت بیٹی کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے۔“

صبح اللہ نے مجھے بتایا تھا بدھ مت کے تین چار پیروکار اس کے خلاف ہیں۔ میں نے وانگ کی باتیں سنیں اور اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھے تو مجھے خیال آیا کہ ان مخالفین میں وانگ بھی شامل ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ اس موضوع پر کچھ اور باتیں کیں لیکن میں نے دیکھا کہ وہ ڈر ڈر کر بولتا تھا اور میرے بعض سوال گول کر جاتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کوئی سیدھا سا اور بدھو سا آدمی نہیں تھا بلکہ اس کے بولنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ اس میں عقل بھی ہے اور خود اعتمادی بھی ہے۔

ہم ٹہلتے ٹہلتے دریا تک چلے گئے تھے۔ وہاں بہت سی کشتیاں کنارے سے بندھی ہوئی تھیں۔ ان میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی تھیں، بڑی اور بہت بڑی بھی۔ تین چار کشتیاں دریا میں تیر رہی تھیں اور مائی گیر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھے۔ دریا پورے جوش میں تھا۔ وہ بارشوں کا موسم تھا۔



میں جب واپس اپنے جھونپڑے میں گیا تو صبح اللہ کو کچھ بھی نہ بتایا کہ وانگ کے ساتھ میری کچھ باتیں ہوئی ہیں۔ میں نے یہ خاموشی اس وجہ سے اختیار کی کہ صبح اللہ وانگ کو مزادے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وانگ مجھے بڑا اچھا لگا تھا۔ بڑی پختہ اور عقل کی باتیں کرتا تھا۔ میں نے کھانا صبح اللہ کے ساتھ کھایا۔ اس نے بتایا کہ میرے لئے ایک جھونپڑا خالی کر لیا گیا ہے۔

”تم اب اس جھونپڑے میں چلے جاؤ“ — صبح اللہ نے کہا۔ ”یہی کہنے پئے۔ رکھو اپنی رانقل، اپنی وردی اور ایمنیشن وغیرہ ساتھ لے جاؤ۔ بستر وغیرہ کا وہاں بندوبست کر دیا ہے۔ ایک آدمی تمہاری خدمت کے لئے مقرر کر دیا ہے اور ایک عورت تمہیں وہیں کھانا دے گی۔“

”میں نے اس لڑکی کو گھر جا کر دیکھا ہے“ — میں نے کہا۔ ”اس پر اڑدھاک دہشت طاری ہے۔ میں نے اس کی دہشت اتارنے کی کوشش کی ہے۔ میں پھر وہاں

پہنچا گا اور.....“

”ایک خیال رکھنا میرے دوست!“ — صبح اللہ نے میری بات کاٹنے ہوئے کہا۔ ”تم وہاں زیادہ نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔ وہ لڑکی یقیناً تم سے متاثر ہوگی۔ میں بات صاف کیا کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لڑکی تمہارے زیر اثر ہو اور وہ تمہیں یا تم اسے ابد ملے۔“

”میری اس کے ساتھ ایسی کوئی دلچسپی نہیں“ — میں نے کہا۔ ”میں نے اس کے ساتھ یا یہاں کی کسی اور لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرنی۔ یہ انسانی ہمدردی کا جذبہ ہے جو مجھے وہاں لے گیا تھا اور پھر بھی لے جائے گا۔“

”اس جذبے کو دبانی کی کوشش کرو“ — صبح اللہ نے کہا۔ ”یہاں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت لڑکی موجود ہے۔ جو لڑکی تمہارے دل کو اچھی لگے، مجھے بتانا شام کے بعد وہ تمہارے پاس ہوگی۔“

میں نے دیکھا کہ صبح اللہ مہاراجوں یا بادشاہوں کی طرح مجھے حکم دے رہا تھا۔ یہ عجیب ہے کہ میں اس سے متاثر ہو گیا تھا اور میں نے دل سے اس کی مریدی قبول کر لی تھی لیکن میرا مزاج اس قسم کا تھا کہ میں تحکمانہ انداز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال میں ناوش رہا۔

صبح اللہ کے کہنے پر میں اپنے جھونپڑے میں جانے کے لئے اٹھا۔ صبح اللہ نے ایک آدمی کو پکارا تو وہ دوڑتا ہوا آیا۔ صبح اللہ کے کہنے پر اس آدمی نے میرا سامان اٹھایا اور اس کے ساتھ صبح اللہ کے جھونپڑے سے نکل آیا۔

میرے لئے جو جھونپڑا خالی کر لیا تھا، وہ بھی صاف ستھرا تھا البتہ اس کا کمرہ ایک ہی لہ میں جب اس جھونپڑے میں پہنچا تو وانگ وہاں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے میرا دم تیار مقرر کیا گیا ہے۔

وانگ کا زیادہ تر وقت میرے ساتھ گزرنے لگا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وانگ میرے ساتھ کھل کر بات کرے اور کسی بھی موضوع پر بات ہوتی تو وہ ٹھیک ٹھاک باتیں کرتا لیکن جب ذکر صبح اللہ کا آ جاتا تو وہ دب سا جاتا اور اس کی کوشش ہوتی کہ یہ موضوع ٹل جائے اور اسے کچھ نہ کہنا پڑے۔

لا یا غلبا، تین دن گذر گئے تو ایک روز عصر کے وقت ساری بستی میں ہڑونگ سی

ہرے اندر کچھ اور ہی اثر ہوتا تھا۔

میں جانتا تھا اور میں نے دیکھا بھی تھا کہ ہرگزیدہ اور پہنچ والے پیروں یا عالموں کے چروں پر ایک جلالی سی کیفیت ہوتی ہے اور یہ تاثر ایسا ہوتا ہے کہ ہر کوئی ان کا ادب اور احترام کرنا چاہتا ہے۔ مسیح اللہ کے چرے پر میں نے جو تاثر دیکھا وہ نورانی بھی نہیں تھا اور جلالی بھی نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ میں شاید اس شخص کو سمجھ نہیں سکتا۔ میں سمجھ رہا ہوں وہ غلط ہے۔ میں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں گناہگار تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ خدا تک اپنی فریاد کس طرح پہنچائی جاتی ہے۔ میں ہی اسی عقیدے کا قائل تھا کہ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے مسیح اللہ جیسے کسی عالم یا عامل یا کسی پیر کی ضرورت یا رہنمائی لازمی ہوتی ہے۔ میں یہ بھی مانتا تھا کہ کوئی بظہر خواہ اس میں اللہ کا نام ہی کیوں نہ ہو، اپنے آپ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس کا اثر ہوائی نہیں اور بعض اوقات اثر الٹا بھی ہو سکتا ہے۔ وظیفہ کرنے کے لئے کسی بزرگ کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اللہ کا نام لینے کے لئے اللہ کا نام پڑھنے کے لئے اللہ کے کسی بندے کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔

کمرے میں چار آدمی داخل ہوئے۔ انہوں نے پتلون نما پاجامے پہن رکھے تھے۔ تینس پاجاموں اُڑسی ہوئی تھیں اور ہر ایک کی کمر کے گرد ایک کپڑا لپٹا ہوا تھا اور ہر ایک نے اس میں تلواریں اُڑسی ہوئی تھیں۔ یہ تلواریں عام تلواروں جیسی نہیں تھیں جن کی نوکیں ہوتی ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ تلواریں جتنے لمبے چھرے تھے جن کے بلیڈ ان کے سے چوڑے تھے اور دستے کے قریب آکر کم چوڑے رہ جاتے تھے۔ ان چاروں آدمیوں نے سروں پر کالے رومال باندھ رکھے تھے۔ ان کے چرے تھے تو ٹھیک ٹھاک لیکن مجھے آج تک یاد ہے کہ ان چروں پر کرختگی کا سا تاثر تھا۔ اس تاثر کے ساتھ کالے لٹل لور کمر بندوں میں اُڑسی ہوئی تلواریں جلاو کا تصور پیش کرتی تھیں۔

”تم سب وہاں چلو“ — مسیح اللہ نے کہا اور میری طرف اشارہ کر کے بولا۔

میں نے بھی لے جاؤ۔

ہماروں نے میری طرف دیکھا اور میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ میری زبان نہیں سمجھتے تھے۔ مجھے مسیح اللہ کا یہ افسرانہ انداز اچھا نہ لگا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اس نے مجھے اپنا دلال بنا دیا تھا اور ہم ایک ہی صوبے میں رہنے والے تھے اس لئے یہ مجھے ذرا اونچی سطح پر

بہا ہو گئی۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ آج یا حضرت بستی کے تمام لوگوں سے خطاب کریں گے۔ اتنے میں ایک آدمی آیا۔ اس نے بتایا کہ مسیح اللہ مجھے بلا رہا ہے۔ میں اس کے جھونپڑے میں گیا۔ میرا جھونپڑا بستی کے ایک اور طرف تھا۔ میرے اور مسیح اللہ کے جھونپڑوں میں اچھا خاصا فاصلہ تھا۔

”میں آج شام ان لوگوں کو اکٹھا کر رہا ہوں“ — مسیح اللہ نے کہا۔ ”تم بھی وہاں موجود ہو گے۔ تمہارے پاس رائل نقل ہونی چاہئے اور رائل نقل میں راؤنڈ پڑے ہوں۔ تم میرے ساتھ کھڑے ہو گے..... جاؤ رائل نقل تیار کر لو اور پھر میرے پاس آجانا۔“

میں واپس گیا۔ رائل نقل کی میگزین میں راؤنڈ ڈالے اور رائل نقل کا سیلنگ کندھے پر لٹکا کر مسیح اللہ کے جھونپڑے میں چلا گیا۔



میں مسیح اللہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ تو ہمارا جہ بنا ہوا۔ اس کے سر پر لال ٹوپی تھی جسے ترکی ٹوپی کہا کرتے تھے۔ اس پر اس نے پگڑی کی طرح ریٹھی کپڑا لپٹا ہوا تھا جس کی لمبائی زیادہ نہیں تھی۔ پگڑی کے دونوں طرف اس نے کسی پرندے کے رنگ دار پر اُڑے ہوئے تھے۔ اس نے جو چنچہ پہنا ہوا تھا وہ بھی ریٹھی سا تھا اور اس کا رنگ ہلکا سبز تھا۔ اس نے کمر کے گرد ایک کپڑا لپیٹ رکھا تھا اور اس میں تلواریں اُڑسی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں سرمہ تھا اور چرو دھلا دھلایا تھا۔ اس لباس اور ٹیلی میں وہ الف لیلہ کی داستانوں کا افسانوی کردار لگتا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی رسمی سی بات کی تو اس نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کسی بادشاہ نے بادل ناخواستہ اپنے غلام کی طرف دیکھا ہو۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ میں اس شخص سے اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اپنے آپ کو اس کا مرید بنا دیا تھا اور میں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے۔ میں نے پہلے یہ بھی کہا ہے کہ اس نے ہاتھ اوپر کیا تھا تو ایک جن نے اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا جوا گلاس دے دیا تھا۔ میں نے وہ جن تو نہیں دیکھا تھا اور میں جانتا تھا کہ جنت نظر نہیں آیا کرتے لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ جن ہی تھا جس نے اس کے ہاتھ میں پانی دیا تھا۔ اس کے باوجود میں جب اس کے چرے پر اور انداز میں رعوت اور فرعونیت سی دیکھتا تو

پر رکھے گا لیکن اس نے مجھے ان لوگوں کی صف میں شامل کر دیا۔

ہم بستی میں سے گزرے۔ میں نے دیکھا کہ باہر صرف بچے کھیل رہے تھے، بڑی عمر کا کوئی مرد نہ کوئی عورت نظر نہیں آتے تھے۔ میں ان چار آدمیوں کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ ہم بستی میں سے نکل گئے۔ آگے ایک ٹیکری سی تھی۔ اس سے گھوم کر آگے گئے تو مجھے ایک اور ہی منظر نظر آیا۔ وہ یہ تھا کہ تمام لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے جس طرح لوگ جلسوں میں بیٹھا کرتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک چوڑا بنا ہوا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ ایک ٹیکری تھی جسے اوھر اوھر سے تراش کر چوڑا بنا دیا گیا تھا۔ اس کی اونچائی ایک گز سے کچھ زیادہ ہوگی۔ لمبائی چوڑائی پندرہ سولہ فٹ سمجھ لیں۔

وہ چاروں آدمی مجھے اپنے ساتھ چوڑے کے پاس لے گئے۔ ان چاروں کو دیکھ کر لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور یہ باتیں اچھا خاصا شور و غل بنی ہوئی تھیں۔ ایسی خاموشی چھا گئی جیسے ان لوگوں نے اپنی سانسیں بھی روک لی ہوں۔

صبح اللہ آیا۔ میں نے اس کی کچھ اور ہی شان دیکھی۔ دو بڑی ہی خوبصورت لڑکیاں اس کے ساتھ تھیں۔ ان کے لباس بڑے ہی اچھے تھے۔ ایک اس کے دائیں طرف اور دوسری بائیں طرف تھی۔ وہ آیا تو تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے سر جھکا لئے۔ کچھ لوگ تو بالکل ہی جھک گئے۔

صبح اللہ لڑکیوں سمیت چوڑے پر چڑھ گیا۔ تلواروں والے چاروں آدمی بھی اس کے پیچھے چوڑے پر چڑھے اور ان کے پیچھے میں بھی چوڑے پر چلا گیا۔ لڑکیاں صبح اللہ کے دائیں بائیں کھڑی رہیں اور ہم پانچوں اس کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔

صبح اللہ نے معلوم نہیں کیا کہا کہ تمام لوگ سیدھے ہو گئے اور بیٹھ گئے۔ صبح اللہ نے بری زبان میں لیکچر شروع کیا جو میں بالکل نہ سمجھ سکا۔ اس کے بولنے کا اور بازو اٹھانے کا اور ہوا میں کے مارنے کا انداز بتاتا تھا کہ یہ شخص غصے میں ہے اور ان لوگوں کی کسی غلطی پر انہیں تاز رہا ہے۔

کچھ دیر غصے میں بولنے کے بعد اس نے پیچھے دیکھا اور ان چار آدمیوں سے کچھ کہہ ان میں سے دو آدمی سامنے سے چوڑے سے کودے اور لوگوں میں جا کر ایک آدمی کو

پکڑا اور چوڑے پر لے آئے۔ صاف پتہ لگتا تھا کہ اس شخص نے کوئی جرم کیا ہے اور اسے سزا دی جائے گی اور اسے کہا جائے گا کہ اپنی صفائی میں کچھ کمنا چاہتا ہے تو کہے۔

ان آدمیوں نے اسے دھکیلا اور چوڑے پر چڑھا دیا۔ میں اس آدمی سے مل چکا تھا۔ یہ تلی کا باپ تھا۔ وہ ڈر سے کانپ رہا تھا اور صبح اللہ کے آگے ہاتھ جوڑتا تھا۔ صبح اللہ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر معلوم نہیں کیا کہا اور پھر اس آدمی سے مخاطب ہو کر کچھ کہہ اس آدمی نے رونا شروع کر دیا۔ صبح اللہ کے اشارے پر دو آدمیوں نے اسے دھکا دیا اور وہ چوڑے سے نیچے جا پڑا۔

لوگوں میں سے اچانک ایک عورت کی چیخ نما آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا وہ تانی فی خواٹھ کھڑی ہوئی تھی اور بڑے غصے میں بول رہی تھی۔ اس کی ماں نے اور ایک اور عورت نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی۔ ماں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور پھر دونوں عورتیں اسے نیچے بٹھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ اوھر اس کا باپ اٹھا اور وہ رونا ہوا لوگوں کے جھوم میں چلا گیا اور بیٹی کو اپنے بازوؤں میں لے کر چپ کر دیا۔

صبح اللہ نے مجھے بازو سے پکڑا اور اپنے پہلو میں کھڑا کر لیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور دوسرا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کچھ کہہ۔

لوگ اٹھ کر خاموشی سے جانے لگے۔ صبح اللہ میری طرف گھوما۔

”میں نے اعلان کر دیا ہے کہ تم میرے خلیفہ ہو“۔ اس نے مجھے پنجابی زبان میں کہا۔ ”اب تمہاری حیثیت ایسی ہو گئی ہے کہ تم ان لوگوں سے اپنی بات منوایا کرو، ان کی نہیں سنا کرو گے۔ تم انہیں حکم دے سکتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی تمہارے گے گستاخی کرے یا بد تمیزی کرے تو مجھے بتا کر اسے گولی مار دینا۔ یہاں نہ انگریز کا قانون چلتا ہے۔ یہاں میرا قانون چلتا ہے۔ جنگ ختم ہونے دو، میں اپنی بادشاہی اور زیادہ بلانوں گا۔۔۔۔۔ اب تم اپنے ٹھکانے پر جا سکتے ہو۔ مجھے جب تمہاری ضرورت محسوس ہو لانا میں تمہیں بلانوں گا۔“

میں وہاں سے چل پڑا اور اپنے جھونپڑے میں چلا آیا۔



رات کھانے کے بعد حسب معمول وانگ میرے پاس آگیا۔ وہ پہلے آتا تھا تو میرے کانٹے جاتا تھا لیکن اس رات وہ دروازے میں رک گیا، جوتی باہر اتاری پھر رکوع میں

چلا گیا اور شاید میرے اشارے کے انتظار میں اسی پوزیشن میں جھکا رہا۔

”وانگ!“ — میں نے اسے کہا — ”سیدھے ہو جاؤ اور میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ۔“

وہ سیدھا ہو گیا اور آہستہ آہستہ چلتا چلتا مجھ تک پہنچا لیکن بیٹھا نہیں۔ میرے کہنے پر وہ بیٹھ گیا۔ میں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کے لمبے میں کہا کہ وہ میرے آگے آئندہ نہ بیٹھے۔
”مجھے گناہگار نہ کریں“ — اس نے کہا — ”آپ یا حضرت کے خلیفہ بن گئے ہیں۔ آپ کا احترام میرا فرض ہے اور اب میں آپ کی برابری نہیں کر سکتا۔“

”میری بات غور سے سنو وانگ!“ — میں نے کہا — ”یا حضرت کو اگر خلیفہ بنایا ہے تو حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے یا وہ خدا کے حکم سے خلیفہ بنا ہے لیکن مجھے یا حضرت نے خلیفہ بنایا ہے۔ یہ خدا کا حکم نہیں۔ میں مسلمان ہوں اور یہ میرا ایمان ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے آگے جھک نہیں سکتا نہ کوئی خدا کا بندہ خدا کے کسی بندے کو اپنے آگے جھکنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ تم میرے دوست ہو اور دوست ہی رہو گے۔ جس طرح پہلے میرے پاس آیا کرتے تھے اسی طرح اب بھی آیا کرو۔“

وہ میری اس بات کا اثر قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس نے کچھ دلیل بازی کی لیکن میں نے اسے بہت کچھ کہہ کر قائل کر لیا کہ وہ میرے ساتھ دوستانہ بے تکلفی رکھے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آج یا حضرت نے لوگوں سے کیا کہا تھا۔

اس نے بتایا کہ مسیح اللہ نے لوگوں سے کہا تھا کہ تانی اور اس کے باپ نے اس کو شان میں گستاخی کی ہے اور اس کی تانی کو یہ سزا ملی ہے کہ اٹھو دھانے تانی کو اپنے منہ میں لے لیا تھا۔ مسیح اللہ نے لوگوں سے کہا تھا کہ اُس وقت وہ اپنے جھوٹے پیروں میں سوا ہوا تھا۔ اسے نیند میں اشارہ ملا کہ تانی کو اٹھو دھانے پکڑ لیا ہے اور اسے پانی میں لے جا رہا ہے۔ مسیح اللہ نے اپنے جنت کو حکم دیا کہ اس لوہی کو بچالو۔ جنت نے اس آدمی کو بچو مجھے وہاں حاضر کر دیا اور میں نے جنت کی رہنمائی میں وہاں پہنچ کر اٹھو دھا کو گولی ماری اور تانی کو بچا لیا۔

مسیح اللہ لوگوں کو یہ باور کرا رہا تھا کہ تانی کو اس کی گستاخی کی سزا ملی ہے اور میں اس کے یعنی مسیح اللہ کے اشارے پر وہاں جا پہنچا تھا۔۔۔۔ وانگ نے بتایا کہ پھر مسیح اللہ نے لوگوں کو بتایا کہ تانی کے باپ نے اور خود تانی نے اس کا حکم نہ مانا تو ان پر ایسا آت

رے گی کہ تم سب لوگ کانپ جاؤ گے اور کئی دنوں تک تم پر خوف طاری رہے گا۔
وانگ نے بتایا کہ اس کے بعد مسیح اللہ نے تانی کے باپ کو اپنے پاس بلایا اور اسے لاکھ رو سات دنوں کے بعد اپنی بیٹی کو اس کے ساتھ بیاہ دے۔ اگر اس نے اب بھی حکم دہلی کی داس کی گردن کاٹ دی جائے گی۔ تانی کے باپ کو دھکا دے کر چھوڑے سے لڑا دیا گیا تھا اور تانی نے چیخنا چلاتا شروع کر دیا تھا۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ باہر کے ساتھ شادی نہیں کرے گی اور یا حضرت چاہے اس کے باپ کو اور اس کی ماں کو اور اس کے چھوٹے بھائی کو بھی قتل کر دے۔

میں نے وانگ سے ان دو لڑکیوں کے متعلق پوچھا جو مسیح اللہ کے ساتھ تھیں۔
انگ نے بتایا کہ ان دو لڑکیوں کو وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہے اور دونوں لڑکیاں اس کی خدمت میں ہیں۔

”مجھے صحیح بات بتاؤ وانگ!“ — میں نے اس سے پوچھا — ”کیا تمہیں یا حضرت بابا باتیں اور یہ دہمکیاں اچھی لگتی ہیں؟“

وانگ چپ رہا۔ میں نے اس سے پھر پوچھا تو عجیب سی کیفیت میں اوڑھ اوڑھ دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں اور یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ ابھی مسیح اللہ کے مخالفین میں سے تھا۔

”مجھ سے مت ڈرو وانگ!“ — میں نے کہا — ”میں یا حضرت جیسا ظالم نہیں ہوں۔“

ظالم کے لفظ پر وانگ چونکا اور اس نے حیرت زدگی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔
اکھ کھنے ہی لگا تھا کہ تانی میرے جھوٹے پیروں میں داخل ہوئی۔ وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔
میں اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اٹھ کر اسے دروازے میں ہی روک لیا۔ اس نے لڑکی کے ساتھ کچھ باتیں کیں وہ میں لفظی طور پر تو نہ سمجھ سکا لیکن یہ سمجھ گیا کہ وہ تانی کو لڑے میں آنے سے روک رہا ہے۔ میں نے اسے ڈانٹا تو وہ تانی کے آگے سے ہٹ گیا اور تانی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ ذرا لنگڑا کر چل رہی تھی کیونکہ اس کے ایک پاؤں کو لڑھکانے زخمی کر دیا تھا۔

میرے پاس بیٹھے ہی اس نے احتجاج اور غصے کے لمبے میں بولنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو نکل آئے۔ دو تین مرتبہ اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ

کر بڑی زور سے جھنجھوڑا اور چیختی چلاتی آواز سے کچھ کہتی رہی۔

میں نے وانگ سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس نے تانی کی ساری بات مجھے اپنی خستہ شکستہ اردو میں سنائی جو مختصراً ”یہ تھی کہ وہ سبوح اللہ کے خلاف نفرت کا اظہار کر رہی تھی اور اسے خوبصورت لڑکیوں کا شکاری اور شیدائی اور شیطان تک کہہ رہی تھی۔ وانگ نے بتایا کہ کچھ دن پہلے یا حضرت نے تانی کے باپ کی اپنے آدمیوں سے پٹائی کرائی تھی۔ تانی کو اس پر بہت ہی غصہ تھا۔ وانگ نے یہ بھی بتایا کہ تانی مجھے کہہ رہی ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ شادی کروں گی جس نے مجھے موت کے منہ سے نکالا ہے اور پھر میرے گھر مجھے دیکھنے بھی آیا تھا۔

”یہ آپ کو دیوتا کہہ رہی ہے“ — وانگ نے کہا — ”یہ کہتی ہے کہ آپ کے ساتھ شادی کرے گی اور یہ بھی کہتی ہے کہ آپ یہاں نہ رکیں اور اسے اپنے ساتھ لے کر کہیں اور چلے جائیں۔“

تانی نے خاصی لمبی بات کی تھی اور وانگ نے ایک ایک لفظ کا ترجمہ کر کے مجھے سنایا تھا، میں نے اس کا لب لباب آپ کو سنایا ہے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے ریشم کے تاروں کے پٹے پر میں نے ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اتنے لمبے لمبے کہ میں ان کی ملامت محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ تھی تو بہت ہی خوبصورت لیکن اس کی اصل خوبصورتی یہ تھی کہ اس کے چہرے پر پچھنے کی جھلک ابھی موجود تھی اور پھر اس کے جس وصف نے مجھے متاثر کیا وہ یہ تھا کہ وہ کردار اور اخلاق کی اتنی کچی تھی کہ سبوح اللہ کو قبول نہیں کر رہی تھی، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ سبوح اللہ اسے اس کے باپ اس کی ماں اور اس کے بھائی کو قتل کروا سکتا ہے۔ مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں اسے کس طرح تسلی دوں اور کس طرح اسے ٹھنڈا کروں۔

وانگ نے مجھے بتایا کہ یہ کہتی ہے کہ اس کے ماں باپ سو گئے تو یہ دبے پاؤں گھر سے نکل آئی۔ یہ تو سب جانتے تھے کہ رات کے اس وقت سبوح اللہ کا کوئی خطرہ نہیں ہو تا کیونکہ وہ شراب اور بدکاری میں مگن ہوتا ہے۔

میں نے وانگ سے کہا کہ اسے میری طرف سے تسلی دو اور اسے کہو کہ میں اسے یا حضرت سے بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ وانگ نے اس کے ساتھ بڑی لمبی بات کی جس سے اس کے چہرے کا کھچاؤ کم ہو گیا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور

مجھ پر دیکھتی رہی پھر اس نے میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا۔ اس ہاتھ کو اٹھانے پر مجھ پر دیکھو آنکھوں سے لگایا اور میرا ہاتھ واپس میرے زانو پر بڑے احترام سے رکھ دیا۔ وہ اٹھی اور میرے جھونپڑے سے نکل گئی۔

وہ تو چلی گئی لیکن مجھے خیالوں اور سوچوں کے کانٹوں پر پھینک گئی۔ کبھی تو میرے اپنے سبوح اللہ آتا جس کا میں معتقد ہو گیا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد یہی سبوح اللہ میری آنکھوں کے آگے ایک فرعون کی حیثیت سے آتا اور میں یہ سوچنے لگتا کہ میں اس شخص کا کیا بازو سکتا ہوں۔ میں اکیلا تھا اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ سات آٹھ سو نفوس کی قی پر وہ کس طرح غالب آیا ہوا تھا۔ وہ یوں بھی کر سکتا تھا کہ بستی والوں کو حکم دیتا کہ اس شخص کو مار ڈالو تو بستی والے مجھ پر ٹوٹ پڑتے اور میرے جسم کی بوٹی بوٹی بکھر جاتی۔ میں نے وانگ سے اس کی صحیح رائے معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ڈر رہا نا اور کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ میں نے بہت حد تک بہت سی باتیں کر کے اسے اپنے ہاتھ بے تکلف تو کر لیا لیکن جہاں سبوح اللہ کا ذکر آجاتا وہ اپنے ہونٹ سی لیتا تھا۔ شاید بات آدمی گزر گئی تھی جب وہ اٹھا اور چلا گیا۔



باتیں بڑی لمبی ہیں۔ اگر میں ایک ایک بات سننے لگا تو میری کہانی کبھی بھی ختم نہیں ہوگی۔ میں آپ کو بوریٹ سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ بھی سوچتا ہوں کہ ایک بڑا واقعہ سنایا اور اس کی تفصیلات اور اس کا پس منظر نہ سنایا تو آپ کہیں گے، سچ نہیں ہو سکتا، یہ تو من گھڑت بات ہے۔ جب تک جواز اور وجوہات اور دائیں ائیں کی باتیں نہ سنائی جائیں، کسی حیرت انگیز واقعہ پر یقین نہیں آتا لیکن میں درخواست کروں گا کہ مجھے اور اپنے آپ کو طوالت سے بچائیں اور موٹے موٹے اوقات سنیں۔

چارپانچ دن گزر گئے۔ ان دنوں میں میری ملاقاتیں سبوح اللہ سے ہوتی رہیں۔ وہ مجھ پر یہ تاثر پیدا کر رہا تھا کہ اس بستی کے لوگ ہمارے غلام ہیں اور ان کی بیٹیاں ہماری بے لگائی بیویاں ہیں اور حد یہ کہ ان کی جانیں ہماری منہی میں ہیں۔ وہ میری ٹریننگ کر رہا تھا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کروں۔

ابن چارپانچ دنوں میں میں نے وانگ کو اپنے ساتھ پوری طرح بے تکلف کر لیا اور

ہنس کر باتیں شروع کر دیں۔

وانگ نے جو انکشاف کئے وہ یہ تھے کہ وہ چار پانچ ہی آدمی نہیں تھے جو سب سے اللہ کی غفلت کے بانی تھے بلکہ ان کی تعداد دس بارہ تھی۔ سب سے اللہ کے ساتھ تلواریں اور کلمے روہاؤں والے جو آدمی تھے وہ ہر ایک کے مشہور ڈاکو اور پیشہ ور قاتل تھے اور ہر کوئی ان سے ڈرتا تھا۔ وانگ نے یہ بھی بتایا کہ مسلمان سب سے اللہ سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ واقعی حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام کا خلیفہ ہے اور اس کے قبضے میں جنت ہیں اور یہ اسی کی برکت اور رحمت ہے کہ وہ خیریت سے رنگوں سے نکل آئے تھے اور یہاں اچھی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن جو غیر مسلم تھے ان میں زیادہ تر سب سے اللہ سے نہیں بلکہ ان چار پیشہ ور مجرموں سے ڈرتے تھے پھر ڈر یہ تھا کہ کسی کے متعلق نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ سب سے اللہ کا جاسوس نہیں۔ عورتوں میں بھی ایسی جاسوس تھیں جو بستی کے ہر گھر میں جا کر ہمدردی اور پیار کی باتیں کرتیں اور دیکھتیں تھیں کہ کوئی سب سے اللہ کے خلاف اٹھ تو نہیں رہا۔

وانگ نے بتایا کہ سب سے اللہ رنگوں میں دکان کرتا تھا تو وہاں اس کی دوستی ایک جادوگر کے ساتھ ہو گئی تھی۔ جادوگر کا مطلب تھا سمیریم کے کرتب دکھانے والا۔ سب سے اللہ کی دکان پر زیادہ تر عورتیں آتی تھیں اور سب سے اللہ کسی نہ کسی عورت کو اپنے جال میں پھنس لیتا اور اس جادوگر کو بھی یہ عورت پیش کرتا تھا۔ اس طرح اس نے اس جادوگر سے کچھ شعبہ سیکھ لئے جن میں ایک یہ تھا کہ خالی ہاتھ ہوا میں بلند کرتا تو اس ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا گلاس آجاتا تھا۔

وانگ نے سب سے اللہ اور اس کے استاد کی سمیریم کے کچھ اور شعبہ بھی سنا۔ وانگ نے بتایا کہ سب سے اللہ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے مقبول عام عامل بن گیا اور اس نے لوگوں کو روحانی عملیات بتانے شروع کر دیے اور چند برسوں میں ہی اس کی چرب زبانی کی بدولت اسے بہت مقبولیت اور شہرت حاصل ہو گئی۔

وانگ نے پوری طرح سب سے اللہ کو بے نقاب کر دیا۔ وہ تو آدمی رات سے ذرا پہلے چلا گیا لیکن میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہی کیفیت پھر طاری ہو گئی، کبھی خیال آتا کہ وانگ بڑھ رہا ہے اور اس لئے وہ سب سے اللہ کے خلاف ہے۔ کبھی خیال آتا کہ وانگ جو کہ رہا ہے بالکل صحیح ہے۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

اس نے میری دوستی کو قبول کر لیا۔ ایک رات وہ حسب معمول میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں مین کا ایک ڈبہ تھا جسے میں مین کی کچی کھوں گا۔ وہ آکر بیٹھا تو ایک گلاس اٹھا کر اس کچی میں سے پانی سا گلاس میں ڈالا اور تقریباً ایک چوتھائی گلاس بھر دیا پھر اس میں پانی ڈالا اور اس نے ایک پیالہ اٹھا کر اس میں کچی سے پانی ڈالا اور اسے دوسرے پانی سے بھر دیا۔ گلاس مجھے دے کر کھنے لگا کہ یہ پی لیں اور اس نے پیالہ اپنے منہ سے لگا لیا۔ میں نے پانی پیا تو یہ ذرا ترش سا تھا لیکن ترشی مجھے اچھی لگی۔ گلاس میں سے بوسی بھی اٹھ رہی تھی۔ میں نے آدھے سے زیادہ گلاس پی لیا اور میری بوقتوں ملاحظہ فرمائیں کہ میں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ خود بھی یہی چیز پی رہا تھا۔ میں اسے اس علاقے کی کوئی بڑی اچھی چیز یا سوغات سمجھ کر پی گیا۔ میں نے گلاس خالی کر کے رکھا تو اس نے کچی میں سے اتنی ہی پانی اس میں ڈال کر دو سرا پینے والا پانی بھی اس میں ڈال دیا۔ میں اب یہ پانی آہستہ آہستہ پینے لگا اور وانگ دو سرا پیالہ بھر کر ذرا تیزی سے پی گیا۔

میں نے کچھ سرور سا محسوس کیا تو مجھے خیال آیا کہ اس شخص نے مجھے شراب ہی تو نہیں پلا دی؟..... میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھے کیا پلا رہا ہے؟
”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ — اس نے کہا — ”آپ شاید اپنے علاقے کی بڑی اچھی قسم کی شراب پیتے ہوں گے اس لئے آپ کو یہ شراب اتنی گھٹیا لگ رہی ہے کہ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں چل رہا کہ یہ شراب ہے۔ یہ میں اس قبضے سے لایا کرتا ہوں۔“
شراب کے نام پر میں بدک اٹھا لیکن سرور اتنا آ رہا تھا کہ میں نے اتنا زیادہ محسوس نہ کیا جتنا کرنا چاہئے تھا۔ میں تو شراب کی بونٹ سے واقف نہ تھا۔ میں اتنی زیادہ پی گیا تھا کہ مجھ پر نشہ اور عجیب سا بخار طاری ہوتا جا رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس دنیا میں کوئی انتہائی سرور اور خوش قسمت انسان ہے تو وہ میں ہوں۔ وانگ پینے چلا جا رہا تھا اور اس پر بھی نشہ طاری ہو گیا تھا۔

شراب پینے کا مجھے انوس تھا یا نہیں، اس مسئلے کو الگ رکھیں، میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ اس نشے نے ایک فائدہ دیا وہ یہ کہ میرا بولنے کا انداز بدل گیا اور وانگ بھی نشے میں آکر بولنے لگا اور اس کے منہ سے وہ باتیں نکلتے گئیں جو میں نکلوانا چاہتا تھا۔ ہم دونوں کا انداز ایسا ہو گیا تھا جیسے ہماری بچپن کی دوستی ہے اور ہم لنگوٹے یا رہیں۔ ہم نے

انگلی صبح میرے اندازے کے مطابق دس بجے کا وقت ہو گا جب وانگ گھبرائے ہوئے سے انداز میں میرے جھوپڑے میں آیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کوئی خاص بات واقعہ ہو گیا ہے۔

”آج تانی کا باپ مارا جائے گا“ — وانگ نے ہکلاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”یا حضرت نے اسے جو سات دنوں کی مہلت دی تھی وہ آج ختم ہو گئی ہے۔ یہ خبر ملی ہے کہ تانی کے باپ کو یا حضرت نے رستیوں سے باندھ کر اپنے جھوپڑے میں قید کر لیا ہے۔ اُدھر تانی، اس کی ماں اور اس کے چھوٹے بھائی کو بھی رستیوں میں جکڑ کر ان کے جھوپڑے میں قید کر دیا گیا ہے۔ آج شام اُسی جگہ سب لوگ اکٹھے ہوں گے اور یا حضرت اپنا فیصلہ سنائیں گے۔ تانی کے باپ کے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنی بیٹی مسیح اللہ کے حوالے کر دے۔ اب دیکھتے ہیں کہ شام کو کیا ہوتا ہے۔“

وانگ ابھی میرے پاس ہی تھا اور میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک آدمی نے آکر کہا کہ مجھے یا حضرت بلا رہے ہیں۔ میں مسیح اللہ کے جھوپڑے کی طرف چل پڑا۔ میں سوچ تو بہت کچھ رہا تھا لیکن میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ مسیح اللہ سے کہوں گا کہ ان غریبوں پر ظلم نہ کرنا۔ لڑکی کسن اور معصوم ہے، اسے پیار سے سمجھاؤ تو سمجھ جائے گی۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے میں مسیح اللہ کے پاس پہنچ گیا۔

”آج شام ہم تمہیں ایک اور تماشا دکھائیں گے“ — مسیح اللہ نے کہا — ”آج تمہیں صبح اندازہ ہو گا کہ میری کتنی کچھ طاقت ہے اور میں کیا کر سکتا ہوں..... تمہیں آج پھر راقص لے کر وہیں پہنچ جانا ہے۔ باقی جو ہو گا، وہ اپنی آنکھوں دیکھ لینا۔“

عصر کا وقت تھا جب میں اُس دن کی طرف چلتا تھا۔ میرے ساتھ وہی چار آدمی کھڑے تھے جن کے پاس تلواریں تھیں اور سروں پر کالے رومال باندھے ہوئے تھے۔ مسیح اللہ اسی طرح آیا جس طرح اُس روز آیا تھا۔ وہی شاہانہ لباس اور ایک لڑکی دائیں طرف اور دوسری بائیں تھی۔ اُس روز تو اس کی چال بڑی ہی مستانی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا کا شہنشاہ وہی ہے۔ وہ چبوترے پر آگیا اور لوگوں سے مخاطب ہوا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اس نے کیا کہا ہے۔

اس کے حکم کی تعمیل ہوئی تو میں سمجھا کہ وہ یہ حکم دے رہا تھا۔ ایک طرف سے تانی

کے باپ کو دو آدمی اس طرح لارہے تھے کہ اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے رستی سے بندھے تھے۔ ایک آدمی نے اسے ایک بازو سے اور دوسرے نے دوسرے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ تانی کا باپ ٹھیک ٹھاک چلتا آ رہا تھا۔ اسے چبوترے پر لے آئے اور دو زانو ٹٹھا دیا۔

دوسری طرف سے تانی، اس کی ماں اور اس کے چھوٹے بھائی کو جس کی عمر گیارہ بارہ سال تھی اسی طرح رستیوں سے بندھا لایا جا رہا تھا۔ ان کے منہ کپڑوں سے بند کر دیے گئے تھے تاکہ وہ چیخ چلا نہ سکیں۔ انہیں چبوترے کے قریب لا کر ان کے باپ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ انہیں چبوترے پر نہ لایا گیا۔

معلوم نہیں مجھے کسی نے کہا تھا یا شاید میں خود ہی وہاں سے اُلٹے قدم چلا اور چبوترے کے ایک کونے پر جا رکا۔ مسیح اللہ نے ایک اور اعلان کیا۔ کالے رومال والے ایک آدمی نے تلوار نکالی اور تانی کے باپ کے دائیں پہلو کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے آگے ہو کر تانی کے باپ کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور اسے اور زیادہ جھکا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا جائے گا۔ کالے رومال والے دوسرے دو آدمی تانی کے باپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت میں نے تانی، اس کی ماں اور اس کے معصوم بھائی کی طرف دیکھا۔ ان کے منہ بند تھے اس لئے آواز نہیں نکلتی تھی لیکن ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کھڑے تڑپ رہے تھے۔

جس نے تلوار نکالی تھی اس نے تلوار پکڑ کر دونوں ہاتھوں میں بلند کی۔ ایک یا دو یکنواخت تانی کے باپ کا سر تن سے الگ ہو جاتا تھا۔ میں نے تانی اور اس کے چھوٹے بھائی کو تڑپتا دیکھا۔ کالے رومال والے جلاد نے بازو اوپر کر کے اور پیچھے کئے تاکہ ایک ہی وار سے گردن کٹ جائے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میری آنکھیں جیسے کسی طاقت نے کھول دیں اور اسی طاقت نے میرے اندر ایسا زلزلہ پھانپا کہ میری راقص اپنے آپ ہی کندھے تک چلی گئی۔ میں نے تلوار والے کی طرف مٹی کر کے ٹریگر دیا دیا دھماکہ ہوا اور اس کی ہوا میں اُٹھی ہوئی تلوار وہیں سے گری اور وہ بھی گر پڑا۔ میں نے بڑی تیزی سے بولٹ پیچھے کر کے آگے کیا، ایک اور راقص ٹھہر گیا۔ تانی کے باپ کے پیچھے دو قاتل پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ انہوں نے

بدمعہ کی طرف دیکھا۔ میں نے دوسرا راؤنڈ ان پر فائز کر دیا۔ فاصلہ دس قدم سے ذرا کم یا زیادہ ہو گا۔ رائل کا راؤنڈ ایک کے پہلو میں لگا اور دونوں کے پہلوؤں میں سے گزر گیا۔ دونوں گرے۔ چوتھا رہ گیا تھا۔ وہ شاید بھاگنے لگا تھا لیکن میرا تیسرا راؤنڈ جبر میں جا چکا تھا۔ میں نے فائز کیا اور وہ بھی گر پڑا۔

میں نے بلند آواز سے وانگ کو بلایا اور کہا کہ فوراً ”یہاں آؤ۔“ معلوم نہیں وہ کہاں تھا۔ لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ایسا شور بھی اٹھا جیسے لوگ بھاگنا چاہتے ہوں۔ وہ میری بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وانگ دوڑتا آیا۔

”وانگ!“ — میں نے بلند اور تیز آواز میں کہا — ”لوگوں سے حکومت بھاگیں، میری بات سن کر جائیں۔“

وانگ نے اپنی زبان میں لوگوں سے کچھ کہا تو سب خاموش ہو گئے اور متشدد دیکھنے لگے۔

”سمیع اللہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ اس نے حکمانہ لہجے میں مجھے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو، لوگ تمہارے جہم کا قیہ کر دیں گے۔ اس وقت میری رائل کی ٹالی اُس کی طرف تھی۔

”وانگ!“ — میں نے کہا — ”ان لوگوں سے کہو کہ وہ اس شخص کو خدا کا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا خلیفہ مانتے ہیں اور اس کے قبضے میں جنت ہیں۔ اسے کہیں کہ اپنے جنت کو حکم دے کہ وہ میرے ہاتھ سے رائل چھین لیں اور اسے بچالیں۔“

— میں نے سمیع اللہ سے کہا — ”اپنے جنت کو حاضر کر لے تاکہ تجھے افسوس نہ رہے کہ میں نے تجھے مقابلے کا موقع نہیں دیا تھا۔“

”یہ کیا حماقت کر رہے ہو“ — سمیع اللہ نے مجھے کہا — ”پھر کچھ اس رائل کو اور میرے ساتھ آؤ۔“

اُدھر وانگ اپنی زبان میں لوگوں کو بتا رہا تھا کہ میں نے کیا کہا ہے۔ لوگوں پر تو موت کی خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ سمیع اللہ مجھ سے دس بارہ قدم دور کھڑا تھا۔ میں نے اُس کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ سمیع اللہ پاؤں پر کھڑا رہا لیکن صرف چار یا پانچ سینکڑے لپٹے پہلے اس کے گھٹنے زمین پر لگے پھر وہ ایک طرف لڑھک گیا۔

میں نے وانگ سے کہا کہ تانی، اس کی ماں اور اس کے بھائی کے ہاتھ کھول دو۔ اُدھر

بدانت کرنا ہو گا۔

اب میں نے پانچ آدمیوں کو قتل کر ڈالا تھا وہاں ایسا خطرہ بالکل نہیں تھا کہ میں گرفتار ہو جاؤں گا اور عدالت سے مجھے سزائے موت مل جائے گی۔ خطرہ یہ تھا کہ ابھی تو میں جذبات کی گرفتاری میں تھا، کیا اس کے بعد بھی میں پانچ انسانوں کا خون ہضم کر سکوں گا؟ یہ قحطہ خطرہ جو میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ میرے سامنے پانچ لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور خون چوتھے پر پھیل گیا تھا۔

میں نے وانگ کو اپنے پاس بلایا۔ مسیح اللہ اور اس کے چار ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر وانگ کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔ وہ ادھر ادھر خوشی سے پھدکتا پھر رہا تھا۔ اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ میں نے اُسے اپنا معتقد بنا لیا تھا۔ میں نے تانی اور اُس کے چھوٹے بھائی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ انہیں کو وہ میرے قدموں سے اٹھے اور ادھر بیٹھ جائیں۔ اس نے انہیں وہاں سے اٹھا دیا اور کہا کہ وہ چوتھے کے ایک کونے پر جا بیٹھیں۔

”میں ایک سوچ میں پڑا ہوا ہوں وانگ!“ — میں نے کہا۔ ”میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب لوگ میرے متعلق اور مسیح اللہ کے قتل کے متعلق کیا سوچ رہے ہیں معلوم کرو کہ انہیں مسیح اللہ کا مرجانا اور ان غنڈوں کا مارے جانا اچھا لگا ہے یا بُرا۔“

”میں ابھی معلوم کرتا ہوں“ — وانگ نے کہا۔

”ایک کام کرو وانگ“ — میں نے کہا۔ ”ان لوگوں سے کہو کہ چپ چاپ بیٹھے رہیں اور شور شرابہ نہ کریں انہیں جو بات کہنی ہے وہ تمہاری معرفت مجھ سے کہیں۔“

وانگ نے لوگوں کی طرف منہ کر کے اپنی زبان میں بات کی۔ اس نے خاموش ہو کر سب پر نظر دوڑائی۔ اتنا بڑا جھوم جو آپس میں کھسک پھسک رہا تھا اور بعض آدمی اونچا بھی بلبل رہے تھے۔ اس جھوم کا یہ حال ہو گیا کہ جیسے وہاں کوئی انسان ہے ہی نہیں مکمل ستانا طاری ہو گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وانگ نے انہیں کیا کہا ہے۔ ان لوگوں کی خاموشی دیکھ کر میں یہ بھی سمجھ گیا کہ ان لوگوں پر میرا یا میری رائے کا خوف طاری ہو گیا ہے۔

”وانگ!“ — میں نے کہا۔ ”انہیں کہو کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر ان ٹمٹے کوئی مجھے جڑ بھلا کے گا تو میں ذرا سی ناراضگی کا بھی اظہار نہیں کروں گا۔“

وانگ ایک بار پھر لوگوں سے مخاطب ہوا۔ آخر بوڑھا سا ایک بری اٹھا اور اُس نے کل بات شروع کر دی۔ جو خاصی بلند آواز میں بول رہا تھا اور اس کے بولنے کے انداز

وہ تو مجھے دیوتا سمجھ رہے تھے لیکن یہ چھ سات سو افراد کا جو جھوم میرے سامنے موجود تھا، اس کے متعلق میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور ان لوگوں میں کس کا ردِ عمل کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو مسیح اللہ کے معتقد اور مرید تھے اور انہیں یقین تھا کہ مسیح اللہ کے ہاتھ میں کوئی غیبی طاقت ہے۔ اگر میرے ہاتھ میں رائفل نہ ہوتی اور میں مسیح اللہ اور اس کے چار محافظوں کو چاقو یا کسی اور ہتھیار سے مار ڈالتا تو یہ لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑتے اور میرے جسم کی بوٹی بوٹی کر دیتے۔ میں ان لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ جسے پیرو مرشد اور نہ جانے کیا سمجھتے ہیں، وہ فریب کار اور گنہگار تھا اور وہ ان پر ان چار غنڈوں کے زور پر حکومت کر رہا تھا لیکن میں نے پہلے یہ دیکھنا تھا کہ یہ لوگ میری بات کو قبول کریں گے بھی یا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو مجھے آج تک یا وہ ہے کہ مجھے خود اپنے متعلق معلوم نہیں تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ خیالوں کا ایک ریل آتا تھا اور ذہن میں سے گزر جاتا تھا۔ میں گناہگار ضرور تھا میں قاتل نہیں تھا۔ زندگی میں پہلا جو قتل کیا تھا وہ صدیق کو گولی ماری تھی۔ یہ پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ صدیق کو میں نے گولی سر میں کیوں اور کن حالات میں ماری تھی۔ میں اسے قتل ہی کہتا ہوں لیکن یہ ایک نیکی بھی تھی۔ میں نے صدیق کو بڑی ہی بری اذیت سے نجات دلائی تھی۔ بہر حال وہ ایک انسان تھا جسے جینے کا حق حاصل تھا لیکن وہ جس حالت میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا وہ حالت دیکھنے والوں کے لئے یا کم از کم میرے لئے قابلِ برداشت نہیں تھی۔ صدیق اُسے کس طرح

میں غصہ بھی تھا اور احتجاج بھی۔

”یہ سچ اللہ کا کچھ زیادہ ہی معتقد معلوم ہوتا ہے۔“ وانگ نے مجھے بتایا۔
اُس نے کہا ہے کہ یا حضرت ہمارے پیرو مرشد تھے اور یہ ان ہی کی برکت تھی کہ ہم
سب رنگون سے یہاں تک بخیر و خوبی پہنچ گئے ہیں اور بڑی اچھی محفوظ زندگی گزار رہے
ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ یا حضرت کی لعنت ہم سب پر پڑے گی۔ اگر یا حضرت نہ ہوتے تو ہم
رنگون سے زندہ نہ نکل سکتے اور ہماری بیٹیاں جلاپانیوں کے پاس ہوتیں۔“

تین چار اور بری اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے اکٹھے ہی بولنا شروع کر دیا۔ وہ بھی
غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ وہ اس بوڑھے کی تائید میں بول
رہے ہیں۔

پھر ایک اور بری اٹھا۔ اس نے بازو لہرا کر اور بڑے ہی جوش و خروش سے کوئی
بات کہی وہ بار بار اس بوڑھے اور اس کی تائید میں بولنے والوں کی طرف اشارے کرتا
تھا۔

”یہ آدمی ان کی مخالفت میں بول رہا ہے۔“ وانگ نے مجھے بتایا۔ ”یہ آدمی
بوڑھے سے کہہ رہا ہے کہ تمہاری ایک سو کئی بار سچ اللہ کے پاس گئی ہے اور اس نے
رات وہیں گزار دی ہے..... پھر یہ آدمی کہتا ہے کہ ان لڑکیوں کو اور جو ان عورتوں کو ہم
رنگون جلاپانیوں سے بچا کر لائے ہیں لیکن ان کی عزت یہاں بھی محفوظ نہیں۔ سچ اللہ
کو جو بھی لڑکی اچھی لگتی تھی اسے سب کے سامنے اپنے ساتھ اپنے جھوپڑے میں لے
جاتا تھا اور اس کو صبح واپس بھیجتا تھا۔ پھر اس آدمی نے کہا کہ سچ اللہ کے یہ چار آدمی جو
پیشہ ور ڈاکو اور قاتل تھے۔ اس بستی میں من مانی کر رہے تھے کسی کی بیٹی ان چاروں سے
محفوظ نہیں تھی پھر اس آدمی نے کہا کہ سچ اللہ مارا گیا ہے۔“

پھر یہ حالت ہو گئی کہ جوم سے کئی آدمی اٹھے اور وہ اس طرح ایک دوسرے کے
ساتھ بحث کرنے لگے جیسے لڑ رہے ہوں۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ ان میں کچھ آدمی سچ
اللہ کے حق میں اور دوسرے اس کے خلاف بول رہے ہیں۔

”صاحب!“ — وانگ نے مجھے کہا — ”آپ اپنا حکم چلائیں۔ ان لوگوں کی نہ
سنیں۔ یہ ان پڑھ اور پس ماندہ لوگ ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ سچ اللہ اور اس کے
ان چار غنڈوں کا مارے جانے کا بہت ہی اچھا واقعہ ہے۔ ان لوگوں کی رائے اور

شور نہ لیں۔“

میں نے وانگ سے کہا کہ میں ان لوگوں سے مخاطب ہوتا ہوں۔ وہ یوں کرے کہ
ان اردو بولوں کا اور جب میرا ایک فقرہ ختم ہو تو وہ اس کا اپنی زبان میں ترجمہ کر کے ان
لوگوں کو بتائے کہ میں نے کیا کہا ہے۔

”میرے بزرگوار میرے بھائیو اور دوستو!“ — میں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا
اور کیا۔ ”تم میں زیادہ تر لوگ مسلمان ہیں تم میں سے کسی ایک کو بھی نماز
پڑھنے نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اس یا حضرت نے جس کا اصل نام سچ اللہ تھا۔
ہیں خدا کے راستے سے ہٹا دیا تھا اور اس نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ تم صرف سچ اللہ کی
عبادت کرو۔ مسلمان کے لئے خدا سے ہٹ کر خدا کے کسی بندے کی عبادت کرنا گناہ
برہ ہے۔ اس شخص نے تمہارے دماغوں میں یہ غلط بات ڈال رکھی تھی کہ اس کے
ہم چار جن ہیں اور یہ حضرت سلیمان کا خلیفہ ہے۔ میں نے اسے گولی مارنے سے
بچا تھا کہ اگر تمہارے قبضے میں جنت ہیں تو انہیں بلا لو کہ وہ تمہیں مجھ سے بچالیں
ہے اس کے جنت کا انتظار کیا لیکن یہ شخص مجھ سے ڈرتا رہا اور کتا رہا کہ رائفل
باز کر لو۔ میں نے اسے تمہارے سامنے گولی مار کر مار ڈالا۔ اگر اس کے قبضے میں جنت
تھے تو وہ فوراً اس کی مدد کو پہنچتے لیکن یہ سب جھوٹ تھا اگر اس کے پاس چار جنت
تھیں یہ غنڈے ڈاکو اور قاتل تھے جنہیں میں نے مار ڈالا ہے ان کی تعداد بھی چار
ہے میں تم لوگوں کو سچ بتاتا ہوں کہ اس نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے پاس رائفل ہے،
میرے ساتھ بیٹیں رہو تاکہ تم لوگ اس سے ڈرتے رہو۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اس
مائی جس لڑکی پر ہاتھ رکھو گے وہ میرے حکم سے رات کو تمہارے پاس آجائے گی۔“

وانگ میری باتیں بری زبان میں ساتھ ساتھ ان لوگوں کو سناتا جا رہا تھا۔

”میں نے تمہاری عزت محفوظ کر دی ہے۔“ — میں نے کہا — ”اب تمہاری
ان کو کوئی بڑی نظر سے نہیں دیکھے گا۔ جتنے مسلمان ہیں وہ خدا کی عبادت شروع کر
دیں گے جو لوگ ہیں وہ اپنی عبادت کریں۔ خدا سب کا ایک ہے اگر
بہدہ ہو گئے ہیں تو ایک دوسرے کے دشمن نہ بن جاؤ۔ خدا کو یہ دشمنی اچھی نہیں
مذہب الگ ہیں تو کوئی بات نہیں تم ایک دوسرے سے الگ نہ ہو جانا۔ اتفاق اور
میل برکت ہے۔ تم سب دعا کرو کہ جنگ جلدی ختم ہو جائے۔ یہاں آپس میں پیار

اور محبت سے رہو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا مجھے آگے جانا ہے۔
میں نے ان لوگوں کو ذرا لمبا لپکھ دیا تھا۔ وانگ نے میرا ہر ایک لفظ ان کے گہروں
تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ لوگ ٹھنڈے رہے اور کسی نے کوئی
اعتراض نہ کیا۔ صرف ایک آدمی اٹھا اور اس نے کچھ کہا۔
”صاحب!“ — وانگ نے مجھے کہا — ”یہ آدمی کہتا ہے کہ آپ چلے گئے تو ان
کی حفاظت کون کرے گا۔“

میں نے وانگ سے کہا کہ انہیں کو کہ تم خدا کی عبادت کرو گے اور خدا سے جو کچھ
بھی مانگو گے وہ تمہیں مل جائے گا اگر تم ایک دوسرے کے ساتھ پیار اور محبت اور ایک
دوسرے کی ہمدردی دل میں رکھ کر رہو گے تو تم دیکھنا خدا کس طرح تمہاری مدد کو پہنچا
ہے..... وانگ نے میری اس بات کا ترجمہ کر کے لوگوں کو سنا دیا۔

سورج پھاڑی کے پیچھے چلا گیا تھا۔ جنگلاتی اور کوہستانی علاقوں میں شام اس وقت
شروع ہو جاتی ہے جب سورج افق سے ابھی کچھ اوپر ہوتا ہے، اور جب سورج غروب ہو
جاتا ہے تو جنگل میں شام تاریک ہو جاتی ہے۔ میں نے وانگ سے کہا کہ یہ پانچ لاشیں دریا
میں پھینکنی ہیں۔ پھر اس سے پوچھا کہ لاشیں دریا تک کس طرح اٹھا کر لے جانی جائیں
گی۔ وانگ نے بتایا کہ یہاں چار پائی تو ہے ہی نہیں۔ وہ بانس کاٹ لائیں گے اور ان کی
سیڑھیاں بنا کر ہر سیڑھی پر ایک لاش رکھیں گے اور دریا میں پھینک آئیں گے۔
بغیر کیلوں کے سیڑھیاں نہیں بنائی جاسکتیں تھیں۔ وانگ نے اعلان کیا کہ یہ پانچ
لاشیں دریا میں پھینکنی ہیں۔ کئی آدمی اٹھ کھڑے ہوئے ان میں ہر ایک آدمی ایک لاش
کندھے پر اٹھا کر دریا میں پھینکنے کے لئے تیار ہو گیا۔

شام خاصی تاریک ہو چکی تھی جب پانچ آدمی چوتھے پر چڑھے اور ہر ایک نے
ایک ایک لاش اس طرح اٹھالی کہ اسے کندھے پر ڈالا سر پیچھے کی طرف اور ٹانگیں
آگے کی طرف لٹک رہی تھیں۔ جب یہ لاش بردار چوتھے سے اتر کر دریا کی طرف
چلے تو تمام لوگ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ میں اور وانگ اس جلوس کے آگے آگے
تھے۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ایک آدمی بڑے غصے اور بڑی اونچی آواز میں بولنے
لگا۔ لاش بردار رک گئے۔ میں نے پیچھے دیکھا اور پھر وانگ کی طرف دیکھا۔
”صاحب!“ — وانگ نے کہا — ”اس آدمی نے کہا ہے کہ ان گناہگاروں کو

جہنم کی لاشوں کو اتنے احترام سے اٹھا کر کیوں لے جا رہے ہو۔ انہیں نیچے پھینکو اور
نہیں پکڑ کر گھسیٹ کر دریا تک لے جاؤ۔“
”میں نے ٹھیک کہا ہے“ — میں نے کہا — ”انہیں کہو کہ لاشیں گھسیٹ کر
لے جائیں یہ لوگ احترام کے قابل نہیں تھے۔“
پانچ آدمیوں نے وانگ کے کہنے پر لاشیں پھینک دیں پھر میں نے یہ منظر دیکھا کہ
ایک لاش کے ساتھ دو دو آدمی ہو گئے ایک نے ایک ٹخنہ اور دوسرے نے دوسرا ٹخنہ
الوداع اس طرح لاشوں کو تھپتھپے ہوئے دریا تک لے گئے۔

سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ میری اجازت کا
غبار کر رہے ہیں۔ میں نے سر سے اشارہ کیا۔ دو دو آدمیوں نے ایک ایک لاش اٹھائی
روہ تین ہزارے دے کر لاش دریا میں پھینک دی۔ اس طرح پانچوں لاشیں دریا میں
پیک دی گئیں اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

”دیکھو وانگ!“ — میں نے کہا — ”تم اب ان لوگوں میں گھومتے پھرتے رہنا۔
مارے جو دوست اور ساتھی ہیں انہیں بھی کہنا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور
ت چت کرتے رہیں۔ مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں اور ان کا
نہل کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب!“ — وانگ نے کہا — ”میں آپ کو ایک بات کہنا چاہتا
ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اب آپ یا حضرت مسیح اللہ کی جھوٹی پڑی میں رہا کریں۔ یہ بہت اچھی
مونہ پڑی ہے۔ یہ لوگ اب آپ کو اپنا مرشد مانیں گے۔“
”ہم وہاں سے واپس چل پڑے تھے اور باتیں کرتے آ رہے تھے۔

”میری ایک بات غور سے سن لو وانگ!“ — میں نے کہا — ”میں مرشد نہیں
ناہتا ہوں میں ایسا ہی انسان رہتا چاہتا ہوں جیسے یہ انسان ہیں اور جیسے تم ہو۔ میں ان کا
فرمان بھی نہیں بنوں گا۔ میں نے آگے جانا ہے۔ میں یہاں رک کر کروں گا بھی کیا؟
میری منزل کچھ اور ہے۔“

”آپ آگے نہ جائیں صاحب!“ — وانگ نے کہا — ”میں نے آگے کی جو
انہاں کی ہیں، وہ بڑی خطرناک ہیں۔ آگے سوائے موت کے کچھ بھی نہیں اگر آپ کو
جاننے لے پکڑ لیا تو وہ آپ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کریں گے۔“

”ایک خطرہ تو آپ نے دیکھ لیا ہے“ — وانگ نے کہا — ”یہ ہے اژدھا۔۔۔۔۔“

نہیں! ایک اژدھا کو تو مار دیا تھا لیکن اس علاقے میں یہ ایک ہی اژدھا نہیں تھا۔ جہاں آپ کو اس قسم کا ٹھہرا ہوا پانی نظر آئے وہاں محتاط ہو کر چلیں۔ اس علاقے میں دُور دُور سے اژدھا ملتے ہیں۔ بعض تو پانی میں ہوتے ہیں اور بعض خشکی پر بھی موجود ہوتے ہیں۔ تو وہ ہری گھاس میں یا جھاڑیوں میں اس طرح چھپے ہوئے ہوتے ہیں کہ نظر نہیں آتے۔ آپ نے احتیاط یہ کرنی ہے کہ کبھی پانی کے قریب آرام کرنے کے لئے یا سونے کے لئے نہ رکیں۔ رات کو بھی آپ جہاں رکیں احتیاط کریں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اژدھا درندوں کی طرح کسی کا تعاقب نہیں کیا کرتا۔ اگر اس کی زوئیں یا اس کی بیوی کوئی جاندار آجائے تو وہ پکڑ لیتا ہے۔“

اس نے خاص طور پر لکھا تھا کہ برما کے جنگوں میں دو خطرے ایسے تھے جنہیں نظر نہیں آئیں کیا جاسکتا تھا اور اس کے لئے ہمیں الگ اختلالات کرنے پڑے۔ ایک تو اس ان اڈوں کا ذکر کیا جو جگہ جگہ پائے جاتے تھے۔ اڈوں کا بہت اور بہت ہی بڑا پتہ ہوتا ہے، جنرل مسلم نے جو دوسرا خطرہ اس کتاب میں لکھا وہ بھی سانپ ہی تھا جو انسانی سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس نے لکھا کہ یہ سانپ چھ انچ سے لے کر آٹھ

شام کھانا کھانے کے بعد وانگ اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ میرے جھونپڑے میں آگیا۔ میں اب سمجھ لیتا تھا کہ جھونپڑے میں آگیا تھا۔ یہ جو برمی وانگ کے ساتھ میرے پاس آئے تھے، ان میں سے دو وانگ کی طرح بدھ مت کے پیروکار تھے اور دو مسلمان۔ یہ سب میرے بہت ہی مشکور تھے کہ میں نے انہیں سمجھ لیا اور اس کے غنڈوں سے نجات دلا دی تھی۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ میں ان کے ساتھ رہوں اور آگے نہ جاؤں۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ میں رک نہیں سکتا لیکن ان کی ضد ایسی تھی کہ ان کی یہ خواہش ایک تقاضا بن گئی۔ یہ سب لوگ دراصل ڈرے ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں بہتر طریقے سے ان کی حفاظت کر سکتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں انڈین نیشنل آرمی کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس آرمی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا بھی لیکن انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ چلیانویں سے ڈر کر بھاگ آئے ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ وہ ریفیوجی تھے یعنی پناہ گزین۔

”ہم آپ کو یہ تو نہیں بتا سکتے کہ جہاں آپ جا رہے ہیں وہ جگہ کتنی دُور ہے اور آپ کس راستے سے جائیں۔“ وانگ نے کہا۔ ”بالہ، ہم آپ کو یہ بتا سکتے ہیں کہ آگے جو علاقہ ہے اس میں کیا کیا خطرے ہیں۔“

288

انچ تک لمبا ہوتا ہے۔ یہ درختوں میں رہتا ہے۔

اس چھوٹے سے سانپ کے متعلق جنرل مسلم نے لکھا کہ اس نے ہمارے بہت سے فوجیوں کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ یہ سانپ درختوں کے ٹنوں پر موجود رہتا ہے اور خطرہ یہ کہ اس کا رنگ سبز ہوتا ہے اس لئے درختوں کی شاخوں میں یہ نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ برما کے درخت اونچے نہیں ہوتے۔ بعض درختوں کے نیچے سے ایک اچھے قد کا آدمی بغیر جھکے گزر سکتا ہے اور بعض اتنے کم بلند ہیں کہ ذرا جھک کر چٹا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ سانپ درخت کے نیچے سے گزرنے والے آدمی کو ڈس لیتا ہے یہ پیشانی کو کاٹتا اور اپنا زہر داخل کر دیتا ہے۔

اس کتاب کے علاوہ میں نے ایک اور کتاب پڑھی تھی جو ایک پاکستانی ریٹائرڈ میجر نے لکھی تھی۔ وہ برما فرنٹ پر لڑا تھا اور اس وقت وہ انڈین آرمی میں کپٹن تھا۔ اس نے بھی ان اثر دہوں اور درختوں میں رہنے والے ان سبز سانپوں کا ذکر کتاب میں کیا ہے۔ یہ تو آج کی بات سمجھیں، میں اس وقت کی بات سناتا ہوں جب میں ایک بھگوڑے فوجی کی حیثیت سے برمیوں میں جا پہنچا تھا۔ وانگ مجھے ان جنگلوں کے خطرے بتا رہا تھا۔

”آپ نے شاید ایک چیز غور سے نہیں دیکھی“ — ”وانگ کہہ رہا تھا۔ ”ہم میں سے کوئی بھی آدمی جب جنگل میں جاتا ہے تو وہ اپنے سر کے گرد کپڑے کی ایک پٹی باندھ لیتا ہے اور اس پٹی پر ایک پٹی چڑے کی باندھی جاتی ہے۔ یہ ایک بیلٹ سی ہوتی ہے۔ بعض آدمیوں نے چڑے کے اس ٹکڑے پر چھوٹے چھوٹے کیل یا کانٹے ٹھونکے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ سبز سانپ سے بچاؤ کا انتظام ہے۔ اس سانپ نے صرف ماتھے پر کاٹنا ہوتا ہے۔ اگر آپ نے یہ پٹی یا یہ بیلٹ نہ باندھی تو آپ اس سانپ کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ سانپ اتنا زہریلا ہوتا ہے کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس کا ڈساجو انسان مر جاتا ہے۔“

میں نے جنرل مسلم کی کتاب میں یہ پڑھا تھا کہ اس سانپ نے صرف ان فوجیوں کو ڈسا تھا جو اپنا سٹیل ہیلرٹ اتار کر ان جنگلوں میں سے گزرتے تھے۔ فوجیوں کو ہیلرٹ کی گنتی تھی کہ وہ جب درختوں کے نیچے سے گزریں تو اپنا سٹیل ہیلرٹ اس طرح سر رکھیں کہ ان کی پیشانیاں ڈھکی ہوئی ہوں۔

”اور صاحب!“ — ”وانگ کہہ رہا تھا — ”یہاں سب سے بڑا خطرہ شیروں اور

بیڑوں کا ہے۔ یہ درندے پہلے بھی ہوتے تھے لیکن اتنے زیادہ نہیں تھے۔ یہ تمام ملک کے جنگلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اب چونکہ ہر طرف جنگ لگی ہوئی ہے اس لئے مارے جنگلوں کے درندے اس طرف آگئے ہیں کیونکہ اس طرف انہیں کوئی دھماکہ نہیں دیتا۔ یہ ہم سب کے لئے خطرہ بن گیا ہے۔ ہماری اس بستی کے ارد گرد بھی یہ درندے موجود ہیں لیکن قریب نہیں آتے۔“

”میں نے کہا — ”میں اتنا جانتا ہوں کہ بھوکا شیر انسانوں سے ڈرا نہیں کرتا۔ وہ انسانوں پر بھی حملہ کر دیتا ہے۔“

”ان کے لئے شکار بہت ہے“ — ”وانگ نے کہا — ”خروگوش بہت ہیں اور پٹی جتنے بڑے بڑے چوہے بھی ان جنگلوں میں بہت پائے جاتے ہیں۔ بکرے کی نسل کا ایک جانور بھی ان جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ ہرن بھی مل جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں بندر اور لنگور بھی بہت ملتے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ شیر کو اور کوئی شکار نہ ملے تو وہ بھیڑیے کو ہی پکڑ کھا لیتا ہے۔ بندروں اور لنگوروں کو بھی یہ درندے اپنی خوراک بنا لیتے ہیں۔“

”آپ کے پاس رائفل ہے صاحب!“ — ایک اور آدمی بولا — ”آپ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں لیکن آپ کو احتیاط کرنی پڑے گی کہ اچانک پیچھے سے کوئی درندہ آپ پر حملہ نہ کر دے۔“

”یہاں قریب سے کوئی سڑک تو گزرتی ہوگی!“ — میں نے کہا۔

”سڑک بہت ہی دور ہے“ — ایک برمی نے جواب دیا — ”اگر آپ اس سڑک تک پہنچ گئے تو آپ کو وہاں شاید اپنے فوجی مل جائیں۔ اگر اپنے فوجی نہ ملے تو جاپانی مل جائیں گے۔“

میں نے سوچا کہ فوجی اپنے ملیں یا جاپان کے میرے لئے دونوں خطرناک ہوں گے۔ کیونکہ اپنے فوجی ملے تو وہ مجھے اپنے کسی افسر کے سامنے پیش کریں گے اور میں جب اسے بتاؤں گا کہ میں اپنی بایلیں سے بھٹک گیا تھا تو وہ نہیں مانے گا۔ مانے گا یا نہیں، یہ ایک الگ بات تھی، اس نے یہ کارروائی تو ضرور کرنی ہوگی کہ مجھے پیچھے بھیج دے گا البتہ جاپانیوں کے متعلق مجھے خیال آیا کہ میں انہیں بتاؤں گا کہ میں آئی این اے میں جانا چاہتا ہوں اور اسی لئے اپنی فوج سے بھاگ آیا ہوں تو شاید وہ مجھے میری منزل تک پہنچا دیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے جنگی قیدی بنالیں اور بھوکا پیاسا مار ڈالیں۔ بہر حال میں

ایسی صورت حال میں پھنس گیا تھا جس طرح کوئی اڑتا ہوا آزاد پرندہ واسے پر اترتا اور
جال میں پھنس جاتا ہے۔

یہ لوگ رات بہت دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے۔ انہوں نے مجھے جو معلومات
دیں ان سے میں نے یہ افہم کیا کہ میں پھنس گیا ہوں اور یہاں سے خدا کی ذات ہی مجھے
نکال سکتی ہے۔ پھر بھی میں مایوس نہیں تھا، میں نے سوچا کہ چلتا چلوں گا، کہیں تو جانکلوں
گا۔

یہ پانچوں چلے گئے تو میں نے دیا بچھادیا اور لیٹ گیا۔ جوانی کی عمر تھی، لیتے ہی میری
آنکھ لگ گئی۔

میں بنے دیکھا کہ میں جنگل میں جا رہا ہوں اور جھکے جھکے درختوں کی شبنیاں میرے
سر کو لگ رہی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ شبنیاں میرے بالوں میں سے
کنکھنی کی طرح گزر رہی ہوں۔ مجھے ان کا اپنے سر سے نکراتا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ میں چلا
گیا اور اچانک میرے ماتھے پر کوئی چیز لگی۔ مجھے فوراً یہ انتہائی خوفناک احساس ہوا کہ
مجھے سبز سانپ نے ڈس لیا ہے۔ میں نے اوپر دیکھا تو ایک سبز سانپ نظر آیا۔ میں نے
اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ مجھ پر اس قدر خوف طاری ہو گیا کہ میں منہ سے نہ جانے کیسی
آوازیں نکالنے لگا اور اس کے ساتھ ہی تاریکی چھا گئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا
کرا اٹھا۔ میں اپنے ماتھے پر صاف محسوس کر رہا تھا کہ ابھی ابھی یہاں کوئی چیز لگی تھی۔

یہ تو میں نے دیکھ لیا کہ میں ایک ڈراؤنا خواب دیکھتے ہوئے جاگ اٹھا ہوں لیکن دل
پر ایسا خوف جیسے میں ابھی مر جاؤں گا۔ دل بڑی تیزی سے اور بڑے زور زور سے
دھڑک رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا اور اونچی آواز میں کلمہ شریف پڑھنے لگا۔ کمرہ تاریک تھا۔
مجھے ایسے لگا جیسے میرے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہو۔

میں نے اس طرف ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ انسانی جسم کو جا لگا۔ میرے منہ سے گھبراہٹ
ہوئی سی آواز نکلی — ”کون ہو تم؟“ — اور میں تیزی سے اٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ
ماچس کھل رکھی ہے۔ میں نے بڑی تیزی سے ماچس اٹھائی، جلائی اور دیا روشن کیا۔ اس
دوران مجھے نسوانی آوازیں سنائی دیں — ”تانی..... تانی“۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تانی میرے بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے

کون کا ساںس لیا۔ میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر ہاتھ کو دیکھا۔ یہ احساس ابھی
میں موجود تھا کہ سبز سانپ نے مجھے پیشانی پر کاٹا ہے۔ میں بستر پر جا بیٹھا۔
”تم اس وقت کیوں آئی ہو؟“ — میں نے تانی سے پوچھا۔

اُس نے اس طرح سر ہلایا جس کا مطلب غالباً ”یہ تھا کہ وہ میری زبان نہیں سمجھتی
تھی۔ اُس نے ہاتھ جوڑ دیے اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ میں نے ایک بار
پھر اپنے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور ہاتھ کو دیکھا۔ تانی شاید سمجھ گئی تھی کہ میں نے اپنے ماتھے پر کسی
چیز کا ساںس محسوس کیا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا پھر اپنے ہونٹوں پر دو انگلیاں
رکھیں اور پھر یہ انگلیاں میرے ماتھے پر رکھیں۔ میں اس کا یہ اشارہ سمجھ گیا۔ میں جب
سویا ہوا تھا تو اس نے میرا ہاتھ چومنا تھا۔

وہ میرے قریب سرک آئی۔ اس نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ وہ میرے آگے
بٹکتے بٹکتے اتنی جھک گئی کہ اس کے جڑے ہوئے ہاتھ اور پھر اس کی پیشانی اور ناک
میرے پاؤں کو چھونے لگی۔ میں نے اُس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے اٹھادیا۔
اُس نے ہاتھ بڑھا کر انگلیاں میرے بالوں میں الجھالیں اور پھر میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے
لگی۔

اگر میری عقل نے صحیح راہنمائی کی تھی تو میں یہ سمجھا کہ میں جب سویا ہوا تھا تو یہ
دبے پاؤں اندر آکر میرے پاس بیٹھ گئی اور اس نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا اور نہ
جانے کتنی دیر ہاتھ پھیرتی رہی تھی۔ یہاں سے میرا وہ خواب شروع ہوا تھا کہ میں
درختوں کے نیچے بے گزر رہا ہوں اور درختوں کی جھکی ہوئی شبنیاں میرے بالوں کو چھو
رہی ہیں۔ جب تانی نے میرا ہاتھ چوما تو خواب میں مجھے یہ نظر آیا کہ سبز سانپ نے میرے
لمبے پرکٹ لیا ہے۔

میرے لئے تانی نے اچھی خاصی مشکل پیدا کر دی۔ میں نے سوچا کہ اس کا باپ
لے اپنے جھونپڑے سے غیر حاضر دیکھ کر ادھر آ نکلا تو وہ مجھے بھی سبج اللہ جیسا بدکار
بگے گگہ مشکل یہ تھی کہ تانی میری زبان نہیں سمجھتی تھی اور میں اس کی زبان سمجھنے
سے معذور تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر
لگا ہے۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ یہ لڑکی میری بہت ہی مشکور اور ممنون ہے۔ میں نے اسے
کالعدم سے اور اس کے غنڈوں سے بچالیا تھا اور اس کے باپ کو موت کے منہ سے

نکالا تھا۔ میں نہ ہوتا تو اس کے باپ کی گردن کٹی ہوئی ہوتی اور یہ لڑکی سمجھ لکھ کے جھوٹے میں ہوتی۔

دوسری مشکل جو اس لڑکی نے میرے لئے پیدا کر دی تھی وہ یہ تھی کہ وہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی اور اس کی عمر بمشکل سولہ سال تھی۔ میں فرشتہ نہیں تھا میں ولی اللہ بھی نہیں اور صوفی بھی نہیں تھا۔ میں فوجی تھا اور جوان تھا۔ یہ حسین اور دلکش لڑکی میرا شکر یہ ادا کرنے آئی تھی۔ یہ مجھے بہت ہی طاقتور انسان سمجھتی تھی۔ اس کا چہرہ اور اس کی حرکتیں بتا رہی تھیں کہ یہ میرے اشارے کی منتظر ہے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کے بال ریشم سے زیادہ ملائم تھے۔ بالوں کے لمس نے مجھ پر کوئی اور ہی کیفیت طاری کر دی۔

میں نے اشاروں میں اُس سے پوچھا کہ اُس کا باپ اور اس کی ماں کہاں ہیں۔ وہ میرے یہ اشارے سمجھ گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے اشارہ کیا کہ وہ گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اس ہاتھ کو چومنے لگی۔ یہ تو میں نے سنا تھا کہ شیطان انسان کو درغلا لیتا ہے لیکن عملی طور پر مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ شیطان جب درغلا لے پر آتا ہے تو انسان کے لئے مزاحمت کس قدر دشوار ہو جاتی ہے۔

میری نظریں تانی کے چہرے پر جم کے رہ گئیں۔ سچ پوچھے تو میں نے شیطان کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ میں نے اُس کے کندھوں پر بازو رکھا تو وہ سرک کر میرے اور زیادہ قریب ہو گئی۔ میں نے اُسے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ اُس نے میرے منہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں پڑیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ میں آج بھی نہیں جانتا کہ مجھے ان معصوم آنکھوں میں کیا نظر آیا کہ میں نے اُسے آہستہ آہستہ ذرا پرے کر دیا۔ پھر میں سرک کر اس سے ذرا دور ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور میں بھی مسکرایا۔ اس نے کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔ میں نے اسے کچھ کہا جو وہ نہ سمجھ سکی۔

میرے سامنے وہ منظر آگیا کہ یہ لڑکی رسیوں میں جکڑی ہوئی تھی اور اس کا منہ بندھا ہوا تھا۔ اُس کے چھوٹے بھائی کو بھی اسی طرح رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا اور اس کا باپ جلاؤ کے سامنے بیٹھا تھا۔ مجھے تانی کا اور اس کے چھوٹے بھائی کا اس وقت کا ڈھنڈا

پڑا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال آیا کہ میں نے ایک نیکی کی تھی اور اب میں اس معصوم لڑکی سے اس نیکی کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ اٹھے اور چلی جائے۔ وہ نظریں میرے چہرے پر جمائے

نہتے آہستہ اٹھی اور اس طرح مجھے دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف چل پڑی۔ دروازے میں جا کر رک گئی۔ اس وقت اس کے چہرے کا تاثر ذرا بدل گیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر جو جذباتی مسکراہٹ تھی وہ اداس سی ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور اس کے قریب چلا گیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ جب میں نے اسے جسم سے الگ کیا تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھے اور میرے آگے رکوع کی حالت میں چلی گئی۔ پھر اسی طرح پیچھے ہٹتے ہوئے میرے جھوٹے سے نکل گئی۔

میں تو بڑی گہری نیند سو گیا تھا لیکن تانی میری نیند اڑا گئی۔ میں بستر پر کروٹیں بدلنے لگا اور بہت دیر بعد مجھے اُوگھ آئی اور میں سو گیا۔ میں اگلی صبح نہیں بلکہ اگلے روز جاگا۔ روز اس لئے کہ رہا ہوں کہ جب میری آنکھ کھلی اُس وقت دن اُڑھا گزرا گیا تھا۔ سب سے پہلا جو خیال میرے ذہن میں آیا وہ تانی کا تھا۔ تانی نازک اندام اور پھولوں جیسے ملائم بدن والی لڑکی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کے چہرے کے تاثرات میری پلکوں میں محفوظ تھے اور اُس نے میرے جسم پر جہاں جہاں ہاتھ لگایا تھا وہاں وہاں میں اس کے ہاتھوں کا لمس ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ ایک سرور سا تھا جو مجھ پر طاری ہو گیا تھا۔

میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ تانی کو میں اپنے دل میں کیا مقام دوں۔ میں نے اس داستان میں پیچھے کہیں سنایا ہے کہ انگریزوں کے دور کے ہندوستانی فوجیوں کا کردار اور اخلاق کیا ہوتا تھا۔ میں بھی انہی فوجیوں میں سے تھا۔ محاذ سے واپس آیا ہوا فوجی جب شہر میں آتا تھا تو وہ سب سے پہلے عصمت فروشوں کے بازار کا رخ کرتا تھا۔ اُس وقت کے فوجی کی نظر میں عورت تفریح اور جسمانی تسکین کا ذریعہ تھی۔ میں جن حالات میں سے گزر رہا تھا اور میں جس صورت حال میں جا پھنسا تھا، میرا ذہن فرار کے راستے تلاش کر رہا تھا۔ ایسی صورت حال میں تانی جیسی حسین لڑکی کا مل جانا ایسے ہی تھا جیسے خدا نے آسمان سے بہت بڑی نعمت صرف میرے لئے بھیجی ہو۔

میں بستر پر بیٹھا تانی کے متعلق سوچتا رہا اور تانی کا تصور مجھ پر ایک نشہ بن کر طاری

ہوتا چلا گیا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ میرے اندر سے ایک آواز اٹھی تھی کہ یہ لوگ پہلے
 مسیح اللہ اور اس کے غنڈوں کی دہشت میں مبتلا رہے ہیں اور مجھے یہ اپنا نجات دہندہ
 سمجھتے ہیں اس لئے میرا رویہ مسیح اللہ جیسا نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے اپنے آپ پر کچھ
 پانے کی کوشش کی لیکن تانی کا سر لپا پھر میرے سامنے آ جاتا تھا۔ میں نے اس کے بالوں کی
 ریشم جیسی ملائم محسوس کی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے گلاب کے کھلے ہوئے پھول
 پر ہاتھ پھیرا ہو۔

میں آج اپنا اُس وقت کی کیفیت کو سامنے رکھ کر تجزیہ کر سکتا ہوں۔ اُس عمر میں
 میں صرف یہ محسوس کر رہا تھا کہ میرے اندر ایک کشش شروع ہو گئی ہے اور جیت آخر
 تانی کی ہوتی تھی یعنی میرا ذہن تانی پر آکر رک جاتا اور مجھے یہ تاثر دیتا کہ تمہارا مطلوب
 اور مقصود یہی ہے۔

کچھ دیر بعد میں نمیا اور پھر میرا نوکر کھانا لے آیا۔ کھانے کے دوران بھی میرے
 تصوروں میں تانی گھومتی پھرتی رہی۔

میں باہر نکل گیا اور بستی سے کچھ دُور جا کر قدرت کے حُسن کو دیکھا۔ ایسا بزمہ اور
 ایسے خوبصورت پہاڑ اور درخت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میں نے محسوس کیا
 کہ میری نظریں بار بار بستی کی طرف گھوم جاتی ہیں۔ ان نظروں کو تانی کی تلاش تھی۔
 کچھ دیر گھوم پھر کر میں واپس اپنے جھونپڑے میں آگیا۔ ابھی میں بستر پر بیٹھا ہی تھا کہ
 ایک نوجوان بری میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر ہاتھ
 جوڑے اور ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ کر رکوع کی پوزیشن میں چلا گیا۔ میں نے اسے اندر
 آنے کا اشارہ کیا۔

وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے ہوئے میرے سامنے بیٹھ گیا پھر جس طرح رات تانی نے
 ہاتھ جوڑ کر میرے پاؤں پر سجدہ کیا تھا اسی طرح اُس نے بھی کیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں
 سے اس کے کندھے تھامے اور اس کو اوپر کیا۔ تب میں نے دیکھا کہ یہ بستی ہی
 خوبصورت جوان ہے۔
 ”کو، کیسے آئے ہو؟“ — میں نے پوچھا۔
 وہ چپ چاپ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا اور اس نے سردائیں بائیں ہلا کرتا ہوا
 وہ میری زبان نہیں سمجھتا۔

میں نے اس کی بات پسند آئی ہو۔
 مجھے بالکل ہی سمجھ نہ آئی کہ اس نے تانی کا نام کیوں لیا ہے اور کیا اشارہ کیا ہے۔
 مجھے یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں کس طرح کا اشارہ کروں جس سے یہ سمجھ جائے کہ
 میں پوچھ رہا ہوں کہ اس نے تانی کا نام کیوں لیا ہے۔ میں نے اتنا ہی کیا کہ مسکرا کر سر ہلایا
 جیسے مجھے اس کی یہ بات پسند آئی ہو۔

وہ کچھ دیر بیٹھا اور پھر میرے آگے سجدہ کر کے چلا گیا۔ میں ان قیاس آرائیوں میں
 الجھ گیا کہ وہ کیوں آیا تھا اور اشاروں اشاروں میں کیا کہہ گیا ہے۔ ایک تو میں یہ سمجھا کہ
 یہ مجھے بیروں میں لے کر جانا چاہتا ہے کہ خراج عقیدت پیش کرنے آیا تھا۔ پھر خیال آتا تھا کہ یہ
 کس لڑکے ہے، اسے خراج عقیدت پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی، اور جب یہ خیال آیا
 کہ اس نے دوبار تانی کا نام لے کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا تو میری سوچیں الجھ گئیں۔
 شام کو تانی کا باپ آگیا۔ وہ بھی میرے آگے سجدے کرنے لگا۔ وہ اُردو کا کوئی کوئی
 نڈا جانتا تھا لیکن پوری بات نہیں کر سکتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اب میں لمحہ بہ لمحہ اور روز بہ روز کی روداد مختصر کر دوں۔ اگر میں
 تفصیلات سامنے بیٹھ گیا تو یہ داستان کہیں ختم ہونے میں ہی نہیں آئے گی۔ آپ یہ سمجھ
 لیں کہ اگلے تین چار دن میرا یہ معمول بن گیا کہ میں بستی میں اور بستی کے ارد گرد اور
 ایک بار پہاڑیوں کے پیچھے گیا اور گھوم پھر کر واپس آیا۔ کبھی تانی میرے پاس آکر بیٹھ
 جاتا۔ اس کا انداز اور رویہ اور اس کی حرکات ویسی ہی ہوتیں جیسے اس نے پہلی رات کی
 طرح۔ وہ مجھے بڑی ہی سخت آزمائش میں ڈال رہی تھی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی
 لٹاکر یہ لڑکی مجھے دعوت گناہ دے رہی ہے۔ میں یہی سمجھ سکتا تھا کہ میں نے اس پر جو
 عمل کیا تھا وہ اس کے صلے میں اپنا آپ پیش کر رہی ہے لیکن میں ایک کشش میں مبتلا
 ہو گیا تھا۔

سمجھ کر میری پوجا کرتا اور چلا جاتا۔ اس نے اپنا نام یون بتایا تھا۔ لڑکا جاتا تو تلی کا باپ اور کبھی اس کی ماں اور ایک دوسرے یون کا باپ آگیا۔

میں نے آخر تک آکر وانگ سے ذکر کیا۔ میں پہلے سوچتا ہی رہا تھا کہ وانگ کو تلی کے سلسلے میں اعتماد میں لوں یا نہ لوں لیکن میں مجبور ہو گیا کہ کچھ سمجھنے کے لئے مجھے وانگ کی راہنمائی لینی پڑی۔

”صاحب!“ — وانگ نے کہا — ”مجھے اور میرے دوستوں کو معلوم ہے کہ تلی اور یون آپ کے پاس آتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان دونوں کے باپ بھی آپ کے پاس آتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ تلی اور یون کی آپس میں ایسی محبت ہے جسے بہتی کا ہر فرد اور بچے بھی جانتے ہیں۔ وہ شادی کرنا چاہتے ہیں اور دونوں کے والدین کی بھی یہی خواہش ہے۔ آپ کے پاس وہ اس لئے آتے ہیں کہ آپ کو انہوں نے دیوتا کا درجہ دے دیا ہے۔ وہ پہلے آپ کی پوجا کر کے آپ کو خوش کر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے آپ سے اجازت لینی ہے کہ یہ شادی کر لیں۔ دراصل بات یہ ہے صاحب! یا حضرت مسیح اللہ نے ان لوگوں پر اپنا قانون ٹھونسا ہوا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی شادی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ بھی وہی قانون چلائیں گے۔

سب سے پہلے تو مجھے شدید دچک لگا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ مجھے صدمہ ہوا کہ تلی مجھے نہیں بلکہ یون کو چاہتی ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہو گئی ہے اور مجھے اپنا آپ پیش کر رہی ہے لیکن بات کچھ اور نکلی۔ میں نے اپنے آپ کو یہ فریب دیا کہ چلو اچھا ہوا کہ راز کی بات معلوم ہو گئی اور میں اس کشمکش سے آزاد ہو گیا جس میں میں نے اپنے آپ کو الجھا لیا تھا۔ وانگ کچھ کہہ رہا تھا لیکن اب میرا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔

”میری بات سنو وانگ!“ — میں نے کہا — ”ان لوگوں سے کہو کہ اب یہاں مسیح اللہ والا قانون نہیں چلے گا۔ انہیں بتا دو کہ یہ سب آزاد ہیں اور صرف اپنے مذہب کے قانون کی پابندی کریں۔ تم یوں کرو کہ تلی اور یون بدھ ہیں۔ بدھ مذہب میں جس طرح شادی ہوتی ہے اس طرح ان کی شادی کر دو۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ ہر کسی کو جس کام کو وہ جائز سمجھتا ہے کرے۔“

مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں کے اوپر کوئی نہ کوئی حاکم یا راہنما ہونا چاہیے جو ان

لوگوں کے مسائل اور امور اور تنازعے سے اور فیصلے کرے۔ میرے پیش نظر اپنے دہائی معاشرے کی پچائیت تھی۔ میں نے وانگ کے ساتھ اس کا ذکر کیا تو اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بھی میرا یہ مشورہ پسند کیا۔ اسی رات میں نے چھ سات معمر اور دانشمند آدمیوں کو بلا کر ایک پچائیت بنادی۔ ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور دو بدھ تھے۔ ساری بہتی کو اکٹھا کر کے میں نے وانگ کی معرفت بتایا کہ اب یہ بزرگ تمہارے مسئلوں کے، جھگڑوں کے اور بیاہ شادیوں کے فیصلے کیا کریں گے۔

اس رات تلی میرے کمرے میں آئی تو وہ اس قدر خوش تھی کہ بچوں کی طرح میرے ساتھ حرکتیں کرنے لگی۔ مجھ پر اس کی خوشی کی حقیقت واضح ہو چکی تھی اس لیے صرف میں مسکراتا رہا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے افسوس بھی ہوا کہ میں اس لڑکی کو جو سمجھا تھا وہ بالکل ہی غلط سمجھا تھا تلی میری نہیں تھی، وہ یون کی تھی، اور اسے ایسے ہی نوجوان کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔



جنگ بہت دُور لڑی جا رہی تھی۔ اتنی دُور کہ جنگ کے ہلکے دھماکے بھی سنائی نہیں دیتے تھے۔ میں تو جنگ کو بھول ہی گیا تھا اور کبھی تو مجھے ایسا خیال بھی آ جاتا تھا کہ میں انہی جنگوں میں پیدا ہوا تھا اور انہی جنگوں میں گھومتا بھٹکتا مرجاؤں گا۔ مجھے احساس ہے کہ مجھ پر جو کیفیت طاری ہوتی چلی جا رہی تھی وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکا اور کیفیت بیان کی بھی نہیں جاسکتی۔ بعض احساسات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہی نہیں جاسکتا۔

میں جنگ کو بھول ہی گیا تھا۔ لیکن ایک روز جنگ اچانک ہی ہماری بہتی میں پہنچ گئی۔ دن کا پچھلا پھر تھا۔ میں اپنے کمرے میں وانگ اور اس کے تین چار ساتھیوں کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ اچانک بہتی میں شور اٹھا، شور بھی ایسا جیسے بہت بڑی مصیبت نازل ہو گئی ہو۔ میں نے رات نقل اٹھائی اور ہم سب اس طرح کمرے سے باہر نکلے جس طرح توپوں کے دھانوں سے گولے نکلتے ہیں۔

باہر یہ منظر تھا کہ بہتی کی ساری آبادی ایک جگہ اکٹھی تھی اور ہر کسی کی نظریں آسمان پر لگی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ہلکی ہلکی گونج کمرے میں سنی تھی لیکن توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے اوپر دیکھا تو ایک فائبر ہوئی جہاز نظر آیا جو ڈول رہا تھا اور

اس میں ہلکا ہلکا سفید دھواں نکل رہا تھا۔

ہوائی جہاز ایک طرف مڑا۔ اس کی بلندی میرے اندازے کے مطابق دس بارہ ہزار فٹ ہو گی۔ ہوائی جہاز میں سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے انجن میں کوئی خرابی ہو۔ ہوائی جہاز نے ایک چکر لگایا۔

میں نے پائلٹ کو ہوائی جہاز میں سے نکلتے دیکھا۔ فائبر جہازوں کی سیٹ جسے کال پٹ کہتے ہیں اوپر ہوتی ہے۔ پائلٹ اوپر کو اٹھا اور اس نے پائیں کو چپ ل۔ ہوائی جہاز آگے کو نکل گیا اور دو تین منٹ بعد پائلٹ کا پیراشوٹ کھل گیا اور وہ آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ دوسرے ہوائی جہاز ناک کے بل ہو گیا اور اسے ہم سب نے دریا میں گرتے دیکھا۔

ہم سب کی نظریں پائلٹ کی طرف لگی ہوئی تھیں وہ پیراشوٹ کے نیچے بندھا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ ہستی کے تقریباً تمام آدمی اس کی طرف دوڑ پڑے۔ مجھے اچانک ایک خیال آ گیا۔ وہ یہ کہ میرے پاس رائل تھی۔ میں وردی میں تو نہیں تھا لیکن رائل سے میں پہچانا جاسکتا تھا کہ میں فوجی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پائلٹ انگریز ہو گا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ ایئر فورس کے پائلٹ افسر ہوتے ہیں۔

لوگ تو پائلٹ کی طرف دوڑے اور میں اپنے جھونپڑے کی طرف دوڑا۔ رائل بستر کے نیچے چھپا دی اور میں جھونپڑے سے دوڑتا ہوا نکلا۔ میں نے سولین پکڑے پن رکھے تھے اور میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ پائلٹ مجھ سے پوچھے گا کہ میں ہندوستانی ہوں اور ان لوگوں میں کیسے رہ رہا ہوں تو میں کیا جواب دوں گا۔

میں نے فور سے دیکھ لیا کہ پائلٹ زمین پر اتر آیا تھا۔ اور وہ اپنا پیراشوٹ لپیٹ رہا تھا۔ میں دوڑتا وہاں پہنچا۔ پائلٹ جب پیراشوٹ لپیٹ چکا تو میں آگے ہوا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ وجہ صاف تھی کہ میں قد بت اور شکل و صورت سے ہندوستانی لگتا تھا اور باقی سب بری تھے۔ میری بڑھی ہوئی داڑھی دیکھ کر وہ یہ بھی سمجھ گیا ہو گا کہ میں مسلمان ہوں۔

”میں ہندوستانی ہوں“ — میں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”آپ اچھی جگہ گرے ہیں۔ ہم لوگ آپ کی پوری پوری مدد کریں گے۔“

اُس نے مسکرا کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اس نے بتایا کہ وہ R.A.F (رائل ایئر

فورس) کا فلائیٹ لیفٹیننٹ ہے۔ آراء ایف برطانیہ کی ایئر فورس کا نام تھا جو اب بھی ہے۔ میں اس کے ساتھ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ فوج کے انگریز افسر اردو بول لیتے تھے اور سمجھتے بھی تھے لیکن ایئر فورس اور نیوی کے انگریز افسر اردو نہیں جانتے تھے۔ میں اپنے ساتھ لے آیا۔ دو آدمیوں سے کہا کہ وہ اس کا پیراشوٹ اٹھالیں۔ پیراشوٹ وانگ اور اس کے دو ساتھیوں نے اچھی طرح لپیٹ کر اٹھایا۔ میں وانگ کے پاس گیا اور اسے کہا کہ اس انگریز کو یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ میں فوجی ہوں۔

انہ اپنے جھونپڑے میں لانے کی بجائے میں اُسے اُس جھونپڑے میں لے گیا جو مجھے سچا اللہ نے دیا تھا۔ میرے کہنے پر وہاں فرش پر بستر بچھا دیا گیا اور میں نے پائلٹ کو س بستر بٹھایا۔ وانگ دوڑا گیا وہ کچھ دیر بعد پانی چائے اور کچھ کھانے کے لیے لے آیا۔ مجھے انگریزی بولنے کی مشق نہیں تھی اس لیے میں رک رک کر بولتا تھا۔ انگریزی س کی مادری زبان تھی اس لیے وہ ذرا تیز بولتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ذرا آہستہ اور مدد بولے تاکہ میں اس کی بات اچھی طرح سمجھ سکوں۔ وہ زندہ دل آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہنسنا اور اس نے کہا کہ وہ آرام آرام سے بولے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مل تک کس طرح آ گیا ہے۔ اس نے بتایا کہ جاپانی برا سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ انگریزوں اور امریکیوں نے مل کر جوابی حملہ کیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں سے لگ بھگ دوڑ لڑی جا رہی ہے۔ اس نے جو فاصلہ بتایا وہ ڈیڑھ سو میل کے لگ بھگ تھا۔ پنے حلق اس نے بتایا کہ اس کا فائبر سکوڈرن جاپانیوں کے مورچوں پر حملے کے لیے آیا تھا۔ حملے کے لیے جانے والے ہوائی جہازوں کی تعداد چوبیس تھی۔ اُسے تقریباً ”نئی تعداد جاپانی جہازوں کی آگئی۔“ نیچے سے ہوائی جہازوں کو گرانے والی توپیں اور ٹینکس فائر کر رہی تھیں۔ فضا میں ہوائی جہازوں کی لڑائی ہوئی اور ہوائی جہاز پھیلتے رہی رہتے گئے۔ یہ فلائیٹ لیفٹیننٹ کچھ زیادہ ہی دُور نکل آیا۔

اس نے بتایا کہ اس کے پیچھے دو جاپانی ہوائی جہاز لگے ہوئے تھے۔ اس وقت تک یہ لیفٹیننٹ جاپانیوں کے دو ہوائی جہاز گرا چکا تھا۔ آخر اس فلائیٹ لیفٹیننٹ کی ٹینکوں کا ایمونیشن ختم ہو گیا۔ اس نے اپنے ہوائی جہاز کے بچاؤ کا یہ انتظام کیا کہ اسے ہوائی جہاز کو غوطے میں ڈال دیا۔ اور درختوں کی بلندی تک پہنچ گیا۔ اسے توقع نہ تھی کہ یہ وادیوں میں چھٹا چھپاتا اڑے گا اور جاپانی ہوا باز واپس چلے جائیں گے لیکن

جاپانی واپس نہ گئے۔

فلائٹ لیفٹیننٹ نے جہاز بلندی پر کھینچا تو جاپانی پھر اس کے تعاقب میں آگئے اور اس کے انجن میں کہیں گولیاں لگ گئیں۔ اس نے مجھے سنایا کہ شاید جاپانیوں کا بھی ایمنیشن ختم ہو گیا تھا اس لیے وہ واپس چلے گئے۔ یہ پائلٹ اتنی دور آگیا تھا کہ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ کہاں آن پہنچا ہے۔ گنوں میں ایمنیشن نہیں رہا تھا اور جب اس نے پٹرول دیکھا تو اس کی سوئی بھی خطرناک حد تک نیچے آگئی تھی۔ اس کے علاوہ جو مشکل اس کے لیے پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ انجن گڑبڑ کرنے لگا تھا۔ کبھی تو انجن بند ہو جاتا اور ایک دوسینڈ بعد خود ہی چل پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ہوائی جہاز ڈول رہا تھا۔

پھر انجن میں سے سفید دھواں نکلنے لگا۔ اب اس پائلٹ کے لیے یہی ایک چارہ رہ گیا تھا کہ وہ ہوائی جہاز میں سے نکل آئے۔ اس وقت وہ ہماری بستی کے اوپر تھا۔ اس نے کاک پٹ اوپر سے کھولی اور ہوائی جہاز میں سے باہر نکل آیا۔ اس طرح اس کی جان بچ گئی۔

”کیا تم نے یہاں یا اس علاقے میں کہیں بھی کوئی جاپانی فوجی دیکھا ہے؟“ — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

”نہیں!“ — میں نے جواب دیا — ”یہ جگہ جنگ سے محفوظ ہے اور جیسا آپ خود بتاتے ہیں کہ یہ جگہ مورچوں سے کم و بیش ڈیڑھ سو میل دور ہے..... اب آپ واپس کس طرح جائیں گے؟“

”میرا وائریس سسٹم بھی خراب ہو گیا تھا“ — اس لیے میں اپنے سکاؤٹرن کمائڈر کو اور اپنے میں کو بتا نہیں سکا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ میرا میں کس طرف ہے۔ ایئر فورس فوج کے اگلے مورچوں سے بہت دور پیچھے ہوتی ہے..... تم کون ہو؟ ان بریوں میں تم کیا کر رہے ہو؟“

”میں رنگون میں کاروبار کرتا تھا“ — میں نے جھوٹ بولا — ”یہ سب لوگ رنگون کے رہنے والے ہیں۔ جب جاپانیوں نے حملہ کیا تو ہم سب وہاں سے بڑے اچھے وقت بھاگے اور یہاں پہنچ گئے۔ یہ بستی خالی پڑی تھی۔ ہم نے یہاں ڈیرے ڈال لیے۔“

”میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم مل گئے ہو“ — اس نے کہا — ”میں ان بریوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ ہمیں سرکاری طور پر بتایا گیا تھا کہ برما کے لوگ انگریزوں

کی نسبت جاپانیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ان بریوں نے ہی جاپانیوں کے لیے برما پر قبضہ آسان بنایا تھا..... کیا تم واپس ہندوستان نہیں جانا چاہو گے؟“

”ہاں نہیں جانا چاہوں گا!“ — میں نے کہا — ”میں تو یہاں ان لوگوں میں جنگ لڑ رہا ہوں۔ میرے لیے مشکل یہ ہے کہ مجھے معلوم ہی نہیں کہ کس سمت کو چلوں اور اگر جاؤں بھی تو کس طرح اتنا لمبا سفر پورا ہو گا۔“

”میں سوچوں گا“ — اس نے کہا — ”میرے پاس اس علاقے کا نقشہ ہے جہاں ہم حملہ کرنے گئے تھے۔ میں نقشہ دیکھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ ہم کہاں ہیں۔ اس کے بعد واپسی کا پروگرام بنائیں گے۔ اگر ہم دونوں اکٹھے چلیں تو سہولت رہے گی۔ ابھی میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تین چار روز یہیں رہوں۔“

”مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں“ — میں نے کہا — ”مجھے آپ جس طرح بھی کہیں گے میں آپ کا ساتھ دوں گا۔“

میں نے صاف طور پر نوٹ کیا کہ یہ آفیسر فوج کے افسروں سے بالکل ہی مختلف تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے مجبوری کے تحت اپنا رویہ اور انداز دوستانہ کر لیا ہو، مگر یہ انگریز مجھے اچھا لگنے لگا۔

دو دن گزر گئے۔ پائلٹ میرے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ ہم لوگ جو غذا کھاتے تھے وہی وہ کھاتا تھا اور پسند بھی کرتا تھا۔ اس کے لیے ہر کھانے میں مچھلی ضرور رکھی جاتی تھی۔ دریا قریب تھا اور مچھلیاں پکڑنے والے ہم میں موجود تھے، وہ مچھلیاں پکڑ لاتے اور ہم کھاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ یہ گورابادشاہ بستی کے اندر زیادہ گھومتا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے میرے ساتھ بری لڑکیوں کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ میں نے بھی ازراہ فلاح یا جوانی کے جذبات میں آکر لڑکیوں کی ہی باتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ وہ کہتا تھا کہ یہاں اس نے کچھ لڑکیاں ایسی دیکھی ہیں جن کے جسم انگریز لڑکیوں سے زیادہ اچھے ہیں۔

وائٹ اور اس کے ساتھیوں نے اسے اس علاقے کی بنی ہوئی شراب بھی پلائی شروع کر دی تھی۔ میں نے اسے دو تین بار کہا کہ وہ اپنا نقشہ دیکھے اور معلوم کرے کہ ہم کہاں ہیں اور کس طرح یہاں سے ہندوستان کی طرف جاسکتے ہیں۔ اب اس کا رویہ

ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتا۔

”معلوم ہوتا ہے آپ کو یہ جگہ پسند آگئی ہے۔“ ایک روز میں نے اسے کہا۔
”کیا یہاں آپ کا دل لگ گیا ہے؟“

”ہاں!“ اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”میں فضا میں بہت لڑا ہوں۔ میرا کچھ دن آرام کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے میرا سکوڈرن کنگ لینڈ میں تھا۔ وہاں میرا سکوڈرن نے جرمینوں کے خلاف بہت لڑائیاں لڑی ہیں۔ پھر ہمیں اوہر بھیج دیا گیا۔ اب مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں اتنی دُور آگراؤں تو میں کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاؤں لو کچھ دن آرام کر کے سوچوں کہ مجھے واپس کس طرح جانا چاہئے۔“

”کیا جاپانیوں نے ہندوستان پر ابھی تک حملہ نہیں کیا؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

”ان کے ہوائی جہازوں نے کلکتہ کے قریب بندرگاہ پر بم گرائے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن اس سے آگے وہ نہیں آسکے۔ اب تو جاپانی حملہ کرنے کی پوزیشن میں رہے ہی نہیں۔ انہیں برا سے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ ہم نے آدھا برا مان سے آزا کر لیا ہے..... میں تمہیں یہ بتا دوں کہ ہندوستان پر ہمارا قبضہ بیش رہے گا۔ ہندوستان کو ہم کسی قیمت پر نہیں چھوڑیں گے۔“

میں اس کے ساتھ ہندوستان کے موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا دل میں انگریزوں کی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ اسی لئے میں اپنی باتیں سے بھاگ آیا تھا۔ اس نے جب کہا کہ انگریز ہندوستان کو کبھی نہیں چھوڑیں گے تو مجھے غصہ سا آگیا اور میرا خاموش رہا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ گورا جلدی یہاں سے چلا جائے۔ ابھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں اسے بیس مار ڈالوں اور لاش دریا میں پھینک دوں۔ مجھے اس گورے کی زندہ دلی اچھی لگتی تھی۔

اگلے ہی روز وہ کچھ زیادہ ہی زندہ دلی پر اتر آیا۔ صبح کے ساڑھے دس یا گیارہ کا وقت ہو گا کہ دو بری دوڑتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ انھوں اور اس پائلٹ کو ساتھ لے کر کسی طرف سیر کے لئے نکل چلیں۔ ان بریوں نے مجھے جو اطلاع دی اس سے میرا خون کھول اٹھا اور میں دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ اُس کا جھونپڑا بستی کی دوسری طرف تھا۔

میں اُدھر جا رہا تھا تو کچھ دُور سے نظر آیا کہ چار پانچ آدمی اس کے جھونپڑے کے باہر کمرے تھے اور جھونپڑے کا دروازہ بند تھا۔ میں بڑی تیزی سے ان تک پہنچا۔ مجھے اطلاع یہ دی گئی تھی کہ اس گورے نے ایک نوجوان لڑکی کو پکڑ لیا ہے اور اسے اپنے ہاتھ جھونپڑے میں لے گیا ہے۔ تین چار آدمیوں نے اس سے لڑکی کو چھڑانے کی کوشش کی تو اس نے ریو اور نکال لیا اور ان آدمیوں کی طرف ریو اور کیا تو وہ سب ہٹ گئے۔ پھر مجھے بتایا گیا کہ لڑکی کو بھی ریو اور سے ڈرا کر وہ جھونپڑے میں لے گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

میں جب اس جھونپڑے تک پہنچا تو چھ سات آدمی جھونپڑے کے باہر کھڑے غصے سے کچھ بول رہے تھے۔ وہاں مجھے احساس ہوا کہ میں خالی ہاتھ آگیا ہوں۔ میں نے اُس گورے سے راقط چھپا کر رکھی ہوئی تھی تاکہ اسے یہ پتہ نہ چل سکے کہ میں فوجی ہوں۔ ایسے موقع جو اس گورے نے پیدا کر دیا تھا میرے ہاتھ میں راقط ہونی چاہئے تھی۔

اس گورے پائلٹ کے پاس ریو اور تھا اور لمبا فوجی چاقو بھی تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ پائلٹ جب فضا میں لڑائی کے لئے جاتے ہیں تو ہر پائلٹ کے پاس ریو اور اور لمبا چاقو یا گورکھوں والی کوکری ضرور ہوتی ہے۔ کوکری یا لکری گورکھوں کا ایک خاص ہتھیار ہے۔ یہ ایک قسم کا چھڑا ہوتا ہے جو آگے سے چوڑا اور پیچھے سے پتلا ہوتا ہے۔ یہ خاص طریقے سے چلایا جاتا ہے۔

یہ جانتے ہوئے کہ اس گورے کے پاس ریو اور اور چاقو ہے، میں نے پھر بھی یہ نہ کیا کہ واپس اپنے جھونپڑے میں جانا اور راقط لے کر آتا۔ میں اسے بد معاشی کا پورا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو اندر جو منظر مجھے نظر آیا وہ بڑی ہی شرمناک اور میرے لئے اشتعال انگیز تھا۔

یہ گورا پائلٹ بالکل برہنہ تھا اور اس نے لڑکی کو بے بس کر کے اپنے نیچے گر لیا ہوا تھا اور اس کے کپڑے بھی اتار دیے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے ریو اور دکھا کر لڑکی کو ڈرایا اور اسے برہنہ کیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ریو اور اس کے قریب فرش پر پڑا تھا۔ میں نے لپک کر ریو اور اٹھالیا اور اس کی ٹالی گورے کی کپٹی پر رکھ دی۔

”گیٹ اپ!“ میں نے اسے کہا۔ ”اپ..... اپ..... گیٹ اپ!“

اُس پر اُس وقت حیوانیت اور شیطانت سوار تھی۔ اُس نے مجھے اس طرح دھکا مارا جیسے میں اس کا غلام تھا اور میری کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ میں نے اپنے دل میں اسے سزائے موت دے دی تھی لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سر میں گولی ماروں اور یہ فوراً "مر جائے۔ میں نے بڑی تیزی سے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے بڑی ہی اذیت ناک موت ماروں گا۔

میں نے اس کی گردن سامنے سے اس طرح ایک ہاتھ میں پکڑ لی کہ اس کی شہ رگ میرے انگوٹھے اور شہادت اور درمیانی انگلی کے شنبے میں تھی۔ میں نے اس کا سانس روک دیا اور اوپر کو زور دیا۔ وہ میرے اٹھتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ ہی اوپر کو اٹھ گیا۔ وہ بے بس ہو چکا تھا۔ میں اسے اسی حالت میں باہر لے گیا اور اسی ہاتھ سے اسے زور سے دھکا دیا۔ اس وقت تک باہر سات آٹھ کی جگہ پندرہ بیس آدمی جمع ہو گئے تھے۔ میرے دھکے سے گور ان آدمیوں کے درمیان جا پڑا۔

"اسے پکڑ لو" — میں نے کہا۔

ان سب نے اسے جکڑ لیا۔ وانگ اور اس کے وہ ساتھی جو اردو سمجھتے تھے وہ بھی پہنچ گئے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ اسے کھلے میدان میں لے چلو۔ گورا پہلے تو مجھے دوستوں کی طرح کہتا رہا کہ میں ان لوگوں کی حمایت نہ کروں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ میرا اور اس کے بعد تمہارا حق ہے کہ ان کی جو لڑکی اچھی لگے اسے استعمال کرو۔ میں نے اسے کچھ بھی نہ کہا جیسے میں اس کی کوئی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ جب لوگ اسے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے تو اس نے بلند آواز میں مجھے اور ان لوگوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ میں اندر جھونپڑے میں چلا گیا۔ لڑکی بیچاری کپڑے پن چکی تھی اور وہ رہی تھی۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے باہر لے آیا۔ اسے اشارے سے بتایا کہ وہ دیکھو اس گورے کا کیا حال کیا جا رہا ہے۔ لڑکی مجھے رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور اُس کے چہرے کے تاثرات میں تشکر کی جھلک نمایاں تھی اور وہ میری مشکور تھی کہ میں نے اُسے ایک حیوان سے بچا لیا تھا۔

میں اُس طرف چل پڑا جس طرف اس فرنگی کو لے گئے تھے۔ وہ جگہ خاصی کٹھن تھی اور ہموار بھی تھی۔ بستی کے تقریباً تمام لوگ شور شرابا سن کر آ گئے تھے۔ وہ نہ آتے تو میں انہیں بلالیتا۔

میرے کہنے پر وہ ایک جگہ رک گئے۔ میں نے وانگ کو بلا کر کہا کہ ان لوگوں سے کہو کہ درختوں کی شبنیاں توڑ کر پتے الگ کر لیں۔ میں نے وانگ کو یہ بھی بتا دیا کہ ان لہیوں کا استعمال کیا ہو گا۔

وانگ نے دوڑ کر یہ اعلان کیا۔ تین چار آدمیوں نے گورے پاگلٹ کو پکڑے رکھا۔ باقی سب شبنیاں توڑنے اور ان کے پتے الگ کرنے لگے۔ اس طرح ہر ایک آدمی کے پاس ایک ایک چھڑی آ گئی۔ اس دوران یہ فرنگی واہی تباہی بکنا رہا۔ گورا برہنہ حالت میں فٹ میں نے وانگ کو آواز دے کر بلایا۔ وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔

"اب یہ کام کرو وانگ!" — "لوگوں سے کہو کہ اسے ان چھڑیوں سے پیٹنا شروع کر دیں۔ یہ مرتا ہے تو مر جائے۔ اسے اسی طرح جان سے مارنا ہے۔" وانگ نے اپنی زبان میں دہیں کھڑے کھڑے اعلان کیا کہ اسے مارنا شروع کر دو۔ لوگوں نے اسے درختوں کی شبنیوں سے پیٹنا جو شروع کیا تو اس کے جسم سے خون پھوٹنے لگا۔ پہلے تو وہ چنچا چلتا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس کی آواز بند ہو گئی۔ وہ گرا۔ لوگوں نے گرے ہوئے پر شبنیاں برسائی شروع کر دیں۔ میں نے دیکھا کہ جو آدمی پیچھے رہ گئے تھے وہ یوں دھکم بھل کر کے آگے جانے کی کوشش کرتے تھے جیسے اس گورے کو مارنا ثواب کا کام ہو۔ میں دور کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ میں نے ویسے ہی دائیں طرف دیکھا تو وہ لڑکی جسے یہ فرنگی اپنے ہاتھ لے گیا تھا میرے پاس کھڑی تھی۔ میں اُسے دیکھ مسکرایا تو اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

"تقریباً نصف گھنٹے بعد لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔ مزید پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے یہ گنہگار فرنگی نظر آنے لگا۔ وہ اب انسان نہیں لگتا تھا۔ اس کا جسم خون کے رنگ جیسا ہو گیا تھا۔ میں اس تک پہنچا۔ اس کا چہرہ بھی پہچانا نہیں جاتا تھا۔ سر سے پاؤں تک کھل لوہڑ مٹی تھی۔ میں نے اس کی نبض پر انگلیاں رکھیں۔ وہ مر چکا تھا۔

میں نے اُردو سمجھنے والے برمیوں سے کہا کہ جس طرح انہوں نے مسیح اللہ اور اس کے ساتھیوں کی لاشوں کو دریا میں پھینکا تھا اسی طرح اس کی لاش کو بھی گھسیٹ کر دریا میں پھینک آئیں۔

اُس روز دریائے ریراوتی کی مچھلیوں کو کھانے کے لیے ایک اور انسان مل گیا۔

شام کھانے کے بعد وانگ اور چند اور بری جو اردو زبان سمجھتے تھے، میرے پاس جایا کرتے اور اُدھر اُدھر کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس شام بھی وہ سب میرے پاس آئے اور قدرتی طور پر ہمارا موضوع یہی انگریز پائلٹ اور اس کا یہ گھناؤنا جرم تھا۔ میں نے ان برمیوں سے کہا کہ ساری بستی میں اعلان کر دو کہ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کی عورت کے ساتھ دست درازی کرے گا اسے یہی سزا دی جائے گی۔

میرے پاس اب ایک ریوالور بھی آگیا تھا جس کے ساتھ چوبیس گولیاں تھیں۔ ایک بڑا چاقو بھی مل گیا تھا۔ میں نے اس گورے کی وردی اور شوز ان لوگوں کو دے دیئے اور کہا کہ کسی کو پہناؤ۔ اس کا پیراشوٹ لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

اس گورے پائلٹ کو لوگوں سے مروا کر میں نے اپنے آپ میں عجیب سی تبدیلی محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے خدا نے مجھے کوئی ایسی طاقت عطا کر دی ہے جو ہر انسان کو نہیں ملتی۔ میں یوں سمجھنے لگا کہ میں جسے چاہوں قتل کروا بھی سکتا ہوں اور کبھی سزا ہوں۔ البتہ میں نے اپنے آپ میں تبدیلی نہ آنے دی کہ میں اپنی اس طاقت پر فخر یا تکبر اور غرور کرتا۔ میں آج سوچتا ہوں کہ میں اگر اس وقت اپنے آپ میں غرور اور تکبر پیدا کر لیتا تو یہ آج تک مجھ میں موجود ہوتا اور میں بڑی ہی فضول زندگی گزار رہا ہوتا۔ میرے یہ بھی سوچتا ہوں کہ وہ فضا اور وہ ماحول اور وہ صورت حال تھی ہی ایسی کہ جس کے ہاتھ میں طاقت تھی وہی بادشاہ تھا۔ یہ کیفیت میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔

اگلے روز تانی اور یون کی شادی ہو گئی۔ بدھ مت کا ایک معتمد پیر وکار موجود تھا۔ شادی اس نے کروائی تھی۔ برمیوں کو جشن منانے کا موقع مل گیا۔ میں نے پہلی بار برمیوں کی شادی دیکھی۔ بری لڑکیاں مل کر بھی ناچیں اور اکیلی لڑکی نے بھی رقص کے کمال دکھائے۔

اگلے روز بھی بستی والوں پر جشن کا موڈ طاری تھا۔ ہر کوئی خوش اور سرگرم نظر آتا تھا۔ تانی اور یون کے والدین نے مل کر ساری بستی کو خاص کھانا کھلایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس رات بھی یہ لوگ ناچ گانا کریں گے لیکن دن کے پچھلے پھر خوشیوں کے اس ہنگامے پر موت کی دہشت طاری ہو گئی۔ دو تین آدمی جنگل میں سے دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے یہ خبر سنائی کہ ایک شیر نے ایک عورت پر حملہ کیا اور اسے اٹھا کر لے گیا ہے۔ عورت جس گھر کی تھی اس گھر میں تو کھرام پرپا ہوتا ہی تھا، میں نے دیکھا کہ

پوری بستی پر سناٹا اور خوف و ہراس طاری ہو گیا تھا۔ مجھے اطلاع ملی تو میں باہر نکلا۔ لوگ ٹولیوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ شیر نے کہاں اور کس طرح حملہ کیا ہے۔

یعنی شاہدوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے کھیتوں میں جو پہاڑی کے دوسری طرف تھے، مئے تو اچانک جھاڑیوں میں سے ایک شیر نے جست لگائی اور اس عورت کو دبوچ لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ شیر نے عورت کی گردن پیچھے سے منہ میں لے لی تھی۔ عورت کی تو آواز بھی نہ نکلی۔ شیر عورت کو گھسیٹا ہوا لے گیا۔ یہ جو آدمی دیکھ رہے تھے یہ چھپ چھپ کر بستی کی طرف دوڑ پڑے۔

میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ شیر کس طرف گیا ہے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ شیر دھاری دار ہے۔ اس سے پہلے شیر یا بھیڑیا بستی کے اتنی قریب نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی دور سے شیر کی دھاڑ یا بھیڑیوں کی آواز سنائی دیا کرتی تھی۔

بستی کے لوگ میرے ارد گرد اس طرح اکٹھے ہو گئے جیسے شیر کو صرف میں ہی مار سکوں گا۔ اُس دور میں میں شیروں کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ شیر سے ہم سمجھتے تھے کہ یہ بھر شیر ہے۔ چیتا بھی سنا تھا۔ میں نے بیس یا تیس سال بعد ایک آدھو شیر کی پہلی کہانی پڑھی تھی۔ یہ اُردو کے ایک رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ پھر میں نے آدھو شیروں کی کہانیاں پڑھنی شروع کیں تو مجھے پتہ چلا کہ دھاری دار شیر بھر شیر نہیں ہوتا بلکہ اسے ٹائیگر کہتے ہیں۔ وہ دھاری دار شیر ٹائیگر تھا جو اس عورت کو پکڑ کر لے گیا تھا۔ یہ تو بہت بعد میں جب میں نے آدم خور شیروں کی کہانیاں پڑھیں تو پتہ چلا کہ آدم خور شیر کو کس طرح مارا جاتا ہے۔ ایک درخت پر چٹان بنائی جاتی ہے۔ نیچے بکرایا بچھڑا باندھا جاتا ہے اور شکاری شام کے وقت چٹان پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ رات کسی وقت شیر بکرے یا بچھڑے کو پکڑنے کے لیے آتا ہے تو اوپر سے اسے گولی ماری جاتی ہے۔

یہ بہت بعد کی بات ہے کہ مجھے یہ معلومات حاصل ہوئی تھیں لیکن برما کے اس جنگل میں جب مجھے بتایا گیا کہ شیر فلاں طرف گیا ہے تو میں نے لوگوں سے کہا تھا میں رائفل لے کر شیر کے پیچھے جاؤں گا اور اسے مار کر واپس آؤں گا۔ میں نے کہا بھی ایسے ہی۔ رائفل کی میگزین میں رائفٹ ڈالے، ایک رائفٹ جیمبر میں کر کے سیفٹی کیج چڑھا دیا اور بائی ایمونیشن جیب میں ڈال کر میں چل پڑا۔ میرے ساتھ چار آدمی ہو گئے۔ ان کے

پاس تلواریں تھیں۔ میرے پاس اب ریو الوز بھی تھا لیکن ان برمیوں میں کوئی ایک بھی آدمی ایسا نہ ملا جو ریو الوز چلا سکتا۔

ہم اس جگہ گئے جہاں شیر نے عورت پر حملہ کیا تھا۔ ایک یعنی شاید ہمارے ساتھ تھا۔ اس کی راہنمائی میں ہم اس طرف چل پڑے جدھر شیر عورت کو لے گیا تھا۔ راستے میں دیکھتا گیا تھا۔ خون کے نشان صاف نظر آئے تھے اور جہاں اونچی گھاس تھی وہاں صاف پتہ چلتا تھا کہ شیر عورت کو گھسیٹ کر لے جا رہا ہے۔ تقریباً ایک میل دور گئے ہوں گے کہ جھاڑیوں میں عورت کی لاش پڑی مل گئی۔ شیر کا کس نام و نشان نہ تھا۔ یہ تو مجھے بائیس سال بعد پتہ چلا تھا کہ شیر اپنے شکار کو اسی وقت کھانے نہیں بیٹھ جاتا بلکہ کبیں جھاڑیوں میں چھپا رہتا ہے اور کچھ دیر بعد یا عموماً رات کے وقت اطمینان سے کھاتا ہے۔ اس وقت ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ عورت کی لاش سامنے پڑی ہے اور شیر وہاں موجود نہیں۔ میں نے اپنے ساتھ جانے والے آدمیوں سے کہا کہ لاش اٹھالیں اور بستی میں لے چلیں۔ ان آدمیوں نے لاش کو اٹھالیا۔ لاش کے کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔ ہم سب بستی کی طرف آ رہے تھے کہ ہم سب نے چونک کر پیچھے دائیں اور بائیں دیکھ لیا۔ یقیناً ہم نے شیر کی ہلکی سی آواز سنی تھی۔ وہ غرایا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے رائفل کا سیفٹی کیچ آن کیا اور رائفل کندھے سے لگا کر نظریں ہر طرف دوڑائیں لیکن اونچی گھاس جھاڑیوں اور درختوں میں شیر کیسے نظر نہ آیا۔ میں نے ان آدمیوں سے کہا کہ وہ تیز چلیں۔ وہ تو ڈر کے مارے بھاگنے کی رفتار سے چل پڑے۔ اور میں زیادہ تر دائیں بائیں اور پیچھے دیکھتا اُلٹے پاؤں چلتا آیا۔ تھوپی دیر بعد ہم نے ایک بار پھر شیر کی ہلکی ہلکی غرائے کی آواز سنی جو زیادہ دور نہیں تھی۔ میں اور زیادہ چوکس ہو کر اُلٹے پاؤں چلنے لگا۔ شیر نظر نہیں آ رہا تھا۔

آخر ہم بستی میں داخل ہو گئے۔ خطرہ تھا کہ شیر بستی کے قریب آ جائے گا۔ ہم اس کا شکار اٹھالائے تھے۔ وہ یقیناً بھوکا تھا ورنہ اس عورت پر حملہ نہ کرتا۔ ساری بستی عورت کی لاش کے گرد اکٹھی ہو گئی۔

عورت مسلمان تھی۔ اُسے غسل دیا گیا۔ کفن نہیں تھا۔ اُسے چادر میں لپیٹ کر دفن کرنا تھا۔ مجھے پیرا شوٹ کا خیال آ گیا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میں کفن کا انتظام کرتا ہوں۔ اپنے جھوپڑے میں جا کر میں نے پیرا شوٹ میں سے چاقو سے بہت بڑا ٹکڑا

کٹا اور یہ عورت کے لواحقین کو دے دیا۔ اُنہوں نے اس میں میت کو لپیٹا اور دفن کرنے کے لیے لے گئے۔ میں بھی اس جنازے میں شریک ہوا۔

○

رات کو جب حسب معمول دانگ اور سات آٹھ آدمی میرے پاس آ کر بیٹھے تو موضوع شیر کا شکار ہونے والی عورت تھی اور شیر تھا۔ اور اس مسئلے پر گفتگو شروع ہو گئی کہ اس شیر کو کس طرح مارا جائے۔

”شیر کو مارنے کا یہ طریقہ نہیں“۔ ایک معمر بری نے کہا۔ ”تمہیں لاش وہاں سے نہیں اٹھانی چاہیے تھی۔ تم رائفل لے کر قریب کے کچھ درخت پر چڑھ جاتے اور اپنے آپ کو شاخوں میں چھپا کر رکھتے۔ شیر نے لاش کو کھانے کے لیے آنا ہی تھا۔ جو نہی وہ آتا تم اوپر سے اسے گولی مار دیتے۔“

”میں اس شیر کو مار کر ہی دم لوں گا“۔ میں کل صبح رائفل لے کر اس کی تلاش میں نکلواں گا۔“

”ایسی بیوقوفی نہ کرنا“۔ اس معمر بری نے کہا۔ ”شیر تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔ وہ چھپ چھپ کر پیچھے سے تمہارے قریب آئے گا اور اس سے پہلے کہ تم سنبھل سکو وہ تمہیں اپنے پنجوں اور منہ میں دیوچ لے گا۔ میں جوانی میں دو بار انگریز شکاریوں کے ساتھ جنگلوں میں گیا ہوں۔ طریقہ یہ ہے کہ کوئی جانور جنگل میں کیسے باندھ دو۔ جگہ وہی موزوں ہے جہاں عورت کی لاش پڑی تھی۔ خود درخت کی شاخوں میں بھپ جانا۔ شیر اس جانور کو پکڑنے کے لیے آئے گا اسے گولی مار دینا۔“

بستی میں خچر میں بھی تھیں، دو گدھے تھے اور تین چار بکریاں بھی تھیں۔ کچھ بحث مباحثے کے بعد یہ طے ہوا کہ کل اس جگہ جہاں سے لاش ملی تھی ایک بکری کو باندھا جائے گا۔ پھر میں کسی قریبی درخت پر چڑھ کر چھپ جاؤں گا۔ معلوم نہیں میرا ذہن اس طریقے کو کیوں قبول نہیں کر رہا تھا۔ یہ تو سال ہا سال بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ شیر کو مارنے کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ میں اس طریقے کو بہتر سمجھتا تھا کہ رائفل لے کر جنگل میں نکل جاؤں گا اور شیر کو مار لوں گا۔

○

یہ لوگ جب رات کو اُٹھ کر چلے گئے اور میں جھوپڑے میں تنہا رہ گیا تو سوچنے لگا

کہ میں شیر کو مار سکوں گا یا نہیں۔ میں یہ نہیں سوچ سکا تھا کہ انسانوں کو مار لینا آسان ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں یہ یقین بیٹھ گیا تھا کہ جس طرح دو منٹ میں میں نے پانچ آدمیوں کو مار دی تھی اس طرح میں شیر کو بھی مار لوں گا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

میں اگلی صبح حسب معمول اس وقت جاگا جب سورج خاصا اوپر آگیا تھا۔ میں خدمت گار کو آواز دینے ہی لگا تھا کہ ناشتہ لے آئے کہ مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی اور کچھ شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں۔ دوڑتے قدم میرے جھونپڑے میں داخل ہوئے اور آنے والے آدمیوں نے مجھے اطلاع دی کہ شیر ایک لڑکے کو ابھی ابھی اٹھا کر لے گیا ہے۔

میں نے راتفل اٹھائی۔ راتفل میں کل کے راؤنڈ پڑے ہوئے تھے۔ میں ان آدمیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا ہر نکلا۔ ہم اُس طرف دوڑتے گئے جدھر ہمیں بتایا گیا تھا کہ شیر لڑکے کو پکڑ کر لے گیا ہے۔ راستے میں یہ آدمی مجھے بتاتے گئے کہ تین چار لڑکے ہستی سے دُور ٹیکری کے پیچھے چلے گئے تھے اور وہ وہاں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اچانک ایک جھاڑی کے اندر سے شیر نے جست لگائی اور تیرہ چودہ سال عمر کے ایک لڑکے کو منہ میں لے کر اُسی طرف چلا گیا جدھر وہ عورت کو لے گیا تھا۔

ہمارے پیچھے چار پانچ آدمی اور دوڑے آئے۔ ان کے پاس تلواریں تھیں۔ یہ عام قسم کی تلواریں نہیں بلکہ یہ چوڑے بلیڈوں والی تلواریں تھیں جو برما اور اس سے اگلے علاقوں میں عام طور پر دیکھنے میں آتی تھیں۔ بعض اوقات لاعلمی بہت فائدہ دیتی ہے۔ اُس وقت مجھے غم نہیں تھا کہ شیر کے تعاقب میں جا کر اسے مارنا بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ مجھے یہ بھی بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ شیر پہلی گولی سے نہیں مرا کرتا۔ پہلی گولی کھا کر وہ گولی چلانے والے پر حملہ کرتا ہے اور عموماً "دوسری گولی چلانے کی مہلت نہیں دیتا۔ اگر شکاری دوسری گولی چلائے بھی تو وہ شیر کو اپنے اوپر آدیکھ کر اتنا گھبرا جاتا ہے کہ اس کی گولی خطا جاتی ہے، پھر اُس کا انجام یہی ہوتا ہے کہ شیر اُسے چیرھاڑ دیتا ہے۔ یہ شیر کا جوابی اور انتقامی حملہ ہوتا ہے۔

میں نے راتفل کے آگے سگین بھی چڑھا رکھی تھی۔ ہم دوڑتے جا رہے تھے اور راستے میں خون کے نشان اور گھاس پر لاش کے کھینٹے کے نشان نظر آرہے تھے۔ بہت

دور جا کر ہم میں سے ایک آدمی اچانک رک گیا اور اس نے ہمارے آگے اپنے بازو پھیلا دیے۔ وہ ہمیں روک رہا تھا۔

"ہیں رکو"۔ اس نے کہا۔ "میں نے شیر کو دیکھ لیا ہے..... چھپ جاؤ اور ذرا آگے جھاڑیوں اور گھاس میں غور سے دیکھو تمہیں شیر بیٹھا ہوا نظر آئے گا۔ مجھے اُس کے کاٹھوڑا سا سر نظر آیا تھا۔"

وہاں گھاس اتنی اونچی تھی کہ اچھے قد کے ایک آدمی کی کمر تک پہنچ جاتی تھی۔ جھاڑیاں بھی بہت زیادہ تھیں اور جھکے جھکے درختوں کی بھی بہتات تھی۔ میرے ساتھی چل گئے اور میں سیدھا چلتا رہا۔ اب ہم سب دبے پاؤں آگے بڑھ رہے تھے اور ہر قدم ہلکے پھلکے کر رکھتے تھے۔

میں نے بائیں طرف دیکھا۔ ایک ٹیکری نظر آئی جو عام زمین سے تھوڑی سی اونچی تھی۔ میں جھک کر چلتا اس ٹیکری پر چلا گیا اور ایک درخت کے پیچھے چھپ کر ادھر دیکھنے لگا۔ جدھر ہمارے ایک ساتھی نے شیر کا سر دیکھا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے ہم نے رت کی لاش اٹھائی تھی۔ مجھے شیر نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ دو بھیڑیے نظر آئے جو ایک رن سے ادھر جا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد تین اور بھیڑیے ادھر سے ہی آتے لٹائی دیے اور وہ تینوں پہلے دو بھیڑیوں سے جا ملے۔ وہاں جھاڑیاں زیادہ بھی تھیں اور ٹیکری بھی تھیں اس لئے نظر نہیں آتا تھا کہ شیر وہاں ہے یا نہیں۔

پانچوں بھیڑیے رک گئے اور پھر سر نیچے کر کے بہت ہی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ وہ جوں جوں آگے ہوتے جاتے تھے اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں چھپتے جاتے تھے۔ اچانک شیر کے غرائے کی آواز سنائی اور اس کے ساتھ ہی شیر کا سر اور پیٹھ نظر آئی۔ وہ بھیڑیوں کو بھگانے کے لئے ان کی طرف دوڑا تھا۔ پانچوں بھیڑیے پیچھے ہٹے اور انڈرائی دیر بعد شیر ایک پہلو سے میرے سامنے آگیا۔ فاصلہ تقریباً "ایک سو گز تھا۔ انکل وہاں تک پوری طرح مار کر سکتی تھی۔ بھیڑیے پیچھے ہٹ کر رک گئے اور شیر ان سے تھوڑی دور رک کر غرائے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شیر نے لڑکے کی لاش یہاں رکھی ہے اور اسے کھا رہا ہو گا کہ اتنے میں بھیڑیے آگئے۔ میں نے راتفل کندھے سے لگائی اور درخت کا سارا لے کر شیر کو شست میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ دھماکہ ہوا اور اس کے اتنی شیر تھوڑا سا اوپر کو اُچھلا مگر اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

شیر شاید یہ سمجھ کر بھیڑیوں کی طرف دوڑا کہ انہوں نے اسے گولی ماری ہے
بھیڑیے پیچھے کو دوڑے۔ شیر پیچھے کو گھڑا اور بڑی زور سے غرایا۔ میں نے اسے ایک بار
پھر شست میں لیا اور گولی چلا دی۔ وہ پہلے کی طرح اچھلا اور گر پڑا۔ اب وہ مجھے نظر نہیں
آتا تھا کیونکہ گھاس اور جھاڑیوں نے اسے چھپا لیا تھا۔

میرے ساتھی جھکے ہوئے چلتے میرے پاس آگئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ شیر کو مار لیا
ہے لیکن یہ یقین نہیں کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اسے غصے سے
غراتا چاہئے تھا۔ ہم نے یہ ارادہ کیا کہ ایک یا دو آدمی چھپ چھپ کر آگے جائیں اور
دیکھیں کہ شیر وہاں موجود بھی ہے یا نہیں اور اگر موجود ہے تو مرا ہوا ہے یا زندہ ہے۔
میں نے وہاں تک پہنچنے کا ایک محفوظ راستہ دیکھ لیا۔ میں ٹیکری کے دوسری طرف
اترا اور اس طرف چل پڑا۔ تلواریں والے دو آدمی میرے ساتھ ہو گئے۔ ہم آہستہ
آہستہ چلتے ٹیکری کی اوٹ میں وہاں تک پہنچ گئے۔ وہاں سے سیدھے ہو کر ایک درخت
کی اوٹ میں سے دیکھا۔ شیر سامنے پڑا تھا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی
تھی۔ اس کا خون بہتا صاف نظر آ رہا تھا۔ میں رائفل آگے کر کے ٹیکری پر چڑھا اور
دوسری طرف اُترا۔ دونوں آدمی میرے ساتھ چل رہے تھے۔ انہوں نے تلواریں تان
رکھی تھیں۔

ایک آدمی نے مجھے روک لیا۔ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور شیر کی طرف پھینکا۔ شیر
دور نہیں تھا پتھر اس کے پیٹ پر لگا۔ شیر نے پھر بھی کوئی حرکت نہ کی۔ ہم تینوں دوڑ کر
قریب پہنچے اور شیر کو دیکھا۔ میں نے رائفل کی ٹالی اس کی طرف کر رکھی تھی۔ میں نے
اس کے سر پر سنگین چھوئی وہ پھر بھی نہ ہلا۔ ہم نے فاتحانہ نعرے بلند کئے۔

میں نے دیکھا کہ میری دونوں گولیاں شیر کے پہلو میں لگی تھیں اور سینے میں سے
گزری تھیں۔ ایک آدمی آگے چلا گیا اور اُس نے آواز دے کر بتایا کہ لڑکے کی لاش
یہاں پڑی ہوئی ہے۔ میں نے جا کر دیکھا۔ تیرہ چودہ سال کا بچہ خون میں ڈوبا پڑا تھا۔ شیر
نے اسے کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا سینہ کھایا ہوا تھا اور پسلیاں نظر آرہی تھیں۔
میں نے ایک آدمی کو بستی کی طرف اس کام کے لئے دوڑایا کہ وہ کچھ آدمیوں کو
لے آئے جو لڑکے کی لاش اور مرے ہوئے شیر کو اٹھالے چلیں۔

یہ شیر کا دوسرا شکار تھا۔ لڑکے کی لاش جب بستی پہنچی تو عورتوں نے چیخ مچا کر

لپٹے سینوں پر ہاتھ مار مار کر ماتم کیا۔ سب نے مرا ہوا شیر دیکھا۔ دیکھنے والوں میں وہ معمر
ہری بھی تھا جس نے مجھے شیر کو مارنے کا صحیح طریقہ بتایا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شیر کے
پاروں پہنچے دیکھے پھر اس کے ہونٹ اوپر پہنچے کر کے اس کے دانت دیکھے۔

”اس نے تو عورتوں اور بچوں کو ہی کھانا تھا“ — اس معمر ہری نے کہا — ”یہ
معلوم نہیں کہاں سے لوہر آ نکلا ہے۔ اس کے بچے بڑھاپے کی وجہ سے اتنے گھس گئے
ہیں کہ یہ اب ہرن اور دوسرے تیز دوڑنے والے شکار کو پکڑ نہیں سکتا۔ اس کے دانت
بھی کمزور ہو گئے ہیں۔ اس کے لئے اب آسان شکار انسان ہی تھا۔ ایسے ہی شیر آدم خور
بن جایا کرتے ہیں۔ ہر شیر ایسا نہیں ہوتا۔ یہ مارا گیا ہے تو سمجھو ہماری بستی محفوظ ہو گئی
ہے۔“

غذے نہیں تھے لیکن میں نے ان سب پر قابو پالیا تھا۔

صرف تانی والا معاملہ سوچیں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ وہ کس قدر حسین لڑکی تھی۔ اس کے حسن میں کوئی ایسی بات تھی کہ صوم و صلوة کی سختی سے پابندی کرنے والا بھی کوئی آدمی اسے دیکھ لیتا تو صوم و صلوة بھول جاتا۔ یہ نو عمر اور دلکش لڑکی رات کے وقت تنہائی میں میرے پاس اس جذباتی کیفیت میں آئی تھی کہ میں اسے جو کتا وہ مان لیتی۔ میں اسے ساری رات اپنے پاس رکھ سکتا تھا لیکن میں نے اسے کہا کہ وہ چلی جائے۔ وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی گئی۔ یہ بات سنانے سے میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ میری اور میرے کردار کی پختگی کی تعریف کریں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ تعریف اُس اللہ کی کریں جس نے ہر انسان کو اتنی قوت عطا کی ہے کہ وہ شیطان کو شکست دے سکتا ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے لیکن میں یہ بھی بتا دوں کہ شیطان پر قابو پانے کے لئے اپنے خلاف یعنی اپنے نفس کے خلاف بڑی ہی شدید جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

یہ تمہید باندھنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کو صرف منفی خیز جذباتی اور چسکے دار کہانیاں ہی نہیں سنانا چاہتا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ میرے اس سفر نامے سے کچھ حاصل کریں۔ جذباتی اور چسکے دار کہانیاں تو میں سناؤں گا ہی۔ ایک نہیں کئی سناؤں گا لیکن میرے سفر نامے کے اس پہلو کو بھی سامنے رکھیں جو آپ کی شخصیت اور کردار کو مستحکم بنانے کی طاقت رکھتا ہے۔

اگر میں آپ کو اچھی طرح نہ سمجھا سکوں تو آپ خود ہی تجزیہ کریں، غور کریں کہ میری شخصیت اور میرے کردار میں اور میرے ذہن میں بھی کیسے کیسے طوفانی انقلاب آئے ہوں گے۔ میں نے ایک انگریز کو مروا دیا اور اس کے بعد ایک آدم خور شیر کو بھی مار ڈالا۔ انگریز ہندوستان کا بادشاہ اور شیر جنگل کا بادشاہ تھا۔ شیر کو راتقل سے مار ڈالنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ شکاری شیروں کو مارتے ہی چلے آئے ہیں اور مارتے چلے جائیں گے لیکن اُس دور میں ایک انگریز افسر کو مار ڈالنا ایسے ہی تھا جیسے کسی نے اپنے اُس دیوتا کو مار ڈالا ہو جس کی لوگ پوجا کرتے ہیں۔

یہ میں اس سفر نامے کے پہلے کسی باب میں بتا چکا ہوں کہ انگریز جب ہندوستان کا بادشاہ تھا تو ہم انتہائی گھٹیا قسم کے گوروں کو بھی آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق سمجھا کرتے تھے۔ ہمارے ہاں یہ مشہور تھا کہ کوئی گورا نظر آئے تو اس کی طرف انگلی سے اشارہ نہ

اگر میں فلسفہ اور نفسیات پڑھا ہوا ہوتا تو کہیں کہیں تجزیہ بھی پیش کرتا جاتا۔ اس طرح بیک وقت دو سفر نامے پڑھنے والوں کے سامنے آ جاتے۔ ایک یہ سفر جو میرے جسم نے کیا اور دوسرا وہ سفر جو میرے ذہن نے طے کیا۔ جسم کا سفر تو سنا چلا جا رہا ہوں لیکن ذہن جن کٹھن راہوں اور جن اجنبی منزلوں سے گزرا وہ اپنی ایک اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں دلچسپی بھی ہے اور میرا خیال ہے کہ میں ان تبدیلیوں کا ذکر کروں جو میرے ذہن میں آئیں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی بھولا بھلا مسافر صحیح راستے پر آجائے اور اللہ اسے اس کی منزل دکھاوے۔

میرے اس سفر نامے کے ابتدائی باب ایک بار پھر پڑھیں۔ آپ کو یاد آجائے گا کہ میں نے اپنے آپ کو نیک اور صاحبِ کردار کہیں بھی ظاہر نہیں کیا بلکہ صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ میں کوئی نیک، شریف اور بااخلاق آدمی نہیں تھا۔ میں بڑے ڈھیلے کردار کا بندہ تھا۔ کسی عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات کو جائز سمجھا کرتا تھا لیکن برما کے ان جنگلوں میں میرے سامنے ایک سے ایک بڑھ کر حسین بری لڑکی تھی۔ یہ لوگ مجھے بڑا ہی طاقتور انسان سمجھتے تھے۔ مسیح اللہ نے اپنی نوسریازی اور چار نامی گرامی غنڈوں کے ذریعے ان لوگوں کو اپنا زر خرید غلام بنا رکھا تھا۔ میں نے مسیح اللہ کو اور اس کے غنڈوں کو مار ڈالا تھا۔ بستی کے لوگ اس وجہ سے بھی مجھ سے مرعوب ہوئے تھے کہ میں نے مسیح اللہ جیسے آدمی کو ختم کر کے اور اس کے غنڈوں کو بھی گولی مار کر بستی والوں کو آڑو کر دیا تھا لیکن میں صاف طور پر سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے بعد مجھ سے متاثر اور مرعوب ہوئے تو میرے اخلاق اور کردار سے متاثر ہوئے۔ دانگ اور اس کے ساتھی بھی کچھ کم

کرنا اور نہ وہ بہت ناراض ہو گا اور معلوم نہیں کہیں کیسی سزا دے لیکن میں نے ایک گورے افسر کو اس طرح مروا دیا جس طرح لوگ باؤلے کتے پر حملہ کر کے اسے مار ڈالتے ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ فرنگی ہمارے ذہن اور دل پر ہی نہیں بلکہ ہماری روحوں پر بھی غلبہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے بادشاہ اور جنگل کے بادشاہ کو مار ڈالا تو بہتی والوں پر یہ عالم طاری ہو گیا کہ میں انہیں کہتا کہ مجھے دیوتا سمجھو اور میرے آگے سجدہ کرو تو یہ لوگ روح کی گمراہیوں سے میرے آگے سجدے کرتے لیکن میرے اندر کچھ اور ہی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ میں نے اپنے ذہن میں خیال بٹھالیا کہ یہ مظلوم لوگ کسمپرسی کی حالت میں مجھے اپنا محافظ سمجھتے ہیں۔ میری اپنی یہ حالت تھی کہ میں خدا کو اپنا حافظ، حامی اور ناصر سمجھتا تھا اور میرے دل سے یہ دعائیں نکلتی تھیں، اے پیدا کرنے والے، میری جان کی حفاظت کرنے والا صرف تو ہے۔

میرے دماغ میں یہ سوچ آگئی کہ میں اللہ سے اپنی حفاظت کی بھیک مانگ رہا ہوں اور یہ لوگ مجھے اپنا محافظ سمجھ رہے ہیں۔ اگر میں نے اس ذمہ داری میں کوتاہی یا بددیانتی کی تو اللہ یہیں مجھے سزا دے دے گا۔ یہ لوگ رنگون سے یا جہاں جہاں سے بھی آئے تھے، اپنی جانیں بچا کر ہی نہیں لائے تھے بلکہ یہ اپنی عورتوں کی عزتیں محفوظ رکھنے کے لئے یہاں اس جنگل میں آکر آباد ہوئے تھے۔

○

میں چلا تو کسی اور منزل کی طرف تھا لیکن ایسے ماحول میں یا ایسی دنیا میں پہنچ گیا جہاں صرف حادثات کی یا عجیب و غریب واقعات کی ہی توقع رکھی جاسکتی تھی۔ بات آگے چلانے سے پہلے میں بتانا چاہتا ہوں کہ شیر کے مرنے کے بعد لوگوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ میرے بھیجے ہوئے آدمیوں نے جب بہتی میں جا کر اطلاع دی کہ میں نے شیر کو مار دیا ہے تو بہتی کی ساری آبادی اٹھ دوڑی اور مرے ہوئے شیر کو دیکھنے کے لئے لوگوں نے جو دھکم پیل کی وہ بڑی ہی دلچسپ تھی۔ سب لوگ بہت خوش تھے کہ ایک بہت بڑا خطرہ ختم ہو گیا ہے۔ جو لوگ شیر کو دیکھ لیتے تھے وہ وہاں سے ہٹ کر مجھے چراغی کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ میں نے شیر مارا ہے۔ میری بہادری تو اب صدقہ اور صلہ ہو چکی تھی۔

لوگ شیر کو تھیت کر بہتی میں لے آئے۔ تین چار آدمیوں نے مل کر شیر کی کھال اندری۔ میں اپنے جھوپڑے میں چلا گیا۔ رات کو مجھے بتایا گیا کہ بہت سے لوگوں نے شیر کو بکرے کی طرح کاٹ کاٹ کر اس کا گوشت آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شیر کا گوشت صرف غیر مسلمانوں نے ہی کھایا ہو گا لیکن پتہ چلا کہ بعض مسلمانوں نے بھی یہ حرام گوشت کھالیا تھا۔

”یہ گوشت تو کسی کے لئے بھی جائز نہیں تھا“ — میں نے کہا — ”کسی بھی بہ میں درندے کا گوشت جائز نہیں سمجھا جاتا“۔

”تمہیں شاید معلوم نہیں“ — پاس بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے بری نے کہا — ”اگر اپنے ہاتھوں مارے ہوئے شیر کا گوشت کھالیا جائے تو کھانے والے میں شیر جیسی بری پیدا ہو جاتی ہے اور دل سے ڈر نکل جاتا ہے“۔

میں نے سوچا کہ اس جنگل میں اور اس قسم کی زندگی میں جیسی یہ لوگ گزار رہے ہیں کچھ ہی جائز ہے۔

وانگ عقلمند آدمی تھا۔ اگر وہ اتنا عقلمند نہیں تھا جتنا میں سمجھتا تھا، تو اس کی یہی خوبی ہے کہ کئی تھی کہ وہ میرا مخلص دوست تھا اور اس سے ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وہ مجھے دھوکا دے گا۔ اُس کے چار پانچ ساتھی بھی اُس جیسے تھے۔ میں نے انہیں کئی بار مانتا تھا کہ مجھے دریا پار کرادیں اور منزل تک پہنچادیں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ میں ہاتھوں تک پہنچ کر انڈین نیشنل آرمی کے ہیڈ کوارٹر میں جانا چاہتا ہوں۔ ہر بار وانگ اور مائے ساتھیوں نے میری حوصلہ شکنی کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہو سکتا ہے جاپانیوں نے ایک جال بچھایا ہو اور وہ ہندوستان کے فوجیوں کو اس جال میں پھاس کر انہیں جنگی لاش بنالیتے ہوں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ کہتے تھے کہ عورتوں کے معاملے میں جاپانی بیک نہیں اور اس قسم کی قوم پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔

شیر کو مارنے کے دو تین دن بعد میں نے وانگ سے پھر کہا کہ وہ مجھے کوئی گائیڈ نہیں دے سکتا تو راستہ ہی بتا دے، میں خود ہی چلا جاؤں گا۔

”ایک بات پر غور کریں صاحب!“ — وانگ نے کہا — ”آپ کو معلوم ہے کہ مائل اُس قصبے میں گیا تھا جہاں سے ہم اپنی ضرورت کی چیزیں لایا کرتے ہیں۔ وہاں لاشیں یہ خبر پھیلی ہوئی ہے کہ جاپانی برا سے بھاگ رہے ہیں۔ وہ جو خود بھاگ رہے

میں نے اس سفر نامے میں پہلے جاپانیوں کے متعلق یہ بتایا ہے کہ جاپان نے جنگ سے بہت پہلے سکا پور، ملایا، برما اور ان تمام علاقوں میں جو آج کل انڈونیشیا کہلاتے ہیں، ہندوستان کا جال بچھا دیا تھا۔ ہندوستان میں بھی جاپان کے جاسوس موجود تھے۔ میں یہ خیالات آپ کو سنا چکا ہوں، اب میں آپ کو یہ سنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جاپانی کس ذریعہ لوگ تھے اور ان میں جانیں قربان کرنے کا جذبہ کس قدر شدید تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے جنگ کے بہت بعد جا کر معلوم ہوئی تھیں۔ مجھے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں جاپانیوں کی ہمدردی اور قومی جذبے کی کہانیاں مشہور ہوئی تھیں۔ جاپانیوں کے دشمنوں نے برطانیہ، امریکہ اور دوسرے تمام یورپی ممالک نے اپنے اخباروں اور رسالوں میں جاپانیوں کے جذبہ ایثار کے واقعات اور داستانیں شائع کی تھیں اور خراج تحسین بھی پیش کیا تھا۔

میں یہ ساری باتیں پہلے ہی لکھ دیتا ہوں تاکہ ان کے پیش نظر آپ میرا سفر نامہ دیکھیں۔ جاپانیوں کے ان جذبوں کی تفصیلات میں اپنے جاپانیوں کو خاص طور پر سنا رہا ہوں۔ یہ جذبہ مسلمانوں میں ہوا کرتا تھا لیکن جاپانیوں نے معلوم نہیں اس جذبے کو اہل بیچک دیا ہے۔ آج شدید ضرورت ہے کہ پاکستانی حکمران اور عوام اس جذبے کو زور و زندگی سے دیکھیں اور نہ ہندو جیسا بزدل اور عیار و دشمن ہمارا نام و نشان مٹا دے گا۔

جاپانی سرنڈر یعنی ہتھیار ڈالنے کے تصور سے ہی نا آشنا تھا۔ میں نے جنگ کے بعد بے شک ایسی بے شمار کتابیں پڑھی ہیں جن میں جاپانیوں کے طریقہ جنگ کی تفصیلات ملتی ہیں۔ جاپانی فوج برما سے اس خیال سے پیچھے ہٹتی چلی گئی کہ انہیں کمک مل جائے گی۔ درہ از سر نو تنظیم اور ترتیب میں آکر پھر حملہ کریں گے۔ برما سے آگے انہوں نے بے شمار علاقے فتح کر رکھے تھے۔ انہیں کہیں سے بھی کمک، سپلائی اور ہر طرح کی مدد مل سکتی تھی۔ بعض جنگی مقاصد نے لکھا ہے کہ جاپانیوں نے وائنٹ برما سے سپلائی اختیار کی تھی اگر انگریز اور آگے آجائیں اور پھر ان کے ساتھ حساب کتاب برابر کیا جائے لیکن اب جاپانیوں کو مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپان کی فوج اپنے ملک سے بہت دور آچکی تھی۔

فوج پر دیکھیں جاپان کہاں ہے اور برما اور ہندوستان کتنی دور ہیں۔ یہ بحر الکاہل ہے کہ اس میں اتنے زیادہ جزیرے ہیں جن کا کوئی شمار نہیں۔ ان میں بعض جزیرے بہت

ہیں وہ ہندوستان کی کیا مدد کریں گے۔ اب آپ جاپانیوں پر اتنا اعتبار نہ کریں صاحب! اگر آپ نے جانتی ہے تو کچھ دن اور انتظار کر لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جاپانیوں کے ساتھ جاپانی اور انہیں شکست ہو جائے۔ پھر آپ پکڑے جائیں گے تو انگریز و دیں آپ کو کوئی مار دیں گے۔“

”میں نے دانگ کی اس بات کو رد نہ کیا۔ اس انگریز پائلٹ نے بھی جسے میں نے ہوا دیا تھا، مجھے بتایا تھا کہ جاپانی پیچھے ہٹ رہے ہیں اور آدھا برما آزاد کر لیا گیا ہے۔ میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا۔ میری پوزیشن میرے لئے بہت خطرناک تھی۔ جاپانی ہوا پر تھے یا انڈونائس کر رہے تھے، میری پوزیشن یہ تھی کہ میں پکڑا جاتا تو فوراً مجھے پیچھے ہٹنا پڑتا اور میرا کورٹ مارشل ہوتا۔ اگر سزائے موت نہ ملتی تو پانچ چھ سال کی سزائے قید ضرور مل جاتی۔ یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے جاپانی پیچھے ہٹ کر انڈین نیشنل آرمی کو ساتھ ملا لیں اور پھر حملہ کریں۔ مجھے ابھی معلوم نہیں تھا کہ آئی این اے میں ہندوستان کی کتنی کتنی نفری اکٹھی ہو گئی ہے۔ برما فرنٹ پر آنے سے پہلے ہمیں یہ پتہ چل گیا تھا کہ جاپانیوں نے سکا پور، ملایا اور سماٹرا وغیرہ میں انگریزوں کی جتنی فوج تھی اس سے ہتھیار ڈالوا لئے ہیں۔ اس فوج میں ہندوستان کی نفری بے شمار تھی۔ اگر یہ ساری نفری جاپانیوں نے آئی این اے میں شامل کر لی تھی تو پھر وہ دوبارہ برما پر زوردار حملہ کر سکتے تھے۔“

میرے سامنے ایسا مسئلہ آپڑا تھا جس کا مجھے کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے اپنا انتخاب بھی اچھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سزائے سجنے کی صرف ایک صورت میرے سامنے آتی تھی۔ انگریز برما پر دوبارہ قابض ہو جاتے تو میں نے اس صورت کو سامنے رکھ کر سوچا کہ میرے سارے پکڑے اتار کر یا صرف پتلون پین کر انڈین آرمی کی کسی یونٹ میں جا چنچوں اور کون گام کہ مجھے جاپانیوں نے جنگی قیدی بنا لیا تھا اور میں وہاں سے فرار ہو گیا تھا اور راستے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے جنگوں میں ہسٹنا پھر تاربا ہوں۔

سوچ سوچ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ابھی ان لوگوں کے ساتھ ہی رہوں پھر دیکھیں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔ میں نے دانگ سے کہا کہ وہ تیسرے چوتھے روز قحبے میں جا کرے اور جنگ کی تازہ بہ تازہ خبریں لایا کرے۔

چھوٹے ہیں۔ ان میں نہ کوئی آبادی اُس وقت تھی نہ آج ہے، اور کچھ جزیرے بہت سی بڑے ہیں جن میں فلپائن ایک ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے کم بڑے جزیروں کا بھی کوئی حساب کتاب نہیں۔ بڑے جزیروں میں آبادی اُس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے۔

جپانیوں نے ان تمام جزیروں پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر وہ سنگا پور، ملایا اور ہمایک پہنچے تھے۔ جپانی فوج اور نیوی اچانک حملہ آور ہوئی تھیں اور سمندری طوفان کی طرح آئیں اور سارے بحر الکاہل پر چھا گئی تھیں۔ انہوں نے کوریا اور چین کے خاصے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔

جپانیوں کے پاس فوج بھی بہت تھی، ایئر فورس بھی کچھ کم نہ تھی اور اس کی نیوی اتنی مضبوط اور طاقتور تھی کہ اس میں طیارہ بردار بحری جہاز بھی تھے۔ یہ ساری جنگی قوت بڑی ہیبت ناک جنگی قوت تھی لیکن جپان کی ہائی کمانڈ اور جپان کے بادشاہ ہیروید نے یہ سوچا ہی نہیں کہ انہوں نے محاذ کو یا دوسرے لفظوں میں میدان جنگ کو اتنا زیادہ پھیلا دیا ہے کہ ہر جگہ تک وہ سپلائی اور کمک نہیں پہنچا سکیں گے۔ اعلیٰ جپانی کمانڈروں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ان کا مقابلہ انگریزوں سے ہے جن کی بادشاہی بلا مغالہ آرمی دنیا پر پھیلی ہوئی ہے۔ انگریزوں کے پاس ایک تو اپنی فوج تھی، اس کے ساتھ ہندوستان، آسٹریلیا، افریقہ اور ایسے کئی ممالک کی فوجیں تھیں۔ اس کے علاوہ امریکہ انگریزوں کا اتحادی تھا۔ امریکہ کے پاس ذرائع اور وسائل بہت ہی زیادہ تھے۔ امریکہ کی جنگی طاقت انگریزوں سے بھی زیادہ تھی۔

میں جنگ کی تفصیلات سنا کر آپ کو بور نہیں کروں گا۔ میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ جپان نے محاذ اتنا زیادہ پھیلا کر اپنے لئے ایسے مسائل پیدا کر لئے تھے جن کا کوئی حل اس کے پاس نہیں تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جپانی فوجوں کی پسپائی شروع ہو گئی تھی۔ امریکہ کی بحری اور فضائی طاقت کا ہی کوئی حساب نہ تھا۔ امریکہ اور برطانیہ کی بحری فوجوں نے مل کر جپانیوں کو برما سے پسپا کر دیا پھر انہیں جاوا، سائرا، ملایا اور سنگا پور سے بھی نکل دیا۔ وہاں یعنی ان جزیروں پر ہوائی جہازوں سے اور بحری جہازوں سے بھی آگ برسائی گئی تھی۔ جپانی بحر الکاہل کے ہزار ہا چھوٹے بڑے جزیروں پر قابض تھے۔ ایک ایک بڑے جزیرے پر حملے کئے گئے تاکہ جپانیوں کو ہر جزیرے میں ختم کیا جائے۔

یہاں سے جپانیوں کی حیران کن بہادری اور جانیں قربان کرنے کا جذبہ سامنے آیا۔ میں صرف یہ واقعات مختصراً پیش کروں گا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ جپانیوں کے ہاں ہتھیار ڈالنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جپانیوں کا جذبہ یہ بھی تھا کہ کوئی جپانی جنگی قیدی نہیں بنتا تھا۔ جنگی قیدی بننے کی بجائے جپانی خود کشی کر لیتے تھے۔ اس خود کشی کو جپانی زبان میں ہارا کیری کہا جاتا تھا اور جپانی بڑے فخر سے خود کشی کیا کرتے تھے۔ خود کشی سے پہلے ہر جپانی نعرہ لگاتا تھا — ”شمنشاہ جپان کے نام پر“ — خود کشی کو جپانی مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔

ٹینک کا مقابلہ ٹینک ہی کر سکتا ہے یا ٹینک ٹینک توپ کا گولہ اثر کرتا ہے۔ ٹینکوں کو روکنے کا ایک طریقہ ٹینک ٹینک بارودی سرنگ بھی ہے۔ یہ بارودی سرنگیں ٹینکوں کے راستے میں پہلے ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بچھا دی جاتی ہیں۔ انہیں زمین میں چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ جب کوئی ٹینک اس سرنگ کے اوپر سے گزرتا ہے تو بارودی سرنگ اس کے وزن سے پھٹ جاتی ہے۔ یہ اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ ٹینک کو تباہ کر دیتی ہے۔

ایسے واقعات جنگ کے بعد فوجیوں نے بھی سنائے تھے اور میں نے انگریزوں کی دو کتابوں میں بھی یہ واقعات پڑھے تھے کہ اچانک ٹینک یا بکتر بند گاڑیاں آگئیں۔ جپانیوں کو قبل از وقت پتہ نہ چل سکا۔ وہ دشمن کے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے سامنے مورچوں سے نکل کر نہیں آ سکتے تھے کہ بارودی سرنگیں بچھا سکیں۔ بارودی سرنگیں بچھانے کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔ جپانی سپاہیوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک ایک بارودی سرنگ ہاتھ میں لے لی اور پیٹ کے بل ریختے ہوئے کسی نہ کسی لوٹ کے پیچھے چھپتے ہوئے ٹینکوں کے راستے میں آگئے۔ ایک ایک سپاہی ایک ایک ٹینک کے قریب ہو گیا۔ جونہی ٹینک قریب آیا، جپانی سپاہی نے سرنگ اس کے پٹے کے آگے رکھ دی۔ ٹینک سرنگ کے دھماکے کا شکار ہو گئے اور اس کے آگے سرنگ رکھنے والے جپانی کے جسم کے بھی پرچے اڑ گئے۔

امریکی فوجوں نے بحر الکاہل کے ان بڑے بڑے جزیروں پر حملہ کیا جن پر جپانی فوج قابض تھی۔ ہر جزیرے میں یہ مظاہرہ دیکھنے میں آیا کہ جپانی ہار گئے لیکن پنا نہیں ہو رہے تھے۔ ان کا جانی نقصان بے شمار ہوا۔ امریکی فوج نے اعلان کئے کہ ہتھیار ڈال دو لیکن جپانیوں نے ہتھیار نہ ڈالے۔ اس کی بجائے انہوں نے اپنے آپ کو گولیاں مار لی

شروع کر دیں یا رانٹوں سے ٹکئیں اتار کر اپنے دلوں میں اتار لیں۔ میں نے ایک انگریزی کتاب میں یہ واقعات پڑھے تھے۔ یہ کتاب ایک امریکی صحافی نے لکھی تھی۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ محاذ پر گیا تھا۔ اس نے لکھا کہ جب ایک جزیرے میں جاپانی فوجیوں نے ہتھیار ڈالنے کی بجائے خودکشی کرنی شروع کر دی تو ایک جاپانی سپاہی کو دیکھا کہ اپنے مورچے سے باہر نکل آیا۔ امریکی سمجھے کہ وہ ہتھیار ڈال کر ان کی طرف آئے گا لیکن اس جاپانی نے یوں کیا کہ ایک گرینیڈ ہاتھ میں لیا، اُس کی پن نکالی، اپنی سٹیل ہیلٹ اتاری اور گرینیڈ اپنے سر پر رکھ کر اوپر سٹیل ہیلٹ رکھ لی اور بڑے آرم سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈ گزرے تو گرینیڈ ہولناک دھماکے سے پھٹا۔ کوئی دیکھ نہ سکا کہ جاپانی کہاں اڑ گیا ہے۔ اُس کے جسم کے ٹکڑے دور دور بکھر گئے تھے۔

ایک جزیرے میں تو اس سے زیادہ حیران کن منظر دیکھنے میں آیا۔ امریکی فوج نے وہاں بھی جاپانیوں پر غالب آ کر اعلان کیا کہ ہتھیار ڈال دو لیکن جاپانیوں کی طرف سے گولیاں آتی رہیں۔ ان کے فائر سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ان کی نفری ہمت تھوڑی رہ گئی ہے۔ آخر جاپانیوں کی طرف سے فائر بند ہو گیا۔

امریکی فوجی یہ جانتے ہوئے کہ جاپانیوں کی زیادہ تر نفری ماری گئی ہے اور ان میں لڑنے کی ہمت نہیں رہی، جاپانیوں کے مورچوں کے قریب نہیں جاتے تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ ایک جاپانی مشین گن ہاتھ میں لئے سامنے آ جائے گا اور مشین گن کے فائر سے ہمارے ہمت سے آدمیوں کو مار کر ایک گولی اپنے آپ کو مار لے گا۔ ان جاپانی مورچوں میں مکمل طور پر خاموشی طاری ہو گئی تو امریکی فوج نے پیش قدمی کی۔ قریب گئے تو مورچے خالی تھے اور وہاں جتنے بھی جاپانی تھے وہ سب مرے پڑے تھے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ جاپانیوں کی ساری نفری ماری گئی ہو۔ وہ بد گھنا جنگل تھا جس میں اوچی اور پھیلی ہوئی جھاڑیاں بھی تھیں اور اوچی نیچی ٹیکریاں بھی تھیں۔

امریکی دوڑتے ہوئے آگے گئے تھے لیکن انہیں کوئی جاپانی فوجی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دو تین امریکی اوچی ٹیکریوں پر چڑھ گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اوپر بلایا اور کہا کہ وہ تماشا دیکھو۔ امریکی دوڑتے ہوئے اوپر گئے۔ انہوں نے سمندر کی طرف دیکھا جو وہاں سے دور نہیں تھا۔ جاپان کے جو فوجی بچ گئے تھے وہ سمندر میں آگے ہی آگے چلے جا رہے تھے۔ وہ پانی میں چلتے گئے اور پانی گھٹنوں سے کمر اور کمر سے اوپر ہو گیا۔ پھر

جاپانیوں کے سر باہر رہ گئے اور پھر سر بھی غائب ہو گئے۔ یہ کم و بیش ڈیڑھ ہزار فوجی تھے جنہوں نے اپنے آپ کو سمندر کے حوالے کر دیا تھا۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی حیرنے کی کوشش نہیں کی نہ پھران میں سے کوئی پانی کی سطح پر نمودار ہوا۔

اب سنیں کہ ہالین کمانڈر، بریگیڈ کمانڈر اور ڈویژن کمانڈر ہار جانے کی صورت میں کیا کرتے تھے۔ یہ کمانڈر جب دیکھتے تھے کہ اب ان کی شکست یقینی ہو گئی ہے تو وہ تمام افسروں کو اگلے مورچوں سے دور پیچھے کسی غار میں یا کسی ایسی جگہ جہاں انہوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر بنائے ہوتے تھے، اکٹھے کر کے باقاعدہ ایک تقریب منعقد کرتے تھے۔ تمام افسر شرب کا ایک ایک یا دو دو گھونٹ پیتے تھے۔ کمانڈر مختصری تقریر کرتا تھا جس میں وہ اپنے ان سپاہیوں سے جو مارے جاتے تھے، معافی مانگتا تھا کہ وہ اپنا فرض ادا نہیں کر سکا۔ وہ اپنے شہنشاہ سے معافی مانگتا اور ایک چھوٹے ساز کی تلوار جو ہر بڑے افسر کے پاس ہوتی تھی نکال کر اپنے پیٹ میں اُس مقام پر رکھ کر جہاں پسلیاں ختم ہوتی ہیں، دونوں ہاتھوں سے تلوار اپنے پیٹ میں اتنی زور سے اتار لیتا تھا کہ تلوار کی نوک پیٹھ کی طرف سے باہر آ جاتی تھی۔ اس طرح کئی ایک سینئر کمانڈروں نے جن میں بریگیڈیئر اور جرنیل شامل تھے، نے خودکشی کی تھی۔

جاپانی اپنے شہنشاہ کو سورج کا بیٹا کہتے تھے اور اب بھی ان کا عقیدہ یہی ہے کہ ان کا بادشاہ سورج کا بیٹا ہے۔ جنگ عظیم والا بادشاہ ہیرو ہٹو تقریباً ”دو سال گزرے مر گیا ہے اور اب اس کا بیٹا بادشاہ ہے۔ جاپان میں جمہوریت رائج ہے، اس کے ساتھ انہوں نے انگریزوں کی طرح بادشاہ کو بھی روایتی طور پر ساتھ رکھا ہوا ہے۔

جاپانیوں نے جنگ کے آخری دنوں میں جذبہ حب الوطنی کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ ساری دنیا کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ امریکہ کا بحری بیڑہ بہت ہی بڑا تھا۔ بحری جنگ میں جاپانی خاص مہارت رکھتے تھے لیکن ان کا بحری بیڑہ امریکہ کے مقابلے میں کم تھا۔ پھر بھی انہوں نے سمندر میں بڑی دلیری سے مقابلہ کیا۔ ان کا بیڑہ جلد ہی تقریباً ”ختم ہو گیا۔ اس صورت حال میں امریکہ کا بحری بیڑہ بڑی تیزی سے جاپان کی طرف بڑھنے لگا۔ جاپانیوں کے پاس اتنی بحری طاقت رہی ہی نہیں تھی کہ امریکہ کے بحری بیڑے کو روک سکتے۔

ایک روز جاپان کی ایئر فورس کے ایک اعلیٰ افسر نے اپنے جو بیس لڑاکا ہوا بازوں کو بلایا اور انہیں بتایا کہ امریکہ کے بحری جہاز بڑی تیزی سے جاپان کی طرف بڑھے آ رہے

ہیں اور انہیں روکنے کے لیے جاپان کے پاس بحری بیڑہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس نے کہا کہ اب ایک ہی طریقہ ہے کہ ایک ایک ہوا باز اپنے ہوائی جہاز کو اڑا لے جائے اور ہر ہوا باز اپنے لیے ایک ایک امریکی بحری جنگی جہاز دیکھ لے اور اس پر غوطے میں جا کر اپنا طیارہ بحری جہاز کی چٹنی پر کریش کر دے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں کسی کو ایسا حکم نہیں دے سکتا، مجھے ایسے رضا کاروں کی ضرورت ہے جو اپنے وطن پر اپنی جان قربان کر دیں۔ اُس نے کہا کہ ادھر ایک جان جائے گی اور ادھر امریکہ کا اتنا بڑا جنگی جہاز تباہ ہو جائے گا۔

مجھے ایئر فورس کے اس آفیسر کا نام یاد نہیں رہا۔ وہ ساری دنیا میں مشہور ہوا تھا اور دنیا بھر کے جنگی وقائع نگاروں نے اسے خراج تحسین پیش کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اسے رضا کاروں کی ضرورت ہے لیکن چوبیس کے چوبیس ہوا بازوں نے اپنی جانیں پیش کر دیں۔ کسی ایک نے بھی ہچکچاہٹ کا اظہار نہ کیا۔

میں تفصیل سے یہ طریقہ جنگ یا دفاع کا یہ حیران کن طریقہ نہیں سن رہا، مختصری بات کرتا ہوں۔ اگر میں ایک ایک جاپانی ہوا باز کا واقعہ سناؤں کہ وہ کس طرح جوش و خروش سے گئے اور انہوں نے کس طرح امریکی بحری بیڑے کی کمر توڑی، تو آپ کے روکتے کھڑے ہو جائیں اور آپ خون میں ابال محسوس کریں۔ مختصر یہ کہ ان چوبیس ہوا بازوں نے اپنے اپنے طیارے امریکہ کے بحری جہازوں پر کریش کیے اور امریکی بحری بیڑے کی پیش قدمی روک گئی۔

امریکہ کے بمبار ہوائی جہازوں نے جاپان پر خصوصاً جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو پر اتنی زیادہ بمباری کی تھی کہ شہر کو طے کا ڈھیر بنادیا تھا۔ جاپان کے چند اور بڑے شہروں کا بھی امریکی ایئر فورس نے یہی حال کیا تھا لیکن جاپانیوں کے مورال کو نہ توڑا جاسکا۔ جرمنی بہت بڑی جنگی طاقت تھی۔ یورپ میں جرمنی نے تباہی مچادی تھی لیکن جرمنی کو آخر ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ جاپانی شکست تسلیم نہیں کر رہے تھے۔

جاپان نے اتنے زیادہ لڑاکا بمبار طیارے امریکہ کے بحری جہازوں پر کریش کر دیے کہ پیچھے ایئر فورس میں بہت تھوڑے طیارے رہ گئے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ پہلے چوبیس ہوا باز مارے جا چکے تھے۔ باقی ہوا باز دوڑ دوڑ کر آتے اور اس فہرست میں نام لکھواتے تھے۔ ہر ہوا باز کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اسے انتظار میں نہ رکھا جائے اور فوراً خود کش مشن پر بھیجا جائے۔

اس طرح ہوائی جہاز ضائع ہوتے چلے گئے اور ادھر ہوائی جہاز بنانے والے بننے بمباری سے تباہ ہو گئے۔ اس تشریفناک صورت حال میں جاپانیوں نے ایک ایسا تیار کر لیا جو بارود سے بھرا ہوا تھا اور اس میں ایک ہوا باز کے بیٹھنے کی جگہ بھی بنائی گئی تھی۔ گائیڈز کی طرح اس میں کنٹرول بھی رکھے گئے تھے۔ یہ بم ایک ہوائی جہاز کے نیچے دیا جاتا تھا۔ ہوائی جہاز کا ہوا باز سمندر پر جا کر کسی امریکی بحری جہاز کو دیکھ لیتا اور اس کو اپر چلا جاتا۔ وہاں وہ بم کو جہاز سے ریلیز یعنی الگ کر دیتا تھا۔ ہوائی جہاز تو واپس چلا آیا مگر بم کے اندر بیٹھا ہوا پائلٹ بم کو جہاز کی چٹنی کے اوپر لے جاتا تھا۔ بحری جہاز کا تان بم کو اپنے جہاز کے اوپر آتا دیکھ کر اپنے جہاز کا رخ دائیں بائیں کرنے لگتا تاکہ بم اندر میں جا کر لے لیکن بم میں بھی پائلٹ ہوتا تھا جو بم کو دائیں بائیں کرتا تھا۔ آخر بم ہی جہاز جہاز پر گرتا اور جہاز کو تباہ کر دیتا تھا۔ اس کا پائلٹ بھی بم کے ساتھ ہی ٹکڑے ہو جاتا تھا۔

ان خود کش ہوا بازوں کو جاپانی زبان میں کسی کاڑے کہا گیا تھا۔

اب جاپان کی جنگی صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ وہ ایک دن بھی لڑنے کے قابل نہ رہا تھا لیکن جاپانی لڑے رہے تھے۔ انہوں نے خود کش ہوا بازوں کے ذریعے امریکہ کے بحری بیڑے کو روک لیا تھا۔ آخر امریکہ نے جاپان کے دو بڑے شہروں ہیروشیما اور ساکی پر ایک ایک ایٹم بم گر لیا تو جاپان نے شکست تسلیم کر لی تھی۔ جاپان کا بادشاہ اور باکمان کبھی شکست تسلیم نہ کرتی لیکن ایٹم بموں نے شہری آبادی کو اور شہروں کو تباہ کر دیا۔ اگر جاپان کی حکومت ہتھیار نہ ڈالتی تو مزید شہریوں کی تباہی کا خطرہ تھا۔

اب اس سے بھی زیادہ حیران کن اور انوکھی بات سنیں اور تصور میں لائیں کہ ان ہاتھوں کا جذبہ کیا تھا۔ اس کا انکشاف 1952ء میں بحر الکاہل کے ایک غیر آباد جزیرے ماہولہ ہوا یہ کہ امریکہ کی نیوی کے کچھ آدمی اس جزیرے میں گئے یا وہ کوئی انجینئر تھے اس جزیرے میں کچھ بنانا چاہتے تھے۔ بہر حال یہ کوئی سرکاری پراجیکٹ تھا۔ جب ان ایک آدمیوں نے جزیرے پر قدم رکھا تو سامنے سے ان پر ایک گولی فائر ہوئی۔ سب مر ادھر ہو گئے۔ ان آدمیوں کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر آگے گئے تو ان پر ایک گولی فائر ہوئی۔ عجیب بات ہے کہ دونوں گولیاں خطا گئیں اور کوئی زخمی بھی ہوا۔

کہ جاپان کو شکست نہیں ہو سکتی۔ وہ مرتے دم تک لڑنا چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ اسے اُس جہاز پر بھیجا جائے جہاں لڑائی ہو رہی ہے۔ اسے بڑی مشکل سے قابو میں لایا گیا تھا۔

اب ایسا ہی ایک اور دلچسپ واقعہ سنیں۔ ”حکایت“ میں میرے اس سفر نامے کی دسویں قسط شمارہ مئی میں شائع ہو چکی تھی تو میرے ایک دوست نے امریکہ کا ایک ہفتہ وار پرچہ ”نیوزویک“ دکھایا۔ یہ یکم مئی 1995ء کا شمارہ ہے۔ میرے دوست جانتے ہیں کہ میرے دماغ پر ابھی تک برما کے جنگلات اور پھر اس سے اگلا سفر اور پھر جاپانی سوار ہیں۔ انہیں اس موضوع پر کوئی مضمون یا واقعہ کہیں بھی چھپا ہوا ملتا ہے تو وہ مجھے دکھاتے ہیں۔ ”نیوزویک“ امریکہ کا اتنا مشہور پرچہ ہے کہ یہ ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ میرے اس دوست نے یہ پرچہ مجھے دکھایا اور میں نے پڑھا تو خیال آیا کہ میں یہ بھی اپنے سفر نامے میں شامل کر دوں۔ میں نے اپنے اس دوست کو کہا کہ وہ مجھے اس کا ترجمہ اچھی آواز میں لکھ دے۔ یہ کام اس نے کر دیا اور میں نے یہ اضافہ مدیر ”حکایت“ کو بھیج دیا کہ یہ بھی میرے سفر نامے میں شامل کر دیں۔ ”نیوزویک“ میں ایک جاپانی فوجی کا انٹرویو شائع ہوا ہے جو 1974ء تک فلپائن کے جزیرے لوباگ میں موجود رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی اور اس کا یہ فرض بھی ختم نہیں ہوا کہ وہ اس جزیرے کا دفاع کرتا رہے

یہ جاپانی اپنے فرض اور اپنے ملک کی آن کے سلسلے میں پاگل پن کی حد تک جذباتی تھا۔ اسے ہر کوئی پاگل پن ہی کہے گا کہ جس وقت اسے یعنی 1974ء میں اس جزیرے میں دیکھا گیا اُس وقت جنگ کو ختم ہوئے 30 سال گزر گئے تھے۔

اس جاپانی کا نام ہیرو انودا ہے۔ اس وقت وہ برازیل میں اپنے ایک بھائی کے ساتھ رہتا ہے جہاں ان کا بہت بڑا زرعی فارم ہے۔ ہیرو انودا نے اپنے حالیہ انٹرویو میں بتایا کہ اسے 1945ء میں جنگ ختم ہونے سے پہلے فلپائن سے ذرا ہی دور اس جزیرے میں بھیجا گیا تھا۔ اس وقت یہ جزیرہ جاپان کے قبضے میں تھا۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اس جزیرے میں اکیلا کس طرح رہ گیا تھا۔ برحال اس نے جنگ جاری رکھی۔

اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم گرائے جا چکے ہیں اور جاپان نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے اور جنگ ختم ہو گئی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے جزیرے میں سے اسے فلپائن کا ایک ہوائی اڈہ صاف نظر آتا تھا۔ اس اڈے سے لڑاکا

مختصریات یہ کہ کچھ دیر بعد ایک جاپانی سپاہی راکفل تانے ہوئے سامنے آیا۔ اس نے کہا کہ یہ جزیرہ اس کا ہے اور اس کی ڈیوٹی ہے کہ وہ اس جزیرے کا دفاع کرے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب تک جنگ ختم نہیں ہو جاتی اور اسے اس جزیرے سے نکلنے کا حکم نہیں ملتا وہ یہاں سے نہیں جائے گا اور کسی کو جزیرے میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ اسے بتایا گیا کہ جنگ ختم ہوئے سات سال گزر گئے ہیں تو بھی اس نے یقین نہ کر لیا یقین کرنے کی بجائے اس نے ان لوگوں کو دھمکی دی کہ وہ اس جزیرے سے نکل جائیں ورنہ وہ ان سب کو گولیاں مار کر ختم کر دے گا۔ وہ مان ہی نہیں رہا تھا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔

کچھ بحث مباحثے کے بعد اس جاپانی فوجی نے کہا کہ اسے شہنشاہ جاپان کا تحریری حکمنامہ دکھایا جائے تو وہ مان لے گا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے۔

وہ لوگ جزیرے سے نکل آئے اور امریکی حکومت کو بتایا کہ اس جزیرے میں ایک جاپانی سپاہی موجود ہے جو کام میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ امریکی حکومت نے جاپان کی حکومت کو اطلاع دی۔ جاپان کے فوجی ہیڈ کوارٹر کو حکم دیا گیا کہ وہ اس سپاہی کو وہاں سے لے آئیں۔ جاپان کی فوج کے ایک دو افسروں نے اس فوجی کو بتایا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اس لیے وہ واپس چلے۔ تب وہ جزیرے سے نکلا۔ یہ خبر دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔

اس واقعہ کو انوکھا اور دلچسپ واقعہ کہا گیا تھا اور اسے اپنی نوعیت کا واحد واقعہ سمجھا گیا تھا لیکن دو سال بعد ایک اور جزیرے سے ایک جاپانی فوجی کی اطلاع آئی کہ وہ ابھی تک جزیرے کے دفاع میں چوکس اور چوکنا ہے اور کسی کو قریب نہیں آنے دے رہا۔ اسے وہاں سے لانے کے لیے جاپان کی فوج کے افسر گئے تو اس نے جزیرہ چھوڑا اور سکون کا سانس لیا کہ آج وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوا ہے۔

اڑھائی یا تین سال اور گزرے ہوں گے کہ ایک اور چھوٹے جزیرے میں چار جاپانی جاپانی فوجی دیکھے گئے جو ابھی تک جزیرے کا دفاع کر رہے تھے۔ جنگ کو ختم ہوئے چودہ سال گزر گئے تھے۔

میں نے ایسا ایک اور واقعہ پڑھا تھا۔ اس سپاہی نے تو اپنی فوج کے افسروں کو بھی بریشان کر دیا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ جاپان کو شکست ہوئی ہے تو وہ مانتا ہی نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا

مبارطیاریے اڑتے رہتے تھے اور لینڈنگ بھی کرتے تھے۔ انودا سمجھا کہ جنگ ابھی تک جاری ہے۔

میں قارئین کو بتانا چاہتا ہوں کہ جاپان نے تمام تر فلیپائن پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور جب امریکہ کے بحری جہازوں اور بری فوج نے جوابی حملہ کیا تو جاپانیوں کو فلیپائن سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔

ہیرو انودا نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ اسے معلوم نہیں ہو سکا کہ 1952ء میں کوریا میں جنگ ہوئی تھی۔ اسے دیت نام کی اتنی خوفناک اور طویل جنگ کا بھی پتہ نہ چل سکا۔ 1974ء میں ایک جاپانی مہم جو نوریو سوزوکی اس جزیرے میں گیا تو اُس نے ہیرو انودا کو دیکھا۔ سوزوکی نے اسے بتایا کہ جنگ کو ختم ہوئے 30 سال گزر گئے ہیں اور وہ اب واپس چلے۔ ہیرو انودا نے جواب دیا کہ جب تک اسے تحریری حکم نہ ملے گا وہ اس جزیرے سے نہیں نکلے گا کیونکہ اس جزیرے کا دفاع اس کی ذمہ داری ہے۔

سوزوکی واپس جاپان گیا اور وہاں فوجی ہیڈ کوارٹر میں گیا اور ہیرو انودا کے متعلق بتایا کہ وہ فلاں جزیرے میں ابھی تک پھر دے رہا ہے اور وہ واپسی کے لیے تحریری حکم مانگتا ہے۔ فوجی ہیڈ کوارٹر نے اسے تحریری حکمنامہ بھیجا تو وہ واپس جاپان گیا۔

اس نے اس جنگ میں 30 سال جس طرح گزارے اور جس طرح وہ اپنی ڈیوٹی دیتا رہا، یہ بڑی دلچسپ داستان ہے جو میں سناتے لگا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اس کا انٹرویو اب اپریل 1995ء کے آخر میں لیا گیا ہے۔ میں آپ کو اس کی دو تین باتیں سنائوں گا۔ ان باتوں پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس جذبے کی آج پاکستان کو ضرورت ہے اور کیا لوگوں میں یہ جذبہ موجود ہے؟..... اس سے پوچھا گیا کہ اس نے کیا سوچا تھا کہ وہ ساری عمر اسی جزیرے میں گزار دے گا؟..... اس نے جواب دیا کہ وہ اپنی عمر کا اندازاً حساب رکھے ہوئے تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سا مہینہ اور کون سا سال ہے۔ اس نے کہا کہ وہ 60 برس کی عمر تک یہ ڈیوٹی دینا چاہتا تھا اور 60 برس سرکاری طور پر ریٹائر ہونے کی عمر ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ 60 برس کی عمر پوری کر کے اس نے اپنے آپ کو گولی مار دی تھی لیکن واپس جاپان نہیں جانا تھا تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے یہ شخص اپنا جزیرہ خالی چھوڑ آیا ہے۔ یہ ہیرو انودا کی خوش قسمتی تھی کہ اسے 60 برس کی عمر سے ذرا پہلے اس جزیرے سے نکال لیا گیا۔

ہیرو انودا دراصل انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ وہ فوجی ہی تھا اور اسے جاپان کے ایک فوجی انٹیلی جنس کے سکول میں ٹریننگ ملی تھی۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس نے اتنا لمبا عرصہ اس گھنے جنگل میں رہنا برداشت کس طرح کیا ہے؟..... اس نے جواب دیا کہ ہمیں انٹیلی جنس ٹریننگ سکول میں یہ پڑھایا گیا تھا کہ ہمیں اپنے ملک پر اپنی جان، اپنی عزت اور اپنا ہم قربان کر دینا ہے۔ اس اصول کو اور اس عہد کو کہ اپنے ملک پر سب کچھ قربان کر دینا ہے ہر جاپانی اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے۔

انودا سے پوچھا گیا کہ امریکہ کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ سوال منجھکے خیز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سوچنا بیکار ہے کہ کون سا ملک اچھا ہے اور کون سا ملک بُرا ہے، میں یہ دیکھتا ہوں کہ میں جاپان میں پیدا ہوا تھا اس لیے جاپان بہت اچھا ملک ہے اور مجھے اس کے لیے قربانیاں دینی چاہیں۔

میں نے ان سب جاپانیوں کے متعلق جو مختلف جنگوں پر جنگ کے بعد بھی سال ہا سال تک ڈیوٹی دیتے رہے، یہ نہیں بتایا کہ وہ وہاں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے کیا کرتے رہے اور ڈیوٹی کس طرح ادا کیا کرتے تھے۔ یہ تفصیلات ہیں تو دلچسپ اور دوسلوں کو نئی زندگی دینے والی لیکن میں ایک تو اپنی کہانی کو طول نہیں دینا چاہتا اور دوسرے یہ کہ میں صرف ایک قومی جذبہ قارئین کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

اب میں جاپان کی نئی زندگی کے متعلق مختصر سی بات کروں گا۔ پہلے ذرا اپنی بات ہو جائے۔ مشرقی پاکستان میں ہمارے اقتدار پر ست سیاسی لیڈروں نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ ہمارے دشمن کو زمین دوز تخریبی کارروائیاں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ سیاسی لیڈروں کے پیدا کردہ حالات نے نوبت جنگ تک پہنچا دی جس میں ہماری فوج کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور مشرقی پاکستان ہم سے کٹ گیا۔ اس کے بعد ہونا یہ چاہیے تھا کہ اپنی غلطیوں اور اپنے گناہوں کا سامنا کرتے، اللہ سے معافی مانگتے اور عبرت حاصل کرتے لیکن ہم نے باقی آدھے پاکستان کو بھی تباہی کے دھانے تک پہنچا دیا۔ مشرقی پاکستان کے حلق ہمارے لیڈروں نے اور بعض سیاسی ذہنیت کے جرنیلوں نے یہ رویہ اختیار کر لیا کہ شکست کی ذمہ داری ایک دوسرے پر پھینکتے گئے اور ان سب نے شکست کی بلکہ اپنے سیاسی گناہوں کی ساری سیاسی فوج کے منہ پر ٹل دی۔ اس طرح قومیں اور ملک تباہ ہو جایا کرتے ہیں۔ میں آپ کو جاپان کی نئی زندگی کی بات سناتا ہوں۔

امریکی حکومت امریکہ میں یہ مہم چلا رہی ہے کہ لوگ صرف امریکہ کی بنی ہوئی مصنوعات خریدیں اور چلانی مصنوعات کو منڈی میں پڑا رہنے دیں لیکن لوگ تو اپنے کائے ہوئے پیسے کے عوض وہ چیز خریدتے ہیں جو پائیدار اور لوگوں کی ضرورت کے مطابق ہو۔

مجھے امریکہ اور چلان کی صنعت و تجارت کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں نہ میں ان دونوں ملکوں کی تجارتی رقابت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، میں صرف وہ جذبہ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں جس نے چلان کو قبر میں سے نکال کر نئی زندگی دی ہے۔ یہ جذبہ وہی ہے قرآن اور احادیث نے اہل اسلام کو دیا تھا۔ قائد اعظمؒ نے یہ جذبہ قوم کو ان الفاظ میں دے دیا تھا۔ ”کلم، کلم، کلم“ اور پھر یہ۔ ”اتحاد، یقین، تنظیم“۔ اگر وہی نظر سے دیکھا جائے تو یہ دو اصول ہمارے دین کے جزو ہیں اور یہی وہ جزو ہیں جن سے ہماری لائق قوم دستبردار ہو گئی ہے اور آج تباہی اور بربادی کے عمل سے گزر رہی ہے۔

چلانیوں کا بنیادی جذبہ حب الوطنی ہے۔ پھر وہ کام اور اپنی ذمہ داریوں کو مذہبی پابندی سمجھتے ہیں۔ شاید قارئین کی نظروں سے غیر ملکی پرچوں کے یہ مضمون گزرے ہوں کہ چلانی جہاں بھی اور جس شعبے میں بھی کام کرتے ہیں، وہ اس قدر کام کرتے ہیں کہ چھٹی کے بعد بھی کام میں جتنے رہتے ہیں۔ اس حد تک کہ وہاں ایک بیماری پیدا ہو گئی ہے جس میں چلان کے ورکر جیتلا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے تشویش کا اظہار کیا ہے کہ اس بیماری کا تعلق اعصاب کے ساتھ ہے۔ یہ لوگ اتنا کام کرتے ہیں کہ ملبہ پر برداشت سے زیادہ بوجھ پڑ جاتا ہے اور اکثر ورکر اعصاب زدگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہاں میں پاکستان کی ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں ہماری فضائیہ کے شاہبازوں نے بھارت کی طاقتور ایئر فورس کا حشر کر دیا۔ اس وقت کے ایئر فورس کے کمانڈر انچیف ایئر مارشل ریٹائرڈ نور خان نے جنگ کے ایک پریس کانفرنس میں جس میں غیر ملکی اخبار نویس اچھی خاصی تعداد میں موجود تھا، کہا تھا۔ ”میرے لئے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ اپنے ہوابازوں کو اتنی بڑی ایئر فورس مقابلے میں کس طرح بھیجوں بلکہ میرے لیے مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اپنے ہوابازوں کو دشمن پر بڑھ بڑھ کر حملے کرنے سے روکوں کیسے۔“

آج کا چلان جنگ عظیم والے چلان کے طبقے کے نیچے سے اٹھا ہے۔ یوں کہہ لیں کہ چلان اپنی قبر میں سے نکلا اور از سر نو زندہ ہوا ہے۔ اینٹ سے اینٹ بجا دیا ایک محاورہ ہے۔ امریکہ کے ہمسایہ ہوائی جہازوں نے اور بحری جہازوں کی توپوں نے چلان کی صحیح معنوں میں اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور دارالحکومت کے علاوہ دیگر بڑے شہروں اور کارخانوں کو طبقے کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا۔ پھر اس ملک پر دو ایٹم بم گرائے گئے۔ چلان کی صرف زمین رہ گئی تھی اور اس زمین پر چلتے پھرتے کچھ چلانی رہ گئے تھے۔ امریکہ نے اپنی فوج چلان میں بھیج دی جو سارے چلان پر قابض ہو گئی۔ اس فوج کو زبانی حکم دیا گیا کہ چلان کی عورتوں کی اتنی آمیزش کی جائے کہ اس قوم میں وقار اور آبرو نام کی کوئی چیز باقی نہ رہے۔ چلانیوں کی تو اب صرف ایک ضرورت باقی رہ گئی تھی اور یہ تھی دو وقت کی روٹی۔ وہاں تو بھوک اور مفلسی کا غلبہ تھا۔ امریکی فوجیوں نے چلانی لڑکیوں اور جوان عورتوں کو جبراً ”خراب نہ کیا بلکہ انھیں دو وقت کی روٹی کے عوض دوست بنالیا اور ان کے ذہنوں کو بدلنے کی ترکیبیں کرنے لگے۔ ایک تو انھیں عصمت اور آبرو سے محروم کیا اور اسے محبت کا نام دے کر ان پر امریکی کلچر اور امریکہ کی نام نہاد عظمت طاری کی۔ امریکہ کا مقصد یہ تھا کہ چلانیوں کا قومی جذبہ کچل دیا جائے اور انھیں ذہنی طور پر امریکہ کا غلام بنالیا جائے۔

کئی امریکی فوجیوں نے چلانی لڑکیوں کے ساتھ شادی کر لی۔ ہزار ہا چلانی عورتوں نے امریکی فوجیوں کے ناجائز بچے پیدا کیے۔ ان بچوں میں سے کئی ایک کو امریکہ لے جایا گیا۔ ساری دنیا دیکھ رہی تھی کہ چلان جسمانی طور پر ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ چلان کی روح بھی ختم ہو گئی ہے بلکہ اس روح پر امریکہ قابض ہو گیا ہے۔ نظریہ آ رہا تھا کہ چلان کا نام و نشان مٹ گیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب چلان امریکہ کی نو آبادی بن جائے گا۔ پھر تھوڑے ہی عرصے بعد جو معجزہ ہوا وہ بھی ساری دنیا نے دیکھا۔ آج دیکھ لیں، صنعت و حرفت کے لحاظ سے چلان ساری دنیا پر چھا گیا ہے۔ الیکٹرانک کے آلات صرف چلان کے ساری دنیا میں مقبول ہیں اور انھیں ہی قابل اعتماد اور مستند سمجھا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں چلان کی بنائی ہوئی کاریں اور موٹر سائیکلیں چلتی ہیں۔ امریکہ کو دنیا کا ایک بڑا صنعتی ملک سمجھا جاتا ہے لیکن امریکہ میں بھی چلان کی مصنوعات مقبول ہیں۔ امریکہ اس قدر پریشان ہو گیا ہے کہ اس نے حال ہی میں چلان پر کچھ پابندیاں عائد کرنے کا اعلان کیا

کہاں گئے وہ جذبے؟

○

میں نے اپنی اصل کہانی سے ہٹ کر جذبول کا قصہ چھیڑ دیا تھا اور بات اتنی لمبی کر دی ہے کہ مجھے شک ہے کہ کچھ خواتین و حضرات نے بوریٹ محسوس کی ہوگی۔ اگر ایسا ہے تو میں ان خواتین و حضرات سے معافی نہیں مانگوں گا بلکہ یہ کہوں گا کہ ان باتوں میں بوریٹ محسوس کرنے والے پاکستانی تو ہیں لیکن وہ سچے پاکستانی نہیں۔ ان میں جذبہ حب الوطنی رہا ہی نہیں۔ ان باتوں میں بوریٹ محسوس کرنے والے کہتے ہوں گے کہ یہ چہرہ ایک جلیانی پاگل ہو گئے تھے جو جنگ ختم ہو جانے کے برسوں بعد بھی جنگوں میں پڑے رہے اور بات یہ بتانی کہ وہ حکم کے بغیر یہاں سے نہیں نکلیں گے..... میں ہر ایک پاکستانی سے کہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے ملک کو تباہی سے اور اپنے آپ کو کسی دشمن کی غلامی سے بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو جذبہ حب الوطنی اور فرض شناسی کے جذبے کی دیوانگی بلکہ پاگل پن پیدا کرنا پڑے گا۔

اب میں اپنے سفر نامے کی طرف آتا ہوں۔ میں نے بہت بعد کی باتیں اس لئے پہلے ہی آپ کو سنا دی ہیں تاکہ آپ کو پتہ چل جائے کہ جلیانی کیسے لوگ تھے اور امریکہ اور برطانیہ کو کس قوم سے پالا گیا تھا۔

وانگ اور اس کے ساتھی مجھے روک رہے تھے کہ میں آگے نہ جاؤں اور کچھ دن انتظار کر لوں۔ میں نے بھی یہی بہتر سمجھا..... اس بستی کے لوگ زیادہ تر مچھلی کھاتے تھے۔ یہ غذا انہیں دریائے ایراوتی سے مفت مل جاتی تھی۔ اس دریا میں مچھلی کی کمی نہیں تھی۔ کشتیاں موجود تھیں، کچھ لوگ دریا میں چلے جاتے اور سب کے لئے مچھلیاں پکڑ لاتے تھے۔ ایک روز وانگ نے مجھے کہا کہ میں کبھی بھی ان کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے نہیں گیا، اب چلوں۔ میں نے خوشی کا اظہار کیا کہ اس طرح دریا کی سیر ہو جائے گی اور ایک اچھا شغل بھی مل جائے گا۔

میں وانگ کے ساتھ چل پڑا۔ کشتی کھینے کے لئے دو آدمی ساتھ تھے۔ میں نے راتقل اپنے ساتھ لے لی۔ دریا بالکل قریب تھا۔ ہم وہاں گئے، ایک کشتی میں بیٹھے اور کشتی کو دریا کے بہاؤ پر چھوڑنے کی بجائے ملاحوں نے اوپر کی طرف یعنی جس طرف سے دریا آتا تھا کشتی کو کھینا شروع کر دیا۔

تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ بستی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہاں سے دریا ٹرنا تھا۔ اس کے علاوہ وہ پہاڑی علاقہ تھا اور جنگل بہت گھنا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی اور ہی دنیا میں جا نکلے ہیں۔ ہم خاصی دور اوپر چلے گئے اور ان لوگوں نے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ ان کے پاس چھوٹا سا جال بھی تھا اور بانسوں کے ساتھ بندھی ہوئی دو گڈیاں بھی تھیں۔

میرے اندازے کے مطابق بارہ بج چکے تھے جب خاصی تعداد میں مچھلیاں پکڑ لی گئی تھیں۔ وانگ نے کہا کہ اب واپس چلنا چاہئے۔ کشتی کے چپو الگ رکھ دیئے گئے اور کشتی بہاؤ کے ساتھ بننے لگی۔ ہم نے واپسی کا تقریباً "آدھا سفر طے کیا ہو گا کہ بارہ تیرہ سال عمر کا ایک لڑکا دریا کے کنارے پر دوڑتا آ رہا تھا۔ ہمیں دور سے دیکھ کر اس نے دایاں بازو اوپر کر کے زور زور سے لہراتا شروع کر دیا۔ اس کی رفتار دوڑنے کے انداز اور بازو لہرانے سے ہمیں فکر پیدا ہو گیا کہ بستی میں کوئی واقعہ یا حادثہ ہو گیا ہے۔ دونوں ملاحوں نے کشتی کے چپو مارنے شروع کر دیئے تاکہ کشتی کی رفتار تیز ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کشتی کو کنارے کے ساتھ کر لیا۔

"کیا ہو گیا ہے؟" — وانگ نے قریب جا کر لڑکے سے پوچھا — "کیوں دوڑے آ رہے ہو؟"

کشتی کو کنارے پر روک لیا گیا۔ لڑکے نے بڑی گھبرائی ہوئی آواز میں تیز تیز بولتے ہوئے اپنی زبان میں کچھ کہا۔

"لو بھائیو!" — وانگ نے اردو میں کہا — "جلیانی بستی میں بھی پہنچ گئے ہیں۔"

یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ میں جلیانیوں کو ڈھونڈ رہا تھا اور وہ خود ہی ہمارے پاس آگئے ہیں لیکن وانگ نے آگے جو بات بتائی اس سے میں شش و پنج میں پڑ گیا۔

"یہ کہتا ہے کہ نو جلیانی ہیں" — وانگ نے لڑکے کی پوری بات سن کر بتایا —

"وہ فوجی ہیں اور ان کے پاس رائفلیں بھی ہیں۔ انہوں نے ساری بستی کی آبادی کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا ہے اور ان میں سے جوان عورتوں کو الگ کر کے کھڑا کر دیا ہے۔ لڑکا بتاتا ہے کہ وہ سخت غصے میں بولتے ہیں اور جو آدمی ان کا اشارہ نہ سمجھے یا آہستہ چلے تو اسے وہ رائفوں کے بٹ مارتے ہیں..... یہ لڑکا اُس وقت جب جلیانی آئے بستی سے ذرا پُور تھا اس نے خود ہی یہ سوچ لیا کہ ہمیں اطلاع دے دے۔ اس نے ہمیں کشتی میں اس طرف آتے دیکھ لیا۔"

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ میں جاپانیوں کے پاس سیدھا چلا جاؤں اور انہیں کہوں کہ میں بھگوڑا ہو کر آیا ہوں اور آئی این اے میں شامل ہونا چاہتا ہوں یا پہلے چھپ کر دیکھ لوں کہ ان جاپانیوں کا رویہ کیا ہے۔ میں نے وانگ سے بات کی اور اُسے کہا کہ وہ مجھے مشورہ دے۔

”ہوش کی بات کرو صاحب!“ — وانگ نے کہا — ”ان جاپانیوں پر بھروسہ نہ کرنا۔ ان کے متعلق ہم پہلے ہی بہت سی باتیں سن کر رنگوں سے بھاگے تھے۔ ہم جس قصبے میں جاتے رہتے ہیں، وہاں کے لوگوں نے بھی ہمیں جاپانیوں کے متعلق بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ جاپان کے فوجیوں کو یہ اجازت ہے کہ وہ جس علاقے کو فتح کریں وہاں سے تمام خوبصورت لڑکیاں اکٹھی کر کے اپنے ساتھ رکھ لیں۔ جاپانی فوج میں اسے ہر فوجی کا حق سمجھا جاتا ہے۔ اب یہ سوچو کہ ہم ان سے اپنی عورتوں کی عزت کس طرح محفوظ رکھیں گے..... ذرا سوچو صاحب!“

”ایک بات میری بھی سن لو صاحب!“ — وانگ کے ایک ساتھی نے اردو میں کہا — ”آپ ان کے ساتھ دوستی لگانا چاہتے ہیں اور آپ کی دوستی ہو جانے سے جاپانی ہماری عورتوں کو چھوڑ تو نہیں دیں گے۔ آپ سوچیں کہ آپ ان کے ساتھ دوستی لگائیں اور وہ آپ کے مذہب کی لڑکیوں کو آپ کے سامنے خراب کریں، آپ یہ برداشت کر لیں گے؟“

”ہاں صاحب!“ — وانگ بولا — ”آپ کو یہ سوچنا چاہئے کہ ہمارے اس دوست نے کیا کہا ہے..... لیکن صاحب! میرے دماغ میں ایک بات آتی ہے جو شاید آپ کو پسند نہ آئے..... ہمارے ساتھ اور اس بستی کے مسلمانوں کے ساتھ آپ کا خون کا کوئی رشتہ تو ہے نہیں۔ آپ کہیں گے کہ آپ نے تو جاپانیوں کے پاس ہی جانا تھا یہ لڑکیوں کے ساتھ عیش موج کرتے ہیں تو کرتے رہیں، اگر یہ مسلمان ہیں تو ہوتے رہیں! وانگ کی یہ بات میرے دل میں تیر کی طرح اتر گئی۔ میں نے اپنے خون میں ابل محسوس کیا۔

”یہ بات نہ کہو وانگ!“ — میں نے کہا — ”تمہارے ساتھ اور تمہاری عورتوں کے ساتھ میرا جو رشتہ بن گیا ہے وہ خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط اور مقدس ہے۔ باقی رہے مسلمان، تو تم شاید نہیں جانتے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے اپنی

ہی کیوں نہ ہو ان کا آپس کا رشتہ اسلام کی وجہ سے خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے..... میں تمہیں اپنے دل کی بات بتاتا ہوں۔ یہاں جتنی عورتیں ہیں وہ سب میرے خون کے رشتے کی عورتیں ہیں۔ میں نے سب سے پہلے اس کے غنڈوں کو کیوں قتل کیا تھا؟ صرف اس لئے کہ وہ ان عورتوں کو خراب کرتے تھے۔ انہیں مار کر یہی کام اس راتقل کے زور پر میں بھی کر سکتا تھا اور اب بھی کر سکتا ہوں لیکن نہیں کروں گا۔“

جب نیت صاف ہو اور انسان کے دل میں ایمان کی روشنی ہو تو اللہ سیدھا راستہ دکھایا کرتا ہے۔ میں نے وانگ اور دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ کشتی یہیں چھوڑ دیتے ہیں اور ہم بستی میں نہیں جائیں گے بلکہ اپنی طرف والی پہاڑی کے اندر چلیں گے اور اوپر جا کر کہیں چھپ جائیں گے اور دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں چونکہ فوجی تھا اس لئے میں نے فوجی انداز میں سوچا۔

مجھے سوچ یہ آئی کہ جاپانی نو ہیں اور ہر ایک کے پاس راتقل ہے۔ نور اتقلوں کے مقابلے میں میری اکیلی راتقل ہے۔ اس کے علاوہ میری کمزوری یہ تھی کہ میرے پاس ایونیشن بہت تھوڑا تھا۔ انگریز پاکٹ کاربو الور اور گولیاں میں اپنے جھونپڑے میں چھوڑ آیا تھا۔ ہر حال میں نے پکا عزم کر لیا کہ ان جاپانیوں نے عورتوں کو چھیڑا تو میں ان کا مقابلہ کروں گا اور اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔

○

ہم نے کشتی وہیں کھینچ کر خشکی پر کر لی اور پہاڑیوں کی طرف چل پڑے۔ بستی دور نہیں تھی۔ ہم دریا کے کنارے کنارے چلتے گئے۔ جب دریا کا موڑ مڑے تو ہم نے دیکھا کہ جہاں بستی کی کشتیوں کا گھاٹ سا بنا ہوا تھا وہاں ایک موٹر بوٹ کھڑی تھی۔ یہ اُن جاپانیوں کی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ دریا کے نیچے کی طرف سے یعنی جس طرف کو پانی کا بہاؤ تھا اس طرف سے آئے تھے۔ یہاں انہوں نے گھاٹ دیکھا تو وہیں رک گئے۔ گھاٹ اس طرح تھا کہ لکڑی کے مضبوط تختوں کا ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔

ہم آگے نہ گئے۔ وہیں سے دائیں طرف پہاڑیوں کے اندر راستہ جاتا تھا۔ یہ بالکلہ راستہ تو نہیں تھا، دو پہاڑیوں کے درمیان جو جگہ تھی ہم اس میں داخل ہو گئے اور آگے چلتے گئے۔

ہمیں اندازہ تھا کہ بستی کتنی دور ہے۔ پہاڑی کے دوسری طرف بستی تھی۔ ہم

پہاڑی پر چڑھ گئے جو کوئی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس پہاڑی کے اوپر وہ درخت تھے جو زیادہ اونچے نہیں تھے اور جھاڑیاں بہت گھنی تھیں اور اونچی گھاس خاصی زیادہ تھی۔ وہاں بہ آسانی سے چھپ کر ارد گرد دیکھ سکتے تھے۔

اوپر جا کر ہم جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر دیکھنے لگے۔ ہمیں یہ منظر نظر آیا کہ بہت کے آدمی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے، ذرا زیادہ عمر کی عورتوں کو الگ بٹھایا جوا تھا اور نوجوان لڑکیاں تھیں انہیں ان جلابانیوں نے الگ بٹھا رکھا تھا۔ بستی کی دوسری طرف ایک ٹیکری تھی۔ چار پانچ جلابانی اس ٹیکری پر چڑھے ہوئے تھے۔ ٹیکری پر چھوٹے چھوٹے دو بکس رکھے ہوئے تھے۔ جلابانی ایک درخت سے قریب کے دوسرے درخت کے ساتھ ذرا بلندی پر ایک تار باندھ رہے تھے۔ اس تار کے درمیان میں ایک اور تار باندھی ہوئی تھی جو نیچے تک آئی ہوئی تھی۔ انہوں نے پانچ چھ آدمی اپنے ساتھ کام پر رکھے تھے۔

انہوں نے بکس کھولے اور اس کے بعد میں تفصیلات سنائے بغیر بتاتا ہوں کہ انہوں نے جو کچھ وہاں کیا وہ یہ تھا کہ ان بکسوں میں وائرلیس سیٹ تھے اور اوپر انہوں۔ جو تار باندھی تھی وہ ان سیٹوں کا ریل تھا۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ ایک جلابانی نے یلیغور کے ریسور کی طرح کا آلہ اپنے کان کے ساتھ لگایا اور کسی کے ساتھ ملاپ کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سگنل کور کے فوجی ہیں لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ نو جلابانی ادھر کیسے آئے ہیں۔ دور دور تک ان کی کسی اور فورس کا نام و نشان نہیں ملتا تھا۔ میں نے دماغ پر زور دیا تو یہ سمجھ سکا کہ جلابانی پسپا ہو رہے ہیں اور یہ نو جلابانی ایسی طرف بھاگ نکلے ہیں کہ اپنا فورس سے بہت دور آگئے ہیں۔

میرے سامنے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں، اصل مسئلہ یہ تھا کہ انہیں یہاں سے نکالا کس طرح جائے۔ میں نے ان کی حرکتیں دیکھ لیں جن سے میں نے اپنے اس فیصلے کو مضبوط کر لیا کہ انہیں ختم کرنا ہے۔ حرکتیں یہ کہ ایک تو وہ جلابانی تھے جو ٹیکری پر کام کر رہے تھے، دوسرے نیچے کھڑے تھے اور کھڑے بھی وہ تھے جہاں نوجوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کبھی ایک جلابانی کسی ایک لڑکی کو بازو سے پک کر اٹھاتا اور اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اس کے ساتھ بے ہودہ حرکتیں کرتا اور کبھی اپنا ہاتھ اس کے کپڑوں کے اندر لے جاتا تھا۔ کبھی دوسرا جلابانی کسی اور لڑکی کو اٹھا کر اس

کے ساتھ ایسی ہی بے ہودگی کرنے لگتا۔ ایک نے ایک لڑکی کے پاس بیٹھ کر اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔ مجھے زیادہ بری یہ بات لگ رہی تھی کہ ان لڑکیوں کے ماں باپ اور بھائی دنیو قریب بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ میرے دل سے جلابانیوں کی دوستی کا خیال نکل گیا اور ویسی ہی نفرت پیدا ہو گئی جیسی انگریزوں کے لئے تھی۔

ہم وہیں چھپے ہوئے دیکھتے رہے اور وقت گزرتا چلا گیا۔ سورج غروب ہونے کے لئے پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔ جلابانیوں نے اپنا کام روک دیا اور جو ٹیکری پر تھے وہ نیچے آ گئے۔ بستی کے کچھ آدمیوں کو انہوں نے اشارہ کیا تو وہ آدمی دوڑتے ٹیکری پر گئے اور وائرلیس سینوں کے بکس اٹھا کر نیچے لے آئے۔

ایک جلابانی وہیں کھڑا رہا، باقی آٹھ نے ایک لڑکی کو اٹھایا اور وہاں سے چل پڑے۔ میں نے دو لڑکیوں کو دیکھا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہی تھیں۔ جلابانیوں نے انہیں مارنا ہیٹھا شروع کر دیا اور اپنے ساتھ لے چلے۔ ان کے باپ دوڑ کر ان کے پیچھے گئے تو جلابانیوں نے انہیں بھی ایک ایک دو دو گھونٹے مار کر بھگا دیا۔

وہ لڑکیوں کو میرے جھونپڑے میں لے گئے۔ یہ صاف ستھرا بھی تھا اور اس کے دو کمرے تھے۔ مجھے اپنا جھونپڑا صاف نظر آ رہا تھا۔ رائفل تو میں اپنے ساتھ لے آیا تھا لیکن انگریز پائلٹ کارپو اور میں نے جھونپڑے میں ہی رکھا رہنے دیا تھا۔ جلابانی اندر گئے اور لڑکیوں کو بھی اندر لے گئے تو تھوڑی ہی دیر بعد ایک جلابانی باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں دو ریو اور تھا جو بیلٹ کے ساتھ ہولشر میں بند تھا۔ جلابانی نے بڑی زور سے کچھ کہا اور اشارہ کیا۔ اس کے قریب بستی کے کچھ آدمی کھڑے تھے۔ وہ سب جلابانی کی طرف دوڑے گئے۔

جلابانی ریو اور ان کے سامنے کر کے کچھ کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ان سے پوچھ رہا تھا کہ یہ ریو اور کس کا ہے۔ بستی کے آدمی ہاتھوں کے اشاروں سے اسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہاں یہ مسئلہ بھی تھا کہ جلابانی ان برمیوں کی اور برمی جلابانیوں کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔

وہ جلابانی جو وہیں کھڑا رہا تھا جہاں انہوں نے سب کو بٹھا رکھا تھا وہ دراصل ان لوگوں پر سنتری کھڑا کیا گیا تھا۔ اس نے ان لوگوں سے کہا ہو گا کہ سب اپنی اپنی جگہ چلے جائیں۔ سب لوگ، عورتیں اور لڑکیاں بھی انھیں اور اپنے اپنے جھونپڑوں کی طرف چلی گئیں۔

یہ جلابی بستی کے ارد گرد ٹھٹھلے لگا۔ اس کے پاس رانقل تھی۔

سورج غروب ہو گیا اور پھر رات گہری ہونے لگی۔ چاند آدھے سے ذرا زیادہ تھا۔ جنگل کے اوپر فضا بڑی ہی صاف شفاف ہو اُرتی ہے۔ جب چاند پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تو ہر ایک چیز صاف نظر آنے لگی۔ یہ سنتری بستی کے اندر بھی ٹھٹھا رہا اور بستی کے ارد گرد بھی چکر کاٹتا رہا۔ اسے اور ان جلابیوں کو لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا، میں یہ سمجھ سکا کہ سنتری اس لئے مقرر کیا گیا تھا کہ یہاں سے کوئی بھاگ نہ جائے۔

ہمیں بھوک پریشان کرنے لگی تھی۔ میری نظر اس سنتری پر تھی۔ میں نے ان لوگوں یعنی جلابیوں میں ایک ڈسپلن دیکھا۔ ایک اور جلابی آیا اور پہلے سنتری کو آوازیں دینے لگا۔ پہلا سنتری آیا تو دوسرے نے اسے جھونپڑے کے اندر بھیج دیا اور خود اسی طرح ڈیوٹی دینے لگا جس طرح پہلا سنتری بستی کے اندر اور باہر ٹھٹھا رہا تھا۔

اس سنتری کو مارنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں سنگین ہاتھ میں لے کر دبے پاؤں نیچے چلا جاتا اور جہاں موقع دیکھتا، اس کی گردن پیچھے سے بازو کے گھیرے میں لے کر سنگین اس کے دل میں اتار دیتا۔ ذرا حوصلہ قائم رکھ کر میں یہ کام کر سکتا تھا لیکن میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ میں تو اسے مار کر پہاڑی کے اندر چھپ جاؤں گا لیکن جلابی اس بستی کے تمام آدمیوں کو ایک جگہ کھڑا کر کے مشین گن سے اڑا دیں گے اور ان کی لڑکیوں اور دیگر جوان عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

میں نے یہاں مشین گن کا نام لیا ہے۔ ان جلابیوں میں سے ایک کے پاس لائٹ مشین گن تھی۔ لائٹ مشین گن ہماری فوج میں بھی تھی جسے V.B گن کہا جاتا تھا اور اس کے اوپر میگزین چڑھائی جاتی تھی لیکن میں نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ جلابیوں کی اس مشین گن کے ساتھ ایمونیشن کا پٹہ چلتا تھا۔ باقی آٹھ جلابیوں کے پاس رنفلین تھیں۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ رات اسی پہاڑی پر گزرائیں گے اور کل صبح جب جلابی باہر نکلیں گے تو میں رانقل سے ایک ایک کو مار ڈالوں گا لیکن غور کیا تو مجھے یہ ترکیب بھی ٹھیک نہ لگی۔ وہ اس لئے کہ وہ سب فوجی تھے۔ میں ایک کو گولی مارتا تو باقی سب فوراً اُدھر اُدھر ہو جاتے اور پھر میں فاز کرتا تو انہیں پتہ چل جاتا کہ فاز کہاں سے آ رہا ہے۔ میری کمزوری یہ تھی کہ میرے پاس ایمونیشن بہت تھوڑا تھا۔

○

میں نے وانگ سے کہا کہ کھانے کا کچھ بندوبست ہونا چاہئے۔ ہم نے آپس میں بات چیت کر کے طریقہ سوچے کہ بندوبست کیا ہو۔ ایک طریقہ دماغ میں آ گیا اور سب اس پر متفق ہو گئے۔ سنتری جب ہماری طرف سے بستی کے باہر باہر گزر گیا تو وانگ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پہاڑی سے آہستہ آہستہ اتر گیا۔ اس طرف جو جھونپڑا سب سے زیادہ قریب تھا یہ دونوں اس کے اندر چلے گئے۔ وہاں سے وہ ساتھ والے دو جھونپڑوں میں گئے۔ وانگ باہر نکلا اور اُدھر اُدھر دیکھا۔ سنتری کسی اور طرف تھا۔ وانگ اور اس کے ساتھی وہاں سے نکلے اور پھر پہاڑی پر چڑھ آئے۔ ان گھروں میں سے انہیں کچھ نیچے ہوئے چاول اور مچھلی مل گئی تھی۔ یہ کھانا تھا تو تھوڑا لیکن ہم سب کی بھوک کی شدت کو دبانے کے لئے کافی تھا۔ وانگ نے ایک عقلمندی یہ بھی کی تھی کہ ٹین کے ایک ڈبے میں پانی بھی لے آیا تھا۔ ہم سب نے مل کر یہ کھانا کھایا، پانی پیا اور ہم ترو تازہ ہو گئے۔ پھر ہم سب وہیں سو گئے۔

میری آنکھ خاصی دیر بعد لگی تھی۔ میں جتنی دیر جاگتا رہا جلابیوں کا شور و غل سنتا رہا۔ وہ میرے جھونپڑے میں ناچ کود رہے تھے اور گانے بھی گارہے تھے۔ اس وقت مجھے تانی یاد آئی اور افسوس ہونے لگا کہ وہ معصوم سی لڑکی ان وحشی جلابیوں کے ہاتھ چڑھ جائے گی اور پھر شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکے۔ مجھے افسوس تو ہو رہا تھا لیکن مجھے یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ ان لڑکیوں میں وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ جلابی جن لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گئے تھے، ان میں بھی تانی نہیں تھی۔ پھر وہ کہاں تھی؟..... مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس کی سلامتی کے لئے میرے منہ سے دعا نکلی۔ اس کے بعد میں سو گیا۔

میں جب جاگا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میرے ساتھی بھی جاگ اٹھے تھے۔ وہ لڑکا بھی ہمارے ساتھ تھا جس نے ہمیں اطلاع دی تھی کہ بستی میں جلابی آ گئے ہیں۔ میں نے بستی کی طرف دیکھا، ایک جلابی رات کی طرح سنتری کی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میری نظریں اپنے جھونپڑے پر لگی ہوئی تھیں جہاں آٹھ جلابی چلے گئے تھے۔ وہاں ابھی خاموشی تھی۔ وہ رات بھر جشن مناتے رہے تھے، انہیں جاننے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا ہو گا جب پہلا جلابی جھونپڑے سے باہر نکلا۔ سورج خاصا لوہا آ گیا تھا۔ ایک دو منٹ بعد دو اور جلابی باہر آ گئے۔ پھر آٹھوں لڑکیاں باہر آئیں۔ دور

سے ہی پتہ چل رہا تھا کہ وہ مغموم اور مظلوم ہیں۔ باہر جو جلیانی کھڑے تھے، ان میں سے ایک نے انہیں کچھ کہا۔ لڑکیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ دو تین اور جلیانی باہر آگئے۔ وہ اب وردی میں نہیں تھے۔ موسم گرمیوں کا تھا اس لئے انہوں نے لمبے اندویش پر نہ رکھے تھے۔ وہ سب دریا کی طرف دیکھ رہے تھے جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بستی بلندی پر تھی۔ دریا کی طرف زمین نیچے کو جاتی تھی۔ اس لئے بستی سے دریا صاف نیچے نظر آ رہا تھا۔ باہر کھڑے جلیانیوں نے اندر والوں کو بھی باہر بلا لیا اور دریا کی طرف اشارے کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے سنتری کو آواز دی اور سنتری دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ پھر یوں ہوا کہ سنتری جھونپڑے سے باہر کھڑا ہو گیا اور آٹھ جلیانی چیتے چلاتے، ہنستے کھیلتے دریا کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ دریا میں نہانے جا رہے تھے۔ وہ پیچھے سنتری اس لئے کھڑا کر گئے تھے کہ جھونپڑے میں ان کی رائفلیں، مشین گن دو سراسمان پڑا ہوا تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے دماغ میں آسمانی بجلی کی روشنی چمکی اور مجھے وہ موقع نظر آ گیا جس کی مجھے امید تھی اور امید یہ بھی تھی کہ ایسا موقع شاید پھر نہ ہی ملے۔ میں نے فوراً سوچ لیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے وانگ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے شاید مجھے اس کی ضرورت پڑ جائے۔ باقی ساتھیوں سے کہا کہ وہ ہمیں چھپے رہیں اور کوئی آدمی کھڑا نہ ہو۔ جلیانی سنتری نے دیکھ لیا تو دور سے ہی گولی مار دے گا۔

میں نے رائفل سنبھالی اور وانگ کو ساتھ لے کر پہاڑی کی پچھلی طرف اتر گیا۔ وہاں سے میں کچھ آگے گیا اور وہاں سے بائیں کو مڑا۔ چونکہ ساون کے دن تھے، بارشیں برستی رہتی تھیں اس لئے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اس سبزے میں چھپ چھپ کر چلنا نہایت آسان تھا۔ میں نے وانگ کو چلتے چلتے بتا دیا کہ میں کیا کروں گا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں ناکام بھی ہو سکتا ہوں۔ وانگ کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ میں ناکام ہو گیا اور جلیانی نے مجھے مار ڈالا تو وانگ کیا کرے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وانگ یہ کام کرے گا۔ یہ کام ایک فوجی ہی کر سکتا تھا۔ وانگ کا کاروبار تھا اور اس کی زندگی کچھ اور طرح گزری تھی جس میں شاید اس نے کبھی مکھی بھی نہیں ماری ہوگی۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں گولی نہیں چلانا چاہتا تھا۔ اگر یہ جلیانی سنتری اکیلا ہوتا تو میں اسے پہاڑی کے اوپر سے ہی شست میں لے کر مار سکتا تھا لیکن میں اس کے نتیجے سے بھی آگاہ تھا جو میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ وانگ کو ساتھ لیے میں بستی کے باہر جا چھپتا

پھپھاتا اپنے جھونپڑے کے پچھواڑے تک پہنچ گیا۔ وہاں بھی درخت تھے، مکھی جھاڑیاں اور اونچی گھاس تھی۔ اب میں اپنے جھونپڑے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے لگا۔ میں نے رائفل سے سنگین اتار لی۔ میں جھونپڑے کے قریب پہنچ گیا اور ذرا سار کا۔ سنتری کے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ جس سے میں سمجھ گیا کہ وہ منہل رہا ہے۔ میں وانگ کو ساتھ لے کر ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔ ذرا انتظار کر کے میں آگے بڑھا۔ اب میں جھونپڑے کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ وانگ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ میں نے رائفل اسے دے دی تھی اور سنگین اپنے ہاتھ میں تیار رکھی ہوئی تھی۔

میں جھونپڑے کے کونے تک پہنچ گیا۔ جلیانی سنتری دریا کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اس کے اور میرے درمیان چھ ساتھ قدموں کا فاصلہ تھا۔ میری سکیم یہ تھی کہ پیچھے سے اس کی گردن اپنے بائیں بازو کے گھیرے میں لے کر دبا لوں گا اور سنگین اس کے پیٹ میں ماروں گا۔

میں جونہی اس پر جھپٹنے لگا وہ پیچھے کو مڑا اور اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اب یہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ مجھے چھ سات قدم کا فاصلہ گولی کی طرح طے کرنا تھا جو میں نہیں جانتا تھا کہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں پیچھے کو بھاگ اٹھتا لیکن وہ بڑے آرام سے مجھے گولی مار کر گرا سکتا تھا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ رائفل کندھے کے ساتھ لگا کر مجھ پر فائر کرے گا۔ جونہی وہ پیچھے کو مڑا اور اس کی نظر مجھ پر پڑی، میں ایسی تیزی اور پھرتی سے اس پر چھوٹا کہ میں آج بھی حیران ہوں کہ ایسی تیزی مجھ میں کہاں سے آگئی تھی۔ میرا جسم اس کے ساتھ ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی میں نے پوری طاقت سے سنگین اس کے پیٹ میں اتار دی۔

میرے جسم کی، ٹکڑے سے وہ پیچھے کو پیٹھ کے بل گرا۔ میں نے اس خیال سے کہ یہ منہ سے آواز نہ نکالے، اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن اس نے اپنا سر زور زور سے ہلایا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی، درمیان والی انگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی اس کے منہ میں دے دیں اور میری انگلیاں اس کے حلق تک پہنچ گئیں۔ اس نے میری انگلیوں میں اپنے دانت اتنی زور سے گاڑ دیے کہ میں سمجھا کہ میری انگلیاں میرے ہاتھ سے الگ ہو جائیں گی۔ میں نے اس کے پیٹ سے سنگین نکال کر پہلے جیسی طاقت سے اس کے سینے میں اس جگہ ماری جہاں دل ہوتا ہے۔ اس کا منہ کھل گیا اور میں نے اپنی

انگلیاں اس کے منہ سے نکال لیں۔ میں نے دو بار پھر سنگین نکال کر اس کے سینے میں ماری۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا ترپتا ہوا جسم ساکت ہو گیا۔

میں نے دریا کی طرف دیکھا۔ آٹھ جلابانی گھاٹ کے کنارے کھڑے ہو کر دریا میں غوطے لگاتے، تیرتے اور پھر باہر آ جاتے تھے۔ وہ اپنے شغل میں محو تھے۔ میں جھونپڑے میں گیا۔ وہاں ان کی مشین گن پڑی تھی۔ راؤنڈوں کا پٹہ بھی ساتھ تھا۔ میں اس مشین گن سے واقف نہیں تھا لیکن کوئی ایسی پیچیدگی بھی نہیں تھی کہ سمجھ میں نہ آ سکتی۔ میں نے مشین گن میں پٹہ لگا لیا اور اسے کاک کر لیا۔ وانگ سے کہا کہ وہ پٹہ اٹھا لے۔ مشین گن میں نے اٹھا لی اور ہم دونوں دریا کی طرف چل پڑے۔ ہم درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں جا رہے تھے۔

جھکے جھکے چلتے، چھپتے چھپاتے ہم اتنا آگے چلے گئے کہ گھاٹ ہم سے صرف پچاس یا پچھن قدم دور رہ گیا۔ وہاں ایک موزوں جگہ دیکھ کر میں نے مشین گن زمین پر رکھی اور اس کے پیچھے لیٹ گیا۔ جلابانیوں کو شست میں لیا لیکن فائر نہ کیا۔ ان میں سے دو تین گھاٹ پر ہوتے تھے اور باقی پانی میں۔ پانی والے باہر آتے تو گھاٹ پر کھڑے پانی میں کود جاتے تھے۔ میں انتظار کرنے لگا کہ یہ سب نما کر باہر آئیں اور اکٹھے چلیں تو میں فائر کروں۔ میں نے وانگ کو بتا دیا کہ وہ پٹہ اپنے ہاتھوں پر رکھے، اسے پکڑے نہیں اور پیچھے بھی نہ کھینچے۔

ہمیں تقریباً نصف گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ وہ تیر تیر کر تھک گئے تو دریا سے نکلے۔ سب نے انڈرویزر اتار دیئے اور نچوڑ کر ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ اب وہ بالکل برہنہ تھے۔ وہ ہماری طرف چلے۔ میں نے انہیں شست میں لیا اور مشین گن کا ٹریگر دبا دیا۔ میں نے بڑا لمبا برست فائر کیا اور مشین گن کو ذرا دائیں اور بائیں کیا۔ آٹھوں جلابانی گرے، ذرا ذرا سے ترپے اور ٹھنڈے ہو گئے۔

میں نے مشین گن وہیں رہنے دی اور دریا کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ سب مر گئے تھے۔ ہر ایک کو کئی کئی گولیاں لگی تھیں۔

بستی والوں کو پتہ چلا تو خوشی کا ایسا ہنگامہ برپا ہوا کہ کانوں پر ہی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ لوگ دریا کی طرف دوڑ پڑے اور انہوں نے ویسی ہی دھکم پیل کی جیسی مرے ہوئے شیر کو دیکھنے کے لئے کی تھی۔

میں تانی اور اس کے خاوند یون کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ دونوں کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ لوگوں نے جلابانیوں کی لاشیں دریا میں پھینک دیں اور پھر واپس بستی میں آئے۔ اس سے خاصی دیر بعد یون اور تانی آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ جس وقت جلابانی آئے تھے اس وقت وہ دونوں بستی سے باہر دھان کے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے جلابانیوں کو دیکھ لیا تھا اور کہیں جا کر چھپ گئے تھے۔ اب لوگوں کا ہنگامہ مَن کر اور یہ معلوم کر کے آئے تھے کہ جلابانی مارے گئے ہیں۔ تانی کو محفوظ دیکھ کر مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔ تانی کسن اور معصوم لڑکی تھی۔ پہلے وہ سبوح اللہ اور اس کے غنڈوں سے بٹا تھی، اب خدا نے اسے جلابانیوں سے بچا لیا تھا۔ اگر وہ بستی میں ہوتی تو جلابانی سب سے پہلے اس پر ہاتھ رکھتے۔

میں نے سوچا کہ جلابانیوں کی رائفلیں ان آدمیوں کو دے دوں گا جنہوں نے کبھی رائفل یا ہندوق فائر کی ہو، اگر یہ نہیں تو وہ اتنے ذہین ہوں کہ رائفل کا استعمال سمجھ سکیں۔

ہو گئی تھی، میں نے صرف وہ لڑچکر بڑھنا شروع کر دیا جو جنگ پر لکھا گیا تھا۔ اب تک یورپی ممالک بے شمار کتابیں لکھ چکے ہیں۔ برما فرنٹ پر تو جرنیلوں نے اور ان سے جو نیر انڈوں نے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ لڑچکر صرف انگریزی میں ملتا ہے۔ مجھے جہاں کہیں پتہ چلا کہ ایک نئی کتاب آئی ہے تو میں نے وہ حاصل کی اور پڑھی۔ بعض لکھنے والوں نے جنگ کے بڑے بڑے واقعات اور لڑائیاں نہیں لکھیں بلکہ چھوٹے چھوٹے اور بڑے ہی دلچسپ واقعات ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور ان کے کرداروں سے مل کر لکھے ہیں۔

بعض لوگ ایسے واقعات پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ سچے نہیں ہو سکتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان سے زیادہ ناقابل یقین واقعات بھی سچے ہیں۔ میں برما کے جس خطے میں پھنس گیا تھا، وہاں لڑائی کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن وہ خطہ جنگ سے محفوظ بھی نہیں تھا کیونکہ پورے کا پورا برما جنگ کی زد میں تھا۔ یوں کہہ لیں کہ میں وار زون میں تھا جہاں کسی بھی وقت جنگ آ سکتی تھی۔ اپنا یاد دشمن کا کوئی ہوائی جہاز غلطی سے وہاں ایک دو بم بھینک سکتا تھا۔ پہلے ایک انگریز پائلٹ ہمارے درمیان آگرا پھر اکٹھے نو جاپانی آ گئے۔ مجھے تو ہر لمحہ توقع تھی کہ کسی بھی وقت پوری کی پوری انٹرنی بیٹلین یا بریگیڈ یہاں آ جائے گا۔

میں کہتا یہ چاہتا ہوں کہ یہ واقعات جو میں سن رہا ہوں، کچھ لوگوں کے لیے قابل یقین نہیں، وہاں میرے لئے یہ محض اتفاقیہ واقعات تھے اور ایسے ماحول اور پس منظر میں سے ایسے ہی واقعات جنم لیا کرتے ہیں۔ بڑی ہی لمبی مدت کے بعد میری ملاقات چند ایک ایسے فوجیوں کے ساتھ ہوئی تھی جو برما فرنٹ پر لڑے تھے اور برما جاپانیوں سے آزاد کرا کے شہروں اور قصبوں میں گئے تھے۔ انہوں نے ایسے ایسے واقعات سنائے تھے جن پر صرف وہی یقین کر سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں سے واقعات دیکھے تھے لیکن میں ان واقعات پر یقین کرتا ہوں۔

○

آئیے میں آپ کو اپنے سفر کے اُس مقام پر لے چلوں جہاں میں نے نو جاپانیوں کو مشین گن سے مار ڈالا تھا۔ ان میں سے ایک کو میں نے سنگین سے مارا تھا۔

میں اگر پنجابی فلسوں کا ہیرو یا ولن ہوتا تو بازو بلند کر کے ایک ٹانگ پر تانچتا اور بوکھس مارتا لیکن میرا رد عمل یہ تھا جیسے زمین و آسمان گھوم گئے ہوں اور اپنے آپ ہی اپنی اصلی

نہیں جانتا کہ جنگ ایک ہولناک اور ہیبت ناک کھیل ہوتا ہے۔ اسے موت کا کون کھیل کہیں تو موزوں ہو گا۔ ظاہری طور پر تو یہی ہوتا نظر آتا ہے کہ دو ملکوں کی فوجیں آپس میں ٹکراتی ہیں، ایک دوسرے پر آگ برساتی ہیں، فوجی مرتے ہیں، شدید زخمی ہو کر زندہ رہ بھی جائیں تو ساری عمر کے لئے معذور ہو جاتے ہیں اور کچھ جنگی قیدی ہو کر قیدی کیمپوں میں اپنے دشمن کے رحم و کرم پر جاگرتے ہیں۔

یہ جنگ کی تصویر کا وہ پہلو ہے جو اخباری رپورٹر جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور ساری دنیا کو اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے سناتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جنگ ایسے ہی ہوتی ہے اور جنگ ختم ہونے کے بعد سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے لیکن اس بھیاں تک کھیل کے اندر کچھ اور ڈرامے اور چھوٹے چھوٹے واقعات ہوتے ہیں جو لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ پاکستانیوں نے تو 17 دن اور 14 دن کی محدود جنگ دیکھی ہے۔ ہم سے پوچھیں جنہوں نے جنگ عظیم دوم دیکھی ہے۔ اس جنگ نے آدھے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس جنگ نے ایسے ڈراموں کو اور ایسے واقعات کو جنم دیا تھا جو دلچسپ بھی ہیں، المناک بھی اور ان میں بعض ناقابل یقین ہیں۔ یہ عجیب و غریب واقعات اُن علاقوں میں ہوتے ہیں جو علاقے جنگ کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔

میری کہانی کے پس منظر میں صرف جنگ عظیم اور اس جنگ کی لپیٹ میں آنے والا صرف ایک وسیع و عریض علاقہ ہے۔ میرے دماغ پر اس جنگ نے اور جو مجھ پر بنی، اس نے ایسا اثر چھوڑا کہ میں آج تک اس وقت کا کوئی ایک لمحہ بھی نہیں بھولتا۔ بھول سکوں گا۔ اس موضوع میں میری دلچسپی اتنی زیادہ بڑھی کہ میں جب واپس آیا تو جنگ پر اپنی بات

تھے۔ انہوں نے اس مرے ہوئے چلبانی پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔

ان لوگوں کا غصہ اور جذبہ انتقام بے معنی نہیں تھا۔ ان چلبانیوں نے بستی کی کچھ بوکیوں کو ساری رات اپنے پاس رکھا تھا۔ اب بستی کے لوگ اپنا سارا غصہ اس ایک مرے ہوئے چلبانی پر نکال رہے تھے۔

مجھے اچانک چلبانیوں کی موثر بوٹ کا خیال آگیا اور اس کے ساتھ یہ خطرہ محسوس ہوا کہ یہ موثر بوٹ ہمیں پکڑوا سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جس طرح یہ نو چلبانی آگئے تھے، کچھ اور چلبانی بھی ادھر آ سکتے تھے۔ اس صورت میں وہ ہم سے پوچھ سکتے تھے کہ جو چلبانی اس موثر بوٹ پر آئے تھے وہ کہاں ہیں۔ ان کی رائفلیں اور ایمونیشن ہم سے برآمد ہوتا تو وہ اس بستی کے تمام آدمیوں کو گولی مار دیتے۔

”وانگ!“ — میں نے کہا — ”جتنی جلدی ہو سکے وہ موثر بوٹ ڈبونی ہے۔“

”کیوں؟“ — وانگ نے حیران ہو کر پوچھا — ”ڈبونی کیوں ہے؟ یہ تو ہمارے کام آئے گی۔“

میں نے اسے بتایا کہ یہ موثر بوٹ ہمارے لئے کیا خطرہ پیدا کر سکتی ہے۔ وانگ نے کہا کہ یہ موثر بوٹ دریا میں ہی نہیں پڑی رہے گی، وہ کچھ آدمیوں کو ساتھ لگا کر اسے جنگلی پرگھسیٹ لے گا اور ایسے طریقے سے چھپا دے گا کہ قریب کھڑے آدمی کو بھی نظر نہیں آئے گی۔

میں وانگ کی یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا لیکن ایک خیال آگیا کہ میں نے یہاں سے نکلنا اور آگے جانا ہے۔ راستے میں دریا حائل تھا اور دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ چوڑوں والی کشتی مجھے دریا پار نہیں کرا سکتی تھی، صرف یہ موثر بوٹ میرے کام آ سکتی تھی۔ میں نے وانگ سے کہا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اس موثر بوٹ کو چھپا دے۔

”دوڑ جانے سے پہلے ایک اور کام کرو وانگ!“ — میں نے کہا — ”ان لوگوں کو اچھی طرح بتا دو کہ میں نے جھونپڑے کے اندر جانے سے کیوں روکا ہے تاکہ انہیں یہ شک نہ ہو کہ چلبانیوں کا اگر کچھ مل ملا تو اس پر صرف ہم قبضہ کر لیں گے۔ انہیں یہ بھی بتاؤ کہ کھانے پینے کا اور ذاتی ضروریات کا جو بھی سامان ملے گا وہ سب میں تقسیم کر دیا جائے گا۔“

وانگ نے تمام لوگوں کو خاموش کرا کے یہ بات کہہ دی۔

حالت پر آگئے ہوں۔ مجھے اپنی اصلیت پر شک سا ہونے لگا جیسے میں وہاں کا رہنے والا نہیں ہوں جہاں میں پیدا ہوا اور جوان ہو کر فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ میں کچھ اس شک میں پڑ گیا تھا جیسے میں اسی جنگل میں پیدا ہوا ہوں اور پراسرار سی جنگلی مخلوق کا فرد ہوں۔ ماضی سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ ابھی میرے وجود میں اس خوشی کی لہر نہیں آئی تھی کہ میں نے نو دشمنوں کو مار ڈالا ہے بلکہ اسے حیرت کئے کہ میں چپ چاپ کھڑا دیکھا رہا اور یقین کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں نے نو انسانوں کو دو تین منٹوں میں ختم کر دیا ہے۔ اچانک ایک شور و غل نے مجھے اس کیفیت سے بیدار کر دیا۔ میں نے گھوم کے دیکھا۔

یہ شور و غل بستی والوں کا تھا۔ وہ خوشی سے ناچ کود رہے تھے اور فتح کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا اور پھر یہ دیکھا کہ تمام آدمی اُس جھونپڑے کی طرف دوڑ پڑے جس میں چلبانیوں نے رات گزاری تھی۔ یہ میرا جھونپڑا تھا۔ لوگ چلبانیوں کا سامان لوٹنے کے لئے ادھر دوڑ پڑے تھے۔ وانگ اور اس کے دو ساتھی مجھ سے تھوڑی ہی دور کھڑے لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ ہنس بھی رہے تھے۔

”وانگ، انہیں روکو“ — میں نے ادھر کو دوڑتے ہوئے کہا — ”انہیں جھونپڑے کے اندر نہ جانے دینا۔ وہاں گرینیڈ بھی ہوں گے۔ کسی آدمی نے گرینیڈ اٹھا لیا تو.....“

میں جھونپڑے کی طرف دوڑا۔ وانگ اور اس کے ساتھی مجھ سے پہلے پہنچ گئے۔ ہم نے جھونپڑے کے سامنے کھڑے ہو کر اس ہجوم کو روک لیا۔ مجھے گرینیڈوں کا اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا یہ خطرہ نظر آیا تھا کہ ان لوگوں نے لوٹ مار کی تو یہ آپس میں چھینا بھینا بھی کریں گے اور ایسا نہ ہو کہ آپس میں لڑ پڑیں۔ یہ لوگ بڑے ہی پیار اور قابلِ قدر اتھاو سے رہ رہے تھے۔ پتہ چل جاتا کہ کسی گھر میں آج کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے تو دوسرے لوگ انہیں کھانا متیا کرتے تھے۔

اُس چلبانی کی لاش جسے میں نے سنگین سے مارا تھا، جھونپڑے کے سامنے پڑی تھی۔ دو تین آدمیوں نے اُسے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔ دوسروں کی توجہ اس طرف ہوئی تو سب اس لاش پر ٹوٹ پڑے۔ سب نے ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر اور آگے ہو کر اسے ٹھڈے بھی مارے اور پاؤں اوپر اٹھا اٹھا کر اس کے منہ پر مارے۔ بعض نے اس کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ ایک دو ایسے بھی آئے جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے

ہوں سے میں نے کہا کہ یہ ساری رقم بستی والوں میں برابر برابر تقسیم کر دیں۔ میں انہیں یہ بھی کہا کہ وہ اگر اپنا حصہ کچھ زیادہ رکھنا چاہیں تو رکھ لیں لیکن اتنا زیادہ بھی کہ سو میں سے آتی وہ رکھ لیں اور میں لوگوں میں تقسیم کریں۔

میں موٹر بوٹ کو فوٹا غائب کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے وانگ سے کہا کہ یہ نوٹ بعد تقسیم کریں گے، پہلے موٹر بوٹ کا کچھ بندوبست ہو جائے۔ وانگ نے دو قابل اعتماد ہاں کو جھونپڑے کے دروازے پر کھڑا کر دیا اور کہا کہ کوئی آدمی اس جھونپڑے کے نہ آئے۔ پھر اس نے سب سے کہا کہ زیادہ سے زیادہ آدمی دریا پر پہنچ جائیں۔ ان کی وہاں کوئی اور مصروفیت تو تھی نہیں، وہ سب دریا کی طرف دوڑ پڑے۔ پیچھے ہم بھی وہاں چلے گئے۔

ہم نے جس طرح جھونپڑے کی تلاشی لی تھی اسی طرح موٹر بوٹ میں گئے اور اس میں بھی کھانے کی اشیاء کے ڈبے پڑے ہوئے تھے اور ایک بوری چاولوں کی رکھی تھی۔ یہ کوئی بہت بڑی موٹر بوٹ نہیں تھی، عام کشتی جیسی تھی۔ وانگ اور کے ساتھیوں نے ایک جگہ دیکھ لی جہاں سے دریا کا کنارہ کٹا ہوا تھا اور اندر کو چلا گیا اس کنارے کے کناروں پر جھاڑیاں بھی تھیں اور اونچی گھاس اور درخت بھی تھے۔ یہ عام کشتیوں جیسی تھی، فرق صرف یہ تھا کہ اس میں انجن لگا ہوا تھا۔ دو آدمی یہ موٹر چلاتے تھے۔ اس میں سے سامان نکال لیا گیا اور اسے چلا کر وہاں تک لے گئے دریا کا کنارہ تھا۔ موٹر بوٹ چھپ گئی تھی لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ قریب آ کر اس پر دستک تھی لیکن سب کہتے تھے کہ اتنی کار آمد اور قیمتی موٹر بوٹ کو ضائع نہ کیا

ملان اٹھا کر ہم جھونپڑے میں آ گئے۔ وہاں مجھے اس وائرلیس اور اس کے ماکھیاں نکلیں۔ یہ پانچ سے لے کر سو روپے تک کے نوٹ تھے۔ برما پر بھی انگریزوں کی حکمرانی تھی اس لئے یہاں کے کرنسی نوٹ بالکل ویسے ہی اور وہی تھے جو ہندوستان میں چلتے تھے۔ ہندوستان اور برما کی کرنسی کو اس طرح الگ کیا گیا تھا کہ برما کے نوٹوں پر کلاں سیاہی سے یہ الفاظ پرنٹ کئے ہوتے تھے — FOR BERMA ONLY

ہم نے یہ نوٹ گنے نہیں۔ یہ تھوڑے بھی نہیں تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک لاکھ کی مالیت کے نہیں تھے تو 90 ہزار کے ضرور ہوں گے۔ مجھے ان نوٹوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے نہ تو ہندوستان میں ٹھہرنا تھا۔ برما میں۔ وانگ اور اس کے

جو آٹھ جاپانی مشین کن سے مارے گئے تھے، ان کی لاشیں تو کچھ آدمی اٹھا کر دریا میں پھینک آئے تھے۔ اس ایک جاپانی کی لاش رہ گئی تھی۔ میں نے کہا ہی تھا کہ اس کو بھی دریا میں پھینک آؤ تو فوراً کئی ایک آدمی اسے گھسیٹتے ہوئے دریا میں پھینک آئے۔ اسی دوران یوں اور تانی بھی آ گئے جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

میں جھونپڑے میں چلا گیا۔ میرے ساتھ وانگ اور اس کے تین ساتھی تھے۔ ایک تو جاپانیوں کی رائفلیں پڑی تھیں اور ایمونیشن کے دو بکس بھی پڑے تھے۔ ایک بکس دیکھا اور کھولا تو اس میں گرینیڈ پڑے تھے۔ مجھے گرینیڈوں کا ہی خطرہ محسوس ہوا تھا۔ کوئی ناواقف گرینیڈ کی پن نکال دیتا تو ایسا دھماکہ ہوتا کہ ارد گرد کھڑے آدمیوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ رہتا۔ میں نے بہت سوچا کہ ان گرینیڈوں کا کیا کروں۔ ایک خیال یہ آیا کہ پورے کا پورا بکس دریا میں پھینک دوں لیکن یہ خیال بھی آ گیا کہ ان کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ آخر یہ فیصلہ کیا کہ انہیں سنبھال کر رکھا جائے اور کوئی آدمی اس بکس کو ہاتھ نہ لگائے۔

اس جھونپڑے میں سے جو کام کی چیزیں برآمد ہوئیں، ان میں ایک تو ٹین کے ڈبے تھے جن میں کھانے کی اشیاء پیک تھیں۔ بسکٹوں کے بھی ڈبے تھے اور پورا ایک کرٹ شراب کی بوتلوں کا تھا۔ وہاں کچھ بوتلیں کھلی پڑی تھیں جو جاپانی رات کو پیتے رہے تھے۔ ڈبے بے شمار تھے۔ جاپانیوں کی دریاں بھی وہیں پڑی تھیں۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے ان کی جیبوں کی تلاشی لی تو ان میں سے کرنسی نوٹ نکلے جو کوئی اتنے زیادہ نہیں تھے۔

وہاں چھوٹا سا ایک اور بکس پڑا ہوا تھا۔ وہ کھولا تو اس میں سے نوٹوں کی بے شمار گنھیاں نکلیں۔ یہ پانچ سے لے کر سو روپے تک کے نوٹ تھے۔ برما پر بھی انگریزوں کی حکمرانی تھی اس لئے یہاں کے کرنسی نوٹ بالکل ویسے ہی اور وہی تھے جو ہندوستان میں چلتے تھے۔ ہندوستان اور برما کی کرنسی کو اس طرح الگ کیا گیا تھا کہ برما کے نوٹوں پر کلاں

سیاہی سے یہ الفاظ پرنٹ کئے ہوتے تھے — FOR BERMA ONLY

ہم نے یہ نوٹ گنے نہیں۔ یہ تھوڑے بھی نہیں تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک لاکھ کی مالیت کے نہیں تھے تو 90 ہزار کے ضرور ہوں گے۔ مجھے ان نوٹوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے نہ تو ہندوستان میں ٹھہرنا تھا۔ برما میں۔ وانگ اور اس کے

جاؤں۔ یہ سوچ کر میں نے یہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر سمجھا۔
 ”صاحب!“ — ایک روز وانگ نے میرے پاس آکر کہا — ”ہمارے لوگ آپ کو کہیں بھی نہیں جلنے دیں گے۔ وہ تو آپ کو اپنی بیٹیاں پیش کر رہے ہیں۔“
 ”بیٹیاں؟“ — میں نے حیرت اور ذرا غصے سے کہا — ”کیا تم لوگ یہاں ایک اور سچ اللہ پیدا کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم مجھے بھی.....“

”نہیں صاحب!..... نہیں!“ — وانگ نے کہا — ”دو آدمی ہیں..... دونوں مسلمان ہیں۔ دونوں کی ایک ایک بیٹی جوان ہو گئی ہے۔ دونوں نے الگ الگ مجھے کہا ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ میں ان کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لوں۔ ایک نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں بھی رکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو دونوں کے ساتھ شادی کر لیں۔“

میں اس داستان میں بڑے واضح الفاظ میں کہہ چکا ہوں کہ میں انسان تھا فرشتہ نہیں تھا۔ انسان بھی ایسا جو اچھی قسم کا انسان نہیں تھا۔ وانگ نے مجھے بڑے ہی سخت امتحان میں ڈال دیا تھا۔ یہ مت بھولیں کہ میں جوان آدمی تھا اور میری فطرت کے تقاضے اور مطالبے میرے جیسے جوان فوجیوں کی طرح کے تھے۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ میں فوراً ”پھل کیوں نہ گیا۔ ایک وجہ تو صاف تھی کہ شادی کا نام سن کر ہی مجھے واجدہ یاد آ گئی اور ایک فلم تھی جو میری آنکھوں کے آگے چل پڑی۔

میں نے وانگ سے کہا کہ میں سوچ کر جواب دوں گا۔ تھکن کا بہانہ کر کے میں نے اسے اٹھا دیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اپنا گھر یاد آ گیا۔ ایسی بے چینی شروع ہو گئی جو میرے قابو میں نہیں آرہی تھی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ واجدہ ایسی بُری طرح میرے دل و دماغ پر غالب آ گئی کہ جی میں آتی تھی کہ اُڑ کر پہنچ جاؤں لیکن میں مجبور تھا اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس کا خاوند زندہ گھر پہنچ گیا تھا یا نہیں، اگر وہ دونوں ٹانگوں کے بغیر گھر پہنچا تھا تو واجدہ نے اسے قبول کر لیا تھا یا نہیں۔

میں مجبور اور بے بس تھا اور ذہن اس قدر پریشان کہ ایک بار سوچ لیا کہ رات نفل میرے پاس ہے، ایک راؤنڈ اس میں ڈالوں اور اپنے آپ کو ختم کر لوں۔ میں موت سے اڑ گیا اور میرا ذہن فرار کے راستے ڈھونڈنے لگا۔ اسے فرار کا ایک ذریعہ مل گیا۔ ان ڈالوں لڑکیوں کو میں نے دیکھا ہوا تھا بلکہ ہر روزی دیکھا کرتا تھا جو مجھے پیش کی جا رہی

درختوں سے اتارا اور ان آدمیوں سے کہا کہ یہ ایریکل اور وانگلیس سیٹ دریا میں پھینک آئیں۔ البتہ اس کی تار ضائع نہ کی۔ وہ لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لی۔ یہ کہیں نہ کہیں کام آنے والی چیز تھی۔



میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں اپنی اصلیت بھول چکا تھا اور جب میں نے ایک ہی بار نو جاپانی مار ڈالے تو مجھے یوں لگا جیسے میں آسمان کی مخلوق میں سے ہوں۔ میں اپنے آپ میں رہنا چاہتا تھا۔ میری جو منزل تھی، اسے میں اپنے ذہن میں رکھنا چاہتا تھا۔ اپنے آپ کو میں نے سنبھال لیا اور اپنی اصلیت کو ذہن میں بیدار کر لیا لیکن وہاں کے لوگوں نے مجھے کچھ اور ہی بتا دیا اور کچھ اور ہی سمجھ لیا۔ انہوں نے جس طرح میرے ساتھ عقیدہ تندی کا اظہار کرنا شروع کر دیا، وہ ویسا ہی تھا جیسا عقیدہ مند لوگ اپنے پیروں کے آگے کرتے ہیں۔ اگر میں ان لوگوں سے کہتا کہ میرے آگے سجدہ کرو تو وہ انکار نہ کرتے۔

وہ کچھ ایسا یقین کر بیٹھے تھے جیسے مجھ میں کوئی غیبی طاقت ہے جو عام لوگوں میں نہیں ہوتی۔ وانگ اور اس کے دو تین دوست مجھے بتاتے رہتے تھے کہ لوگوں نے میرے متعلق کیا رائے قائم کر لی ہے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ میں ان ہی جیسا انسان ہوں اور مجھ میں کوئی بافوق الفطرت طاقت نہیں لیکن وہ نہیں مانتے تھے۔ وانگ اور اس کے یہ ساتھی اس بہتی کے لوگوں کے لیڈر تھے اور لوگ ان کی ہر بات مانتے تھے۔ یہی لیڈر مجھے سطح انسانی سے بالا سمجھنے لگے تھے تو دوسرے لوگ مجھے اتنا بڑا رُتبہ کیوں نہ دیتے!

میں نے جب دیکھا کہ لوگ مجھ سے اتنے زیادہ مرعوب ہو گئے اور میرے آگے جھکنے بھی لگے ہیں تو مجھے ایک اور خیال آ گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ سچ اللہ کی طرح میں بھی ان کا پیرو بن جاتا اور عیش کرتا لیکن میں جس صورت حال میں پھنس کے رہ گیا تھا اس سے نکلنے کے لئے مجھے اپنے اللہ کی مدد درکار تھی۔ اللہ گناہگاروں کی مدد نہیں کیا کرتا..... مجھے نیا خیال یہ آیا کہ یہ محض اتفاقات تھے کہ میں نے انگریز پائلٹ کو ان ہی لوگوں کے ہاتھوں مروا دیا تھا اور اب جاپانیوں کو مار ڈالا تھا، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے ہی کوئی اور آجائے یا ایسی صورت حال پھر بھی ہو جائے اور میں کچھ بھی نہ کر سکوں بلکہ گرفتار ہو

تھیں۔ دونوں خوبصورت تھیں اور نوجوان بھی تھیں۔ پریشان حال اور شکست خوردہ ذہن مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں ان دونوں میں سے ایک لڑکی کے ساتھ شادی کر لوں۔ میں نے تقریباً فیصلہ کر لیا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ انہی خیالوں اور تصویروں میں میری آنکھ لگ گئی۔

میں اگلے روز حسب معمول دیر سے جاگا۔ ذہن خاصا پرسکون تھا۔ ناشتہ کر کے میں باہر نکلا ہی تھا کہ وانگ آگیا اور اس نے پہلی بات یہ پوچھی کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے ایک مسکراہٹ کے سوا کوئی اور جواب نہ دیا۔ وانگ میری مسکراہٹ کو شاید رضامندی سمجھا ہو گا لیکن میں کسی اور ہی خیال میں گم ہو گیا تھا۔ اُس وقت میری نظریں ان لوگوں کے جھوپڑوں پر گھوم رہی تھیں۔

میرا جھوپڑا ذرا بلندی پر تھا جہاں سے مجھے یہ ساری بستی بڑی صاف نظر آتی تھی۔ جھوپڑوں کی چھتیں نظر آتی تھیں اور بعض کے صحن بھی میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے خیال یہ آ گیا کہ یہ لوگ جنگ سے بھاگ کر یہاں آئے اور آباد ہو گئے۔ یہ خوف و ہراس کے مارے ہوئے اپنے آپ کو اتنا کمزور سمجھ رہے تھے کہ مجھے ہی اپنا محافظ اور نجات دہندہ سمجھ لیا۔ میرا دھیان اللہ کی طرف چلا گیا تو ایک خیال آیا کہ ہر کسی کا محافظ اللہ ہے لیکن ان لوگوں کو وہ اللہ نظر نہیں آ رہا اس لئے انہوں نے مجھے اپنا خدا یا دیوتا بنا لیا ہے۔

”اے گناہگار انسان!“ — میری ذات سے آواز اٹھی — ”کیا تو اللہ سے برابری کرنے کی سوچ رہا ہے؟ اپنے آپ پر نظر ڈال، تو ان سے زیادہ کمزور ہے۔“

میرا وجود سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگی اور مدد بھی۔

”آپ شادی کر لیں صاحب!“ — وانگ نے کہا — ”زیادہ مت سوچیں۔“

”میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں وانگ!“ — میں نے کہا — ”اتفاق سے موٹر بوٹ مل گئی ہے۔ اس میں مجھے دریا کے اگلے کنارے پر چھوڑ آؤ۔“

”کیا آپ دریا کی حالت دیکھ نہیں رہے صاحب!“ — وانگ نے کہا — ”روز بروز طغیانی بڑھ رہی ہے۔ کچھ دنوں بعد یہ دریا کناروں سے باہر آ جائے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ روزانہ مینہ برستا ہے۔ مون سون کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ کم از کم دو

مہینے آپ یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔“

اس نے جو کہا تھا وہ ٹھیک کہا تھا۔ ساون کی بارشیں شروع ہو گئی تھیں اور دریا چڑھتا جا رہا تھا۔ دریا کے درمیان جو موجیں اٹھتی تھیں وہ روز بروز اونچی اور تیز و تند ہوتی جا رہی تھیں۔ موٹر بوٹ ان میں سے نہیں گزر سکتی تھی، البتہ الٹ کر ہمیں ڈبو سکتی تھی۔ اس دریا پر دور اوپر پُل تھا اور نیچے کی طرف بھی ایک پُل تھا۔ یہ مجھے انہی لوگوں نے بتایا تھا لیکن دونوں پُل میرے لئے بیکار اور خطرناک تھے۔ دونوں پُلوں پر دونوں طرف فوج کے پہرے کھڑے رہتے تھے۔ میں کسی بھی پُل پر جانا تو پکڑا جاتا۔

”شادی کی سوچو صاحب!“ — وانگ نے کہا — ”شادی کی سوچو..... ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔“

میں ہنس پڑا اور وانگ کے کندھے پر تھپکی دی۔

”کبھی تو ایسا خیال آتا ہے کہ یہاں سے بھاگ جاؤں“ — میں نے وانگ سے کہا — ”دل گھبرا جاتا ہے۔ کبھی ایسے بھی لگتا ہے جیسے میں یہاں قید ہو گیا ہوں۔“

”تو پھر میری ایک بات مانیں“ — وانگ نے کہا — ”ہمارے ساتھ کسی دن قصبے میں چلیں۔ آپ کو وہاں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ آپ کے پاس یہ کپڑے ہیں ان کپڑوں میں آپ کو کوئی بھی نہیں پہچان سکے گا..... اس طرح آپ کے دل کے بھلنے کا ایک ذریعہ مل جائے گا۔ آپ اس قصبے اور وہاں تک جانے والے راستے کو یقیناً پسند کریں گے۔“

وانگ کا یہ مشورہ مجھے اچھا لگا۔ میں تو ایک ہی جگہ قید ہو کر رہ گیا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ قصبے میں جانا میرے لئے خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا۔ میں فوجی امور کو سمجھتا تھا۔ قصبے میں ہماری انٹیلی جنس کے آدمیوں اور مخبروں کا ہونا لازمی تھا۔ میں چونکہ بری نہیں تھا اس لئے میں برمیوں میں پہچانا جاسکتا تھا کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ اس کے باوجود میں وانگ کے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی نے مجھ سے پوچھا تو میں کون گا کہ پنجاب کا رہنے والا ہوں اور رنگون میں میری دکان تھی۔ وانگ اور ان کے ساتھیوں نے یہی گواہی دینی تھی۔

اگلے روز ہم قصبے کو روانہ ہوئے۔ میرے ساتھ وانگ اور اس کے چار ساتھی تھے۔ میں نے سچ اللہ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر کپڑے کی ٹوپی تھی اور میری

واڑھی لمبی تھی۔ میں نے کرتے کے نیچے نیفے میں انگریز پائلٹ کا ریو اور اڑسا ہوا تھا۔ اس میں چھ گولیاں بھری ہوئی تھیں اور بارہ گولیاں بیلٹ میں اڑی ہوئی تھیں۔ میں نے یہ بیلٹ کرتے کے اندر کمر سے باندھ لی تھی۔ ہم بستی سے نکل کر پہاڑی کے پیچھے چلے گئے۔ پیچھے دھان کے کھیت تھے ان سے آگے پہاڑیاں تھیں۔ وہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔

دیکھنے کو یہ علاقہ بہت ہی خوبصورت اور صحت افزا تھا۔ سبزہ زار کے نیچے زمین تو نظر ہی نہیں آتی تھی۔ پہاڑیوں کے دامن میں کہیں کہیں ہرے سرکندے کھڑے تھے جو اتنے گھٹے تھے کہ ان میں سے گزرا نہیں جاسکتا تھا۔ درخت تو بہت ہی زیادہ تھے۔ پہاڑیوں کے اوپر بھی سبزہ اور درخت تھے۔ آسمان پر ساون کے بادل منڈلا رہے تھے۔ سارا ماحول اتنا دلربا تھا کہ انسان اپنے آپ کو دکھ و درد اور مسائل سے آزاد سمجھنے لگتا تھا لیکن جب خیال آتا کہ یہ خطہ جنگ کی زد میں ہے تو دل پر خوف سا طاری ہو جاتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جنگ اس طرف آگئی تو توپوں کی گولہ باری اور ہوائی جہازوں کی بمباری اس خطے کے حسن کو جلا کر راکھ کر دے گی اور فوجیں اس سبزہ زار کو پاؤں تلے روند ڈالیں گی۔

ہم بونے درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں میں سے راستہ بناتے چلے جا رہے تھے۔ یہ شاخیں رات کی بارش کے قطروں سے بوجھل تھیں۔ ان شاخوں نے ہمارے کپڑے جھگو دیے۔ آگے جو پہاڑی تھی اس کے درمیان شکاف تھا۔ ہم اس شکاف میں سے گزرے تو آگے یک لخت زمین نیچے چلی گئی۔ یہ ایک وسیع اور خاصا لمبا کھڈ تھا جس میں بارش کا پانی کنارے تک بھرا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں سے گزرنے کی ذرا سی بھی جگہ نہیں تھی۔ اس کھڈ کے درمیان ایک لمبی چٹان تھی جو ایک کنارے سے سامنے والے کنارے تک چلی گئی تھی لیکن یہ اوپر سے نوکیلی نہیں بلکہ چھٹی تھی۔ ایک آدمی اس کے اوپر چل کر آسانی سے گزر سکتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے یہ کھڈ خشک موسم میں خشکی کی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ یہ اتنا گہرا ہے کہ لمبا ترنگا ایک آدمی اس میں ڈوب سکتا ہے۔

ہم اس کھڈ کے درمیان کھڑی چٹان پر چلتے گزر گئے۔ آگے پہاڑی بھی کئی ہوئی تھی۔ ہم اس میں سے بھی گزر گئے۔ آگے جا کر ہمیں دائیں طرف مڑنا پڑا کیونکہ آگے

ایک اونچی ٹیکری کھڑی تھی جس میں سے گزرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم دائیں طرف چلتے کچھ دور تک پہنچ گئے تو یہ ٹیکری ختم ہو گئی اور ہم بائیں کو گھوم کر آگے چلے گئے۔

آگے اسی قسم کی اونچی نیچی کوئی چھوٹی کوئی بڑی ٹیکریاں تھیں اور نوکیلی چٹانیں بھی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس علاقے میں آنے والے ہم پہلے انسان ہیں۔ جنگل اور گھنا ہوا گیا تھا۔ جھاڑیاں بھی بہت تھیں اور گھاس خاصی اونچی تھی۔ کہیں کہیں ہرے سرکندے بھی کھڑے نظر آتے تھے۔ وانگ میرا گائیڈ تھا۔ وہ آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ کچھ دور آگے ایک باقاعدہ پگنڈی آجاتی ہے۔

○

ہم کچھ اور آگے گئے تو وانگ اچانک ٹوک گیا اور اُس نے بازو پھیلا دیئے جس کا مطلب یہ تھا کہ سب ٹوک جاؤ۔ وہ کچھ دیکھ کر رُکا تھا۔ اس نے جو دیکھا تھا وہ مجھے بھی نظر آیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ پچیس تیس قدم آگے اور ذرا بائیں کو صاف نظر آیا کہ کوئی انسان یا کوئی جانور یک لخت جھاڑیوں اور اونچی گھاس کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ وہ کوئی انسان نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان ہوتا تو اسے چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کوئی درندہ ہی ہو سکتا تھا۔

”شیر نہ ہو!“ — وانگ نے سرگوشی کی۔

”ہو سکتا ہے!“ — میں نے کہا اور نیفے سے ریو اور نکال لیا۔

میں اس علاقے میں ایک شیر مار چکا تھا اور معلوم ہوا تھا کہ جن جنگلاتی علاقوں میں جنگ لڑی جا رہی ہے، وہاں سے شیر اور بھیڑیے وغیرہ بھاگ کر اس طرف آگئے ہیں۔ یہ نو جھاڑیوں اور اونچی گھاس میں چھپ گیا تھا شیر بھی ہو سکتا تھا اور بھیڑیا بھی لیکن میں نے سوچا کہ یہ کوئی درندہ کوئی اور جانور ہو تا تو وہ کچھ نہ کچھ حرکت ضرور کرتا۔ یوں ایک جگہ بے حس و حرکت نہ ہو جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی چیز انسان یا جانور ضرور چھپا ہے۔

”خبردار رہنا صاحب!“ — ہمارے ایک ساتھی نے کہا — ”شیر جب حملہ کرنے لگتا ہے تو اسی طرح چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور بڑی ہی تیز رفتاری سے اٹھتا اور چھپتا ہے۔“

میں نے دو تین منٹ انتظار کیا۔ میری نظریں اسی جگہ مرکوز تھیں جہاں کوئی چیز چھپی تھی۔ میں نے بائیں طرف دیکھا۔ قریب ہی ایک چٹان تھی۔ میں وہاں پاؤں پھینک کر گیا اور اوپر چڑھ گیا۔ بلندی سے دیکھا تو صاف نظر آیا کہ وہ ایک آدمی ہے جس کا کمر سے اوپر جسم ننگا ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل ہو گیا تھا اور اس نے سر زمین کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ مجھے یہ بھی صاف دکھائی دیا کہ اس نے نیکر پہن رکھی تھی۔ جو خاکی رنگ کی تھی۔ میں بڑی تیزی سے چٹان سے اترا اور اپنے ساتھیوں کے قریب سے گزر کر آگے چلا گیا۔ میں اس آدمی کے اور قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریو لوریا کوئی اور ہتھیار ہو سکتا تھا۔ میری انگلی ریو لور کے ٹریگر پر تھی۔

میں نے یہ سوچ کر کہ یہ کوئی بری ہی ہو گا، وانگ کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ وہ اپنی زبان میں اونچی آواز سے کہے کہ تم جو کوئی بھی ہو سامنے آ جاؤ ورنہ ہم گولی چلا دیں گے۔

وانگ نے بلند آواز میں یہ الفاظ کہے لیکن آگے گھاس میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ میں یہ سمجھا کہ یہ آدمی بری زبان نہیں سمجھتا۔ میں نے اس کی خاکی نیکر دیکھی تھی۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی میری طرح محاذ سے بھاگا ہوا یا بھٹکا ہوا فوجی ہی نہ ہو!

”تم جو کوئی بھی ہو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ“ — میں نے بلند آواز سے کہا — ”اگر تم فوراً نہ اٹھتے تو میں تم پر ریو لور فائر کر دوں گا۔“

”فائر نہ کرنا“ — اُدھر سے نحیف سی آواز آئی — ”میں اٹھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہت کمزور ہو گیا ہوں۔“

میں نے ٹریگر میں انگلی رکھے ہوئے ریو لور کی نالی اُدھر ہی کور رکھی اور انتظار کرنے لگا۔ پہلے مجھے اس کی پیٹھ نظر آئی پھر سر زرا اوپر اٹھا۔ وہ کمر تک گھاس اور جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا، مجھ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ نہایت آہستہ آہستہ سیدھا ہوا۔ وہ قد آور جوان تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی جلیاں گئی جاسکتی تھیں۔ وہ واقعی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا تو میں نے کہا کہ دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لو اور آگے آ جاؤ۔

اُس نے میرے الٹی میٹم کے جواب میں کہا تھا کہ وہ اٹھ رہا ہے تو میں نے نوٹ کیا تھا کہ اُس نے اُردو میں جو جواب دیا تھا اس کا لہجہ پنجابی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہمارے

طرف آیا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ چل نہیں سکتا۔ شاید بیمار تھا۔ اس کے پاؤں میں پٹوری چپل تھی۔ اس کے ایک بازو پر کئی سے اوپر خاکی کپڑا بندھا ہوا تھا اور اسی طرف کی ٹانگ کی پٹنڈی پر بھی ایسا ہی کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی نہیں تھیں۔

میں دوڑ کر اُس تک پہنچا اور اس کے ایک پہلو میں ہو کر اس کا بازو اپنے کندھے پر رکھا اور اس کا کچھ بوجھ اپنے اوپر لے لیا۔ میرے ساتھی بھی دوڑتے پہنچے اور اُسے سارا دیا۔ وہاں تھوڑی سی جگہ ایسی تھی جہاں گھاس نہیں تھی۔ اسے وہاں بٹھایا اور ہم اس کے پاس بیٹھ گئے۔

”کون ہو تم بھائی؟“ — ”میں نے پوچھا۔“ — ”تم ہو تو ہندوستانی، یہ بتاؤ کس صوبے کے رہنے والے ہو؟“

”میں جہلم کا رہنے والا ہوں۔“ — اس نے بڑی ہی کمزور آواز میں آہستہ آہستہ جواب دیا — ”اور میں فوجی ہوں۔ میرا نام حوالدار فضل واو ہے۔۔۔۔۔ کئی دنوں سے بھوکا ہوں، کچھ کھلا دو۔ صاف ستھرا پانی پلا دو۔ معلوم نہیں کب سے گندہ پانی پی رہا ہوں۔“

وہ میرے اپنے وطن کا آدمی تھا اور فوجی بھی تھا۔ میں اسے مرنے کے لئے وہیں چھوڑ دینا گناہ کبیرہ سمجھتا تھا۔ میں نے وانگ کو سر سے اشارہ کیا کہ چلو واپس چلیں۔ وانگ میرے پاؤں کے خیال سے آیا تھا۔ اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار آ گئے۔

”اٹھو وانگ!“ — میں نے اٹھتے ہوئے کہا — ”تم لوگ مل کر اسے اٹھاؤ اور اپنے ہاں لے چلو۔“

ہم سب اٹھے۔ میں نے ریو لور اپنے نیچے میں اڑس لیا۔ میں نے اُسے اس طرح اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا کہ اس کا اوپر کا دھڑ میری پیٹھ کے پیچھے لٹک رہا تھا اور کمر سے نیچے یعنی ٹانگیں میرے سامنے تھیں۔ میرے ساتھیوں نے مجھے روکا اور کہا کہ اسے وہ اٹھائیں گے لیکن میں نے ان کی نہ سنی اور چل پڑا۔ کچھ دور آگے آ کر میرے ایک ساتھی نے اسے اسی طرح اٹھا لیا جس طرح میں نے اٹھایا تھا۔ اس طرح تھوڑی تھوڑی دور تک باری باری اٹھاتے اسے اس جگہ تک لے آئے جہاں پانی والا لہجہ چوڑا کر رہا تھا اور جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں سے حوالدار فضل واو کو گے لے جانا زرا مشکل نظر

آنے لگا۔ وہاں گزرنے کا راستہ تو تھا جو دیوار جیسا تھا لیکن اس پر ایک آدمی چل سکتا تھا۔ اتنا زیادہ وزن کندھوں پر ڈال کر اس راستے پر سنبھل کر چلنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ یہ مشکل بہر صورت حل کرنی تھی۔ میں نے فضل داد کو زندہ رکھنے کا بڑا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ میرے اس ارادے میں انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی تھا اور یہ بھی کہ وہ میری طرح فوجی تھا اور تیسری بات یہ کہ وہ میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اُس وقت وہ میرے کندھے پر تھا۔

میں نے اسے زمین پر کھڑا کر دیا تھا تاکہ میں ذرا سٹالوں۔ میرے جسم کو اللہ تعالیٰ نے دل کھول کر طاقوت دی تھی۔ میں نے فضل داد کو پھر اسی طرح ایک کندھے پر ڈال لیا جس طرح پہلے اٹھایا تھا۔ پانی سے بھرے ہوئے وسیع کھڈ کے کنارے پہنچے تو میں نے اللہ کا نام لے کر اس کے درمیان چٹان پر قدم رکھا۔ دوسرا قدم نہایت آہستہ رکھا۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ اس چٹان کی چوٹی چھٹی تھی لیکن یہ میزیا فرش کی طرح چھٹی نہیں تھی۔ کہیں ذرا اونچی اور کہیں ذرا نیچی تھی۔ چونکہ یہ گیلی تھی اس لئے اس سے پاؤں پھسلنے کا خطرہ موجود تھا۔ میں جو قدم اٹھاتا وہ آگے رکھ کر جاتا اور پھر دوسرا قدم اٹھاتا تھا۔ اس طرح میں نصف راستہ طے کر گیا۔

”صاحب جلدی آگے نکلو“ — پیچھے سے وانگ کی سخت گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی — ”مگر مجھ آ رہا ہے۔“

”کدھر سے؟“ — میں نے پوچھا۔ میں بھی وانگ کی طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔

”دائیں طرف دیکھو“ — وانگ نے کہا۔

میں نے فضل داد کو دائیں کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ اوھر سے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے اس طرف گھوم کر یعنی پورے جسم کو اُس طرف کر کے دیکھا تو میرا خون خشک ہو گیا۔ ایک مگرچہ کا سر پانی میں سے باہر نظر آ رہا تھا اور وہ میری طرف تیرتا آ رہا تھا۔ اس سے نیچے کی ایک ہی صورت تھی کہ میں آگے کو دوڑ پڑتا لیکن وہاں تو آہستہ چلنا بھی چر خطر تھا۔

”یہ چھوٹے والا ہے صاحب!“ — مجھے ایک اور ساتھی کی آواز سنائی دی — ”پھر بھی خطرناک ہے۔۔۔۔ آگے نکلو۔“

ہمارے دو ساتھی جو میرے آگے آگے جا رہے تھے وہ دوڑ کر آگے نکل گئے اور جو

پیچھے تھے وہ پیچھے کو بھاگ گئے۔ چٹان پانی میں پوری طرح ڈوبی ہوئی نہیں تھی۔ پانی اس کی چوٹی سے ڈیڑھ دو فٹ نیچے تھا۔ مگرچہ بڑی آسانی سے منہ اوپر کر کے میرے پاؤں یا ہاتھ کو منہ میں بے سکتا تھا۔ یہ تو میں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ یہ چھوٹا مگرچہ ہے۔

مگرچھوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو بہت بڑا ہوتا ہے اور اس کی ایک نسل چھوٹی ہوتی ہے۔ اس کے جسم کی لمبائی ایک گز بمشکل ہوتی ہے۔ میں اس کی لمبائی میں اس کی ڈوم کو شامل نہیں کر رہا۔ میں نے یہ چھوٹے مگرچہ کراچی منگو پیر کی ایک خانقاہ کے ٹاب میں دیکھے تھے۔ یہ بھی بڑے مگرچھوں کی طرح خطرناک ہوتے ہیں۔ اس چھوٹے مگرچہ نے مجھے یا فضل داد کو نکل تو نہیں لیتا تھا نہ وہ اتنی بڑی چیز کو نکل سکتا تھا اس نے کہا تھا کہ میری ٹانگ منہ میں لے کر پانی میں مجھے گھسیٹ لیتا تھا اور ڈوب کر مار ڈالتا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے اور فضل داد کو کھانا تھا۔

میں نے ریو الوور نکال لیا۔ مگرچہ وہاں سے اوپر آنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں میں کھڑا تھا۔ اس کے منہ اور میرے پاؤں کے درمیان مشکل سے ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ وہ ایک ہی بار منہ کا چھٹا مار کر میری ٹانگ پکڑ سکتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ مگرچہ کی پیڑ پر گولی اثر نہیں کرتی کیونکہ اس کی کھال پتھر جیسی سخت ہوتی ہے۔ اس مگرچہ نے ایک بار منہ کھول کر اوپر آنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے منہ کی طرف ریو الوور کر کے ٹیگر دبا دیا۔ گولی اس حلق میں لگی ہوگی۔ وہ آدھے سے زیادہ پانی سے اوپر کو اچھلا اور پیچھے کو گرا پھر ایسا تڑپا کہ پانی اُچھل اُچھل کر میرے اوپر گرتا تھا۔ میں وہاں سے ہلا نہیں۔

”اس کے پیٹ میں گولی مارو صاحب!“ — میرے ایک ساتھی نے کہا۔

مگرچہ کبھی پانی میں ڈبکی لگا جاتا اور کبھی زور سے اوپر کو اٹھتا اور پھر پانی میں گر پڑتا۔ مجھے یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ مجھ پر آخری حملہ کر دے گا جو بڑا ہی خطرناک ہو گا۔ ایک بار وہ اٹھا ہو گیا اور اس کا پیٹ اوپر کو ہوا میں اس کے پیٹ میں گولی اتار دی۔ زبرد اس کا تڑپنا بند ہو گیا اور وہ مجھے پانی پر تیرتا نظر آنے لگا۔ وہ مر چکا تھا۔ نشانی یہ تھیں کہ پیٹ نیچے اور پیٹ اوپر تھا۔ میں بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ کھڈ عبور ہوا۔ ذرا آگے ہو کر میں نے فضل داد کو کندھے سے اتار دیا۔ پانی کو دیکھا، سرخ ہوا با تھا۔

”میرے لئے اتنی مصیبت نہ اٹھاؤ دوست! — فضل داد نے مرل کی آواز میں کہا — ”میں نے تو مرنا ہی ہے، مجھے یہیں پھینک دو۔“

”تم بری تو نہیں!“ — فضل داد نے مجھ سے پوچھا — ”ہندوستان کے کون سے علاقے کے رہنے والوں ہو؟“

”پنجاب کا ہی رہنے والا ہوں“ — میں نے پہلی بار اسے پنجابی زبان میں کہا اس سے پہلے میں اردو بولتا رہا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ — اس نے پوچھا۔

”رنگون میں میری دکان تھی“ — میں نے جھوٹ بولا — ”جپانیوں نے حملہ کر دیا تو میں اور وہاں کے اور بھی بہت سے بری بھاگ آئے اور یہاں قریب ہی بنے ہوئے جھونپڑے ہیں مل گئے اور یہاں ٹھکانہ کر لیا۔“

میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں فوجی ہوں۔ ابھی تو میں نے دیکھا تھا اور معلوم کرنا تھا کہ فضل داد یہاں تک کس طرح پہنچا ہے۔

ہم وہاں بیٹھ گئے۔ ہمارا ایک ساتھی اڈھڑ عمر تھا وہ ملاح اور ماہی گیر تھا اور آبی جانوروں کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ کھڈ مگر چھوں کا ٹھکانہ نہیں بن سکتا کیونکہ بارشوں کا موسم گزر جائے گا تو اس کھڈ میں سے پانی کم ہوتے ہوئے ختم ہو جائے گا۔ مگر مجھ اُس جگہ ہوتے ہیں جہاں پانی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مگر مجھ چھوٹے مگر چھوں کی نسل میں سے نہیں ہو گا بلکہ بچہ ہو گا۔ یہ کھڈ دو پہاڑیوں کے درمیان تھا۔ بارشوں میں پانی بڑی تیزی سے سیلابی حالت میں یہاں سے گزرتا تھا۔ یہ مگر مجھ کہیں دور سے پانی میں بہتا یا تیرتا یہاں تک پہنچ گیا اور اسی کھڈ کو اپنا ٹھکانا بنالیا۔ اس سے ہمیں یہ خیال آیا کہ یہ بچہ ہی ہو گا۔ بہر حال مگر مجھ تھا اور خطرناک تھا۔ اس کے مارے جانے سے یہ راستہ محفوظ ہو گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اُس وقت برما کے جنگلوں میں اڑدھا بھی ہوتے تھے اور مگر مجھ بھی لیکن یوں نہیں کہ جدھر جاؤ اُدھر اڑدھا اور مگر مجھ ہی تھے۔ ان کے اپنے اپنے ٹھکانے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی مگر مجھ یا اڑدھا کے ٹھکانے خود ہی پہنچ جاتا تو اس کا بچنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔

ہم وہاں سے چلنے لگے تو فضل داد نے کہا کہ وہ چلنے کی کوشش کرے گا۔ اُسے چلنے نہ دیا اور اسے میرے دو ساتھیوں نے اس طرح اٹھایا کہ دونوں —

کندھے جوڑ لئے اور فضل داد ان جڑے ہوئے کندھوں پر بیٹھ گیا۔ مشکل یہ تھی کہ ان برمیوں کے قد چھوٹے تھے۔ طاقت تو پوری تھی لیکن اتنی مشقت کے یہ لوگ عادی نہیں تھے۔ کچھ اور آگے جا کر فضل داد کو میں نے اٹھالیا، پھر دو اور ساتھیوں نے اسے اٹھایا اور اپنے ٹھکانے پر لے آئے۔ میں اسے اپنے جھونپڑے میں لے گیا اور اپنے بستر پر لٹا دیا۔

بستی میں رہنے والے چند ایک لوگوں نے دودھ کے لئے بکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ دودھ گرم کر لائیں۔ وہاں قدرت کی ایک اور نعمت یہ افراط پائی جاتی تھی۔ یہ شہد تھا۔ کئی گھروں میں شہد موجود تھا۔ یہ لوگ شہد کے چھتے توڑ کر شہد نکال لیا کرتے تھے۔ میرے دو ساتھی دوڑے گئے۔

فضل داد کی بات سنانے سے پہلے میں ایک اور بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ مگر مجھ مار دینے سے میرے کارناموں اور معجزوں کے ریکارڈ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے ساتھیوں نے ساری بستی میں مشہور کر دیا تھا کہ صاحب نے ایک مگر مجھ کو مار ڈالا ہے ورنہ یہ مگر مجھ معلوم نہیں کس کس کو کھا جاتا۔ میں نے ایک انگریز پائلٹ کو ان ہی لوگوں سے مروایا تھا پھر نو جپانیوں کو مارا تھا لیکن ان لوگوں پر میری دھاک اُس وقت بیٹھی تھی جب میں نے ایک شیر مارا تھا۔ اس شیر کا پورا واقعہ پہلے سنا چکا ہوں۔ اس سے پہلے میں نے ایک اڑدھا کو مار کر تانی کو اس کے منہ سے نکالا تھا اور یہی واقعہ ان لوگوں کے ساتھ میرے تعارف کا ذریعہ بنا تھا پھر جس طرح میں نے سبغ اللہ اور اس کے غنڈوں کو مارا تھا وہ پہلے سنا چکا ہوں۔ اب ایک مگر مجھ مار ڈالا تو ان لوگوں نے اپنے اس عقیدے کو اور پختہ کر لیا تھا کہ مجھے خدا نے کوئی مافوق الفطرت طاقت دی ہے۔ میں جو کچھ تھا وہ مجھے معلوم تھا اسی لئے میں وہاں سے بھاگ نکلنے کی سوچ رہا تھا۔

○

فضل داد کی حالت بہت بُری تھی۔ اس کے بازو اور ایک ٹانگ پر جو کپڑے بندھے ہوئے تھے وہ اس کی فوجی قبض میں سے پھاڑے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ دو مگرے زخم ہیں۔ اس کے جسم پر خراشیں بے شمار تھیں۔ یہ خاردار درختوں اور جھاڑیوں کی تھیں۔ ابھی میں اس سے نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اس جنگل میں کس طرح آگیا ہے۔ سب سے پہلے تو اسے کچھ کھانا پلانا تھا تاکہ اس میں کم از کم بولنے کی خانت آجائے۔ وہ

کچھ کہنے لگا تھا لیکن میں نے اُسے روک دیا۔ اسے بٹھا کر پانی دیا اور کہا کہ وہ آہستہ آہستہ ایک ایک گھونٹ پئے۔

میں اس کے زخموں سے کپڑے کھولنے لگا تو دیکھا کہ خون جم گیا تھا اور کپڑا زخموں پر چپکا ہوا تھا۔ اس کی خوش نصیبی دیکھیں کہ چلبانیوں کے سامان میں فٹس ایڈ بکس بھی تھا جس میں تمام دوائیاں، پٹیاں اور مرہم پٹی کا سارا سامان موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص بہت گندہ ہو گیا ہے، اسے پہلے نہلایا جائے، اس سے یہ بھی فائدہ ہو گا کہ کپڑے جو زخموں پر چپکے ہوئے تھے وہ اتر جائیں گے۔

میری خدمت کے لئے دو آدمی میرے جھونپڑے کے باہر موجود رہتے تھے۔ وہی میرا کھانا پکاتے اور میرے تمام کام کرتے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ پانی کے دو کنستر بھر لائیں۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ جھونپڑے کے پیچھے چادریں وغیرہ تان کر ہم نے غسل خانہ بنا رکھا تھا۔ فضل داو کو میں سارا دے کر وہاں لے گیا اور اس کی نیکر اتار ڈالی۔ میں نے اپنے کپڑے بدل لئے تھے۔ پانی آیا تو میں نے فضل داو کو اپنے ہاتھوں نہلایا۔ اس کا جسم خشک کیا اور ایک چادر کمر کے ساتھ باندھنے کے لئے دی۔ اسے واپس جھونپڑے میں لے آیا۔

اتنے میں دودھ اور شہد آگیا تھا۔ یہ شہد دودھ میں ملا کر فضل داو کو دیا کہ وہ آہستہ آہستہ پیتا رہے۔ اس نے بتایا کہ وہ کئی دنوں سے بھوکا تھا۔ ہمیں یہ باتیں بتانی گئی تھیں کہ زیادہ دن پیٹ خالی رہے تو فوراً ”کچھ کھانا نہیں چاہئے بلکہ آہستہ آہستہ پہلے کوئی چیز پینی چاہئے جس کے لئے شہد اور دودھ بہترین غذا ہے۔ اس کے بعد کچھ کھانا چاہئے لیکن وہ بھی آہستہ آہستہ!

صرف نہانے سے فضل داو کے چہرے پر رونق آگئی تھی اور جب اس نے شہد اور دودھ پی لیا تو اس کی آنکھوں میں بھی جوانی کی چمک آگئی۔ جب دیکھا کہ اس کی جسمانی طاقت بحال ہو رہی ہے تو میں نے اس کے بازو والے زخم سے کپڑا اتار دیا۔ گیلیا ہو جانے کی وجہ سے کپڑا اتر آیا۔ میں زخم دیکھ کر گھبرا گیا۔ یہ کم و بیش چار انچ لمبا اور ایک انچ گہرا تھا۔ اس میں ذرا ذرا سی پیپ نظر آرہی تھی۔

میں نے فٹس ایڈ بکس کھولا۔ اس میں جو سامان تھا وہ چلبان کا بنا ہوا تھا لیکن میں مرہم پٹی کی ہر چیز سے واقف تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اس زخم کی ڈرننگ کر دی۔

ہانگ سے کپڑا کھولا۔ یہ زخم تر چھا تھا اور اس کی بھی لمبائی اور گہرائی بازو والے زخم جتنی تھی۔ اس کی بھی ڈرننگ کر دی۔ میں نے ایک خطرہ مول لے لیا۔ وہ یہ تھا کہ فٹس ایڈ بکس میں دو شیشیاں رکھی تھیں جن میں گولیاں تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ ذہر تو ہو نہیں سکتا، یہ اگر مرہم پٹی کے سامان میں رکھی ہیں تو ان کا استعمال یہی ہو گا کہ ایک ایک گولی زخمی کو دی جائے۔ میں نے ایک گولی ایک شیشی سے اور ایک دو سری شیشی سے نکالی اور فضل داو کو کھلا دی، ساتھ تھوڑا سا پانی پلا دیا۔

فضل داو نے جو دودھ پیا تھا وہ تین پاؤں سے کم نہ تھا اور اس میں شہد بھی اچھا خاصا ڈالا گیا تھا۔ اس دودھ اور شہد نے اسے بھوک کی اذیت سے نجات دلا دی اور اس کے ساتھ اس نے سکون اس سے بھی محسوس کیا ہو گا کہ اس کے زخموں کی صحیح مرہم پٹی ہو گئی تھی جس سے درد رک گیا تھا۔ اس کے جسم پر جو خراشیں ڈرا گئی تھیں، میں نے ان پر تھوڑی تھوڑی مرہم لگا دی اور اوپر پاؤڈر چھڑک دیا۔ فضل داو پر غنودگی طاری ہو گئی۔ وہ بیٹھا ہوا تھا، آہستہ آہستہ پیچھے ہوا اور اس طرح لیٹ گیا جیسے گر پڑا ہو۔

میں نے سب کو اشارہ کیا کہ یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ اب کئی گھنٹے سوئے گا۔ اس کے لئے یہی سکون اور اطمینان کچھ کم نہ تھا کہ وہ جنگل کے خطروں سے نکل آیا اور ایک محفوظ پناہ میں پہنچ گیا تھا۔

آدھی رات گزر گئی ہوگی، میں گہری نیند سویا ہوا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ فضل داو جاگ اٹھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں بھی اٹھا اور دیا جلادیا، پھر فضل داو کے پاس بیٹھ گیا۔ اس سے حال احوال پوچھا تو اس نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اسے لائے زندگی دی ہے۔ میں نے کہا کہ زندگی دینے اور واپس لینے والا صرف اللہ ہے اور وہ اللہ کا ہی شکر ادا کرے۔

”کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟“ — اُس نے التجا کے لہجے میں پوچھا۔

”کیوں نہیں!“ — میں نے کہا۔ ”تمہارا کھانا الگ رکھا ہوا ہے۔“

میں اٹھا اور اس کا کھانا لاکر اس کے آگے رکھ دیا۔ وہاں میں اسے کوئی مرغن اور لکھن کھانا تو نہیں کھلا سکتا تھا، چاول تھے اور ان کے ساتھ مچھلی تھی۔ اس کے لئے یہی ماہ بہت بڑی نعمت تھی۔ اس نے میرے کہنے پر آہستہ آہستہ یہ کھانا کھایا اور پانی پیا۔ اسے کچھ عیاشی بھی کرا سکتا تھا۔ چلبانیوں کے خوراک والے ڈبے میرے کمرے میں

ہر جگہ اور تیز ہو گئی۔ ہم سب بڑی اچھی آڑ میں تھے اس لئے چھوٹے ہتھیاروں کا فائر ہر کوئی نقصان نہیں کر رہا تھا۔ جاپانیوں نے مارٹر گن کی شینگ شروع کر دی۔ دو تین بل ہمارے گلائیڈر پر گرے اور اس کے پر نچے اڑ گئے۔ پھر ہر طرف سے چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ میں حوالدار تھا اس لئے جوانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے لٹکاتا رہا لیکن وہاں ہوائے موت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے گورے لیفٹیننٹ کو دیکھا۔ ایک شیل نے اس کے جسم کی یہ حالت کر دی تھی کہ ایک ٹانگ الگ ہو گئی اور سامنے سے اس کا دم اڑ گیا تھا۔ پھر میں نے اپنے صوبیدار کو مرتے دیکھا۔ تب میں نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ دیکھنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے کہ فائر تین طرفوں سے آ رہا تھا۔ شینگ صرف ایک رخ سے آ رہی تھی۔ پیچھے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں گھاس اور جھاڑیوں میں بڑی تیزی سے رینگتا ہوا پیچھے کو چلا گیا اور مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ پیچھے ڈھلوان ہے جو دور نیچے تک چلی ہے۔ میں وہاں سے لڑھکتا ہوا نیچے ہی نیچے آنے لگا۔ ایک درخت کے تنے نے مجھے رک لیا۔ میری کمر کو چوٹ تو لگی لیکن میں نے پروا نہ کی۔ میں اٹھا اور کبھی ڈھلوان پر نہ رکھا اور کبھی کسی درخت کو پکڑتا نیچے ہی نیچے اتر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ہمارا گلائیڈر راز میں پر اتر تھا وہ بلندی پر تھی۔۔۔۔۔

”میں نیچے اتر گیا۔ میرے آگے پہاڑیاں تھیں۔ اوپر ابھی تک گولے برس رہے۔ میں ایک پہاڑی کے کنارے میں سے گزر کر دو پہاڑیوں کے درمیان چلا گیا اور پھر چلتا گیا۔۔۔۔۔ سارا دن گزر گیا لیکن میں رکا نہیں۔ ایک جگہ شفاف پانی کی چھوٹی سی ندی بہہ لاتی تھی۔ اس سے پانی پیا۔ میرے جھولے میں کھانے کے لئے کافی چیزیں تھیں۔ ان کے ڈبے بھی تھے جو امریکہ کی فوج کو دیئے جاتے تھے۔ یہ کھا کر پیٹ کی آگ رات میں رات کو بھی چلتا ہی رہا۔ میری کوشش یہ تھی کہ جاپانیوں کی فرنٹ لائن دور نکل جاؤں۔۔۔۔۔

”صبح ہوئی تو بھی میں میدان جنگ کے قریب ہی تھا۔ مجھے یہ اندازہ اس طرح ہوا کہ ملک کی آوازیں زیادہ دور نہیں تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنے دن اور کتنی راتیں گزر گئیں اور میں چلتا ہی رہا۔ کہیں چند منٹوں کے لئے رک جاتا تھا اور ڈرامہ لے کر پھر چل نکلتا اگر یہ علاقہ میدانی ہوتا تو پھر میں دشمن کو دور سے بھی نظر آ جاتا لیکن خدا کا

ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ ان پر لکھی ہوئی جاپانی زبان تو میں پڑھ نہیں سکتا تھا، ڈبوں پر تصویریں بنی ہوئی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ اس ڈبے میں کیا بند ہے۔ ایک ڈبے کے باہر ناشپاتی کی قسم کے پھلوں کی تصویریں تھیں۔ میں نے رائفل کی ٹنگین سے یہ ڈبہ کھولا اور پلیٹ میں اندر لے دیا۔ یہ ناشپاتی تھی یا جو کچھ بھی تھا، بڑا ہی مزے کا تھا۔ میں نے اور فضل داؤد نے پورا ڈبہ مل کر کھا لیا۔

فضل داؤد مجھ سے دس گیارہ سال بڑا تھا اس لئے میں نے اسے بھائی جان کہنا بہتر سمجھا۔

”اب بتائیں بھائی جان!“ — میں نے پوچھا — ”سونا ہے یا باتیں کرنی ہیں!“
 ”تم سو جاؤ“ — فضل داؤد نے کہا — ”میں نے تو سولیا ہے، تمہیں نیند سے اٹھا دیا ہے۔“

”میری فکر نہ کریں“ — میں نے کہا — ”یہاں سونے کے سوا کوئی کام نہیں۔ رات جاگوں گا تو کل دن سولوں گا۔۔۔۔۔ اگر آپ سونا نہیں چاہتے تو بتائیں کہ یہاں آپ کس طرح پہنچ گئے ہیں۔“

”ہمیں گلائیڈروں سے جاپانیوں کے اگلے مورچوں کے پیچھے اترنا تھا۔“ — فضل داؤد نے کہا — ”ہمارا گلائیڈر شاید غلط جگہ اتر گیا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ ہمارے گلائیڈر میں چھبیس آدمی تھے جن میں ایک انگریز لیفٹیننٹ، ایک صوبیدار، ہم دو حوالدار تھے اور باقی سب جوان تھے۔ ان میں تین چار ٹائیک اور لائن ٹائیک تھے۔ کئی ہزار نفری کی ایک فورس گلائیڈروں سے اتاری گئی تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ جب ہم اتر کر گلائیڈروں سے نکلیں گے تو ہمارا مال اپنی اپنے گروپ کمانڈر کے ساتھ ہو جائے گا۔ ہمارا گلائیڈر تو ٹھیک ٹھاک اتر گیا تھا اور ہم اس میں سے نکل آئے تھے۔ صبح ہوئی تو ہم پر تین طرفوں سے فائر آنے لگا۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ ہماری چھبیس جوانوں کی پائونڈر دشمن کے گھیرے میں آ گئی ہے۔۔۔۔۔

”ہمیں لیفٹیننٹ اور صوبیدار نے بتایا کہ فورس کے ساتھ ہمارا رابطہ نہیں ہو رہا اور شاید ہمیں غلط جگہ اتر دیا گیا ہے۔ اس گورے لیفٹیننٹ نے کہا ہم دشمن کے گھیرے میں ہیں اور اب ہر آدمی اپنی جان بچانے میں آزاد ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہتھیار نہیں ڈالنے اور جنگی قیدی نہیں بننا۔ اس کے بعد ہم سب بکھر گئے اور جاپانیوں کی

کرم تھا کہ جنگل بہت ہی گھنا ہے جس نے مجھے چھپائے رکھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں اور میں کہاں ہوں۔ سورج سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں ہندوستان ہی کی طرف جا رہا ہوں لیکن جنگل 'پھاڑیاں اور ندی نالے ختم ہونے میں ہی نہیں آتے تھے.....

”آگے یہ دریا آگیا۔ اس کا نام میں نے پہلے سنا تھا..... ایراوتی..... آج کل تو اس میں سیلاب آیا ہوا ہے، اس وقت یہ سیلابی نہیں تھا۔ میں بڑا ماہر تیراک ہوں اور بریگیڈ کے مقابلوں میں اول کبھی دوم رہا ہوں۔ میں اللہ کا نام لے کر اس دریا میں اتر گیا۔ پانی ٹھنڈا تو تھا لیکن بچ نکلنے کی ایک ہی صورت تھی کہ میں یہ دریا تیر کر پار کر جاؤں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس دریا پر پل ہیں لیکن یہ بھی معلوم تھا کہ ان پلوں پر فوجی پوٹیشین بنی ہوئی ہیں اور گزرنے والے کو بڑی سختی ہے چپک کیا جاتا ہے۔ اگر مجھے یقین ہو تاکہ فلاں پل پر ہماری فوج کی یا گورارجنٹ کی ڈیوٹی ہے تو میں سیدھا وہاں چلا جاتا اور وہ لوگ مجھے پیچھے بھیج دیتے۔ خطرہ یہ تھا کہ وہاں پوسٹ جاپانیوں کی ہوئی تو وہ مجھے دیکھ کر ہی گولی مار دیں گے.....

”میں نے دریا پار کر تو لیا لیکن جب میں اگلے کنارے جا لگا اور دریا سے نکلا تو میرا جسم اکڑ چکا تھا۔ بازوؤں کی یہ حالت تھی جیسے لکڑیوں کے بنے ہوئے ہوں۔ یہی حال ٹانگوں کا تھا۔ میں بڑی ہی مشکل سے قدم گھسٹتا آگے گیا اور گر پھر اپر مجھے ہوش نہ رہا۔ معلوم نہیں میں بے ہوش ہو گیا تھا یا سو گیا تھا۔“

میں دیکھ رہا تھا کہ فضل داد بولتے بولتے اونگھنے لگا تھا اور وہ بعض فقرے اس طرح بولتا تھا جیسے نیند میں بول رہا ہو۔ اس میں بولنے کی طاقت کم ہوتی جا رہی تھی۔

”آپ سو جائیں بھائی جان!“ — میں نے کہا — ”دماغ پر اتنا زور نہ دیں۔ میں آپ کی باقی باتیں کل سن لوں گا۔“

”ہاں بھائی!“ — اس نے جھائی لے کر کہا — ”مجھ میں تو بولنے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ اس سے آگے مجھ پر جو گزری اور جہاں میں پہنچ گیا وہ اس قدر خوفناک ہے کہ سنانے کے لئے مجھے اچھی خاصی طاقت کی ضرورت ہوگی۔ وہ ٹانگے جنگلیوں کا ایک قبیلہ تھا جس نے مجھے اور ایک جوان عورت کو پکڑ لیا تھا..... یہ کل سناؤں گا۔“

وہ لینا اور لیٹنے ہی خراٹے لینے لگا۔

اکثر قارئین سوچتے ہوں گے کہ یہ گلائڈر کیا چیز ہے جو جاپانیوں کے مورچوں کے پے اتارے گئے تھے۔ میں اپنی آپ بیتی سے ہٹ کر آپ کی معلومات میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور اس اضافے میں آپ کو کام کی کچھ باتیں بھی معلوم ہو جائیں گی۔ آپ کو دلچسپ اور فکر انگیز بات معلوم ہو جائے گی کہ یہودیوں نے فلسطین کو اسرائیل بنانے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا اور انہوں نے کیا کیا پاپڑ بیلے تھے..... امداد فضل داد نے جب مجھے گلائڈروں کے اترنے کی بات سنائی تھی اس وقت مجھے یوم نہیں تھا کہ یہ گلائڈر کیا ہوتے ہیں اور یہ برما کے جنگلوں میں جاپانیوں کے پیچھے اس طرح اتارے گئے تھے۔ میں نے پہلے آپ کو بتایا ہے کہ مجھے جنگ عظیم دوم کے ملحق تاریخ اور لٹریچر میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں جب اپنے گھر آیا تھا تو اس جنگ کے متعلق جو بھی کتاب ملی وہ میں نے پڑھی۔ ان گلائڈروں کے آپریشن کے متعلق بھی یہ تفصیلی معلومات ایک کتاب سے حاصل ہوئی تھیں۔ یہ میں آپ کو سناتا ہوں۔ باتیں تو آپ پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ اگر کہانی میں کوئی کارآمد یا تاریخی اہمیت کی بات آئے تو وہ کہانی کو خراب یا بے مزہ نہیں کرتی بلکہ پڑھنے والے کی معلومات میں اضافہ آتا ہے۔

دسمبر 1971ء کے وہ دن یاد کریں جب مشرقی پاکستان ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ وہاں اپنی جہت ہی تھوڑی تھی اور جو تھی اسے انتہائی ضروری جنگی ساز و سامان بھی میسر نہیں۔ بھارت نے ڈھاکہ کے قرب وجوار میں اپنی کچھ فوج ہیلی کاپٹروں کے ذریعے اتار دی تھی جس نے ڈھاکہ کو محاصرے میں لے لیا تھا۔ پھر نوبت ہتھیار ڈالنے تک پہنچی..... نمن پر عقب سے حملہ کرنے کا تصور بڑا ہی پرانا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں خالد بن ولیدؓ کے بعد میں صلاح الدین ایوبی نے عقب سے حملہ کرنے کی جنگی چالوں سے بڑی نمایاں حاصل کی تھیں۔

دوسری جنگ عظیم میں برما فرنٹ پر گلائڈروں سے جاپانیوں کے عقب میں فوج اتری گئی تھی، پھر جب اتحادیوں یعنی امریکیوں اور انگریزوں نے یورپ پر فرانس کے اہل سے جرمنوں کے خلاف حملہ کیا تھا تو پیراشوٹوں سے فوج جرمنوں کے عقب میں اتری گئی تھی۔ میں برما فرنٹ کی بات کروں گا۔

..... جنگ عظیم کے دن ان ہیلی کاپٹر موجود نہیں تھے نہ ابھی ہیلی کاپٹر بننا تھا۔ ہیلی

کاپٹر پہلی دفعہ جنگ عظیم کے آخری دنوں میں تیار ہوا اور اس کی پرواز کا تجربہ کیا گیا تھا۔ لیکن پہلی کاپٹر استعمال نہیں کئے گئے تھے۔ یوں کہہ لیں کہ پہلی کاپٹر جنگ عظیم کے بعد بنے اور ان کی باقاعدہ پرواز شروع ہوئی تھی۔

یہ میں پوری تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ دوسری جنگ عظیم میں جاپانی کس طرح حملہ آور ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر ماہر آقا باض ہوئے تھے۔ وہاں سے انگریزوں کی اپنی اور انڈین آرمی کی پسپائی کو ایک تاریخی پسپائی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد انگریزوں اور امریکیوں نے مل کر ہر ماہر جاپانی حملہ کیا لیکن جاپانی جم کر لڑے اور وہ پسپا ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔

انگریزوں کی فوج میں ایک بریگیڈیئر تھا جس کا نام ونگیٹ تھا۔ کسی نہ کسی کو خدا کوئی ایسا غیر معمولی وصف دے دیتا ہے جس سے وہ معجزہ نما کارنامے کر کے دکھا دیتا ہے۔ ایسے لوگ ماہرین سے کئی درجے اوپر ہوتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے اپنا ایک فوجی افسر کرنل لارنس عرب کی سرزمین میں بھیجا تھا۔ اس نے دو مسلمان ملکوں، عرب اور ترکی، کو آپس میں ٹکرا دیا تھا جس کے نتیجے میں ترکوں کو شکست ہوئی اور اس کا سارا فائدہ انگریزوں کو پہنچا۔

دوسری جنگ عظیم میں بریگیڈیئر ونگیٹ نے اپنی مہارت کے خصوصی جوہر دکھائے۔ ونگیٹ پہلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ پیدا انٹھی گوریلا ہے اور اس میں جنگ کی لڑائی کے جوہر پیدا انٹھی طور پر پائے جاتے ہیں۔ وہ ابھی کیپٹن ہی تھا جب یہ سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ونگیٹ گوریلا جنگ اور جنگ کی لڑائی کا ماہر ہے اور اس میں یہ وصف خصوصی طور پر پایا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب انگریزوں نے دیکھا کہ جاپانی ہر ماہر سے پیچھے ہٹ نہیں رہے تو انہوں نے ونگیٹ سے مشورہ طلب کیا۔ اس وقت وہ بریگیڈیئر تھا۔ اس نے کہا کہ ایک ہی طریقہ ہے کہ فوج جاپانیوں کے عقب میں اتاری جائے۔

جنگ ہر ماہر کے گھنے جنگوں اور پہاڑی علاقوں میں لڑی جا رہی تھی۔ بریگیڈیئر ونگیٹ نے جائزہ لیا تو اس کے دماغ میں یہ سکیم آئی کہ گلائڈروں کے ذریعے فوج جاپانیوں کے عقب میں اتاری جاسکتی ہے۔ اس نے بتایا کہ گلائڈر کتنا بڑا بنایا جائے۔ گلائڈر ایک ہوائی جہاز ہوتا ہے جس میں انجن نہیں ہوتا۔ اسے فضا میں کنٹرول

کرنے کے لئے پورا انتظام موجود ہوتا ہے جس سے اسے کسی بھی طرف موڑا جاسکتا ہے اور اسے اسی طرح لینڈ کیا جاسکتا ہے جس طرح ہوائی جہاز لینڈنگ کرتے ہیں۔ اسے اڑانے کے لئے ایک بڑی لمبی تار سے ہوائی جہاز کے پیچھے باندھ دیا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز جب رن وے پر دوڑتا ہوا ٹیک آف کرتا ہے تو اس کے پیچھے گلائڈر ہوا میں چلا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز اسے وہاں تک لے جاتا ہے جہاں اسے اتارنا ہوتا ہے۔ گلائڈر میں ایک ہینڈل سالگا ہوتا ہے جسے کھینچو تو وہ تار اس سے الگ ہو جاتی ہے جس کا دوسرا سرا ہوائی جہاز کے پیچھے بندھا ہوتا ہے۔ گلائڈر کے کنٹرول پر ایک آدمی بیٹھا ہوتا ہے جو اسے بڑے آرام سے زمین پر اتار لیتا ہے۔

بریگیڈیئر ونگیٹ کے پلان کے مطابق بے شمار گلائڈر تیار کئے گئے۔ یہ ایلو مونیئم کے بنے ہوئے ہوائی جہازوں جیسے ڈھانچے تھے اور ان ڈھانچوں پر بڑا موٹا کیوس کی طرح کا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ ہر ایک گلائڈر اتنا بڑا تھا کہ اس میں پچیس اور اس سے بھی کچھ زیادہ فوجی بیٹھ سکتے تھے۔ انہیں فضا میں لے جانے کے لئے ڈکونڈ طیارے استعمال کئے گئے تھے۔

ڈکونڈ دوسری جنگ عظیم کا بڑا مشہور طیارہ ہے جو امریکہ نے بنایا تھا۔ اس کا ایک ونگ اور دو انجن ہوتے ہیں۔ یہ فوجوں کی بار برداری اور فوجیوں کو اودھر اودھر لے جانے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہ بے شمار مسلمان اور فوجی اٹھا لے جاتا تھا۔

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کتنے گلائڈر تیار کئے گئے تھے۔ اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ جاپانیوں کے عقب میں کتنے ہزار فوج اتاری گئی تھی۔ بعض نے نفی پچاس ہزار اور بعض نے تیس ہزار لکھی ہے۔ یہ ساری فوج بنگال کے کسی ہوائی اڈے پر اکٹھی کی گئی جہاں ڈکونڈ طیارے اور سینکڑوں گلائڈر تیار کھڑے تھے۔ اس فوج کو یوں ہی گلائڈروں میں بھر کر ہرما کے جنگوں میں اتار نہیں دیا گیا تھا بلکہ اس ساری فوج کو بنگال اور آسام کے گھنے جنگوں میں لے جا کر جنگوں کی لڑائی کی اور گوریلا لڑائی کی بڑی سخت ٹریننگ دی گئی تھی۔ اس فوج میں جو افسر تھے، انہیں بھی گلائڈر کو فضا میں کنٹرول کرنے کی اور اتارنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔

ان گلائڈروں کو ہرما کے جنگوں سے واپس لانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی اتنی قیمتی چیز نہیں تھی۔ بیشتر گلائڈر زمین پر اتر کر بے کار ہو جاتے تھے۔ یہ

میدانوں پر یا باقاعدہ رن دے پر چڑھائے اور اتارے جائیں تو محفوظ رہتے ہیں۔ گلائڈر جنگل میں اتارا جائے تو اس کے اتنے بڑے بڑے ونگ درختوں کے ساتھ ٹکرا کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

آخر ایک رات بریگیڈیئر ونگمٹ نے اس خصوصی فورس کے تمام افسروں کو اکٹھا کیا اور انہیں آخری بریفنگ دی۔ نقشے پر انہیں بتایا کہ وہ گلائڈر کہاں اتاریں گے۔ یہ تو انہیں ٹریننگ دی جا چکی تھی کہ ان جنگلوں میں اتر کر وہ کس طرح حملے کریں گے اور ان کی دیگر جنگی کارروائی کیا ہوں گی۔ اس پوری فوج کو گلائڈروں پر سوار کر دیا گیا۔ ہر گلائڈر میں کم از کم پچیس فوجی تھے۔ ان میں انگریزوں کی انڈین آرمی کے منتخب جوان اور افسر بھی شامل تھے۔ ان میں سے بعض کو خصوصی طور پر گوریلا ٹریننگ دی گئی تھی۔ انہوں نے جاپانیوں پر گوریلا طرز کے حملے کرنے اور شہنوں مارنے تھے۔ باقی فوج نے ایک فوج کی طرح پیچھے سے حملہ کرنا تھا۔

یہ ساری فورس برما کے جنگلوں میں جاپانیوں کی اگلی پوزیشنوں کے پیچھے اتار دی گئی۔ اسے رات کے وقت اتارا گیا۔ ڈکوئہ طیارے کچھ گلائڈروں کو برمالے جا کر چھوڑ دیتے اور واپس آکر مزید گلائڈروں کو لے جاتے اور اس طرح یہ سلسلہ رات بھر چلتا رہا۔ انگریز اور امریکن پُر امید تھے کہ ان کا یہ آپریشن کامیاب رہے گا لیکن یہ آپریشن بڑی ہی جری طرح ناکام ہوا۔ وہ اس طرح کہ بریگیڈیئر ونگمٹ غالباً "برما کے جنگل پوری طرح دیکھ نہیں سکا تھا۔ گلائڈر اترے اور درختوں سے ٹکرا کر یا چٹانوں کی چوٹیوں سے ٹکرا کر ایسے تباہ ہوئے کہ ان میں بیٹھے ہوئے فوجی بھی زخمی اور ہلاک ہو گئے۔ بہت سے گلائڈر غلط جگہوں پر جا اترے۔ وہ محفوظ تو رہے لیکن جاپانیوں نے انہیں گھیر کر فوجیوں سے ہتھیار ڈالوا لئے یا جس طرح حوالدار فضل واو کی پلانٹوں کے ساتھ ہوا تھا، بعض پلانٹوں یا گروپوں کو گھیر کر ایسی فائرنگ اور شینگ کی کہ انہیں ختم کر ڈالا۔

یہ برما فرنٹ کی سب سے بڑی ٹریجنڈی تھی لیکن انگریزوں نے حوصلہ قائم رکھا اور آخر جاپانی پسپا ہونے لگے لیکن انگریزوں اور امریکیوں کو اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

بریگیڈیئر ونگمٹ کو اپنے آپریشن کی اس ناکامی کا بہت ہی دکھ تھا۔ اُن ہی دنوں اسے ترقی دے کر میجر جنرل بنا دیا گیا تھا۔ وہ عہدے کا نہیں بلکہ فح کا خواہش مند تھا۔ اس

نے ایک اور گوریلا فوج تیار کی اور خود اس کے ساتھ برما کے جنگلوں میں گیا۔ اس نے جاپانیوں کے پاؤں اکھاڑ دیے لیکن وہیں مارا گیا۔

میں نے پہلے یہودیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہودی مجھے ونگمٹ کے سلسلے میں یاد آ گئے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں ونگمٹ کیپٹن ہو گیا تھا اور ان ہی دنوں وہ گوریلا جنگ کا ماہر تسلیم کیا گیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد انگریزوں نے یہودیوں کی جنگی خدمات کا صلہ دینے کے لئے ان سے وعدہ کیا کہ وہ فلسطین کو ان کا وطن بنا دیں گے۔ 1902ء میں برطانیہ کے سیکرٹری نوآبادیات، جیمز لین نے افریقہ کے ملک یوگنڈا کا تمام علاقہ یہودیوں کو بطور تحفہ پیش کیا اور کہا تھا کہ اسے اسرائیل بنالیں لیکن یہودیوں نے بلکہ مسیحیوں نے یوگنڈا کو پسند نہ کیا اور کہا کہ انہیں فلسطین چاہئے۔

مسیحیوں نے فلسطین میں اراضی خریدنی شروع کر دی اور وہاں زرعی فارم بنا لئے۔ یہ ایک بہانہ تھا فلسطین میں آباد ہونے کا۔ یہ داستان بڑی لمبی ہے، میں اختصار سے سناؤں گا۔ یہودی اپنی صیہونی تنظیم کے تحت فلسطین میں داخل ہوتے رہے اور وہاں آباد ہوتے چلے گئے۔ انگریزوں نے کیپٹن ونگمٹ کو فلسطین اس مقصد کے لئے بھیجا کہ وہ صیہونیوں کو گوریلا جنگ کی ٹریننگ دے اور انہیں اس قابل بنادے کہ وہ اپنے زور بازو سے وہاں اپنی حکومت قائم کر لیں اور انگریز پس منظر ہی میں رہیں۔ ونگمٹ نے ان یہودیوں کو ایسی ٹریننگ دی کہ انہیں دنیا کے مانے ہوئے گوریلے بنا ڈالا۔ اسرائیل کا مشہور جرنیل موٹے دایان جو 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اپنی فوج کا کمانڈر انچیف تھا اور بعد میں وزیر دفاع بن گیا تھا، بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ میں ونگمٹ کا شاگرد ہوں اور اسے اپنا پیرو مرشد مانتا ہوں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر اسرائیلی سپاہی ونگمٹ کا شاگرد ہے، اس نے ہمیں فتح کا راستہ دکھایا تھا۔

یہ تھا ونگمٹ جس نے انگریزوں کی اور اسرائیل کی تاریخ میں بڑا اونچا مقام پیدا کیا۔ اس نے برما فرنٹ پر تیس سے پچاس ہزار تک فوج مروا ڈالی اور نہ جانے کتنے گلائڈر تباہ کر دیئے تھے لیکن انگریز جاپانیوں کی پسپائی کا سراو ونگمٹ کے سرماندھے ہیں کیونکہ اس نے اپنی غلطی کا کفارہ اپنی جان دے کر ادا کیا تھا۔

حوالدار فضل واو ونگمٹ کے آپریشن کا ہی مارا ہوا تھا اور ابھی تک برما کے جنگلوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ نہ جانے اس جیسے کتنے ہندوستانی اور برطانوی فوجی ان جنگلوں میں

باب میں آپ کو صرف حوالدار فضل داو کی کہانی ملے گی۔

س انسان چاند تک پہنچ گیا ہے۔ انسان خلا کی سرانجامی کر رہا ہے۔ پھر انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ زمین کے ہر گوشے اور ہر کونے کھدے تک پہنچ گیا ہے لیکن کہیں نہ کہیں سے خبر ملتی ہے کہ دنیا کے فلاں ملک کے فلاں علاقے میں بیب و غریب جانور یا عجیب الخلق انسان دیکھنے میں آئے ہیں یا یہ کہ انسان تو ہم جیسے ہی ہیں لیکن ان کی عادات اور ان کے اطوار درندوں جیسے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دنیا میں پتھر کے زمانے کے لوگ آج بھی موجود ہیں جنہیں معلوم ہی نہیں کہ انسان مانسی ترقی کے کس عروج پر پہنچ چکا ہے۔

ایک برفانی انسان دیکھا گیا ہے جس کا تمام کا تمام جسم سر سے پاؤں تک ریچھوں کی طرح سیاہ کالے بالوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس کا قد چھ فٹ سے کہیں زیادہ ہے اور اس کے پاؤں کے جو نشان برف پر دیکھے گئے ہیں وہ کم و بیش ایک فٹ لمبے ہیں۔ یہ انسان دو تین ملکوں کے پہاڑی علاقوں کی بلندیوں پر دور سے دیکھا گیا ہے اور اس کے فوٹو بھی لئے گئے ہیں۔ حال ہی میں بلوچستان میں دور دراز پہاڑی علاقے میں ایک قبیلہ دریافت ہوا ہے جس کے تمام افراد بونے ہیں۔ سب سے اونچے قد کا آدمی صرف چار فٹ کا ہے۔ میں ایسی چند اور مثالیں دے سکتا ہوں لیکن بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اس تمہید سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ انسان نے کرۂ ارض کے ہر گوشے کی تحقیق کر لی ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی یہ دنیا بہت ہی وسیع و عریض ہے اور اللہ کی اس زمین پر ابھی بہت سے راز ہیں جو انسان پر بے نقاب نہیں ہوئے۔

بھٹک بھٹک کر بھوکے پیاسے مر گئے تھے۔

یہاں میں قارئین کی دلچسپی کے لئے ایک اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ مشرقی پاکستان میں جسے مکتی باہنی کہا گیا تھا وہ دراصل انڈین آرمی کی کمانڈو اور گوریلا فورس تھی۔ ایوب خان مرحوم نے اپنے دور حکومت میں اس کی تعداد تیس ہزار بتائی تھی۔ 1971ء میں یہ تعداد 80 ہزار ہو گئی تھی۔ وہ جنگوں اور نندی ٹالوں کا علاقہ ہے۔ انڈین آرمی کی اس فورس کو گوریلا ٹریننگ اور جنگل کی لڑائی Jungle War Fare کی ٹریننگ اسرائیلیوں نے دی تھی اور اس کا ایک ماہر اسرائیلی جرنیل جنرل جیکب انڈین آرمی کی ایئرٹن کمانڈر میں موجود تھا۔

فضل داو کا مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ وہ ان جنگلوں میں سے زندہ نکل کر پیچھے پہنچ جائے بلکہ وہ ایک اور مصیبت میں جا گرفتار ہوا تھا۔ اس وقت برما اور ہندوستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف چھوٹا سا علاقہ تھا جس میں قدیم جنگلی قبائل آباد تھے۔ ان کی زندگی اور رسم و رواج افریقہ کے حبشیوں سے ملتے جلتے تھے۔ وہ انسانی جانوں کی قربانی اپنے دیوتاؤں کے حضور پیش کرتے تھے اور وہ انسانی کھوپڑی کو بہترین تحفہ سمجھتے تھے۔ فضل داو ایک آسامی عورت کے ساتھ ان کے ہاتھ چمکھ گیا تھا۔ وہاں سے وہ کس طرح نکلا اور اس نے وہاں کیا دیکھا؟ یہ ایک بڑی ہی خوفناک کہانی ہے جو بظاہر ناقابل یقین لگتی ہے لیکن میں نے بعد میں پڑھا تھا کہ اس علاقے میں اس سے زیادہ خوفناک کہانیاں جنم لیتی رہی ہیں۔ میں آپ کو فضل داو کی پوری کہانی سناؤں گا۔

حوالدار فضل داد جس وحشی قبیلے کے ہاتھ چڑھ گیا تھا وہ ایسے ہی لوگ تھے جن تک ابھی تہذیب اور سائنس نہیں پہنچی تھی۔ یہ قبیلے کہیں دور دراز سمندر میں کسی جزیرے میں نہیں رہتے تھے بلکہ تہذیب یافتہ ہندوستان اور براکے درمیان ایک پہاڑی علاقے میں رہتے تھے۔ تہذیب اور جدید تمدن میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود وہ تہذیب جدید سے ناواقف تھے یا انہوں نے دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو تہذیب سے دور رکھا ہوا تھا۔ یہ ٹانگے یعنی بالکل برہمنہ رہنے والے وحشی لوگ تھے جو پہاڑیوں کی بلندیوں پر رہتے تھے۔

میں یہ داستان بہت پہلے لکھ چکا تھا۔ یکم مئی 1995ء کا امریکی رسالہ ”نامم“ دیکھا۔ اس میں ایک خبر پڑھی جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ میں اس خبر کا ترجمہ اس باب میں اضافے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ یہ اس میں ضرور شامل کر لیں۔ یہ خبر بڑھ کر اپنی رائے خود ہی قائم کریں کہ انسان میں انسان خوری تہذیب یافتہ ہونے کے باوجود موجود ہے۔ خبر یہ ہے:

یہ بات افریقہ کے جنگلی حبشیوں کی نہیں بلکہ جنوبی چین کے مذہب لوگوں کی ہے۔ جنوب میں چین کی سرحد جہاں ہانگ کانگ سے ملتی ہے وہاں چین کا ایک شہر شیزین آباد ہے۔ امریکہ کے ہفت روزہ رسالے ”نامم“ نے یکم مئی کے شمارے میں خبر دی ہے کہ ہانگ کانگ کے سرحدی علاقے کے لوگوں نے سنا کہ چین کے شہر شیزین میں ایک خاص بخنی یعنی سوپ پیا جاتا ہے۔ یہ بخنی ان بچوں کے گوشت پوست سے بنائی جاتی ہے جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے اور رحم مادر میں آٹھ یا نو ہفتے پورے کر چکے ہوئے ہیں۔ اتنے سے بچے کو جنین اور انگریزی میں FETUS کہتے ہیں۔ اسے FOETUS بھی لکھا جاتا ہے۔ تلفظ اور معنی ایک ہی ہیں۔

”نامم“ لکھتا ہے کہ جنین کی بخنی اس لئے پی جاتی ہے کہ اس سے جسم کی جلد ملائم اور پُرکشش ہو جاتی ہے اور یہ بخنی انسان کو ہمیشہ صحت مند رکھتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ چین کے اس شہر کے سرکاری ہسپتال اور ہر پرائیویٹ کلینک سے جنین مل جاتے ہیں۔ قیمت بہت ہی معمولی ہے۔ صرف تین ڈالر فی جنین یعنی تیس بیس روپے۔

یہ خبر گزشتہ سال ہانگ کانگ زبانی پہنچی تو ہانگ کانگ کے لوگوں نے اسے جابجا مانا۔ سچ ماننے والی بات ہی نہیں تھی۔ کوئی مذہب اور ہوش و حواس والا انسان اس بچے

کی بخنی نہیں پی سکتا جس کی عمر رحم مادر میں آٹھ یا نو ہفتے ہو چکی ہوتی ہے بلکہ نوزائیدہ بچے کے ساتھ بھی کوئی انسان ایسا سلوک نہیں کر سکتا لیکن ہانگ کانگ میں یہ بات پھیلتی چلی گئی۔ آخر ہانگ کانگ کے تین چار صحافی سرحد پار کر کے چین کے اس شہر میں گئے اور ایک پرائیویٹ کلینک کے مالک ڈاکٹر سے ملے۔ انہوں نے یہ نہ بتایا کہ وہ صحافی ہیں یا وہ ہانگ کانگ سے آئے ہیں۔ انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ جلدی امراض کے مریض ہیں اور ویسے بھی ان کی صحت گری گری رہتی ہے اور انہوں نے سنا ہے کہ یہاں ایک خاص بخنی پی جاتی ہے جو جلد اور صحت کو ٹھیک رکھتی ہے۔

یہ صحافی حیران رہ گئے کہ اس چینی ڈاکٹر نے بلا جھجک اور بے خوف ہو کر انہیں بتایا کہ یہ بخنی اس کے ہاں مل سکتی ہے لیکن انہیں انتہا کرنا پڑے گا۔ اس نے انہیں بتایا کہ جنین کی بخنی سرکاری ہسپتال اور ہر پرائیویٹ کلینک کے ڈاکٹر خود بھی پیتے ہیں۔ اس نے بخنی بنانے کا طریقہ یہ بتایا کہ جنین کو ماں کے پیٹ سے نکال کر اور صاف کر کے پانی میں ڈالا جاتا ہے اور اسے جوش دیا جاتا ہے۔ اس میں چونکہ ذرا ناگوار سی بو ہوتی ہے اس لئے اس میں اورک اور لسن بھی ڈالا جاتا ہے۔

یہ صحافی وہاں کے دو اور ڈاکٹروں سے ملے تو انہوں نے بھی ایسی ہی باتیں کیں اور پردہ ڈالنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی..... قدرتی طور پر سوال اٹھا کہ اتنے جنین مل کہاں سے جاتے ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ملا کہ چین میں خاندانی منصوبہ بندی کا قانون بہت ہی سخت ہے۔ شادی شدہ جوڑا صرف ایک بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ اگر کسی کے ہاں دو سرا بچہ پیدا ہو جائے تو اس کے باپ کو سزا ملتی ہے۔ اس اتنے سخت قانون کا ایک نتیجہ یہ سامنے آ رہا ہے کہ میاں بیوی ایک بچہ پیدا کرتے ہیں اور وہ لڑکی نکل آتی ہے۔ ہر ماں باپ لڑکا پسند کرتے ہیں لیکن وہ دو سرا بچہ پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ نوزائیدہ بچی کو مار کر کہیں غائب کر دیتے ہیں یا زندہ ہی کہیں پھینک آتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ان کا ابھی کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ پھر کوشش کرتے ہیں کہ ان کی لڑکے کی خواہش پوری ہو جائے۔ چین میں اکثر نوزائیدہ بچیاں باہر پڑی ملتی ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک عورت نے ایک بچہ پیدا کر لیا اور وہ پھر امید سے ہو گئی۔ ایسی مائیں پرائیویٹ ڈاکٹروں کے پاس جا کر اسقاطِ حمل کرا لیتی ہیں۔ رحم مادر میں بچے کی عمر عموماً آٹھ نو ہفتے ہو چکی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر یہ جنین رحم مادر سے نکال کر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ بعض عورتیں سرکاری

ہسپتال میں جا کر اسقاط (ایبارشن) کرا لیتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چین کی حکومت نے لوگوں کو اسقاط کی اجازت دے رکھی ہے یعنی پیٹ میں دوسرا بچہ پرورش پانے لگے تو اسے ضائع کر دو۔

یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ وہ کون ڈاکٹر تھا جس نے سب سے پہلے جنین کی بخنی بنائی اور یہ تجربہ کیا کہ اس بخنی کے یہ فوائد ہیں۔ بہر حال یہ بالکل صحیح ہے کہ چین کے اس سرحدی شہر میں یہ بخنی پی جاتی ہے جو مذہب دنیا کا کوئی انسان تصور میں نہیں لاسکتا۔ اگر یہ خبر کسی ملک کے محدود سے علاقے میں پڑھے جانے والے معمولی سے اخبار یا رسالے میں چھپی ہوتی تو اس پر کوئی یقین نہ کرتا اور یہ کہا جاتا کہ اس پر پے نہ کاروباری مفاد کی خاطر یہ ناقابل یقین اور سنسنی خیز خبر گھڑ کر چھاپ دی ہے۔ اس خبر کو ہم اس لئے سچ سمجھتے ہیں کہ یہ نیویارک سے نکلنے والے ہفت روزہ رسالے ”ٹائم“ میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ہفت روزہ ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے اور اس کی خبریں اور تبصرے مضامین میں حوالوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے میں وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ یہ خبر غلط نہیں ہو سکتی۔

○

اب میں فضل داؤ کا سفر سناتا ہوں جو اس نے اس جنگل میں طے کیا تھا۔ یہ تو سنا چکا ہوں کہ وہ مجھ تک کیسے پہنچا تھا۔۔۔۔ اس کا گلائیڈر تباہ ہو گیا اور پھر اس کا سارا گروپ جاپانیوں کی گولہ باری کی نذر ہو گیا تو وہ وہاں سے بھاگا۔ وہ ڈھلانوں سے گرا، کہیں سنبھل سنبھل کر اترتا، اس نے ندیاں اور پھر دریا تیر کر عبور کیا۔ اس کے پاس شین گن تھی جو ڈھلان سے گرتے وقت گر پڑی تھی اور معلوم نہیں کہاں تک جا پہنچی تھی۔ فضل داؤ — شین گن کا ایمونیشن بھی پھینک دیا۔ اس کے پاس چار گریینڈ تھے۔ اس نے وہ بھی پھینک دیئے۔ اسے یہ خطرہ تو نظر آ رہا تھا کہ کہیں بھی جاپانی اسے دیکھ لیں گے اور پکڑ لیں گے لیکن وہ اکیلا لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے زندہ رہنے کی یہ ترکیب کی کہ اپنے پاس نہ کوئی ہتھیار رہنے والا نہ ایمونیشن۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جاپانیوں سے آنا سامنا ہو گیا تو وہ بڑے آرام سے ان کا جنگی قیدی بن جائے گا۔

وہ اور ہی گھنے جنگل میں چلا گیا تھا۔ وہاں سبزے اور درختوں سے لدی ہوئی ٹیکریاں بھی تھیں، ایسی چٹانیں بھی تھیں جن پر گھاس کی ایک پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اگر

یہ اس سبزہ زار کو بیان کرنے لگوں تو پڑھنے والے کہیں گے کہ یہ تو کوئی صحت افزا مقام ہے اور وہ لوگ خوش نصیب تھے جو ایسے روح افزا اور خوبصورت علاقے میں رہتے تھے۔ یکن مجھ جیسے اور فضل داؤ جیسے آدمی ہی بتا سکتے ہیں کہ اس خطے کے حُسن میں ایک رشت تھی جو دل و دماغ پر مسلط ہو گئی تھی۔ ایک خوف تو یہ تھا کہ وہ علاقہ جنگ کی زد میں تھا، دوسرا خطرہ یہ کہ جاپانی کہیں سے بھی آنکلتے اور فضل داؤ کو پکڑ لیتے۔ فضل داؤ پکڑے جانے کے لئے تیار تھا لیکن ہماری فوج میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ جاپانی یوں بھی کرتے ہیں کہ ہندوستانی یا انگریز فوجی کو پکڑ کر اس پر سنگین بازی (بیونٹ فائٹنگ) کی پریکٹس کرتے ہیں یا انہی مذاق میں اسے گولی مار دیتے ہیں۔ ان جنگلوں میں ایک خطرہ بگ جانے اور کسی درندے کا شکار ہو جانے کا بھی تھا۔ فضل داؤ دراصل بھٹکا ہوا ہی تھا۔ اس کی اب یہ کوشش تھی کہ پیچھے آجائے اور اپنی فوج سے آٹے۔ وہ پہاڑیوں میں گم ہو گیا تھا جہاں اُسے سمت کا کوئی خیال نہیں رہا تھا۔ وہ زیادہ تیز نہیں چلتا تھا کہ تھکن نہ ہو۔ کچھ فاصلہ چلتا اور پھر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کے سفر کا وہ دن پہاڑیوں کے اندر ہی گزر گیا اور تاریکی چھانے لگی۔ وہ سونے کے لئے کوئی موزوں جگہ تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ اُسے نظر آئی جہاں سے پہاڑی اوپر جا کر برآمدے کی چھت کی طرح باہر کو آئی ہوئی تھی۔ وہ وہیں لیٹا اور کچھ دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔

رات شاید آدھی گزر گئی ہوگی جب بے ہنگم شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ بالکل اس کے قریب کئے لڑ رہے تھے۔ فضل داؤ انہیں کتے ہی سمجھا لیکن اسے فوراً پتہ چل گیا کہ یہ کتے نہیں اور نہ ہی یہ آپس میں لڑ رہے ہیں بلکہ یہ بھیڑیے ہیں اور انہوں نے اپنا شکار پکڑ لیا ہے اور مل جل کر اسے جھنجھوڑ رہے ہیں۔ فضل داؤ نے غظندی یہ کی دیک کر بیٹھا رہا اور اٹھ کر دوڑ نہیں پڑا۔ وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ ان کا شکار خرگوش ہے یا کوئی اور جانور، بہر حال انہوں نے شکار مار لیا تھا جسے گھینے ہوئے وہ ایک طرف چلے گئے۔ تب فضل داؤ کو بچتا ہوا کہ وہ شین گن اور ایمونیشن پھینک آیا ہے۔

یہ بھیڑیے تو تقریباً اس کے اوپر چڑھ آئے تھے۔ اس کا دل خوف کے مارے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے حوصلہ مضبوط کیا اور پھر لیٹ گیا۔ اب جو لیٹا تو اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب سورج سر پر آ گیا تھا۔ اس روز اُس کے پاس کھانے کے لئے کچھ چیزیں موجود تھیں۔ یہ امریکہ کے پیک کئے ہوئے راشن کے ٹبے تھے۔ فضل داؤ نے

تھوڑا سا کھانا کھایا اور اُٹھ کر چل پڑا۔

میں فضل داد کے اس سفر کی پوری روداد نہیں سناؤں گا۔ اگر میں نے قدم قدم کی یا ایک ایک دن کی باتیں سنائی شروع کر دیں تو یہ میری داستان جیسی لمبی ہو جائیں گی۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ اس کا یہ سفر میرے سفر جیسا ہی تھا۔ وہ اسی روز یا شاید اگلے روز ان پہاڑیوں میں سے نکل گیا۔

آگے ایک وسیع و عریض علاقہ ایسا تھا جو ہموار تو نہیں تھا لیکن اس میں ٹیکریاں اور چٹانیں نہیں تھیں، بہر حال یہ پہاڑیوں اور چٹانوں میں گھرا ہوا میدان تھا۔ اس نے درختوں کو دیکھنا شروع کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ان درختوں میں کوئی پھل دینے والا درخت بھی ہے یا نہیں۔ اسے انجیر اور بیروں جیسے پھل دینے والے کچھ درخت نظر آ گئے۔ اسے احساس تھا کہ وہ چند دنوں میں ہی اس جنگل میں سے نکل نہیں سکے گا اور اس کے پاس جو راشن ہے وہ ایک ہفتے سے زیادہ نہیں چلے گا۔

اس کے پاس پانی کی بوتل تھی اور جھوللا (کیونوس بیک) بھی تھا۔ اس نے ان درختوں سے بہت سا پھل توڑ لیا اور جھولے میں ڈال لیا۔ اس علاقے میں پانی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ نمناک علاقہ تھا۔ اوس اتنی زیادہ بڑی تھی کہ درختوں کے پتے چوس لیتے تو انہی سے پیاس بجھ جاتی تھی۔ ویسے ندیاں بھی تھیں اور کہیں کہیں چشمہ بھی نظر آتا تھا۔



فضل داد کو وقت کا احساس اس لئے رہا کہ اُس کے پاس گھڑی تھی۔ پہلے کچھ دن تو اس نے حساب رکھا کہ کتنے دن گزر گئے ہیں لیکن کچھ دنوں بعد اُسے یہ یاد نہ رہا۔ پھر دن راتیں ایک دوسرے کے پیچھے گزرتے چلے گئے۔ فضل داد کبھی گھنے جنگل میں جا رہا ہوتا، کبھی پہاڑیوں کے درمیان اور کبھی میدان میں چلا جا رہا ہوتا اور اس طرح اس کا سفر جاری رہا۔ شام کے بعد کہیں موزوں جگہ دیکھ کر لیٹ جاتا اور صبح ہوتے چل پڑتا۔

راتوں کو وہ بھیڑیوں اور گیدڑوں کی آوازیں سنا کرتا تھا۔ کئی بار اس نے شیر کی گرج بھی سنی تھی اور کئی بار اس نے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنی جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ شیر یا کوئی درندہ اپنے شکار کا تعاقب کر رہا ہے۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ ان درندوں سے بچا رہا تھا۔ اس وقت تو مجھے کچھ سمجھ نہیں تھی لیکن بہت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس گھنے جنگل میں شیروں اور بھیڑیوں کے لئے شکار بہت تھا۔ میں برا کے جس

جنگلی علاقے میں تھا، وہاں میں نے خنزیر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فضل داد نے بتایا کہ جنگل کے جس حصے میں وہ جا پہنچا تھا وہاں جنگلی خنزیر خاصی تعداد میں نظر آتے تھے۔ بھورے رجب کے خرگوش تو وہاں عام تھے۔ فضل داد نے دور سے چار پانچ ہرن بھی دیکھے تھے۔ اگر درندوں کے لئے یہ شکار نہ ہوتا تو فضل داد کبھی کا بھیڑیوں یا کسی شیر کے پیٹ میں پہنچ چکا ہوتا۔

فضل داد نے سنایا کہ ایک روز وہ چلتے چلتے ایک ٹیکری پر چڑھ گیا۔ ٹیکری بہت اونچی نہیں تھی۔ وہ اگر گرد گرد کے علاقے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کو توقع یہ تھی کہ کہیں آبادی نظر آجائے گی لیکن وہاں آبادی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

فضل داد نے سنایا کہ وہ ٹیکری پر چلا گیا تو آگے اسے پانی کھڑا نظر آیا۔ یہ ایک قدرتی تالاب بنا ہوا تھا جو کوئی زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا۔ اس تالاب کے ایک طرف خاصی کھلی جگہ تھی جو ہموار تھی اور کچھ پرے ہٹ کر دیوار کی طرح ایک چٹان کھڑی تھی جو اس ٹیکری کے ساتھ آکر مل جاتی تھی جس پر فضل داد کھڑا تھا۔

فضل داد کو کچھ سات خنزیر نظر آئے جو اس تالاب سے پانی پی رہے تھے۔ ایک طرف گھنی جھاڑیاں تھیں جن کے پتے چوڑے تھے۔ فضل داد نے دیکھا کہ ایک اژدھا نے ان جھاڑیوں میں سے منہ نکالا۔ پھر آہستہ آہستہ اژدھا جھاڑیوں سے باہر آنے لگا۔ وہ بہت ہی موٹا اور بڑا ہی لمبا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد پورے کا پورا باہر نکلا۔ فضل داد کا تو جیسے سانس رک گیا ہو۔ اس نے کبھی اژدھا نہیں دیکھا تھا۔ گھاس ذرا اونچی تھی اور اژدھا اس میں رینگتا ہوا خنزیروں کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ ان کے قریب پہنچا تو خنزیروں نے شاید اس کی مشک سونگھ لی ہوگی، وہ سب اکٹھے بد کے اور پیچھے ہٹے۔

اژدھا اس خنزیر پر جھپٹا جو اس کے قریب تھا لیکن اس کا منہ خنزیر تک نہ پہنچ سکا۔ خنزیر بھاگ اٹھی لیکن یہ خنزیر جس پر اژدھا نے حملہ کیا تھا اپنے ساتھیوں کے پیچھے جانے کی بجائے گھبرا کر چٹان کی طرف دوڑ پڑا۔ اژدھا بڑی تیزی سے رینگتا اس کے تعاقب میں گیا۔ خنزیر کا راستہ چٹان نے روک لیا تھا۔ وہ پیچھے کو دوڑا تو اژدھا نے اسے روک لیا۔ خنزیر کے بھاگنے کے لئے جگہ کافی تھی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اس میں بھاگنے کی طاقت ہی نہ رہی ہو۔

خنزیر نے ٹیکری پر چڑھنے کی کوشش کی تو اژدھا اس کے پیچھے گیا۔ خنزیر بہت تیز

دور نے والا جانور ہے لیکن اس سے ٹکری پر نہ چڑھا گیا حالانکہ ڈھلان سیدھی اور ٹھری نہیں تھی بلکہ چڑھنے کے لئے نہایت آسان تھی۔ اس سے تو قدم بھی نہیں اٹھائے جا رہے تھے۔

میں نے یہ تماشا خود دیکھا ہے کہ بلی جب چوہے کے پیچھے دوڑتی ہے تو چوہے سے دوڑا نہیں جاتا، وہ اچھلتا ہے لیکن پوری طرح دوڑ نہیں سکتا۔ سانپ کے آگے بھی چوہے کا کیسی حال ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ بلی یا سانپ چوہے کو ہٹانا تر کر لیتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ چوہے پر اتنا خوف طاری ہو جاتا ہے کہ اس کی جسمانی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی حالت اس خنزیر کی ہو گئی تھی جس کے تعاقب میں اڑدھا آ رہا تھا۔ فضل داو نے بتایا کہ خنزیر ڈھلان چڑھتے پھسلے لگا اس کے پاؤں پھسلے گئے۔ نیچے سے اڑدھا اوپر آ رہا تھا۔ اس نے خنزیر کی پچھلی ٹانگ پکڑ کر نیچے کو ٹھیسٹ لیا۔ خنزیر نے ایسی خوفناک چیخیں ماریں کہ فضل داو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اڑدھانے خنزیر کو اس طرح بھجھوڑا کہ خنزیر کامنہ اڑدھا کے منہ کی طرف ہو گیا۔ اڑدھانے اس کامنہ اپنے منہ میں لے لیا اور اسے آہستہ آہستہ مٹھوڑنے لگا۔

بہت عرصے بعد میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ اڑدھا جس جانور کو پکڑتا ہے سب سے پہلے اس کامنہ گردن تک اپنے منہ میں لیتا ہے۔ یہ وہ اس لئے کرتا ہے کہ شکار دم گھٹنے سے مرجائے۔ اس اڑدھانے خنزیر کامنہ اپنے منہ میں لے لیا۔ فضل داو نے بتایا کہ خنزیر ٹانگیں زور زور سے مارتا اور ترہتا رہا۔ آخر اس کا جسم کچھ دیر بعد بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ فضل داو نے سنایا کہ اسے یہی نظر آ رہا تھا کہ اڑدھا اپنے جسم سے کئی گنا زیادہ موٹے تازے خنزیر کو نگل نہیں سکے گا اور اُسے مار کر پھینک دے گا لیکن ہوا یہ کہ اڑدھانے اُسے آہستہ آہستہ نگلنا شروع کر دیا۔ فضل داو یہ دیکھ کر حیران ہوتا رہا کہ اڑدھا کا جسم خنزیر کے جسم کے مطابق پھیلتا جا رہا تھا۔ اڑدھانے آہستہ آہستہ پورے خنزیر کو نگل لیا۔ پھر اس کے اندر کی مشینری ایسی تھی کہ خنزیر اس کے جسم کے اندر پیچھے ہی پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ وہ اڑدھا کے پیٹ میں جا رہا تھا۔ فضل داو حیرن ہو رہا تھا کہ خنزیر اڑدھا کے پیٹ میں جمل جاڑ کا وہاں سے اڑدھا کا جسم خنزیر جتنا موٹا ہو گیا تھا۔

فضل داو نے اس واقعہ اور منظر کا بہت ہی اثر قبول کیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس پر

تو جیسے سکتے طاری ہو گیا تھا۔ اُس نے اڑدھا کا نام سنا تھا لیکن کبھی دیکھا نہیں تھا۔ دیکھا بھی تو اس طرح کہ اڑدھانے اپنے جسم کی موٹائی سے کئی گناہ موٹے جانور کو نگل لیا۔ فضل داو تھا تو دلیر آدمی لیکن اس پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ کبھی اسے بھی اڑدھا مل جائے گا اور اسی طرح نگل لے گا۔ فضل داو نے ٹکری سے اتر کر وہ راستہ ہی چھوڑ دیا اور اندھا موند ایک اور طرف چل پڑا۔

○

فضل داو کو اس کی گھڑی صرف وقت بتاتی رہی، دن نہیں بتا سکتی تھی کہ کتنے گزر گئے ہیں۔ فضل داو نے مجھے بتایا کہ اس کے انکل بچہ اندازے کے مطابق جنگل میں بیٹھتے تین مہینے یا چار مہینے گزر گئے تھے۔ جنگل کے تین چار قسم کے درختوں نے اسے بھوکا نہیں رہنے دیا۔ پیاسا مرنے کا تو اسے کوئی خطرہ ہی نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسی بات بتائی جس کا میں تجربہ کر چکا تھا۔ وہ یہ کہ اس نے اپنے آپ کو اس جنگل کی مخلوق سمجھتا شروع کر دیا تھا۔ پہلے اسے اپنی بیلین اور اپنے دوست، گاؤں کے لوگ اور عزیز و اقارب یاد آتے تھے لیکن اسے عجیب تجربہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ یہ سب لوگ اُس کے ذہن سے اتر گئے اور وہ کچھ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے وہ اسی جنگل میں پیدا ہوا تھا اور اسے اسی جنگل میں زندہ رہنا اور یہیں مرنے ہے..... میں خود اس تجربے سے گزر رہا تھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

پھر ایک روز ایسے ہوا کہ اُسے زنانہ چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پہلے تو اسے یہ خیال آیا کہ قریب کوئی گاؤں ہو گا اور یہ عورت اس گاؤں کی ہوگی اور اس پر کسی درندے نے حملہ کر دیا ہو گا۔ یہ بھی خیال آیا کہ اس عورت کو اکیلے دیکھ کر ایک دو آدمیوں نے بری نیت سے پکڑ لیا ہو گا۔

فضل داو کے سامنے ایک اونچی ٹکری تھی جو کچھ دُور تک چلی گئی تھی۔ یہ چیخیں ٹکری کی دوسری طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ فضل داو نے پہلے تو یہ سوچا کہ اس عورت کی مدد کو پہنچے۔ اس کے اس ارادے کو اس خیال نے رد کر دیا کہ یہ کوئی درندہ ہی نہ ہو اور اگر وہ انسان ہوئے تو دو تین نہ ہوں اور اس پر بھی حملہ کر دیں گے۔ وہ اپنے آپ کو کسی مصیبت میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اُسے یہ بھی سوچھی کہ یہ عورت اڑدھا کے منہ میں ہی نہ آگئی ہو۔ اب تو وہ بالکل ہی ڈر گیا۔

اتنے عرصے بعد فضل داد کو پہلی بار یاد آیا کہ اس کے جھولے میں فوجی چاقو پڑا ہے جو کمائڈو اور گوریلے لپٹے ساتھ رکھتے ہیں۔ یہ چاقو پہلے راشن کے ڈبوں کے نیچے پڑا رہا تھا اور اس کے بعد ان پھلوں کے نیچے رہا جو فضل داد درختوں سے توڑ کر جھولا بھر لیتا تھا۔ اس نے چاقو نکال لیا۔ اس چاقو کے دو تین مختلف قسم کے پھل ہوتے ہیں جن میں ایک خاصا لمبا اور جوڑا ہوتا ہے۔ عورت ابھی تک چیخ رہی تھی لیکن کسی درد مندے یا کسی اور انسان کی آواز نہ آتی تھی۔ فضل داد اس ٹیکری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ وہ اس عورت کو نظر انداز کر کے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔

آگے ٹیکری ختم ہو جاتی تھی اور اس سے آگے ایسی ہی ایک اور ٹیکری شروع ہوتی تھی۔ ان کے درمیان سے گزرا جاسکتا تھا۔ فضل داد اس جگہ سے چند قدم پیچھے ہی تھا کہ ایک عورت وہاں سے چھٹی چلائی سامنے آئی اور فضل داد کو دیکھ کر رک بھی گئی اور خاموش بھی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت زدگی کا تاثر آ گیا۔ اوھر فضل داد جو پہلے ہی ڈراڈر اساتھا خوفزدہ ہو گیا۔

خوفزدگی کی وجہ یہ تھی کہ یہ عورت جوان تھی اور سر سے پاؤں تک بالکل برہنہ تھی۔ اس کے بال لمبے اور بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا رنگ زردی مائل گورا تھا۔ بری اور آسامی عورتوں کے رنگ کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ تھی تو عورت لیکن فضل داد اسے عورت نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ اگر کپڑے پہنے ہوئے ہوتی تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ فضل داد دیہاتی آدمی تھا۔ دیہات میں چڑیلوں کے وجود کو مانا جاتا ہے۔ آج جبکہ دیہات میں تعلیم بھی چلی گئی ہے اور ہمارے زیادہ تر لوگ باہر کے ملکوں میں بھی چلے گئے ہیں، وہ اپنے اس عقیدے پر قائم ہیں کہ چڑیل کا وجود ہے اور وہ عورت کے روپ میں رات کو یادوں کو دیرانے میں کسی نہ کسی آدمی کو روک لیتی ہے۔

فضل داد نے اسے بلا شک و شبہ چڑیل سمجھا۔ اس کے ہاتھ میں فوجی چاقو تھا۔ دیہات میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی چمکتا ہوا ہتھیار پاس ہو تو چڑیل بھاگ جاتی ہے۔ ہتھیار سے مراد کھماڑی، کھوار، چھری یا چاقو ہے۔ فضل داد نے چاقو کھول کر سامنے کر لیا۔ اس نے دل ہی دل میں کلمہ شریف کا ورد شروع کر دیا۔ عورت منہ کھولے اور آنکھیں کچھ زیادہ کھولے آہستہ آہستہ اس کی طرف آرہی تھی۔ اس کا منہ دراصل حیرت سے کھل گیا تھا اور آنکھوں کا اتنا زیادہ کھل جانا بھی حیرت کا اظہار تھا۔ فضل داد

نے کلمہ شریف کا ورد اونچا کر دیا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اسے توقع تھی کہ یہ چڑیل اس کا چاقو دیکھ کر عتاب ہو جائے گی۔ تہذیب و تمدن سے دور وہ جنگل چڑیلوں کے لئے ہی موزوں تھا۔ یہ شک بجا تھا کہ مرے ہوئے لوگوں کی روحمیں بدروحیں اور جن بھوت اسی جنگل میں رہتے ہیں۔

عورت آہستہ آہستہ فضل داد کی طرف بڑھ رہی تھی اور فضل داد اسی کی رفتار سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ بھاگ اٹھنے سے ڈرتا تھا۔ اس نے یہ روایت بھی سن رکھی تھی کہ چڑیل کو دیکھ کر بھاگو تو کبچہ منہ کے راستے نکل دیتی ہے۔

”تمہیں اللہ اور رسول کا واسطہ ہے، مجھے بخش دو“۔ فضل داد نے اس سے کہا۔ ”میں بہت دور کا رہنے والا پرہیزی ہوں، مجھے جانے دو..... اگر تمہارے دل میں رحم پیدا ہو جائے تو مجھے راستے پر ڈال دو کہ میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤں۔“

”تم انسان!“۔ عورت نے کہا۔ ”ہم انسان..... ہم آسامی..... تم ہندوستانی..... ٹھہر جاؤ۔“

فضل داد کو یاد آیا کہ چڑیلوں کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے ہاتھ اور پاؤں اٹلے ہوتے ہیں۔ اس نے اس عورت کے ہاتھ پاؤں دیکھے وہ قدرتی طور پر سیدھے تھے جیسے انسانوں کے ہوتے ہیں۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ کوئی آدمی ذرا دل مضبوط کر کے چڑیل کو بالوں سے پکڑ لے تو پھر وہ بے بس ہو جاتی ہے۔ فضل داد نے اپنا دل مضبوط کرنا شروع کر دیا اور ٹوک گیا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ یہ قریب آئی تو پینترہ بدل کر اس کے بال مٹھی میں پکڑ لے گا۔

وہ رکا تو عورت اس کے قریب آ گئی۔

”نہیں ڈرو“۔ عورت نے کہا۔ ”تم کون؟..... مسلمان؟..... ہم مسلمان..... ہم اللہ الرحمن الرحیم..... تم اوھر کیوں آیا؟..... اوھر بیٹھو۔“

عورت نے فضل داد کی کلائی پکڑ کر بٹھالیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”تم چڑیل ہو“۔ فضل داد نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ دیکھو چاقو.....“

”میں کیا؟“

”چڑیل!“۔ فضل داد نے کہا۔

”ہم نہیں معلوم..... کیا بولا؟“۔ عورت نے پوچھا۔

”چڑیل..... چڑیل“ — فضل داد نے کہا اور اسے چاقو دکھا کر بولا — ”یہ چاقو دیکھو۔“

”یہ نہیں مارو“ — عورت نے کہا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔

وہ ایسی روئی کہ اس کی سسکیاں اور پھر چٹکیاں نکلنے لگیں۔ فضل داد نے مجھے سنایا کہ اس عورت کی شکل صورت بہت اچھی تھی اور اس کا جسم اور ہی زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اس کے بل چمکدار اور ملائم تھے۔ فضل داد نے ایک تو اس خیال سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا کہ اس کے بل پکڑ کر کھینچے گا۔ اگر یہ چڑیل ہوئی تو قابو آ جائے گی یا بھاگ جائے گی، اور دوسرے اس نے اس خیال سے بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا کہ یہ دیکھے کہ اس کے بل ریشم کے تو نہیں بنے ہوئے!

فضل داد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس عورت نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ کر اپنے سر پر رکھ دیا اور اپنے ہاتھ جوڑ دیئے جیسے وہ کوئی التجا کرنا چاہتی ہو۔
”ہم اکیلا!“ — عورت نے کہا — ”کوئی نہیں!“ — اُس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے کہا — ”اللہ..... صرف اللہ..... تم مسلمان..... ہم مسلمان... .. ہمارا نام زہرہ خانم!“

میں پہلے بھی اپنی اس داستان میں لکھ چکا ہوں کہ کئی ایسے واقعات قارئین کرام کو نا قابل یقین معلوم ہوں گے۔ نا قابل یقین واقعات انہوں نے واقعات اور پراسرار واقعات انہی کو نظر آتے ہیں جو اس قسم کے ماحول میں چلے جاتے ہیں جہاں ہر کوئی نہیں جاسکتا۔ اگر جنگل میں کسی مسافر کو ایک نوزائیدہ بچہ پڑا ہوا مل سکتا ہے تو کسی اور کو ایک برہنہ نوجوان عورت بھی مل سکتی ہے۔ کیا آپ نے یہ واقعات نہیں سنے کہ ہندوستان میں ایک بچے کو بھینڑیوں نے پالا تھا۔ ایک بچے کو بندروں نے پالا تھا اور عرب کے ایک علاقے میں دس بارہ سال کا ایک بچہ غزالوں کے غول میں دوڑتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ اسے پکڑ کر بھی لے آئے تھے۔ جنگلوں اور بیابانوں میں ایک سے بڑھ کر ایک نا قابل یقین کہانی جنم لیتی ہے۔ یہ عورت جو اپنا نام زہرہ خانم بتاتی تھی، اس کی داستان بھی آپ کو سنائی جا رہی ہے۔

اس عورت اور فضل داد میں اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں اور عورت نے کچھ ایسی حرکتیں بھی کیں جن سے فضل داد کو یقین ہو گیا کہ یہ واقعی انسان ہے اور چڑیل نہیں۔

یہ عورت زہرہ خانم ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتی تھی جس سے اس کا مطلب واضح ہو جاتا تھا۔ اسے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کب سے اس جنگل میں بھٹک رہی ہے۔ اس کی کہانی یوں تھی:

اس نے فضل داد کو سنایا کہ وہ آسام کی رہنے والی ہے۔ اُس نے اپنے قصبے کا نام بھی بتایا تھا جو فضل داد کو یاد نہیں رہا تھا۔ آسام میں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی شروع سے ہی چلی آ رہی ہے۔ زہرہ خانم کی عمر گیارہ بارہ سال تھی جب اس کا باپ فوت ہو گیا۔ وہ ٹل کلاس گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس سے چھوٹا اس کا ایک بھائی تھا اور اس سے چھوٹی ایک بہن تھی۔ ایک سال بعد زہرہ خانم کی ماں نے ایک بنگالی مسلمان کے ساتھ شادی کر لی۔ زہرہ خانم نے اردو اس طرح سیکھی تھی کہ اس کا باپ کاروباری آدمی تھا اس لئے وہ اردو بول لیتا تھا۔ زہرہ خانم کی ماں بھی ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتی تھی۔ اس طرح زہرہ خانم نے بھی اردو بولنی سیکھ لی۔

جس بنگالی کے ساتھ زہرہ خانم کی ماں نے شادی کی وہ اچھی خاصی اردو بول سکتا تھا۔ وہ بھی تجارت پیشہ آدمی تھا لیکن اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس کے پاس روپیہ پیسہ بہت تھا اور زیادہ تر آسام میں ہی رہتا تھا اور شادی کر کے وہ زہرہ خانم کے گھر میں ہی رہنے لگا۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں باہر چلا جاتا تھا اور کبھی چارپانچ روز اور کبھی آٹھ دس روز باہر ہی رہتا تھا۔ واپس آتا تو سب سے پہلے زہرہ خانم کی ماں پر اس شک کا اظہار کرتا کہ اُس نے کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔

زہرہ خانم کی ماں قسمیں کھا کھا کر اسے یقین دلاتی تھی کہ وہ اسے ایسا دھوکا نہیں دے رہی نہ کبھی دے گی۔ زہرہ خانم کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ اس کا سوتیلا باپ شراب بھی پیتا ہے اور عیاش آدمی ہے۔ اس نے زہرہ خانم کی ماں سے ایک تو اس وجہ سے شادی کی تھی کہ زہرہ خانم کے باپ کا کاروبار ٹھیک ٹھاک چلتا تھا اور اس پر اس شخص نے قبضہ کر لیا تھا اور شادی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ زہرہ خانم کی ماں خوب صورت تھی اور ابھی اچھی عمر میں تھی۔

سوتیلے باپ بچوں کے ساتھ کوئی خاص پیار نہیں کرتا تھا اور کوئی سختی بھی نہیں کرتا تھا۔ اگر سختی کرتا تو زہرہ خانم کی ماں کے ساتھ کرتا تھا۔ زہرہ خانم جب چودہ برس کی ہو گئی تو اس کا رنگ روپ نکھرا اور نوجوانی کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے۔ سوتیلے باپ نے

زہرہ خانم کے ساتھ کچھ زیادہ ہی پیار جتنا شروع کر دیا اور وہ جب کبھی کچھ دنوں کی غیر حاضری کے بعد گھر آتا تو زہرہ خانم کے لئے نئے کپڑے یا زیور کی کوئی چھوٹی موٹی چیز لے آتا یا کوئی اور تحفہ ضرور لاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے زہرہ خانم کی ماں کے ساتھ اپنا رویہ ٹھیک کر لیا۔

زہرہ خانم نے فضل داد کو سنایا کہ جب اس کی عمر سولہ سال سے کچھ اوپر ہو گئی تو سوتیلے باپ نے اسے اپنے پاس الگ بٹھانا شروع کر دیا اور پیار میں اور زیادہ اضافہ کرنے لگا۔ زہرہ خانم کی ماں کو کچھ شک سا ہوا۔ اس نے زہرہ خانم سے کہا کہ یہ شخص میرا خاوند تو ہے لیکن تمہارا باپ نہیں اور یہ عیاش اور شرابی کبلی آدمی ہے اس سے ذرا دور رہا کرو۔

زہرہ خانم نے ماں کو بتایا کہ یہ شک اسے بھی ہے کہ اس شخص کی نیت ٹھیک نہیں لیکن اس سے دور رہنا ممکن نہ تھا۔ ایک روز زہرہ کی ماں نے اپنے اس دوسرے خاوند کو کہہ ہی دیا کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے اس لئے اسے اپنے پاس علیحدگی میں نہ بٹھایا کرو۔ اس بد طینت آدمی نے زہرہ خانم کی ماں کو اس بات پر بہت ہی مارا پیٹا اور پھر زہرہ خانم کو بازو سے پکڑ کر الگ کمرے میں لے گیا۔ اس پر کوئی سختی یا سخت کلامی نہ کی بلکہ بہت ہی پیار اور محبت کا اظہار کیا اور ایسی باتیں کیں کہ زہرہ خانم اس کی باتوں میں آگئی اور اسے اپنا سگیاپ ہی سمجھنے لگی۔

ان ہی دنوں زہرہ خانم کی ماں کو بخار آنے لگا۔ یہ بخار ذرا لمبا ہو گیا۔ زہرہ خانم کا سوتیلہ باپ اس کی ماں کے لئے دوائی لاتا رہا۔ زہرہ خانم نے فضل داد کو بتایا کہ اسے شک ہوا کہ یہ شخص ایسی دوائی لاتا ہے جس سے اس کی ماں کمری نیند سو جاتی ہے اور چھ سات گھنٹے سوئی رہتی ہے۔ رات کو تو اس کی ماں کو کوئی ہوش نہیں رہتی تھی۔ ایک رات سوتیلہ باپ زہرہ خانم کو الگ کمرے میں لے گیا اور پیار پیار میں بڑی بے ہودہ حرکتیں کرنے لگا۔ زہرہ خانم پہلے تو شرماتی اور ہنستی رہی۔ اس کے اس رویے کو سوتیلہ باپ رضامندی سمجھا اور اس نے اپنی نیت کا اظہار صاف لفظوں میں کر دیا۔ زہرہ خانم کو یوں لگا جیسے سوتیلے باپ نے اس کے دل میں خنجر اتار دیا ہو۔ وہ اٹھ کر کمرے سے بھاگنے لگی تو باپ نے اٹھ کر اسے پکڑ لیا اور زبردستی پلنگ پر گرالیا۔ لڑکی اچھی صحت والی تھی اور جسم میں طاقت بھی تھی وہ اچھل کر پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوتیلے باپ نے اسے پھر

گرالیا اور جبر کرنا چاہا لیکن لڑکی اس کے ہاتھ نہ آئی۔ ایک بار تو لڑکی نے اس شخص کو اتنی زور سے دھکادیا کہ وہ کرسی پر گر کر کرسی الٹ گئی اور وہ فرش پر جا پڑا۔

اس بدکار شخص کے دماغ پر شیطان غالب آچکا تھا۔ لڑکی کمرے سے نکل رہی تھی کہ اس آدمی نے دوڑ کر پھر اسے پکڑ لیا اور مارنے پینے لگا۔ اس نے آخر لڑکی کو گرالیا لیا اور لڑکی نے چیخا چلاتا شروع کر دیا۔ گھر میں اس کی چیخیں سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ اس کی ماں دوائی لے کر بے ہوشی کی نیند سوئی ہوئی تھی اور چھوٹا بھائی اور اس سے چھوٹی بہن بچپن کی بے فکری کی نیند سو رہے تھے۔

زہرہ خانم نے فضل داد کو بتایا کہ اچانک اس میں اتنی زیادہ طاقت آگئی کہ اس نے سوتیلے باپ کو پہلے ہاتھوں سے پیچھے دھکادیا پھر دونوں پاؤں جوڑ کر اس کے سینے میں اتنی زور سے مارے کہ وہ پلنگ کی پائنٹی کی طرف پیچھے کو گر اور فرش پر جا پڑا۔ زہرہ خانم بہت ہی تیزی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی لیکن وہ اندر نہ گئی بلکہ باہر والا دروازہ کھول کر باہر کو بھاگی۔ اس کا باپ اس کے پیچھے آیا لیکن اس نے زیادہ تعاقب نہ کیا۔ زہرہ خانم چیختی جا رہی تھی۔

زہرہ خانم نے فضل داد کو اپنی اس وقت کی ذہنی حالت ٹوٹی پھوٹی اردو میں سنائی، اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اس کے دماغ پر کچھ اُلٹا اثر ہو گیا تھا یا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اسے اتنا ہی یاد تھا کہ اس نے اپنے سوتیلے باپ کو اس شیطانت میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا لیکن وہ جب اٹھ کر دوڑی تو اس کے جسم پر شلوار نہیں تھی۔ اس نے صرف قمیض پہن رکھی تھی اور وہ ننگے پاؤں تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے اپنے دماغ میں اور وجود میں ایک دھماکہ محسوس ہوا تھا جس وقت اس نے اپنے سوتیلے باپ کو دھکے دے کر فرش پر گرالیا تھا۔ ان لوگوں کا گھر قصبے کے باہر تھا جہاں سے کھیت شروع ہو جاتے تھے اور اس سے آگے جنگل تھا اور پھر کچھ علاقہ پہاڑیوں اور چٹانوں کا تھا۔ زہرہ خانم کو اتنا ہی یاد رہا کہ وہ قصبے سے نکل آئی ہے۔ اس وقت وہ اپنے سر میں یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اس کی کھوپڑی میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں اور اس کے دماغ کو کاٹ بھی رہی ہوں۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ وہ کہاں گئی اور کہاں رہی۔

اس کی باتوں سے فضل داد نے جو مطلب نکالا وہ یہ تھا کہ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا یا یوں کہہ لیں کہ وہ پاگل ہو گئی تھی۔ فضل داد نے اس کی جو باتیں مجھے سنائیں، ان سے

میں نے بھی یہی رائے قائم کی کہ یہ لڑکی پاگل ہو گئی تھی۔ اسے بالکل ہی یاد نہیں تھا کہ وہ کہاں کہاں جھکتی پھرتی رہی اور وہ برما کے جنگل میں یہاں کس طرح آن پہنچی۔ برما اور آسام کی سرحد ایک ہے۔

اس نے بتایا کہ مینہ یا ڈیڑھ مینہ پہلے اس کا دماغ صاف ہونے لگا اور آہستہ آہستہ اسے پتہ چلا کہ وہ اس گھنے جنگل میں گھوم پھر رہی ہے اور اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور وہ اپنے گھر سے کتنی دور ہے۔

○

یہاں سے زہرہ خانم کی یہ کہانی ایسی گھپ تاریکی میں چلی جاتی ہے جس میں نہ فضل داد کو کچھ نظر آیا نہ میں کچھ دیکھ سکا۔ خود زہرہ خانم فضل داد کو کسی بھی سوال کا جواب نہ دے سکی۔ فضل داد نے مجھے بتایا کہ وہ جب بھی اس سے کچھ پوچھتا تھا تو اس کے ماتھے پر شکنیں آ جاتی تھیں اور اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر آ جاتا تھا جیسے وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو گئی ہو۔ وہ دراصل ذہن پر زور دیتی تھی اور سوچنے کی اور یاد کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ کہاں رہی اور کتنا عرصہ گزر گیا جس کا اسے پتہ ہی نہ چلا۔ سوچ سوچ کر وہ اتنا سہاوی جواب دیتی تھی کہ وہ جب یاد کرتی ہے تو اسے ایسے لگتا ہے جیسے وہ کوئی خواب دیکھتی رہی ہے۔ اُس وقت جب میں اور فضل داد جوانی کی عمر میں تھے اور برما کے جنگل کے قیدی بنے ہوئے تھے، اس واقعہ کو تو نہیں البتہ زہرہ خانم کی سنائی ہوئی کہانی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ میں نے فضل داد کے ساتھ کچھ بیسودہ باتیں اس لڑکی کے بارے میں کی تھیں اور فضل داد نے بھی کچھ ایسی ہی اخلاق سے گرمی ہوئی باتیں سنائی تھیں۔ میں اس کہانی کو آگے چلانے سے پہلے آپ کا ذہن کسی اور طرف لے جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ وقت دکھایا جب میں واپس اپنے گھر پہنچا۔ اُس وقت میں پختہ عمر میں داخل ہو چکا تھا اور دماغ بہتر طریقے سے بہتر باتیں سوچنے کا عادی ہو چکا تھا۔

پھر جب یہ ارادہ کیا کہ اپنی زندگی کی یہ داستان قلمبند کروں تو میں نے ضرورت محسوس کی کہ ہر بات کا جو از ملنا چاہئے اور میں کوئی واقعہ اس طرح نہ سناؤں جس طرح چنڈال چوڑیوں میں بیٹھ کر لوگ ایک دوسرے کو سنسنی خیز کہانیاں سنایا کرتے ہیں۔ زہرہ خانم کی کہانی میرے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے مختلف کتابوں کا مطالعہ شروع کر

دیا تھا۔ نفسیات کی کتابیں بھی پڑھیں اور پھر میں تین ڈاکٹروں سے ملا جو ذہنی اور دماغی امراض کے ماہر تھے۔ ڈاکٹر بغیر فیس کے بات نہیں کیا کرتے اور بات بھی وہ کرتے ہیں جو ان کی مرضی اور پسند کی ہوتی ہے۔ میرا تعارف ان ڈاکٹروں سے کرایا گیا تھا اور میں انہیں ان کے گھروں میں جا کر ملا تھا۔ انہوں نے بڑا اچھا تجربہ کیا تھا۔

تینوں ڈاکٹروں کی رائے تقریباً ایک جیسی تھی۔ رائے یہ تھی کہ عام فہم زبان میں لڑکی پاگل ہو گئی تھی لیکن ایسی پاگل نہیں کہ اس کے دماغ میں کوئی خرابی آ گئی ہو۔ اگر کوئی خرابی آ بھی گئی تھی تو وہ عارضی تھی۔ لڑکی کو سوتیلے باپ نے شدید اور غیر متوقع صدمہ پہنچایا تھا جو اس کی برداشت کے دائرے سے بہت باہر اور دور تھا۔ وہ وہاں سے بھاگی اور پھر اس کا ذہن بھی مفروز ہو کر اپنی ایک دنیا آباد کر بیٹھا۔ اسے شیرو فریڈیا کی ایک خاص قسم کا مرض کہتے ہیں۔

ڈاکٹروں نے ایک بڑی عجیب بات بتائی۔ انہوں نے کہا کہ اس لڑکی کو اگر پاگل خانے میں داخل کر دیا جاتا تو وہ پاگل ہی پاگل ہوتی چلی جاتی اور کبھی ٹھیک نہ ہو سکتی۔ اسے اگر گھر میں رکھ کر ذہنی سکون کی دوائیاں یعنی ٹراکولازر دیے جاتے تو بھی یہ ٹھیک نہ ہو سکتی۔ ٹھیک ہونے کی بجائے وہ ان دوائیوں کی عادی اور نشی ہو جاتی اور ہر وقت غنودگی کی کیفیت میں رہتی۔ پھر ان دوائیوں کا اثر بھی زائل ہونا شروع ہو جاتا اور وہ ان کی مقدار اور طاقت میں اضافہ کیا جاتا۔

ان ڈاکٹروں نے اپنی اصطلاحوں میں یہ تجربہ کیا تھا۔ مجھے کچھ اصطلاحیں یاد رہ گئی ہیں اور زیادہ تر بھول گیا ہوں، میں قارئین کو اس جھیلے میں نہیں ڈالنا چاہتا کہ وہ یہ اصطلاحیں سنیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک عام ذہن کو سمجھانے کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ لڑکی زہرہ خانم اپنا شعور کھو بیٹھی تھی اور لاشعور میں چلی گئی تھی۔ اس کا جسم اپنی ضروریات لاشعوری طور پر پوری کرتا رہا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے میں اور فضل داد درختوں سے جو بھی پھل حاصل ہوا کھاتے رہے اور پانی پیتے رہے اور جانوروں کی طرح جہاں جگہ ملی سو گئے۔ ان حالات میں ضروریات جانوروں جیسی ہی رہ گئی تھیں۔ ایک پیٹ بھرتا اور دوسرا اپنے آپ کو خطروں سے بچائے رکھنا۔ اس لڑکی کا احساس زندہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کدھر جا رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ یہ کوئی عجیب واقعہ نہیں ہے۔ ایک ڈاکٹر نے کہا کہ ہمارے پاس ایسے کیس آتے ہیں کہ ایک نوجوان لڑکا گھر

سے بھاگ گیا اور سال ڈیڑھ سال بعد واپس ایسی حالت میں آیا جیسے اس کا دماغی توازن ٹھیک نہ ہو۔ ایسے کیس اس لڑکی سے ملتے جلتے ہیں۔

اگر مجھے نفسیات کے ان ڈاکٹروں سے یہ تجزیہ نہ ملتا اور وہ یہ نہ کہتے کہ یہ کوئی عجیب اور مافوق الفطرت واقعہ نہیں تو میں اسے اپنی اس داستان میں کبھی شامل نہ کرتا۔۔۔۔۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ لڑکی اپنے ذہن لاشعور کی دنیا میں زندہ رہی، بھٹکتی پھری اور کچھ عرصے بعد اس کا ذہن آہستہ آہستہ حقیقت میں آنے لگا اور جب اس نے فضل داد کے روپ میں ایک انسان کو دیکھا تو اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا اور اسے گئی گزری ساری باتیں یاد آ گئیں۔ وہ جو روئی تھی، اس کا بھی اچھا اثر پڑا تھا۔ اس کے شعور کے دروازے کھل گئے تھے۔ البتہ وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی تھی کہ وہ کتنا عرصہ جنگلوں میں بھٹکتی پھرتی رہی ہے۔ فضل داد نے اس سے پوچھا کہ جب وہ گھر سے نکلی، کیا اس وقت جنگ شروع ہو چکی تھی؟۔۔۔۔۔ اس نے جواب دیا کہ کوئی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی اور نہ اسے معلوم ہے کہ کہیں جنگ ہو رہی ہے۔ اس سے فضل داد نے اور میں نے بھی اندازہ اور حساب لگایا تو پتہ چلا کہ وہ پانچ چھ سال ان جنگلوں میں جانوروں کی طرح زندگی گزارتی رہی ہے۔

بہر حال میں یہ مسئلہ ان خواتین و حضرات کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں جو نفسیات کے ڈگری یافتہ ہیں اور وہ بھی جو نفسیات کے ماہر اور عالم ہیں۔ میں نے آپ کو واقعہ سنایا ہے، تجزیہ اپنا اپنا کر لیں۔



فضل داد نے مجھے سنایا لڑکی جوں جوں بلتی جا رہی تھی، اس کا ذہن صاف ہوتا جا رہا تھا۔ بہت سا بول کر اور آنسو بہا کر وہ بالکل صحیح حالت میں آگئی اور وہ بازوؤں اور ٹانگوں سے اپنا ستر چھپانے لگی۔

فضل داد و دیہاتی تھا اور فوجی بھی تھا۔ میں نے اس داستان میں پیچھے سنایا ہے کہ اس وقت کے فوجیوں کی اخلاقی حالت کتنی پست ہو کر تھی۔ محاذ سے واپس آنے والے فوجی سب سے پہلے عصمت فروش عورتوں کے بازار کا رخ کرتے تھے۔ فضل داد کے سامنے ایک جوان عورت بالکل برہنہ بیٹھی تھی اور وہ خوبصورت بھی تھی۔ خوبصورت تھی یا نہیں، ایک فوجی کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ ایک عورت تھی۔ اس وقت فضل داد کی

ذہنی اور جذباتی حالت حیوانوں جیسی تھی۔ وہ بے قابو ہونے لگا اور اس نے ایک بار پھر زہرہ خانم کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اچانک اس کے اندر زلزلے جیسا ایک جھٹکا آیا۔ میں نے کہا ہے کہ وہ دیہاتی بھی تھا۔ دیہاتیوں میں غیرت کا جذبہ بڑا ہی شدید ہوتا ہے۔ فضل داد کے اندر یہ جذبہ بیدار ہو گیا۔ زہرہ خانم ایک مظلوم لڑکی تھی جسے ایک شخص نے باپ بن کر بے آبرو کرنے کی کوشش کی تھی۔ فضل داد نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لئے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے زہرہ خانم کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ بیٹھی رہے۔ وہ خود چند قدم پرے گیا اور زہرہ خانم کی طرف پیٹھ کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ یا اللہ! مجھے شیطان کے قبضے سے چھڑا دے اور اتنی ہمت دے کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھوں اور اس مظلوم عورت کو ایک پاکیزہ امانت سمجھوں۔

اُس نے نہ کوئی نقل پڑھے نہ کوئی آیت پڑھی، صرف اور صرف اللہ کو پکارا اور روح کی گمراہیوں سے یہ التجا کی۔ یہاں وہی بات ہوئی — بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — فضل داد کے وجود میں اور اس کی ذات میں ایسی ٹھنڈک سی آگئی کہ وہ بالکل ہی بدلا ہوا انسان بن گیا۔ اس نے اللہ تبارک و تعالیٰ کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

وہ ایک اونچی جھاڑی کی اوٹ میں چلا گیا۔ اس نے اپنی خالی پتلون اتاری۔ اس کے نیچے اس نے انڈرویئر پہنا ہوا تھا۔ یہ فوجی انڈرویئر تھا جو گھٹنوں سے ذرا اوپر تک لمبا ہوتا ہے اور اس میں ازار بند پڑا ہوتا ہے۔ اس نے یہ انڈرویئر جسے عام زبان میں پھنکھرا کہتے ہیں، اتار لیا اور پھر پتلون پہن لی۔ واپس زہرہ خانم کے پاس آیا اور اسے دے کر کہا کہ یہ پہن لے۔ پھر اس نے اپنی فیض اتاری اور یہ بھی زہرہ خانم کو پہنا دی۔

زہرہ خانم کا جسم ڈھانپا گیا اور اب فضل داد کے جسم پر بنیان تھی اور پتلون۔ ایک مرد نے زہرہ خانم کا جسم ڈھانپ دیا تو اس پر ایسا اثر ہوا کہ وہ فضل داد کے ساتھ لپٹ گئی اور ایسی روئی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ یہ سکون اور مسرت کا رونما تھا۔ فضل داد پر کوئی اُلٹا اثر نہ ہوا بلکہ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور اس کی پیٹھ تھپتا تا رہا۔ وہ بہت دیر روئی رہی اور فضل داد سے الگ ہو گئی۔

یہ میں اپنے الفاظ میں کہہ رہا ہوں کہ اب لڑکی ذہنی طور پر نارمل ہو گئی تھی۔

فضل داد پر بڑی ہی نازک ذمہ داری آپڑی تھی۔ اس ذمہ داری کا اہم پہلو یہ تھا کہ اسے اپنے آپ پر قابو رکھنا تھا اس لئے زہرہ خانم سے پوچھا کہ اس علاقے سے وہ واقف ہے یا نہیں اور یہ علاقہ آسام سے کتنی دُور ہے..... زہرہ خانم کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

میں اپنی اس داستان میں وہ تفصیلات پیش نہیں کر رہا کہ دونوں اس جنگل میں کتنا عرصہ اکٹھے رہے اور کس طرح رہے اور انہوں نے اور کتنا سفر طے کر لیا۔ فضل داد نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اس جنگل سے نکل کر آسام یا بنگال پہنچ گیا تو وہ زہرہ خانم کو اپنے ساتھ اپنے گاؤں میں لے جائے گا اور اس کی شادی کسی اچھے آدمی سے کرادے گا۔ وہ خود شادی شدہ تھا۔ زہرہ خانم کو ماں، چھوٹا بھائی اور چھوٹی بہن یاد آتے تھے اور رو بھی پڑتی تھی۔ کبھی تھی کہ اس کی ماں زندہ نہیں ہوگی اور اس کا بھائی اور بہن نہ چلے کہاں دبدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے۔ فضل داد اسے جھوٹی سچی تسلیاں دینے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

فضل داد نے بتایا کہ اس کے اندازے کے مطابق وہ ایک مہینے سے زیادہ عرصہ اکٹھے رہے۔ فضل داد نے سورج کو دیکھ کر مشرق، مغرب اور شمال جنوب کا حساب رکھا ہوا تھا۔ وہ صبح اٹھتے ہی شمال کی طرف چل پڑتے تھے۔

آگے علاقہ کچھ آسان سا آگیا تھا۔ پہاڑیاں اور ٹیکریاں تو تھیں لیکن ذرا دُور دُور تھیں لیکن باقی علاقہ اتنا غیر ہموار نہیں تھا کہ چلنے میں دشواری ہوتی۔ فضل داد یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ زمین اوپر کو اٹھی جا رہی ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بلندی کی طرف جا رہے تھے۔

گرمیوں کا موسم شروع ہو گیا تھا لیکن وہاں اتنی زیادہ گرمی نہیں تھی جتنی میدانی علاقوں میں ہوتی ہے۔ اُس علاقے میں بھی درختوں اور اونچی نیچی گھاس کی اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ یہ درخت کچھ اور قسم کے تھے اور جھاڑیاں بھی مختلف تھیں۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ خطہ کوئی اور ہے اور شاید یہ برما نہیں۔

ایک شام فضل داد اور زہرہ خانم بڑی خوبصورت جگہ رک گئے چھوٹی چھوٹی گھاس مٹل کی طرح ملائم اور نرم تھی اور اس کے ارد گرد گھنے درخت تھے۔ انہوں نے رات

سونے کے لئے یہ جگہ موزوں سمجھی۔ وہ لیٹے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر سو گئے۔

○
فضل داد کو اپنے جسم پر تین چار جگہ جھین محسوس ہوئی اور وہ بیدار ہو گیا اور اس کے ساتھ کچھ آدمیوں کی باتیں سنائی دیں اور پھر اُسے زہرہ خانم کی آواز سنائی دی۔ اس نے اس کا نام لے کر پکارا تھا۔

فضل داد نے آنکھیں کھولیں۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ تیز روشنی نے اس کی آنکھیں نہ کھلنے دیں۔ وہ اٹھ بیٹھا اس نے آنکھیں مل کر دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ اس کے ارد گرد چار بالکل برہنہ آدمی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاثیمیاں سی تھیں جو آگے سے برہمنوں کی طرح تراشی ہوئی تھیں۔ ان برہمنوں کی نوکیں فضل داد کے جسم کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ وہ جب سویا ہوا تھا تو اس نے انہی نوکوں کی چھین محسوس کی تھی۔ تب اس نے ہر طرف دیکھا۔ زہرہ خانم اس سے سات آٹھ قدم دور کھڑی تھی اور دو آدمیوں نے اس کے بازو پکڑ رکھے تھے۔ یہ سب آدمی بالکل برہنہ تھے۔ ان کے جسموں کے رنگ گندمی اور بڑے صاف تھے۔ بعض کے بال خاصے لمبے اور بعض کے کٹے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کے ہاتھ میں فضل داد کا جھولا تھا۔

فضل داد سمجھ گیا کہ یہ وہی نانگے قبائلی ہیں جن کے بارے میں اس نے پہلے بھی سن رکھا تھا وہ ان کے ہاتھ چڑھ گیا تھا اور اسے یہی نظر آ رہا تھا کہ وہ اسے قتل کر دیں گے اور زہرہ خانم کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ زہرہ خانم رو رہی تھی لیکن فضل داد بے بس ہو گیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آپس میں اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں دو ایک طرف دوڑے ہوئے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں پودوں کی لمبی لمبی مٹنیاں تھیں جو بیلین معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے فضل داد کے ہاتھ آگے کر کے ان بیلوں سے باندھ دیئے، پھر اس کے پاؤں بھی باندھ دیئے گئے۔ دو آدمیوں نے اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں اور بندھی ہوئی ٹانگوں کے نیچے سے دو لاثیمیاں جوڑ کر گذاریں اور اس طرح فضل داد کو اٹھالیا کہ لاثیمیوں کے اگلے سرے ایک آدمی کے کندھے پر اور پچھلے سرے پچھلے آدمی کے کندھے پر تھے۔ اس طرح فضل داد بندھے ہاتھوں اور پاؤں سے لٹک رہا تھا۔ ایک آدمی نے زہرہ خانم کو اپنے کندھے پر ڈال

کلے لنگ رہے تھے۔ کوئی فکر ایک باشت سے زیادہ نہیں تھا۔ اسی رسی میں پھول دار شبنیاں بھی اڑی ہوئی تھیں۔ اس شخص کے سر کے ارد گرد رنگ دار کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی جس میں پرندوں کے رنگ دار پر اڑے ہوئے تھے اس کے بال عورتوں کی طرح لمبے تھے۔ وہ چہرے سے اویڑ عر لگتا تھا۔ اویڑ عری کی دو تین لکیریں ظاہر ہو گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً دو فٹ لمبا ڈنڈا تھا جس پر رنگ دار کپڑے لپٹے ہوئے تھے اور اس کے آگے والے سرے پر رنگ دار پر لگے ہوئے تھے اور اس کے پچھلے سرے کے ساتھ دو چھوٹی چھوٹی گھینٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

وہ جب آیا تو جھوم یہ پرستانا طاری ہو گیا اور ہرچہ عورت اور آدمی دو زانو بیٹھ گئے اور سر جھکا لئے۔ یہ شخص جسے میں سردار ہی کہوں گا، پہلے زہرہ خانم کے پاس گیا اور اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اس کے ارد گرد دو چکر لگائے اور پھر پیٹھ کے پیچھے کھڑے ہو کر بڑے غور سے دیکھا اور پھر اس نے ڈنڈے کا اگلا سرا جہاں پرندوں کے پر اڑے ہوئے تھے زہرہ خانم کی پیٹھ کے ساتھ لگا کر منہ سے عجیب سی آواز نکالی۔ اس نے جھوم کی طرف منہ کر کے کوئی بات ایسے انداز میں کہی جیسے کوئی اعلان کیا ہو۔

جھوم نے اچھل کود کر اور تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے سردار نے اعلان کیا ہے کہ ان کے مطلب کی چیز مل گئی ہے۔

پھر یہ سردار فضل داو کے سامنے جا کر اور اسے بھی اچھی طرح دیکھا۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے ناگوں کو آہستہ سے کچھ کہا۔ ناگے فضل داو کو ایک طرف لے گئے اور ایک درخت کے پاس کھڑا کر کے اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں میں مضبوط رسی ڈال دی اور رسی کا دوسرا سرا درخت کے ساتھ باندھ دیا جیسے کسی جانور کو باندھا جاتا ہے۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں سے فضل داو کو سب کچھ نظر آرہا تھا۔

شام کے وقت فضل داو کو ایک جھوپڑے میں لے گئے جو پتھروں کا بنا ہوا تھا اور اس کی چھت میں درختوں کے موٹے ٹن اور سرکنڈے اور ان پر مٹی ڈالی ہوئی تھی۔ اس جھوپڑے کا ایک ہی دروازہ تھا۔ فضل داو کو اندر بٹھا کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ توڑی دیر بعد اسے کھانا دیا گیا۔ یہ اُبلے ہوئے چاول تھے اور شوربے والی مچھلی تھی۔ فضل داو نے بڑی ہی لمبی مدت کے بعد صحیح کھانا دیکھا تھا۔ وہ اس کھانے پر نوٹ پڑا اور پیٹ بھر کر کھایا۔ اس کے ہاتھ اس جھوپڑے میں داخل کر کے حبل دیئے گئے تھے۔ دو ناگوں نے اسے

لیا۔

فضل داو نے موت کو قبول کر لیا۔ اس نے اپنے آپ کو اس طرح قتل دی کر جلائیوں کے ہاتھوں بھی مرنا تھا وہاں سے بچ نکلے تو جنگل میں کسی درندے کا شکار ہو جانا تھا وہ نہ ہوئے تو ان ناگے وحشیوں کے ہاتھوں موت لکھی ہوئی تھی وہ مل رہی ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔۔۔۔ فضل داو دائیں بائیں دیکھتا جا رہا تھا۔ سارا علاقہ سرسبز تھا اور درخت تو بہت ہی تھے۔ ہری بھری ٹیکریاں اور اونچی نیچی پہاڑیاں بھی تھیں لیکن یہ علاقہ دشوار گزار نہیں تھا۔ آگے چڑھائی ہی چڑھائی تھی۔ کہیں ذرا سی اترائی آتی تھی اور پھر زمین اوپر کو چلی جاتی تھی۔ فضل داو سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ بلندیوں پر رہتے ہیں۔ فضل داو کے پاس گھڑی تھی جو ان ناگوں نے نہیں اتاری تھی۔ ناگے بہت ہی تیز چل رہے تھے۔ زہرہ خانم کو وہ باری باری اٹھا رہے تھے۔ وہ جسموں سے بہت طاقتور معلوم ہوتے تھے۔

وہ جب رُکے تو فضل داو کو گھڑی نے بتایا کہ چار گھنٹے اور کچھ منٹ گزر گئے ہیں۔ انہوں نے فضل داو کو بڑے آرام سے زمین پر رکھ دیا اور لاٹھیاں جو دراصل ان کی برقیات تھیں کھینچ لیں۔ پھر اسے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ اس کے پاؤں کھول دیئے گئے لیکن ہاتھ نہ کھولے گئے۔ فضل داو نے سب سے پہلے زہرہ خانم کو دیکھا۔ اسے بھی انہوں نے کندھوں سے اتار دیا تھا اور وہ رو رہی تھی۔

ہر طرف دیکھا تو یہ جگہ پہاڑیوں سے گھری ہوئی نظر آئی۔ سبزہ زار اور درختوں کی وجہ سے یہ ساری جگہ بہت ہی خوبصورت لگتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ناگے آدمیوں اور عورتوں اور بچوں کا ایک جھوم اکٹھا ہو گیا۔ بچے تالیاں بجا رہے تھے اور بڑے بھی ہنستے مسکراتے باتیں کر رہے تھے۔ اگر ان کی باتیں سمجھ میں آتیں تو کچھ اندازہ ہو جاتا کہ ان لوگوں کا مقصد کیا ہے۔ وہاں ادھر ادھر درختوں کے ٹنوں، سرکنڈوں اور گھاس پھوس کے جھوپڑے بنے نظر آ رہے تھے جن میں بعض گول تھے اور باقی چوکور۔

اچانک جھوم میں ہڑونگ سی ہوئی اور یکجہت یہ ہڑونگ خاموشی میں بدل گئی۔ ایک طرف سے جھوم نے ادھر ادھر ہٹ کر راستہ بنا دیا۔ ایک ناگہ آ رہا تھا جس کے پیچھے چار ناگے تھے۔ یہ ناگان ان کا سردار معلوم ہوتا تھا وہ پوری طرح ناگہ نہیں تھا۔ اس نے کر کے گرد ایک رسی باندھ رکھی تھی۔ اس رسی سے رنگ دار کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے

فضل داد ان ناگوں کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ ان ناگوں کے متعلق کچھ حوالہ دار ضروری باتیں پہلے ہی بتا دوں تو میرا خیال ہے اچھا رہے گا۔ ان ناگوں کی میں پرانی تاریخ تو نہیں جانتا، اور شاید ان کی کوئی تاریخ ہے بھی نہیں۔ جنگِ عظیم کے فوراً بعد یہ قبائل تاریخ میں نمایاں طور پر ابھر کر آ گئے۔ اب یہ نانگے نہیں بلکہ ناگا قبائل کہلاتے ہیں۔ ان کی اپنی سیاسی قیادت ہے اور یہ قیادت اتنی مخلص اور دیانت دار ہے کہ اس نے آدم خور ناگوں کو ایک باعزت قوم بنا دیا ہے۔

اگر قیادت مخلص اور دیانتدار ہو اور اسکے دل میں اپنے لوگوں کی محبت ہو تو معجزے مودعا ہو سکتے ہیں۔ اس کی ایک مثال پاکستان ہے۔ بڑے صغیر کے مسلمان، خصوصاً پاکستان میں آنے والے صوبوں کے مسلمان پسماندہ تھے، بے باپ تھے اور تعلیم سے بھی بے بہرہ تھے۔ ان کی اکثریت مزدور اور کسان تھی۔ قیادت ملی تو اسی قوم نے ایک الگ مملکت بنا لی تھی۔

جنگِ عظیم کے تھوڑا ہی عرصہ بعد اخباروں میں دو قبائل کے نام آنے لگے۔ ایک ناگا اور دوسرے میزو۔ ان قبائل کا علاقہ آسام کے مشرق اور شمال مشرق میں ہے۔ اس سے آگے برا شروع ہو جاتا ہے۔ ناگا اور میزو قبائل کا علاقہ ہندوستان میں آتا ہے یعنی وہاں ہندوستان کی حکومت ہے۔

ناگا قبائل تو بالکل ہی وحشی اور آدم خور تھے۔ انسانی کھوپڑی ان کے کلچر اور عقیدے کا لازمی حصہ تھا۔ یہ لوگ باورِ زادہ ننگے رہتے تھے۔ کچھ پہاڑوں کے دامن میں رہتے اور باقی پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور بلندیوں پر رہتے تھے۔ یہ وہی نانگے تھے جن کے

زبانے کیا کچھ کہا تھا۔ وہ انگلیاں اور ہاتھ اس کی طرف کر کے زور زور سے ہلاتے اور غم سے بولتے تھے۔ وہ یقیناً یہی کہتے ہوں گے کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو تمہیں زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔

○

فضل داد کی رات اس کمرے میں گزری۔ یہ اس کا قید خانہ تھا۔ اسے اپنا کوئی غم نہیں تھا، وہ زہرہ خانم کے لئے پریشان تھا۔ وہ ایسی توقع رکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ نانگے وحشی اس خوبصورت عورت کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کریں گے لیکن وہ اس عورت کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت ہی تھکا ہوا تھا اور اس نے کھانا اتنا زیادہ کھالیا تھا کہ اس پر غنوغی طاری ہو گئی اور وہ سو گیا۔

اگلے روز دو نانگے اس کے پاس آئے اور اسے کھانے کے لئے کچھ دیا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ یہ کیا ہے۔ اس نے اشاروں سے ان ناگوں سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ ناگوں نے اس کے اشارے سمجھ لئے اور ان میں ایک نے اپنی گردن پر یوں ہاتھ کا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ تمہاری گردن کاٹ دی جائے گی۔ اگر وہ ان کی زبان سمجھتا تو ان سے کہتا کہ گردن بہت جلدی کاٹ دو ماکہ میں اس دنیا کے جہنم سے آزاد ہو جاؤں۔

دونوں نانگے وہاں سے نکل گئے اور دروازہ بند کرنے لگے۔ فضل داد نے سوچنا شروع کر دیا کہ مرنا تو ہے ہی لیکن وہ بزدلوں کی طرح نہیں مرے گا یا بکرے کی طرح اپنی گردن نہیں کٹوالے گا بلکہ ایک دفعہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش ضرور کرے گا اور یہ کوشش بھی کرے گا کہ زہرہ خانم کو بھی ساتھ لے جائے۔

ہاتھ فضل داد اور ذہرہ خانم چڑھ گئے تھے۔ میزو قبائل ان سے بہتر تھے۔ ان میں ناگوں جیسا وحشی پن نہیں تھا اور درندگی بھی نہیں تھی۔ میزو قبائل کا علاقہ ناگوں کے علاقے کے ساتھ ملتا ہے۔ اکثر میزو قبائل کے لوگ ہی نانگے آدم خوروں کا شکار ہوا کرتے تھے۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ 1950ء سے ذرا پہلے ان ہی ناگوں اور میزو قبائل نے ہندوستان کی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کر دی اور آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ انہیں الگ مملکت دی جائے جس کا نام ناگالینڈ ہو گا۔ دراصل ناگا اور میزو قبائل متحد ہو گئے تھے۔ وہ آج تک متحد ہیں اور ان میں وہی سیاسی بیداری ہے جو ہر تہذیب یافتہ قوم میں پائی جاتی ہے۔ ان کی مسلح بغاوت کو دبائے کے لئے ہندوستان کو اپنی فوج استعمال کرنی پڑی اور خاصی شدید اور خونریز جنگ لڑی گئی جو کئی سال چلتی رہی۔ یہ جنگ آزادی ایسی ہی تھی جیسی صوبہ سرحد کے قبائلی پٹھانوں نے اپنے علاقے میں انگریزوں کے خلاف لڑی تھی۔

ہندوستان ناگا اور میزو قبائل کی مسلح بغاوت کو فوجی طاقت سے دبانے سکا۔ اس کی خبریں ساری دنیا کے اخباروں اور رسالوں میں آنے لگیں اور یوں مذہب دنیا ناگا اور میزو قبائل اور ان کی جنگ آزادی سے واقف ہوئی۔ نانگے اور میزو پہاڑیوں میں چلے گئے اور گوریلا قسم کی لڑائی لڑتے رہے۔

یہاں میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناتا ہوں جو شاید بہت سے قارئین نے پہلے سنی نہ ہوگی۔ اگر میں کہوں کہ ناگا اور میزو قبائل کا رابطہ ہمارے قبائلی پٹھانوں کے ساتھ تھا تو آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن ہوا۔ یہ رابطہ یا تعلق اس طرح تھا کہ صوبہ سرحد سے چرس اور اینٹوں منوں کے حساب سے سسکل ہو کر کراچی پہنچتی تھی۔ سسکل وہاں سے بحری جہازوں میں یہ مشرقی پاکستان تک پہنچاتے تھے۔ اس کے عوض وہاں یا کراچی میں ہی بین الاقوامی سسکل رانٹھیں، مشین گنیں، گرنیڈ اور دیگر ایمنونیشن فراہم کرتے تھے۔ یہ اسلحہ مشرقی پاکستان سے سسکل ہو کر ناگا اور میزو قبائل تک پہنچتا تھا۔ یہ کاروبار پاکستان اور ہندوستان کے سسکل کرتے تھے اور اس سے انہوں نے بے تحاشہ دولت کمائی تھی۔ اوسر برا اڑھائی تین سال میدان جنگ بنا رہا تھا۔ جاپانیوں، انگریزوں، امریکیوں اور ہندوستانیوں کے بے انداز افسر اور جوان مارے گئے تھے۔ مکھن جنگلوں میں

پہاؤ اس کی صورت یہ بن گئی جیسے وہ نانگے انسان نہیں بلکہ جنات یا اس جنگل کے بھوت پریت تھے جو اچانک نمودار ہوئے اور ایک نوجوان مزدور کو اٹھا کر کہیں عتاب ہو گئے۔ یہ بھی سنا سنا گیا کہ دو تین مزدور ان کے تعاقب میں ان تک پہنچ گئے تھے۔ ناگوں نے پیچھے مڑ کر انہیں دیکھا تو یہ سارے مزدور بغیر ہاتھ لگائے چکر اکر گرے اور بے ہوش گئے۔ یہ ایک مبالغہ تھا۔

راستے اور سڑکیں بنانے کے کام کی نگرانی انگریز افسر کر رہے تھے جن کا تعلق انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ تھا۔ انگریز بیدار مغز قوم تھی اور انہوں نے آدمی دنیا پر حکومت جو کی تھی، یہ ان کی دانشمندی کا نتیجہ تھا۔ دانشمندی یہ کہ انگریز جس ملک میں جاتے تھے، وہاں کے ملک کے لوگوں کی نفسیات، نظریات اور ان کے معاشرتی امور کو سمجھ لیتے اور ان کے ساتھ ان کے مطابق سلوک اور برتاؤ کرتے تھے۔ اس طرح وہ اس ملک کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر انہیں غلام بنا لیتے تھے۔

انگریز افسروں کو پتہ چلا کہ کچھ نانگے لوگ ایک مزدور کو اٹھا کر لے گئے ہیں تو انہوں نے ان کو وحشی لوگوں کے خلاف فوج استعمال نہ کی بلکہ ان تک پہنچے۔ میں یہ تو نہیں جانتا تھا کہ ان انگریزوں نے کس طرح ان ناگوں کو رام کیا، میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ انگریزوں نے ان پر کوئی تشدد نہیں کیا تھا۔ یہ دیکھا گیا کہ جب انگریز افسر واپس آئے تو ان کے ساتھ سینکڑوں نانگے تھے۔ انہیں انگریز مزدوری کے لئے ساتھ لے آئے تھے۔

یہ مزدوروں کا ایک الگ لشکر بن گیا جس میں صرف نانگے تھے اور جب انہوں نے کام شروع کیا تو پتہ چلا جیسے یہ انسان نہیں بلکہ مشینیں ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے مزدور اور پگڈنڈیوں کے لئے جنگل صاف کر دیے اور پہاڑیاں کاٹ ڈالیں۔ ان کی خوراک اپنی ہی تھی۔ وہ چھپکلی سے لے کر گیدڑ اور بھیڑیے تک کو پکڑ کر کھا جاتے تھے۔ ان کی اپنی کچھ شرائط تھیں۔ ان میں سے نہایت دلچسپ شرط یہ تھی کہ وہ نوٹوں کی شکل میں اپنی اجرت وصول کرتے تھے۔ ان دنوں روپیہ رسکے کی صورت میں زیادہ چلتا تھا لیکن نانگے رسکے قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ پانچ روپے، دس روپے اور سو روپے کا نوٹ لیتے تھے لیکن کوئی نوٹ ذرا سا بھی مڑا مڑا ہوا تو وہ نہیں لیتے تھے۔ کہتے تھے کہ بالکل نئے نوٹ لیں گے۔ لہذا ان کے لئے بالکل نئے نوٹ لائے جاتے تھے۔

جس مزدور کو وہ اٹھا کر لے گئے تھے، اسے انہوں نے کھائی لیا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ

ہر طرف اسلحہ اور ایمونیشن بکھرا پڑا تھا۔ برما کے ڈاکو مشہور ہوا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے یہ اسلحہ اور ایمونیشن اکٹھا کر کے کہیں چھپا لیا تھا۔ جنگ کے بعد انہیں اسلحہ کی منڈی مل گئی۔ یہ تھی ناگا اور میزو قبائل کی جنگ آزادی۔ اس طرح برما کی طرف سے بھی ان قبائل کو اسلحہ بارود ملتا رہا۔

اب ان قبائل کی مسلح جنگ آزادی رک گئی ہے لیکن سیاسی میدان میں ان کی جنگ جاری ہے اور یہ لوگ ہندوستانی حکومت کے لئے ایک مسلسل مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ ان کے نمائندے اسمبلیوں میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے ناگالینڈ کا قیام۔ ان کی دیکھا دیکھی بھوٹان کے لوگوں نے بھی کچھ عرصہ پہلے بغاوت کر دی تھی اور اعلان کیا تھا کہ وہ ہندوستان سے الگ ہو کر اپنی الگ مملکت بنائیں گے جس کا نام گورکھالیڈ ہو گا۔ ہندوستان نے کئی ڈویژن فوج ان علاقوں میں رکھی ہوئی ہے اور وہاں فوجیوں پر فائرنگ کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ ان وحشی اور آدم خور ناگوں میں بیداری کس طرح پیدا ہوئی۔ میں نے بتایا ہے کہ یہ نانگے دشوار گزار پہاڑی اور جنگلاتی علاقے میں رہتے تھے۔ پہاڑیوں کے دامن میں بھی اور بلندیوں پر بھی۔ جنگ عظیم برما میں بھی آگئی تو انگریزوں کو وہاں سب سے بڑی جس دشواری کا سامنا ہوا وہ وہاں کے جنگل اور پہاڑ تھے۔ ان میں سے پا پیاہ گزرنا بھی محال تھا لیکن اس دشوار گزار علاقے میں سے گاڑیاں گذارنی تھیں اور فوجوں نے نقل و حرکت کرنی تھی۔ اتنے چوڑے راستے بنانے تھے جن پر فوجی ٹرکوں اور ٹینکوں نے چلنا تھا۔ اگر فوجیوں کو اس کام پر لگا دیا جاتا تو لڑنے کے لئے کوئی فوجی نہ رہتا۔ اس کام کے لئے مزدور اکٹھے کئے گئے۔ یہ ایک سوئیلین فوج تھی جو آسام اور بنگال سے اکٹھی کی گئی تھی۔ اس فوج کے پاس دو ہی ہتھیار تھے۔ کینٹنی اور پیٹل۔ ان مزدوروں کے رہنے اور کھانے کا انتظام وہیں جنگلوں میں کر دیا گیا تھا اور وہ دن بھر جنگل کاٹنے اور پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر راستے اور سڑکیں بناتے رہتے تھے۔

ایک روز اس مزدور فوج میں جھگڑا مچ گئی۔ معلوم ہوا کہ کچھ جنگل میں سے بالکل تنگ دھڑنگ آدمی نکلے اور ایک نوجوان مزدور کو اٹھا کر لے گئے۔ کچھ مزدوروں نے ان کا پیچھا کیا لیکن وہ نانگے بالکل ہی غائب ہو گئے جیسے فضا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔ وہاں ہزار ہا مزدور کام کر رہے تھے۔ ایک مزدور کے اغوا کا واقعہ تمام مزدوروں کے کانوں تک

یہ لوگ اپنے کسی خاص تہوار یا تقریب پر انسانی جان کی قربانی دیتے ہیں اور پھر اسے پکا کر کھا لیتے ہیں..... یہ نانگے مزدوری کرنے آئے تو ان کا تعلق تہذیب یافتہ دنیا کے لوگوں کے ساتھ پیدا ہوا۔ آسام اور بنگال کے مزدور ان سے ڈرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کا خوف ختم ہو گیا۔ ان ناگوں نے آسامیوں اور بنگالیوں کے اثرات قبول کرنے شروع کر دیئے۔ پہلا اثر یہ قبول کیا کہ انہیں یوں برہمن نہیں رہنا چاہئے۔ انہوں نے پہلا جو لباس پہنا وہ صرف ایک رستی تھی جو کمر کے گرد باندھ لیتے تھے۔ پھر انہوں نے اس رستی میں آگے اور پیچھے کپڑے کا ایک ایک ٹکڑا اڑس لیا اور پھر انہوں نے کمر کے گرد کپڑا باندھنا شروع کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی جو نانگے پہاڑیوں کی بلندیوں پر رہتے تھے، وہ بھی نیچے آنے لگے لیکن تمام کے تمام قبائل نیچے نہ آئے۔ وہ اپنا رہن سہن اور تمدن جیسا کیسا بھی تھا، چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔

جنگ ختم ہو گئی تو یہ نانگے واپس تو چلے گئے لیکن اب وہ نانگے نہیں رہے تھے۔ وہ اب اپنا ستر و حجاب کر رکھتے تھے اور بعض نے تو لباس بھی پہننا شروع کر دیا تھا۔ جنگ عظیم نے کئی پسماندہ قوموں میں سیاسی اور ذہنی بیداری پیدا کر دی اور ان میں آزادی کی تڑپ آگئی۔ انہیں لیڈر شپ مل گئی۔ جنگ عظیم کے بعد کی تاریخ پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ بے شمار چھوٹے چھوٹے ملک جو استعماری طاقتوں کے قبضے میں ہوا کرتے تھے، آزاد ہوئے۔ ان میں انڈونیشیا کی جنگ آزادی تاریخ کا ایک بہت ہی بڑا واقعہ ہے۔ پاکستان معرض وجود میں آیا اور افریقہ کے چھوٹے چھوٹے ملک بھی آزاد ہوتے چلے گئے۔ میں آگے چل کر آپ کو انڈونیشیا کی جنگ آزادی کی کہانیاں سناؤں گا جو میں اس لئے وثوق کے ساتھ سنا سکتا ہوں کہ میں خود اس جنگ آزادی میں شریک ہوا تھا۔ انڈونیشیا کے مسلمانوں نے آزادی کے لئے جان و مال کی جو قربانیاں دی تھیں وہ ولولہ انگیز بھی ہیں اور حیران کن بھی۔

ان ناگوں کو بھی لیڈر مل گئے جو ان جیسے پسماندہ اور وحشی نہیں تھے بلکہ ان علاقوں کے رہنے والے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ انہوں نے ناگوں کی ذہنی بیداری کو ایسا استعمال کیا کہ ان میں سیاسی بیداری پیدا کر دی۔ انہیں نانگے کی بجائے نانگے کہنے لگے اور ان کا اتحاد میزو قبائل کے ساتھ کر کے انہیں ایک قوم بنا دیا۔ یہ قوم جس طرح جنگ آزادی کے محاذ پر ڈٹی ہوئی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنی آزاد مملکت، ناگالینڈ بنانے

اب آئیے، میں آپ کو آدھی صدی پیچھے لے چلتا ہوں جہاں حوالدار فضل داوان ناگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس وقت نانگے نانگے نہیں تھے بلکہ وحشی اور درندے تھے۔

فضل داو جھوپڑے میں بیٹھا ہوا تھا۔ دن کا وقت تھا۔ اُس نے فرار ہونے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ اٹھا اور دروازے کا جائزہ لیا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے دروازے کو ہاتھ لگایا اور ذرا سادھکیلا۔ اس سے اسے اندازہ ہو گیا کہ دروازہ مضبوط نہیں۔ اگر وہ دروازے کو اپنے جسم کے دھکوں سے دھکیلتا تو دروازے کے تختے ٹوٹ سکتے تھے۔ وہ زور زور سے ٹھٹھڑے مار کر بھی دروازہ توڑ سکتا تھا لیکن اس نے ایسی جرأت نہ کی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر نانگے موجود ہیں وہ اسے فوراً پکڑ لیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے مار ہی ڈالیں۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ شام کا کھانا تو کوئی لائے گا ہی۔ اگر وہ اکیلا ہوا تو اس پر قابو پالے گا اور اس کا گلا گھونٹ کر بھاگ جائے گا۔ اسے اپنا یہ پلان بھی اچھا نہ لگا کیونکہ وہ زہرہ خانم کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے کمائنڈو ٹریننگ لی ہوئی تھی۔ وہ اپنا ہر داؤ آزمانا چاہتا تھا اور اس کا یہ ارادہ بہت ہی مضبوط تھا۔

وہ فرار کے طریقے سوچ رہا تھا کہ اسے باہر سے دروازہ کھولنے کی آوازیں آئیں۔ وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازے کا کواڑ بڑی تیزی سے کھلا اور دو نانگے بہت ہی تیزی سے اندر آئے۔ ایک نے فضل داو کا ایک بازو اور دوسرے نے دوسرا بازو پکڑا اور اسے اٹھالیا۔ اب فضل داو کھڑا تھا اور ایک ناٹکا اس کے ایک پہلو میں اور دوسرا دوسرے پہلو میں کھڑا ہو گیا تھا۔ دونوں نے اس کے بازو پکڑ رکھے تھے۔ ایک دو منٹ بعد دروازے میں ان کا سردار نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دی ڈنڈہ تھا جو فضل داو نے پہلے دیکھا تھا۔ یہ دو فٹ لمبا ڈنڈہ تھا اور اس پر رنگ دار کپڑے کے ٹکڑے لپٹے ہوئے تھے۔ اس کے ایک سرے پر پرندوں کے رنگ دار پر لگے ہوئے تھے اور دوسرے سرے پر چھوٹی چھوٹی دو گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ زہرہ بھی تھی۔

زہرہ خانم کو زندہ اور سلامت دیکھ کر فضل داو کو اطمینان ہوا۔ وہ اب اس سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ گزشتہ رات کیا سلوک ہوا لیکن یہ پوچھنے کی مہلت نہ

دی گئی۔ جوا یہ کہ جن دو ناگوں نے اسے پکڑ رکھا تھا انہوں نے ایک تو اس کے بازو نیچے کو کھینچے جیسے اسے بٹھانا چاہتے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس کے سر اور گردن پر ہاتھ رکھ کر نیچے کو دبایا۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے۔ ایک نانگے نے اسے چھوڑ کر سجدہ کیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے فضل داو کو اشارہ کیا کہ وہ بھی سجدہ کرے۔ ان کا سردار زہرہ خانم کے ساتھ دروازے میں ہی رک گیا تھا۔

فضل داو اس کے آگے سجدہ نہیں کر رہا تھا۔ وہاں مسئلہ زبان کا تھا۔ اگر ناگوں کا سردار فضل داو کی زبان سمجھ سکتا تو فضل داو اسے بتاتا کہ ہم ایک اللہ کے سوا کسی کے آگے سجدہ نہیں کیا کرتے۔ کہنے کی بجائے فضل داو نے ہاتھ اوپر کر کے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور نفی میں سر ہلایا۔ اس اشارے سے وہ اپنا مطلب واضح کرنا چاہتا تھا جو نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں ناگوں نے اس کا سر پھرنیچے کو دبانا شروع کر دیا۔

سردار دروازے میں ہی کھڑا فضل داو کو چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ فضل داو نے دیکھا کہ سردار کے ہونٹوں پر تبسم سا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کا ہلکا سا بھی تاثر نہیں تھا۔ ہم جب فوج میں بھرتی ہوئے تھے تو ہمیں فوجی ٹریننگ دی گئی تھی جو مکمل سمجھی جاتی تھی لیکن جنگ کے دوران اس ٹریننگ میں کچھ اضافے ہوئے تھے۔ ان میں لڑائی کا ایک اور طریقہ بھی شامل تھا۔ اُسے Unarmed Combat کہتے تھے۔ مطلب یہ کہ آپ کے پاس کوئی ہتھیار نہیں اور دشمن کے ایک دو فوجی آپ کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے پاس رائفلیں ہیں جن پر سنگینیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ہمیں داؤ سکھائے گئے تھے کہ خالی ہاتھ مسلح دشمن کے خلاف کیسے لڑنا ہے۔ اسے بے ہتھیار کی لڑائی کہا گیا تھا۔ فضل داو نے ایک تو یہ ٹریننگ لی تھی اور اس کے علاوہ اسے گوریلا اور کمائنڈو ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔ جھوپڑے میں دو نانگے اس کا سر جھکانے کی کوشش کر رہے تھے۔

فضل داو نے یہ داؤ کھیلنا کہ اپنے دونوں بازو آگے کو کئے اور دائیں بازو کی کہنی دائیں والے نانگے کے پیٹ میں اور بائیں بازو کی کہنی بائیں طرف والے نانگے کے پیٹ میں اتنی زور سے ماری کہ دونوں ناگوں نے اس کا سر چھوڑ دیا اور وہ اپنے پیٹوں پر ہاتھ رکھ کر دوہرے ہو گئے۔ فضل داو نے دونوں کی گردنوں پر ہاتھ رکھے اور پہلے انہیں ذرا پیچھے ہٹایا پھر بڑی زور سے اس نے دونوں کو آگے جھٹکا دیا اور ان کے سر آپس میں ٹکرائے۔ دونوں سیدھے ہو گئے اور چکرانے لگے۔ فضل داو نے ایک بار پھر دونوں کی

گردنوں کے پیچھے ہاتھ رکھے اور دونوں کے منہ اور ماتھے آپس میں پہلے کی طرح اور زور سے ٹکرائے۔ دونوں ٹانگے چکرائے۔ ایک تو گر ہی پڑا اور دوسرا اس طرح ڈولنے ڈوگمانے لگا جیسے کسی نشے میں ہو۔

”نہیں فضل دادا!“ — زہرہ خانم نے گہرا کر کہا — ”یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔“

فضل دادا نے ان کے سردار کی طرف دیکھا۔ سردار کے ہونٹوں پر ہلکا سا جو تبسم تھا وہ اب کھلی ہوئی مسکراہٹ بن گیا تھا۔

سردار اور زہرہ خانم کے پیچھے دو اور ٹانگے کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں بانسوں کی برچھیاں تھیں۔ جب فضل دادا نے اندر والے دونوں ٹانگوں کے پٹوں میں کھنیاں ماری تھیں تو باہر کھڑے دونوں ٹانگے برچھیاں تان کر اندر آنے لگے تھے۔ وہ فضل دادا کو برچھیاں مارنا چاہتے تھے یا ان کا ارادہ فضل دادا پر قابو پانے کا تھا۔ وہ آگے ہونے لگے تو سردار نے اپنے بازو دائیں اور بائیں پھیلا کر انہیں باہر ہی روک لیا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے آدمیوں میں کتنی طاقت ہے اور کیا وہ اس آدمی فضل دادا کا مقابلہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کے چہرے سے یہ بھی پتہ چلتا تھا جیسے فضل دادا نے جو داؤ چلائے تھے، یہ سردار کو بہت اچھے لگے تھے۔

دونوں ٹانگے سنبھل کر سیدھے ہوئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک نے دوسرے سے کچھ کہا اور دونوں نے یہ حرکت کی کہ ایک جھونپڑے کی ایک طرف کی دیوار تک چلا گیا اور دوسرا سامنے والی دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ فضل دادا جھونپڑے کے وسط میں کھڑا دونوں کو دیکھتا رہا۔ دونوں نے گھونٹے تو نہ تانے، یوں کیا کہ اپنے ہاتھ آگے کئے۔ ان کی انگلیاں کھلی ہوئی اور ذرا آگے کو مڑی ہوئی تھیں جیسے وہ دونوں فضل دادا کو بچنے مارنا چاہتے ہوں۔ دونوں تیزی سے فضل دادا کی طرف دوڑے۔ وہ درندوں کی طرح دانت نکال کر پیس رہے تھے۔ جب وہ فضل دادا کے قریب آئے تو فضل دادا ایک قدم پیچھے ہٹا، ایک ہاتھ ایک کی گردن پر اور دوسرا ہاتھ دوسرے کی گردن پر رکھ کر اندر کو دیا۔ دونوں پہلے ہی دوڑے آ رہے تھے، فضل دادا کے ہاتھوں نے ان کی رفتار اور تیز کردی اور وہ آپس میں بڑی زور سے ٹکرائے۔ ایک بار پھر ان کے منہ اور ماتھے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور دونوں تیرائے اور ان کے سر ڈولنے لگے۔

وہ دونوں فضل دادا کے مقابلے میں یقیناً ”طاقتور تھے لیکن انہیں وہ داؤ معلوم نہیں تھے جو فضل دادا کھیل رہا تھا۔“

وہ دونوں ذرا سنبھلے اور فضل دادا کو قبر بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ سردار نے گرج کر ایک ہی لفظ کہا تو دونوں فوراً ”پیچھے ہٹ گئے۔“ سردار نے فضل دادا کو ڈنڈے سے اشارہ کیا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ بیٹھ جاؤ۔

”فضل دادا!“ — زہرہ خانم نے کہا — ”گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ جاؤ۔“

فضل دادا زمین پر دو زانو ہو گیا۔ سردار آگے بڑھا اور اپنے ڈنڈے کا پروں والا سرا اس کے ایک کندھے سے لگایا پھر دوسرے کندھے سے لگایا اور پھر ڈنڈے کا سرا اس کے سر پر آہستہ سے رکھا۔ اس نے کچھ کہا بھی جو فضل دادا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ اتنا ہی سمجھ سکا کہ سردار غصے میں نہیں اور اس نے اسے شاباش دی ہے۔

اس کے بعد سردار نے اپنا ڈنڈہ درمیان سے پکڑا اور بازو لمبا کر کے ڈنڈہ فضل دادا کے سر سے ذرا اوپر لایا اور پھر اس کے ہاتھ بڑی زور سے کانپنے لگے اور ڈنڈے کے دوسرے سرے پر ٹنگی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ کچھ دیر بعد سردار نے ڈنڈہ پیچھے کر لیا اور وایاں ہاتھ فضل دادا کی طرف بڑھایا۔ فضل دادا نے یہ سمجھ کر وہ اس کے ساتھ ہاتھ ملانا چاہتا ہے، اپنا ہاتھ آگے کیا جو سردار نے اپنے ہاتھ میں لے کر عجیب سے طریقے سے مصافحہ کیا۔ پھر اس نے فضل دادا کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”زہرہ!“ — فضل دادا نے زہرہ خانم سے پوچھا۔ ”کیا تم کچھ سمجھ سکتی ہو کہ اس کا مطلب کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے میں سمجھ گئی ہوں۔“ — زہرہ خانم نے جواب دیا — ”میں کل سے اسے اشاروں سے سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ ہمیں زندہ رہنے دیں اور ہم دونوں کو آزاد کر دیں۔ اگر میں اس کے اشارے سمجھ گئی ہوں تو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ ہمیں آزاد نہیں کرے گا لیکن تمہیں قیدی نہیں رہنے دے گا اور جان سے مارے گا بھی نہیں۔ میں یہ بھی سمجھی ہوں کہ اس شخص نے مجھے کوئی اونچا درجہ دے دیا ہے۔ درجہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ مجھے اپنی بیوی بنا لے گا۔“

”دعا کرو یہ مجھے زندہ رہنے دے۔“ — فضل دادا نے کہا — ”میں تمہیں یہاں سے نکال لے جانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

فضل داد نے مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ وہ جب زہرہ سے ہمکلام تھا تو سردار خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس سے فضل داد کو یہ اطمینان ہوا کہ زہرہ خانم کے ساتھ باتیں کرنے پر سردار کو اعتراض نہیں اور یہ بھی کہ وہ بڑے اچھے موڈ میں ہے۔

سردار نے اچھے موڈ کا ایک مظاہرہ یہ بھی کیا کہ اس نے زہرہ خانم کی طرف دیکھا اور مسکرا کر سر کو ہلکی سی اوپر نیچے کو جنبش دی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اس نے زہرہ خانم کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی اور شاید اسے یہ کہا تھا کہ تمہارے ساتھی کو اس نے قیدی نہیں دے دیا۔ فضل داد نے اپنے دل میں کچھ ایسی امید بھی رکھ لی تھی جیسے سردار اسے رہا کر دے گا لیکن اس کے بعد سردار نے ڈنڈے سے اور سر اور ہاتھوں سے جو اشارے کئے، ان سے پتہ چلتا تھا کہ اسے چھوڑا نہیں جائے گا۔ فضل داد نے سوچا کہ اسے چھوڑا نہ جائے لیکن قید میں نہ رکھا جائے۔ اس طرح اس کا اپنا فرار تو ممکن ہو سکتا تھا لیکن وہ زہرہ خانم کو بھی وہاں سے نکالنا چاہتا تھا۔

سردار وہاں سے چلا گیا اور جھونپڑے کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فضل داد اب قیدی نہیں تھا۔ وہ دونوں نانگے جو فضل داد کے پاس جھونپڑے میں گئے تھے اور اسے سجدہ کرانے کے لئے اس کا سر نیچے کر رہے اور پھر فضل داد سے مار کھائی تھی، وہ فضل داد کو ترقی نظروں سے دیکھتے ہوئے سردار کے پیچھے چلے گئے۔

فضل داد نے یہ جگہ ایک روز پہلے بھی دیکھی تھی لیکن اس وقت وہ ایسی حالت میں تھا کہ گرد و پیش کی ہر ایک چیز نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اور اسے ایک مژدہ جانور کی طرح لایا گیا تھا۔ پھر اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا اور اس کے بعد اسے جھونپڑے میں قید کر دیا گیا تھا۔ اب وہ ایک آزاد آدمی کی حیثیت سے اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ دراصل فرار کا راستہ دیکھ رہا تھا۔ یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ وہاں سے فرار کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ کوئی جیل خانہ تو نہیں تھا لیکن اس نے زہرہ خانم کو بھی ساتھ لے جانا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ زہرہ خانم کو کہاں رکھا گیا ہے۔

اس نے مجھے سنایا کہ وہ جگہ کسی پہاڑی کی بالائی جگہ تھی اور اس کے ساتھ ہی پیچھے کی طرف اس سے اونچی پہاڑی کھڑی تھی جس جگہ وہ کھڑا تھا وہ کشادہ اور ہموار تھی۔ یوں پتہ چلتا تھا کہ یہ جگہ درخت کاٹ کر ان لوگوں نے خود بنائی ہے۔ ایک طرف ایک

چوترہ بنا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد اور ہر طرف اونچے نیچے درخت تھے۔ پھولدار پودے بھی تھے۔ دیکھنے کو یہ جگہ بڑی خوشنما اور صحت افزا تھی لیکن فضل داد نے بتایا کہ اس کے دل پر ایک خوف سایہ گیا تھا۔ خوف اس لئے کہ اس حسین اور دلنشین منظر میں کہیں کہیں کالی کالی اور گول گول چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ ان چٹانوں کی وجہ سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوہ قاف ہے جہاں جن بھوت اور پریاں رہتی ہیں۔

وہ جگہ تو یقیناً ”خوبصورت تھی“ میں نے ایسی کئی جگہیں دیکھی تھیں جہاں اس طرح کی بد رنگ اور بد صورت چٹانیں بھی ہیں اور ان کے ارد گرد سبزہ زار بھی ہیں لیکن فضل داد جو کچھ محسوس کر رہا تھا، یہ اس کی ذہنی حالت تھی۔ وہ ایک تجربہ کار کمانڈو تھا اور وہ اپنے دشمن پر آیا تھا لیکن ہرما کے جنگلوں میں آکر الجھ گیا۔ زہرہ خانم نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ انسان ہے لیکن کسی کسی وقت فضل داد کو پھر بھی شبہ ہونے لگا تھا کہ یہ عورت انسان نہیں، کوئی اور ہی مخلوق ہے۔ اسے یہ شبہ تھوڑی سی دیر کے لئے ہوتا اور پھر اس ذہن صاف ہو جاتا تھا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ یہ نانگے اس کے لئے عجیب و غریب مخلوق تھی۔ کبھی تو اسے شک ہوتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔

○

اس نے دیکھا کہ چند ایک نانگے چوترے پر صفائی کر رہے تھے اور چوترے کے آگے جو جگہ خالی اور ہموار تھی اس میں بھی کہیں کہیں مٹی یا چھوٹے چھوٹے پتھر ڈال کر ہموار کر رہے تھے۔ ان نانگوں میں عورتیں بھی تھیں۔ وہ بھی برہنہ تھیں۔ فضل داد نے افریقہ کے حبشیوں کی باتیں سنیں تھیں اور ان کی آدم خوری وغیرہ سنی تھی اور اس نے حبشی دیکھے بھی تھے۔ جنگ عظیم میں حبشیوں کے الگ بریگیڈ تیار کئے گئے تھے۔ کلکتہ میں پہلی بار فضل داد نے حبشی دیکھے تھے۔ وہ تو بہت ہی بھدے اور بد صورت تھے لیکن ان کے مقابلے میں نانگے اتنے سیاہ رنگ کے نہیں بلکہ گندی رنگت والے تھے اور ان کے چروں کے نقوش بھی اچھے تھے جیسے ہمارے ہوتے ہیں۔ ان میں بعض عورتیں تو صاف رنگت اور بڑے اچھے نقش و نگار والی تھیں لیکن فضل داد انہیں اس طرح نہیں دیکھتا تھا جس طرح ہم لوگ ایک عورت کو دیکھا کرتے ہیں۔

فضل داد مثلاً چلا گیا اور ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ نانگے رک کر اور کام چھوڑ کر اسے دیکھتے، آپس میں کچھ بات کرتے اور کام میں لگ جاتے تھے۔ عورتیں بھی اسے دیکھتی

تھیں، مسکراتیں اور آپس میں تبصرہ کر کے اپنی راہ لگ جاتی تھیں۔ ان کے لئے فضل داوود عجیب مخلوق تھا۔

وہ کسی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ان کا سردار کہاں رہتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ جہاں سردار ہو گا وہیں زہرہ خانم ہوگی۔ وہ جگہ یا جھونپڑا دیکھ کر اس نے پلان بنانا تھا کہ زہرہ خانم کو وہاں سے کس طرح نکالے..... وہ خراباں خراباں آگے چلا گیا تو یککٹ منظر بدل گیا۔ وہ رک گیا۔ اس نے اپنے آپ کو بلندی پر کھڑا پایا اور اس کے سامنے نیچے ایک داوی تھی جس میں کچھ جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ یہ بکھرے ہوئے جھونپڑے تھے۔ دائیں طرف ایک راستہ نیچے اترتا تھا۔ وہ ایک اور طرف چل پڑا۔ کچھ آگے جا کر اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے جو منظر ہے وہ تو اور ہی زیادہ دل نشین اور خوشنما ہے۔ ذرا بلندی پر ایک جھونپڑا تھا جو دوسرے تمام جھونپڑوں سے زیادہ اچھا تھا۔ اس کے ارد گرد بڑے خوشنما درخت تھے جن کی بلندی زیادہ نہیں تھی۔ انہوں نے جھونپڑے کے اوپر جا کر جھونپڑے پر سایہ کر رکھا تھا۔ ایک ٹانگا تراشے ہوئے بانس کی برجمی ہاتھ میں لئے ہوئے اس جھونپڑے کے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس ٹانگے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ یہاں سنتری کی ڈیوٹی دے رہا ہے۔ سنتری ٹہلتے ٹہلتے جھونپڑے کے ساتھ ساتھ دروازے سے ذرا پرے چلا گیا اور اچانک رک کر پیچھے کو مڑا اور دوڑ کر دروازے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اندر سے کوئی باہر آنے والا ہے۔

دروازہ کھلا تو زہرہ خانم باہر آئی اور اوہر اوہر دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کا افسوس کا یا گھبراہٹ کا کوئی تاثر نہیں تھا اور کوئی ایسا تاثر بھی نہیں تھا کہ وہ خوش نظر آتی۔

زہرہ خانم نے نیچے فضل داوود کو کھڑے دیکھا تو وہ اندر چلی گئی۔ ذرا ہی دیر بعد وہ واپس آئی اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے فضل داوود کو اوپر بلا دیا۔ اوپر جانے کے لئے اس ٹیکری کو کٹ کٹ کر اس نے سیڑھیاں سی بنائیں تھیں۔ فضل داوود بڑی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا اور جب دروازے کے قریب پہنچا تو زہرہ خانم نے اسے کہا کہ سردار اندر بلا رہا ہے۔ فضل داوود اندر چلا گیا۔

”یہاں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟“ فضل داوود نے زہرہ خانم سے پوچھا۔
— ”سلوک اچھا نہیں ہو گا!“

”وہ سلوک نہیں ہو رہا جس کا مجھے ڈر تھا“ — زہرہ خانم نے کہا — ”یہ تو اس طرح میری عزت کرتے ہیں جسے میری پوجا کر رہے ہوں۔ انہوں نے شاید مجھے اپنی دیوی بنایا ہے۔“

فضل داوود اس کے ساتھ زیادہ باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ زہرہ خانم نے اسے کہا کہ اس سردار کے آگے دو زانو بیٹھ جاؤ۔ سردار فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے گردن اگڑا رکھی تھی اور چہرے پر رعب کے تاثرات تھے۔ وہ فضل داوود پر یہ تاثر پیدا کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس دنیا کا بادشاہ ہے۔

سردار نے ہاتھوں کے بہت اشارے کئے۔ کبھی وہ زہرہ خانم کی طرف اشارہ کر کے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیتا اور اس نے اس قسم کے اشارے بھی کئے جن سے فضل داوود سمجھا کہ زہرہ خانم کے متعلق وہ کہہ رہا ہے کہ یہ عورت اب اس کی ہے اور اسے بڑا اونچا رتبہ دے کر رکھا جائے گا اور تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور ہم تمہیں احترام سے رکھیں گے۔

فضل داوود کو یہی اطمینان کافی تھا کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ جب سردار کوئی بات اشاروں میں ختم کرتا تو فضل داوود زہرہ خانم کے ساتھ ایک آدھ بات کر لیتا تھا۔ وہ زہرہ خانم سے کہتا تھا کہ یہاں سے فرار ہونا ہے اور زہرہ خانم اسے کہتی تھی کہ یہ تمام علاقہ ان لوگوں کا ہے اور یہ لوگ جنگلی جانوروں اور درندوں کی طرح اس سارے جنگل میں پھیلے ہوئے ہیں۔

”ایک بات صاف صاف بتا دو زہرہ!“ — فضل داوود نے پوچھا — ”کیا تم یہاں سے نکلنا چاہتی ہو یا ان کی دیوی یا ملکہ بن کر یہیں خوش رہو گی؟“
”اگر ممکن ہو تو مجھے ابھی یہاں سے لے چلو“ — زہرہ خانم نے کہا — ”تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ میں ان جنگلیوں کے ساتھ رہنا پسند کروں گی؟“

”میں نے محسوس کیا ہے کہ تم یہاں مطمئن ہو گئی ہو“ — فضل داوود نے کہا۔
”میں روؤں گی تو کیا یہ لوگ مجھے چھوڑ دیں گے؟“ — زہرہ خانم نے کہا۔

”یہاں آکر میں بہت روٹی تھی، اس سردار کے قدموں میں سجدہ بھی کیا تھا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر اسے کہا تھا کہ ہم دونوں کو آزاد کر دے لیکن یہ جنگلی پہلے تو میرے سردار پیٹھ پر چمکیاں دے دے کر بے لار ہوا اور جب دیکھا کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو اس نے تلوار

واپس اپنے گاؤں آیا تو فوجیوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر گزرے وقتوں میں بہت فوجی ملے جن میں سے بعض برہا میں لڑے تھے اور بعض آسام کے ان علاقوں میں بھی گئے تھے جو ان ناگلوں کا علاقہ تھا۔ ان فوجیوں میں سے بعض نے مجھے ان ناگلوں کے قصے سنائے تھے۔ فضل داو جب اپنی آپ بیتی سنا رہا تھا اور مجھے اس پر شک ہوتا تھا اور مجھے ان فوجیوں کی سنائی ہوئی باتیں یاد آ جاتی تھیں اس لئے میرا شک رفع ہو جاتا تھا۔ ان فوجیوں نے ناگلوں کو دیکھا تھا اور ان کی زندگی، آدم خوری، کھوپڑی پرستی اور ان کے رہن سہن کی باتیں صرف سنی تھیں۔ اس کے برعکس فضل داو ان کی خوفناک اور پراسرار دنیا کے اندر چلا گیا تھا یا لے جایا گیا تھا۔ فضل داو نے سردار کے جھونپڑے کے اندر پانچ انسانی کھوپڑیاں دیکھیں جو بڑے قرینے سے رکھی تھیں۔ تین نیچے اور دو ان کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔

فضل داو نے وہ دن کچھ گھومتے پھرتے اور باقی جھونپڑے میں لیٹے اور بیٹھے گزار دیا۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے فضل داو باہر نکلا کیونکہ اسے باہر کوئی بڑی سرگرمی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بہت سے نانگے چوترے پر کپڑے بچھا رہے تھے اور اس کے سامنے جو جگہ تھی اسے صاف بھی کر رہے تھے۔ چوترے سے چند گز دور ایک بڑا اونٹنی پتھر رکھ دیا گیا تھا جو فضل داو سمجھ نہ سکا کہ یہ کیوں رکھا گیا ہے۔ پہاڑی اور جنگلاتی علاقے سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے ہی تاریک ہو جاتے ہیں کیونکہ سورج بڑے پہاڑوں کے پیچھے چلا جاتا ہے۔

شام ہوتے ہی چوترے پر اور چوترے کے سامنے میدان کے چاروں کونوں پر بانس ٹھونک کر ان پر مشعلیں لگا دی گئی تھیں۔ ان پر بندھے ہوئے کپڑوں کو تیل میں بجھایا گیا ہو گا۔ یہ تیل ان کپڑوں کو جلا رہا تھا۔ ایک مشعل اس گول پتھر کے قریب گاڑی گئی تھی جو وہاں رکھا گیا تھا۔ ان کی روشنی اتنی زیادہ تھی کہ رات کو دن بنا دیا گیا تھا۔

نانگے اس کشادہ جگہ کے ارد گرد اکٹھے ہونے لگے تھے اور ان کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ وہ سب آتے اور خاموشی سے بیٹھتے پلے جاتے تھے۔ بعد میں آنے والوں کو جگہ نہ ملی تو وہ بلند جگہوں پر جا بیٹھے اور ان میں سے کچھ درختوں کے مضبوط منہوں پر چڑھ گئے۔ فضل داو سمجھ گیا کہ آج ان کی کوئی خاص تقریب ہے۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔

نکال لی اور مجھے بٹھا کر میرا سر جھکایا اور تلوار میری گردن پر رکھ دی۔ پھر اس نے میرے بال پکڑ کر مجھے اٹھایا اور اس طرح اشارے کئے جیسے میں نے روٹا بند نہ کیا تو یہ مجھے بالوں سے درخت کے ساتھ باندھ دے گا اور مجھے برہمیاں ماری جائیں گی..... تم فرار کی ترکیب سوچو پھر مجھے بتا دینا میں اپنی جان دے دوں گی لیکن ان جنگیلوں میں نہیں رہوں گی۔“

زہرہ خانم نے فضل داو سے کہا کہ سردار کے سامنے غصے کا اظہار نہ کرنا اور چہرے سے یہ ظاہر ہوتا رہے کہ تم نے اس کی غلامی قبول کر لی ہے اور یہاں ہم دونوں خوش ہیں۔

○
فضل داو نے مجھے چھوٹی چھوٹی باتیں بہت سنائی تھیں جو میں نے سنائی شروع کر دیں تو خواہ مخواہ بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ میں آپ کو بڑے واقعات سنانا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ جب فضل داو مجھے یہ باتیں سنا رہا تھا تو کبھی کبھی مجھے شک ہوتا تھا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ فوجیوں میں یہ ایک خصلت پائی جاتی ہے کہ ہارکوں میں تنہائی کی زندگی گزارتے گزارتے کچھ ایسے بور ہونے لگتے ہیں کہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ دل ہلایا جائے۔ اکثر فوجی اپنے عشق و محبت کے من گھڑت قصے سنایا کرتے ہیں۔ مثلاً ”معمولی سا ایک سپاہی سنا تا ہے کہ اس کے گاؤں کے سردار کی بیٹی اس پر مر مٹی تھی۔ پھر وہ اس سے ملاقاتوں کی کمائیاں سنا تا ہے۔ فوجیوں اور دیہاتیوں کے ہاں یہ رواج بھی ہے کہ وہ جب کوئی واقعہ سناتے ہیں تو اس میں زیب و داستان اور مبالغہ ضرور جاتا ہے اور اسے وہ بہت ہی سنسنی خیز بنا دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو من پسند افواہیں بہت اچھی لگتی ہیں پھر ان میں سے ہر ایک بندہ ان افواہوں میں مزید سنسنی خیزی اور اسرار پیدا کر کے آگے سنا تا ہے۔“

میں کبھی کبھی یہ سمجھتا تھا کہ فضل داو پر اس جنگل نے ایسا اثر کیا ہے کہ یہ شخص تصورات کی دنیا میں چلا گیا ہے۔ صحرا میں ایسے ہی ہوتا ہے کہ تھکا ہارا اور پیاس کا مارا مسافر قدم گھسیٹتا جاتا ہے اور اس کا ذہن اسے نخلستان اور پانی کی جھیلیں دکھاتا ہے۔ پھر یہ مسافر اس سراب کے تعاقب میں چلتا ہی رہتا ہے حتیٰ کہ گرنا اور مر جاتا ہے۔ میں یہ سمجھا تھا کہ فضل داو اپنے ذہن کی دنیا کی باتیں سنا رہا ہے لیکن بہت عرصہ بعد جب میں

تھا جس نے اتنی خوبصورت لڑکی پر قبضہ کر لیا تھا۔ فضل داؤ کے غصے میں تہر اور عتاب یہ سوچ کر پیدا ہو گیا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو بالکل پاک اور شفاف رکھا تھا۔

سردار اور زہرہ خانم چوترے پر چڑھ گئے اور وسط میں آکر رک گئے۔ سردار کے ہاتھ میں وہی ڈنڈہ تھا جس پر رنگ دار کپڑے لٹکے ہوئے تھے، اس کے ایک سرے پر پرندوں کے رنگ دار پر اور دوسرے سرے پر چھوٹی گھینٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے یہ ڈنڈہ بلند کیا تو ناگوں کی مترنم گونج ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی نقارے بجنے لگے۔ سردار اور زہرہ خانم بیٹھ گئے۔ پہلے تو نقاروں کی آواز ایک شور جیسی تھی لیکن سردار کے بیٹھتے ہی نقارے ایک تال پر بجنے لگے اور ان کی آواز دھیمی ہو گئی۔ تمام ناگوں نے ایک زبان ہو کر کوئی اور گیت گانا شروع کر دیا۔ کوئی ایک بھی آواز الگ تھلگ یا تال سے ٹوٹی ہوئی نہیں لگتی تھی۔

چند منٹ یہ گیت جاری رہا اور جب ختم ہوا تو سردار نے ڈنڈہ اوپر کر کے کچھ کہا۔ اس کا اشارہ فضل داؤ کی طرف تھا۔ فضل داؤ کے آگے اور پیچھے جو نائگے بیٹھے ہوئے تھے ان سب نے پیچھے فضل داؤ کی طرف دیکھا۔ دوسرے نائگے بھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ چوترے کے قریب کھڑے ناگوں میں سے دو فضل داؤ کی طرف آئے اور اس کے قریب آکر اشارہ کیا کہ وہ ان کے سردار کے پاس چلے۔ فضل داؤ نے سوچا کہ ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو وہ اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اس طرح کھیٹے جس طرح سزائے موت والے قیدی کو پھانسی کے تختے تک لے جایا جاتا ہے۔ انہوں نے احترام سے ذرا جھک کر اسے اشارہ کیا تھا کہ وہ چلے۔ فضل داؤ نے زہرہ خانم کی طرف دیکھا تو زہرہ خانم نے ہاتھ اوپر کر کے اسے اشارہ کیا کہ وہ آجائے۔

فضل داؤ چوترے پر چلا گیا۔ دو ناگوں نے اس کے جوتے اتروائے تھے۔ سردار اٹھا اور فضل داؤ کو بازو سے پکڑ کر دو زانو بٹھادیا۔ پھر اس نے اعلان کرنے کے انداز سے کچھ کہا۔ پھر اس نے اپنے ڈنڈے کا پروں والا سرا پہلے فضل داؤ کے ایک کندھے کے ساتھ اور پھر دوسرے کندھے کے ساتھ لگایا اور پھر یہ سرا کچھ دیر سر کے ساتھ لگا کر رکھا اور کچھ کتابھی رہا۔ اس نے ناگوں کی طرف منہ کر کے پھر کچھ کہا۔ ناگوں نے نعرہ سا لگایا اور تالیاں بجائیں جس کا مطلب صاف تھا کہ وہ سب اپنے سردار کے فیصلے پر بہت خوش ہیں۔ سردار نے فضل داؤ کو زہرہ خانم کے پہلو میں بٹھادیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوا تھا کہ

چار نائگے نقاروں کی طرح کے چار ڈھول یا ڈرم اٹھائے ہوئے آئے اور چوترے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی چھڑیاں تھیں جن سے یہ ڈرم بجائے جاتے تھے۔ کسی نے اعلان کے انداز سے دو تین لفظ بلند آواز سے کہے۔ تمام نائگے جو کھڑے تھے یا بیٹھے تھے، بالکل ہی چپ ہو گئے اور یوں لگا جیسے سب مر گئے ہوں۔ انہوں نے سر جھکا لئے۔ اچانک ایک گونج سی سنائی دی جو بلند ہوتی چلی گئی۔ ان تمام ناگوں نے کوئی گیت گانا شروع کر دیا تھا۔ کسی ایک بھی نائگے کی آواز دوسروں سے الگ تھلگ سنائی نہیں دیتی تھی۔

فضل داؤ نے مجھے اپنے اُس وقت کے تاثرات یوں سنائے کہ اُس نے تو لیاں بھی سنی تھیں اور ایسی تو لیاں سنی تھیں جنہوں نے اس کی جذباتی دنیا میں زلزلے پھا کر دیئے تھے۔ اس نے اپنے ہاں ایک سے ایک سرلی آواز والے گویوں کے گلے سے سنے تھے اور پھر فلمی گلے تو اس نے بہت ہی سنے تھے لیکن ان ناگوں کے گیت کی گونج میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ اس پر غماز سا طاری ہونے لگا اور اس کا وجود اپنے آپ ہی درخت کی نشیوں کی طرح پلنے لگا۔ یہ وجد کی کیفیت تھی جو فضل داؤ پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ اپنے جھونپڑے کے سامنے کھڑا تھا۔ چونکہ وہ جگہ بلند تھی اس لئے سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔

ایک طرف سے سردار زہرہ خانم کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنا سامنے آیا۔ اس کا حلیہ تو وہی تھا جو فضل داؤ نے پہلے دیکھا تھا لیکن زہرہ خانم کو دیکھ کر وہ چونکا۔ زہرہ خانم کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا لیکن اُس کا ستر بے پردہ بھی نہیں تھا۔ اس کی کمر سے ایک ریتی یا کسی پودے کی تیل بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ پھولدار مٹینیاں لٹک رہی تھیں جن سے زہرہ خانم بے پردہ نہیں لگتی تھی۔ اس کے گلے میں ایسے ہی پھولوں کے بے شمار پڑے ہوئے تھے جو آگے کو اور پیٹھ کی طرف بھی لٹک رہے تھے۔ ان ہاروں نے زہرہ خانم کا سینہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے بازو ننگے تھے اور اس کے پالوں کا جوڑا بنا ہوا تھا جو سکھوں کی طرح سر کے پیچھے نہیں بلکہ سر کے اوپر تھا۔ اس کے سر کے ارد گرد بھی پھولوں کے ہار لپٹے ہوئے تھے۔

فضل داؤ نے مجھے کہا کہ زہرہ خانم خاصی خوبصورت لڑکی تھی لیکن پھولوں کے اس لباس میں تو وہ پہلے سے بہت ہی زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اُسے غصہ اس سردار پر آ رہا

فضل داد کو بھی سردار نے زہرہ خانم کی طرح اونچا درجہ دے دیا تھا۔ فضل داد کو خیال آیا کہ ان لوگوں نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے اور اب سردار اسے کسے گا کہ یہ کپڑے اتار دو اور ٹانگوں کے ساتھ نانگے بن جاؤ۔

فضل داد کا دماغ ایک بار پھر فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا لیکن جب اس نے ٹانگوں کے اس جھوم کو دیکھا تو وہ ڈر گیا۔ زیادہ تر ٹانگوں نے برچھیاں اٹھا رکھی تھیں اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے کندھوں کے ساتھ کمائیں اور پیٹھ پیچھے تیروں کی ترکیبیں لگا رکھی تھیں۔ فضل داد نہتہ تھا۔ اس کے پاس ایک چاقو تھا جو اس کے جھولے میں پڑا ہوا تھا اور جھولانہ ٹانگوں نے لے لیا تھا۔

میں کھوپڑیوں کا ذکر بھول گیا ہوں۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ان لوگوں میں انسانی کھوپڑی کو خصوصی اہمیت تھی۔ جس چوڑے پر سردار، زہرہ خانم اور فضل داد بیٹھے تھے، اس چوڑے کے چاروں کونوں پر سلیقے سے کھوپڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو کھوپڑیاں سردار اور زہرہ خانم کے آگے رکھی گئی تھیں۔ جب فضل داد کو زہرہ خانم کے پہلو میں بٹھایا گیا تو ایک ٹانگا ایک اور کھوپڑی اٹھا کر لایا اور فضل داد کے آگے رکھ کر چلا گیا۔

اس کے بعد دو عورتوں اور دو مردوں نے مل کر ڈانس کیا۔ یہ ڈانس ان کا کوئی اپنا ہی تھا۔ ان کے جسموں کی حرکات کچھ ایسی تھیں جیسے وہ ان حرکات سے کوئی بات سمجھا رہے ہوں۔ اس ڈانس میں کوئی عجیب سا تاثر تھا جو فضل داد نے خاص طور پر محسوس کیا۔

میں نے فضل داد سے پوچھا کہ وہاں مرد بھی ننگے اور عورتیں بھی تنگی تھیں تو ان کا آپس میں رویہ کیا تھا۔ فضل داد نے کہا کہ وہ خود حیران ہے کہ بالکل ننگے ہونے کے باوجود کوئی مرد کسی عورت کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ان لوگوں میں ڈسپلن ہے اور اس طرح کی بدی نہیں جو ہمارے مذہب معاشرے میں دیکھنے میں آتی ہے۔

یہ ڈانس ختم ہوا تو دونوں مرد اور دونوں عورتیں اپنی اپنی جگہ چلے گئے اور اس کے فوراً بعد بارہ تیرہ آدمی ایک صف میں کھڑے ہو گئے اور ان کے سامنے بارہ تیرہ عورتیں اسی طرح صف میں آن کھڑی ہوئیں۔ یہ سب نوجوان اور جوان عورتیں تھیں۔ انہوں نے نقاروں کی تھاپ پر ڈانس بھی کیا اور کوئی گیت بھی گایا۔ وہ آہستہ آہستہ صفوں میں

ایک دوسرے کے قریب آتے اور اسی طرح داہیں ہو جاتے تھے۔ پھر یہ ناچتے ناچتے ایک دائرے میں ہو گئے اور پھر ایک مرد اور ایک عورت الگ الگ ہو کر ایک ہی تھاپ پر ایک ہی قسم کا ڈانس کرتے کرتے پھر الگ ہو گئے اور پہلے کی طرح صفوں میں جا کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر بعد یہ ناچ گانا بھی ختم ہو گیا۔

○

سردار نے جو آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، اپنا دو فٹ لمبا ڈنڈہ بلند کر کے ہلایا اور کوئی حکم دیا یا اعلان کیا۔ تمام نانگے ایک طرف دیکھنے لگے۔ اس طرف سے تین نانگے ایک جواں سال آدمی کو لارہے تھے۔ اس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ چل نہیں رہا تھا بلکہ اسے چلایا جا رہا تھا۔ اس آدمی کے چہرے کے نقوش آسمانوں جیسے تھے یا وہ بری تھا۔ اس کا رنگ سفیدی مائل پیلا تھا وہ بالکل برہنہ تھا۔

اسے اس گول پتھر کے قریب لے جا کر کھڑا کر دیا گیا جو اس جگہ وسط میں رکھا گیا تھا۔ اس وقت فضل داد نے دیکھا کہ اس کے ساتھ جو نانگے تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چوڑے پھل والی تلوار تھی۔ وہ اس آدمی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس آدمی کو شاید کچھ پلا دیا گیا کیونکہ اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور وہ کچھ بھی نہیں بولتا تھا۔ اسے دو ٹانگوں نے کندھوں سے نیچے کو دبایا تو وہ زمین پر دو زانو بیٹھ گیا۔

سردار اٹھا اور چوڑے سے اتر کر اس آدمی کے پاس جا رک۔ ایک ٹانگا ہاتھ میں ایک پیالہ لئے دوڑا آیا اور پیالہ دونوں ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے سردار کے آگے کر دیا۔ سردار نے اس پیالے میں اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں ڈبوئیں اور باہر نکال کر پانی سا اس آدمی کی پیٹھ پر چھڑک دیا۔ سردار نے اپنا ڈنڈہ درمیان سے پکڑا اور بازو لمبا کر کے ڈنڈہ اس آدمی کے جسم سے ذرا اوپر رکھا۔ سردار نے آسمان کی طرف رخ کر کے بڑی بلند آواز میں کچھ کہا اور پھر اس کا ڈنڈے والا ہاتھ بڑی زور سے کانپنے لگا جس طرح مداری ڈگڈگی بجایا کرتا ہے۔ اس حرکت کے مطابق ڈنڈہ بھی ڈگڈگی جیسی حرکت کرنے لگا۔ سردار اس آدمی کے چاروں طرف گھومنے لگا اور پھر سردار کا سارا جسم زور زور سے کانپنے لگا اور یوں لگتا تھا جیسے سردار دماغی توازن کھو بیٹھا ہو یا اسے کوئی دورہ پڑ گیا ہو۔ سردار کا جسم اتنی زور زور سے تھرکنے لگا کہ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اعضاء جسم سے الگ ہو کر بکھر جائیں گے۔

جب وہ اور زیادہ جوش میں آیا تو اس کے تھرکنے کی نال پر تھارے بچنے لگے اور باقی ناگوں نے اسی نال پر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ پھر سردار آہستہ آہستہ نارمل حالت میں آنے کی بجائے یلگت رک گیا جیسے سوچ آف کر دیا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی تھارے خاموش ہو گئے اور ناگوں کی تالیاں بھی بند ہو گئیں۔ سردار آہستہ آہستہ چلتا اور کچھ بدبوتا پھر چوترے پر چلا گیا اور ڈنڈے سے اشارہ کر کے بیٹھ گیا۔

ایک ناگنا دوڑا آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا بہت بڑا پرات نما برتن تھا جو اس نے پتر کے آگے رکھ دیا۔ دو ناگوں نے قیدی کو پکڑ کر پتر کے قریب اس طرح کیا کہ اس کا سر پتر کے ذرا آگے تھا اور گردن پتر پر تھی۔ تلواری والا ناگنا اس کے بائیں پہلو پر آیا اور ایک ہی وار میں اس نے قیدی کا سر جسم سے الگ کر دیا۔ سر برتن میں جا پڑا۔ ایک ٹانگے نے سر فوراً اٹھالیا اور دوسروں نے اس بد قسمت آدمی کا باقی دھڑاٹھا کر اس طرح آگے کر دیا کہ اس کا سارا خون پرات میں گرے لگا۔ زہرہ خانم یہ ہولناک منظر دیکھ رہی تھی۔ جب قیدی کی گردن کٹ گئی تو زہرہ خانم نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر ہلکی سی چیخ ماری۔ فضل داو نے اپنا ایک بازو اس کے کندھوں پر رکھا پھر اس کی پیٹھ پر تھکی دے کر کہا کہ حوصلہ قائم رکھو۔ سردار نے زہرہ خانم کو اس خوفزدگی کی حالت میں دیکھا تو اس نے بھی زہرہ خانم کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔ ادھر ناگوں نے وہ شور و غل بپا کیا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

قیدی کے خون سے مٹی کا برتن بھرتا جا رہا تھا۔ دو ٹانگے اس کی پیٹھ کو کمر سے لے کر کندھوں تک یوں دبا رہے تھے جیسے ماش کی جاتی ہے۔ اس سے قیدی کے جسم کا خون باہر آ رہا تھا۔ پھر انہوں نے اس کی ٹانگیں بھی دبائیں اور بازو بھی۔

آخر خون نکلنے کی بجائے وہیں نینے لگا جہاں سے گردن کٹی تھی۔ دو ناگوں نے برتن اٹھایا اور چوترے پر جا کر سردار کے آگے رکھ دیا۔ سردار نے اس خون میں اپنی انگلی ذرا سی ڈبوئی اور اپنے ماتھے پر لگائی۔ اس نے وہی انگلی پھر خون میں ڈبو کر زہرہ خانم کے ماتھے پر لگائی اور پھر وہی انگلی حوالدار فضل داو کے ماتھے پر لگا دی۔

خون والا برتن وہاں سے اٹھالیا گیا اور چار پانچ ٹانگے ایک مٹکا اٹھائے ہوئے میدان میں آئے اور وہاں رکھ دیا۔ ایسا ہی ایک اور مٹکا آگیا۔ ناگوں نے برتن والا خون دونوں مٹکوں میں آدھا آدھا ڈال دیا اور پھر دو مٹکوں نے اپنی برہمیاں مٹکوں میں ڈال کر زور

زور سے ہلائیں۔ مٹکوں میں شاید پانی تھا یا نہ جانے کیا چیز تھی جس میں یہ ٹانگے خون ملا رہے تھے۔ مٹکے بہت بڑے بڑے تھے۔ سردار نے اپنا ڈنڈہ ہوا میں بلند کر کے کچھ کہا تو ناگوں کے جھوم میں بھگدڑ مچ گئی۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے ان کا مجمع منتشر ہو رہا ہے لیکن وہ پیچھے کو اور ادھر ادھر دوڑ کر کچھ دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر وہ اسی ہلپلازی کی حالت میں رہے اور جب وہ پُر سکون ہوئے تو کسی کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ، کسی کے ہاتھ میں ٹین کا گول ڈبہ اور کسی کے ہاتھ میں مگ تھا۔ وہ ایک قطار میں مٹکوں کے قریب سے گزرنے لگے۔ ایک ناگنا ہر ایک کے برتن میں پانی سامٹکوں میں سے نکال نکال کر ڈال رہا تھا۔ اس دوران سردار نے اپنا ایک بازو زہرہ خانم کی کمر میں ڈال دیا اور اسے اپنے قریب کر لیا۔ فضل داو جو سمجھا وہ یہ تھا کہ یہ سردار نے زہرہ خانم کے ساتھ شادی کی تھی۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ سردار نے زہرہ خانم کو بیوی بنالیا تھا۔

○

تمام ٹانگے اپنی اپنی جگہ پر جا چکے تھے اور وہ مٹکوں میں سے وہ پانی سا پی رہے تھے جس میں ایک انسان کا خون ملایا گیا تھا۔ ایک ناگنا ایک پیالہ اٹھائے چوترے پر آیا اور سردار کے آگے پیش کیا۔ سردار نے فضل داو کی طرف اشارہ کیا۔ پیالہ فضل داو کے آگے گیا تو فضل داو نے جھک کر دیکھا۔ پیالے میں بد رنگ سا پانی تھا جس سے ناقابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی۔ یہ بدبو خون کی نہیں تھی۔ یہ ان کی اپنی تیار کی ہوئی شراب تھی۔ فضل داو شراب کی بو سے واقف تھا۔ فضل داو نے نفی میں سر ہلا کر بتایا کہ وہ نہیں پیئے گا۔ سردار نے زہرہ خانم کو یہ شراب پیش نہ کی خود پی۔

میدان خالی ہو چکا تھا۔ ٹانگے ارو گرد بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ بے سر لاش پتر کے قریب پڑی تھی۔ سردار کے اشارے پر دو ٹانگے لاش کے قریب گئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھریاں تھیں۔ انہوں نے لاش کا پیٹ چاک کیا پھر پیلوں کے نیچے سے پیٹ میں چھریاں مار کر پورا پیٹ کھول دیا۔ ایک ٹانگے نے لاش کے سینے میں ہاتھ ڈالا اور کھینچا تو اس کے ہاتھ میں لاش کا دل اور کیچڑی تھی۔

اس نے یہ دل اور کیچڑی سردار کو پیش کی۔ سردار نے سر سے اشارہ کیا تو کیچڑی اور دل ایک ٹانگے لے گیا۔ پھر چھریوں سے لاش کے اعضاء الگ کئے گئے۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے قریانی کا بکرا ذبح کر کے کاٹا جا رہا ہو۔ انہوں نے بازو کے دو ٹکڑے کئے۔ اسی طرح دو دو

کڑے ناگوں کے بھی کئے اور چار پانچ نانگے یہ سارے اعضاء اٹھا کر لے گئے۔ صاف۔
ظاہر تھا کہ جنہوں نے انسانی خون شراب میں پیا تھا وہ یہ گوشت بھی کھائیں گے۔ سردار
بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

”خدا کے لئے مجھے یہاں سے جلدی نکالو“ — زہرہ خانم نے سرگوشی میں فضل داو
سے کہا۔

”میں آج ہی کوشش کروں گا“ — فضل داو نے کہا — ”تم یہ خیال رکھنا کہ
سردار کے جھونپڑے کا دروازہ اندر سے پکا بند نہ ہو۔ اگر اس جنگلی نے دروازہ اندر سے
بند کر دیا تو تم کسی بہانے، کسی طرح دروازہ کھول دینا۔“

یہ شراب بہت ہی تیز معلوم ہوتی تھی۔ نانگے بھکنے لگے تھے اور بعض نے قمقمے
لگانے شروع کر دیئے تھے۔ بعض نے ہل بازی بھی کی لیکن وہ وہیں گرتے جا رہے تھے۔
بعض اٹھ کر چل پڑے لیکن ان سے ٹھیک طرح چلا نہیں جاتا تھا۔ کچھ تو میدان میں ہی
گر پڑے تھے اور اٹھ نہ سکے۔

عورتوں نے بھی شراب پی تھی۔ ان کی حالت بھی مردوں جیسی ہو گئی تھی۔ بعض
عورتوں نے لڑکھاتی زبان سے گانا بھی گایا تھا لیکن چند قدم چل کر گریں اور وہیں پڑی رہ
گئیں۔ اتنے زیادہ نشے کے باوجود کوئی نانگا آدمی کسی عورت کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا
تھا۔ نشے میں انسان ہر قسم کی گھنیا حرکت کر گزرتا ہے اور گناہ بھی کرتا ہے لیکن ان
وحشیوں کے ہاں عورت کے معاملے میں اتنا اچھا اخلاق پایا جاتا تھا کہ کسی نے کسی عورت
کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

بہت دیر بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ بہت سے نانگے بے سندھ پڑے تھے اور جو چلے
گئے تھے وہ معلوم نہیں اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ بھی سکے تھے یا نہیں۔

آخر سردار اٹھا زہرہ خانم اور فضل داو کو بھی اٹھایا۔ اس نے ڈنڈے کا سرا فضل داو
کے سینے سے لگا کر ڈنڈے کا اشارہ اس کے جھونپڑے کی طرف کیا اور کچھ کہا جس کا
مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ تم اپنے جھونپڑے میں چلے جاؤ۔ پھر سردار نے زہرہ خانم کو
اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ وہ جب اس تقریب میں آئے تھے تو زہرہ خانم سردار کے ساتھ
چلتی آئی تھی لیکن اب سردار نے اسے بازوؤں پر اٹھالیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب
زہرہ خانم اس کی بیوی تھی۔

فضل داو کے لئے یہ منظر ناقابل برداشت تھا کہ زہرہ خانم کو ایک جنگلی اٹھا کر لے جا
رہا تھا لیکن اُس نے دل پر پتھر رکھ کر برداشت کیا اور اپنے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔
فضل داو نے دیکھا کہ جب سردار نشے میں مدہوش ناگوں میں سے گزر کر ذرا اوپر گیا تو کم
و بیش بیس نانگے کہیں سے نکلے، اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ یہ غالباً اس کے باڈی
گارڈ تھے اور انہوں نے یقیناً ”شراب نہیں پی تھی کیونکہ اپنے سردار کی حفاظت ان کی
ذمہ داری تھی۔“

فضل داو رک گیا اور انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے جگہ بدل کر دیکھا کہ
سردار بلندی چڑھتا چڑھتا اپنے جھونپڑے تک گیا۔ مشعلوں کی روشنی وہاں تک پہنچ رہی
تھی۔ سردار زہرہ خانم کو اٹھائے اندر چلا گیا۔ اس کے باڈی گارڈ وہاں سے ایک طرف
چلے گئے اور ایک آدمی جس کے پاس برچھی تھی، دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ فضل داو
نے سوچا کہ ان لوگوں کی موجودگی اور بیداری میں زہرہ خانم کو اغوا کرنا آسان نہیں ہو
گا۔

○

فضل داو اپنے جھونپڑے میں چلا تو گیا لیکن وہ اس قدر بے چینی اور بے قراری
محسوس کر رہا تھا کہ جھونپڑے میں اس سے ٹکا نہیں جا رہا تھا۔ ایک نانگا اس کے لئے کھانا
لایا۔ رات آدھی گزر گئی تھی۔ بھوک کی شدت کو وہ محسوس کر رہا تھا لیکن کھانے کو اس
کا جی نہیں چاہتا تھا اس نے یہ نہ دیکھا کہ کھانا کیا ہے۔ حلال ہے یا حرام۔ نہ چاہتے ہوئے
بھی جو کچھ بھی تھا اس نے جلدی جلدی کھالیا۔

اس نے دیکھا کہ یہ نانگا پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ وہ اس نانگے سے پوچھنا
چاہتا تھا کہ اس نے شراب کیوں نہیں پی لیکن اشاروں کے باوجود وہ نانگا کچھ بھی نہ سمجھ
سکا۔ وہ صرف ہنستا رہا۔ ویسے بھی یہ نانگا بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ وہ اپنے سردار کے
جھونپڑے کی طرف اشارے کر کر کے کچھ کہہ رہا تھا اور ہاتھوں کے اشارے بھی کرتا
تھا۔ ہاتھوں کے اشاروں سے جب اس نے عورت کا تصویر پیدا کیا تو فضل داو سمجھ گیا کہ
یہ اسے بتا رہا ہے کہ اس کے سردار کی شادی ہو گئی ہے اور اب سردار موج میلہ کرتا ہو
گا۔

یہ نانگا چلا گیا تو فضل داو کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ یہاں باڈی گارڈوں کے علاوہ

بھی کچھ لوگ ہوش میں ہیں۔ پہلے تو وہ خوش تھا کہ تمام نانگے شراب پی کر بے ہوشی کی نیند سو رہے ہیں۔ بہر حال اس نے پکارا وہ کر لیا کہ آج وہ زہرہ خانم کو سردار سے آزاد کرا لی لے گا۔ وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اُن دنوں چاند آدھی رات کے بعد اوپر آتا تھا۔ چاند ابھی ساتھ والی پہاڑی کے پیچھے تھا لیکن کچھ کچھ روشنی آ رہی تھی۔ فضل داو سردار کے جھونپڑے کی طرف چل پڑا لیکن وہ میڑھیاں نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان میڑھیوں سے وہ اوپر گیا تو سردار کے جھونپڑے کا سنتری اسے دیکھ لے گا۔ اس نے سردار کے جھونپڑے کو اچھی طرح دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پیچھے کی طرف سے بھی آیا جاسکتا ہے حالانکہ اوہر سے راستہ ہموار نہیں تھا۔ پہلے نیچے جانا تھا پھر پیچھے جا کر پہاڑی کے اوپر چڑھنا تھا پھر کہیں جا کر وہ جھونپڑے کے پچھواڑے پہنچ سکتا تھا۔

وہ دبے پاؤں چلتا گیا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ سردار کے باڑی گارڈ کہاں رہتے ہیں۔ وہ ایک طرف کو نیچے گیا اور ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چلتا آگے بڑھتا گیا۔ اسے درختوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ پاؤں پھسلنے کا خطرہ موجود تھا۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا اور اس نے اندازہ کیا کہ وہ جھونپڑے سے آگے نکل آیا ہے۔ ایک جگہ سے وہ اوپر چڑھنے لگا۔ وہاں ڈھلوان زیادہ سیدھی تھی۔ ایک بار اس کا پاؤں پھسلا لیکن ایک جھاڑی نے اسے روک لیا اور اس نے ساتھ والے درخت کا تان پکڑ لیا۔

وہ کمانڈو تھا۔ اٹھا اور درختوں کا سہارا لے کر اوپر چلا گیا۔ اتنے میں چاند پہاڑی کے اوپر آگیا تھا۔ وہاں درخت زیادہ تھے اس لئے چاندنی درختوں میں سے ہو کر آتی تھی جو فضل داو کے لئے فائدہ مند تھی۔ اس کے لئے پوری طرح چاندنی میں آ جانا خطرناک تھا۔ وہ اوپر گیا اور بائیں طرف دیکھا۔ پچیس تیس قدم دور ڈھلان کے نیچے اسے سردار کا جھونپڑا نظر آ رہا تھا اور صاف دکھائی دیتا تھا کہ جھونپڑے کے اندر روشنی ہے۔ وہ قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا یہ ڈھلوان اتر گیا اور جھونپڑے کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ اس نے جھونپڑے کے ایک کونے سے ایک آنکھ آگے کر کے دیکھا۔ اسے سنتری نظر نہ آیا۔ اس نے فوراً پیچھے دیکھا کیونکہ اسے خیال آگیا تھا کہ سنتری جھونپڑے کے ارد گرد چکر بھی لگاتا ہے، کہیں پیچھے سے ہی نہ آجائے۔

اسے جھونپڑے کے دوسرے پہلو کی طرف سے ہلکے ہلکے قدموں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ سنتری اوہر سے آ رہا ہے۔ بائیں طرف ایک موٹے

تتے والا درخت تھا۔ فضل داو دبے پاؤں اس تتے کے پیچھے ہو گیا۔ اب وہ سنتری کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ سنتری جھونپڑے کے پچھواڑے آیا اور آہستہ آہستہ چلتا پہلو کی دیوار کے ساتھ ہو لیا۔ فضل داو میں اور سنتری میں تین چار قدموں کا فاصلہ تھا۔ سنتری دیوار سے ہٹ کر اسی درخت کے قریب آگیا جس کے پیچھے فضل داو چھپا ہوا تھا۔ سنتری کے پاس بانس کی برچھی تھی۔ سنتری ایک دو قدم آگے یعنی جھونپڑے کے سامنے جانے کے لئے چلا۔ فضل داو اس پر اس قدر تیزی سے چھٹا کہ سنتری کو پتہ ہی نہ چلا کہ یہ کون ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

فضل داو نے اپنا ایک بازو سنتری کے گلے میں اس طرح ڈال لیا تھا کہ اس کی شہ رگ دب گئی تھی۔ سنتری کی آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ فضل داو نے بازو کا ٹکنبہ اور سخت کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ میں زور زور سے ٹکے مارنے شروع کر دیے۔ فوجیوں کو بغیر ہتھیار کے لڑائی کی جو ٹریننگ دی گئی تھی، اس میں یہ داؤ خاص طور پر سکھایا گیا تھا۔ اس نانگے نے اب دم گھٹنے سے مرنا تھا۔ اس نے تڑپنے کے انداز سے نانگیں ماریں اور پھر اس کا جسم بے حرکت ہو گیا۔ فضل داو نے اس کی نبض پر انگلیاں رکھیں۔ وہ مر چکا تھا۔ اس نے نانگے کو چھوڑ دیا اور اس کی برچھی اٹھالی۔

وہ دبے پاؤں جھونپڑے کے دروازے تک گیا اور دروازے پر ہاتھ رکھا۔ نہایت آہستہ سے دروازے کو دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ جھونپڑے میں ایک دیا جل رہا تھا۔ فضل داو نے اندر جو منظر دیکھا اس نے اسے باؤلا کر دیا۔ سردار کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی اور زہرہ خانم کو اس نے اپنے نیچے گرا رکھا تھا۔ زہرہ تڑپ رہی تھی اور اس کے نیچے سے ننگے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس جنگلی کو خاوند کی حیثیت سے قبول نہیں کر رہی تھی۔ جنگلی سردار اس قدر بدست تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ موت اس کے پیچھے صرف دو قدموں تک آن پہنچی ہے۔

فضل داو نے پوری طاقت سے برچھی اس کی پیٹھ میں اتار دی۔ سردار کے منہ سے بڑی لمبی بابا باکی آواز نکلی اور وہ اٹھنے لگا۔ فضل داو نے برچھی اس کی پیٹھ سے نکالی کہ پاؤں اس کی پیٹھ پر رکھا اور برچھی کھینچی۔ زہرہ خانم بڑی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سردار پیٹھ کے بل گرا۔ فضل داو نے پہلے کی طرح پورے زور سے اس کے سینے

میں برچھی ماری جو پسلیاں توڑتی ہوئی دور تک اندر چلی گئی۔ فضل داو نے اس کے پیٹ پر کھڑے ہو کر برچھی نکالی اور زہرہ خانم سے کہا کہ اب رکتا نہیں۔ اس نے زہرہ خانم کا بازو پکڑا اور اسے ساتھ لے کر جھوپڑے سے نکل گیا۔

فضل داو کو راستے کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ ایک طرف اترنے لگا۔ خاصی دور نیچے اترے تو اوپر اسے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے نانگے بیدار ہو کر اپنے سردار کے جھوپڑے میں پہنچ گئے ہوں۔ سردار کے منہ سے بڑی بلند آواز نکلی تھی جو اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ اس کے محافظ اس آواز پر جاگ اٹھے ہوں گے۔

پہاڑی سے اتر کر وہ ایک طرف کو دوڑ پڑے۔ ایک جگہ پہاڑ کٹا ہوا تھا۔ وہاں سے وہ مڑے اور آگے چلے گئے۔ یہ جگہ ذرا کشادہ تھی لیکن اس میں جھاڑیاں اور کم بلند درخت ذرا زیادہ تھے جن میں سے تیزی سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔ فضل داو نے فوجی چہل پہن رکھے تھے لیکن زہرہ خانم ننگے پاؤں تھی۔ اُسے کانٹے بھی چبھ رہے تھے لیکن جان بڑی پیاری چیز ہے اس لئے وہ فضل داو کی رفتار کا ساتھ دے رہی تھی۔

اس سے آگے ٹیکریوں کی بھول بھلیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں وہی خطرہ تھا جس میں سے بھی کبھی گزرا تھا۔ فضل داو دماغ کو حاضر رکھ کر بھاگا جا رہا تھا۔ وہاں سے نکلے تو آگے پھر ایک پہاڑی آگئی جس کے ساتھ ساتھ وہ دوڑنے لگے۔

”زہرہ!“ — فضل داو نے تیز چلتے ہوئے زہرہ خانم سے کہا — ”اگر تم ننگے پاؤں نہیں چل سکتیں تو میں تمہیں اٹھا لیتا ہوں۔“

”نہیں!“ — زہرہ خانم نے جواب دیا — ”میری فکر نہ کرو، چلتے چلو۔ میرے پاؤں اگر چھلنی ہو گئے تو بھی پرواہ نہیں کروں گی۔ جان بھی دے دوں گی لیکن اپنی عزت پر کسی کو ہاتھ نہیں ڈالنے دوں گی۔ تم بڑے ٹھیک وقت پر اس جنگلی کے جھوپڑے میں پہنچ گئے تھے۔“

اگر علاقہ میدانی اور ہموار ہوتا تو دونوں اتنی تیز دوڑ سکتے تھے کہ اس وقت تک بہت دور پہنچ چکے ہوتے۔ فضل داو کو خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ نانگے اس دشوار گزار علاقے سے اچھی طرح واقف تھے اور فضل داو کو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس سمت میں جا رہا ہے اور کہیں ایسا تو نہیں کہ گھوم پھر کر اور موڑ مڑتے مڑتے وہ واپس ہی چلا جا رہا ہو..... وہ دوڑنے کی رفتار سے چلتا گیا اور زہرہ خانم اس کا بڑا ٹھیک ساتھ دے رہی تھی۔ چاند

اوپر آگیا تھا۔ جنگل کی فضا نمی کی وجہ سے بالکل صاف ہوتی ہے، ذرا سا بھی گرد و غبار نہیں ہوتا۔ اس لئے چاندنی پوری طرح شفاف ہوتی ہے۔ دونوں بھاگے چلے گئے۔ دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ فضل داو کو اس برچھی کا بھروسہ تھا جس سے اس نے سردار کو قتل کیا تھا وہ برچھی ساتھ لے آیا تھا۔

فضل داو کے اندازے کے مطابق ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ اسے نانگوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ نانگے قریب پہنچ رہے تھے۔ وہ کچھ اور دوڑ گئے تو ایک سیدھی کھڑی چٹان نے ان کا راستہ روک لیا۔ وہ دائیں بائیں کوئی راستہ دیکھنے لگے۔ آخر انہیں ایک راستہ نظر آگیا۔ فضل داو نے زہرہ خانم کو بازو سے پکڑا اور اسے آگے کیا کہ پہلے وہ اس تنگ سے راستے میں سے گزر جائے لیکن زہرہ خانم پیچھے ہو گئی اور فضل داو کو آگے کیا۔ وہ اس کے پیچھے رہنا ہی شاید محفوظ سمجھتی تھی۔

وہ راستہ قدرتی طور پر چٹان کے درمیان سے بنا ہوا تھا۔ دو آدمی پہلو پہلو اس میں سے گزر سکتے تھے۔ جو نبی فضل داو اس راستے میں داخل ہوا اسے اپنے پیچھے ہلکی سی دھمک سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی زہرہ خانم کے منہ سے ہائے یا آہ جیسی آواز نکلی۔ فضل داو نے رک کر پیچھے دیکھا۔ زہرہ خانم چٹان کے ساتھ گر پڑی تھی اور ایک برچھی اس کی پیٹھ میں اتری ہوئی تھی۔ فضل داو نے برچھی نکال دی اور دیکھا کہ یہ کم و بیش چار انچ زہرہ خانم کے پیچھڑوں میں اتر گئی تھی۔ اب اس لڑکی کا زندہ رہنا ممکن نہیں تھا۔

فضل داو نے وہ برچھی وہیں پھینکی اور وہاں سے بھاگ اٹھا۔ اسے یقین تھا کہ نانگوں کو زہرہ خانم کی لاش ہی ملے گی۔ اب چونکہ فضل داو اکیلا تھا اس لئے اسے بھاگنے دوڑنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ پہلے وہ کچھ دور جا کر رکتا اور زہرہ خانم کو ساتھ لیتا اور آگے چلتا تھا۔

اب وہ تیز دوڑنے لگا لیکن وہ جگہ تیز دوڑنے نہیں دیتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے درخت تھے، گھنی جھاڑیاں تھیں اور کہیں کھڈ آ جاتا اور کہیں چھوٹی بڑی کوئی ٹیکری راستہ روک لیتی تھی۔ فضل داو دو تین مرتبہ گرا بھی لیکن اٹھ کھڑا ہوا اور پھر دوڑ پڑا۔

وہ اتنا محسوس کر رہا تھا کہ زمین نیچے کو جا رہی ہے۔ وہ بلندی سے اتر رہا تھا۔ اسے نانگوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان سے اس نے نہ جانے کیسے اندازہ کیا کہ نانگے بکھر گئے ہیں۔ وہ تھک گیا تھا۔ ایک جگہ ایک ٹیکری کے ساتھ بڑی گھنی جھاڑیاں تھیں۔

فضل دادوان کے اندر جا کر چُھپ گیا۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ اس کے تعاقب میں آنے والے آگے نکل جائیں گے تو وہ کسی اور سمت میں چلا جائے گا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دو ٹانگے انہی جھاڑیوں کے قریب آ کر رک گئے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ وہ بھی تعاقب میں تھک گئے تھے۔ فضل دادو یہ نہ دیکھ سکا کہ ان کے پاس ہتھیار کیا ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ بمبھیاں ہی ہوں گی۔ وہ ٹانگے وہاں سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ فضل دادو کو یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ یہ دونوں جھاڑیوں کے اس طرف نہ آجائیں جہاں وہ چھپا بیٹھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ اسے چاندنی میں دونوں ٹانگے اپنی طرف پشت کئے بیٹھے نظر آئے۔

اُس نے ایک ٹانگے کی پیٹھ میں اسی طرح اور طاقت سے برچھی ماری جس طرح اس نے ان کے سردار کو ماری تھی۔ وہ ٹانگا برچھی کھا کر اٹھ نہ سکا لیکن دوسرا اٹھ کر ذرا پرے ہو گیا۔ تب فضل دادو نے دیکھا کہ اس ٹانگے کے ہاتھ میں چوڑے بلیڈ والی لمبی تلوار تھی۔ اب فضل دادو بھاگ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اسے وہاں سے نکلنے کے راستے کا پتہ ہی نہیں تھا اور وہ چُھپ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ جھاڑیوں میں سے سامنے آ گیا۔

فضل دادو جب مجھے یہ واقعہ سنا رہا تھا تو اس نے حیرت کا اظہار کیا کہ اس ٹانگے نے اپنے ساتھیوں کو کیوں نہیں پکارا تھا۔ اسے شاید یقین تھا کہ وہ فضل دادو کو مارے گا۔ اس نے تلوار لہرائی اور ادھر سے فضل دادو نے جب لگا کر اس پر برچھی کا وار کیا۔ ٹانگے نے نہ صرف یہ کہ آگے سے پھرتی سے ہٹ کر وار خطا کر دیا بلکہ تلوار چلا کر اس نے فضل دادو کی بانس کی برچھی کو درمیان میں سے کاٹ ڈالا۔ برچھی کا اگلا حصہ پچھلے حصے کے ساتھ لٹک گیا۔ فضل دادو نے اگلے حصے کو گرنے سے پہلے پکڑ لیا اور پچھلا حصہ الگ توڑ پھینک دیا۔ اب ٹانگا اس پر وار کرنے کے لئے پینترے بدلنے لگا۔ فضل دادو برچھی پر تلوار کے وار نہیں لے سکتا تھا کیونکہ برچھی کمزور تھی اور تلوار نے اس باقی نصف برچھی کو بھی کاٹ دیا تھا۔

ٹانگے نے بڑھ کر وار کیا جو فضل دادو بچا گیا۔ دوسری بار ٹانگے نے پھر وار کیا تو فضل دادو بڑی پھرتی سے ایک طرف ہوا۔ اس نے نہ صرف وار بچایا بلکہ برچھی ٹانگے کو ماری لیکن یہ چھوٹا سا ٹکڑا تھا جو ٹانگے کو لگا تو سہی لیکن کارگر وار نہ ہو سکا۔ ٹانگا ویسے ہی تیز اور پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ فضل دادو کو معلوم تھا کہ جن جھاڑیوں کے پیچھے وہ چھپا ہوا تھا وہ

جھاڑیاں ذرا اگے کھڑے کھڑے تھیں۔ اس نے یہ کوشش شروع کر دی کہ ٹانگے کو ان جھاڑیوں کے پاس لے چلے تاکہ وہ اس کھڑے میں گر پڑے۔ وہ گرتا تو فضل دادو اُس پر برچھی کا بڑا ہی کاری وار کر سکتا تھا۔

ٹانگے نے بڑی تیزی سے تلوار گھمانی شروع کر دی جس سے فضل دادو گھبرا گیا۔ اس نے حوصلہ قائم رکھا اور ٹانگے سے دور ہی دور رہا۔ ایک بار وہ اس کے قریب ہوا تو ٹانگے کی تلوار فضل دادو کے بازو کو تھوڑا زخمی کر گئی لیکن فضل دادو اس زخم کی پرواہ کرنے والا نہیں تھا۔ تلوار نے پٹھ کاٹا تھا۔ فضل دادو ایسے پینترے بدلنے لگا جن سے اس کا مقصد یہ تھا کہ ٹانگا جھاڑیوں کے قریب ہو جائے۔

آخر فضل دادو کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ ٹانگے کی پیٹھ ان جھاڑیوں کی طرف تھی۔ فضل دادو نے ایک پتھر اٹھالیا جو کم و بیش ڈیڑھ کلو وزن تھا۔ اس سے ٹانگا کچھ گھبرایا۔ فضل دادو نے پوری طاقت سے پتھر ٹانگے کو مارا۔ ٹانگا آگے سے ہٹ گیا لیکن پتھر اس کے بائیں کندھے پر لگا۔ ٹانگا تیزی سے پیچھے ہٹا اور اس کھڑے میں گر پڑا جس میں جھاڑیاں تھیں۔ وہ پیٹھ کے بل گر اٹھا۔ کھڑ ڈیڑھ پونے دو فٹ ہی گمراہ تھا۔ جو نہی ٹانگا اس میں گرا، فضل دادو نے برچھی تان کر پوری طاقت سے ٹانگے کے پیٹھ میں اتار دی۔ ٹانگے نے تلوار گھما کر ماری جو فضل دادو کی ٹانگ پر لگی لیکن وارا اتنی زور سے نہ پڑا جتنی زور سے ٹانگے نے کیا تھا۔ اب ٹانگا اٹھ نہیں سکتا تھا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ جو فضل دادو نے اٹھالی۔ ٹانگا اپنے پیٹھ میں اتری ہوئی برچھی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھنے لگا۔ اب تلوار فضل دادو کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ٹانگے کی گردن پر وار کیا اور اس کی گردن آدھی کٹ گئی۔

فضل دادو نے مزید وار کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ تلوار ہاتھ میں لئے وہاں سے چل پڑا۔ اس نے خون روکنے کا جو انتظام کیا تھا وہ میں آپ کو پہلے سنا چکا ہوں۔ وہ چلتا گیا۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ ان دو ٹانگوں کے ساتھی بکھر کر اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔

فضل دادو نے دیکھا کہ وہ ڈھلوان سے اتر رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں۔ کچھ اونچی اور کچھ کم بلند اور چھوٹی تھی۔ وہ چلتا گیا اور جہاں ڈھلوان ختم ہو رہی تھی وہاں سے اسے ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے آگے ندی بہہ رہی ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے درختوں میں سے گزرتا جب آگے گیا تو واقعی ایک ندی تھی جو پہاڑی

کے دامن میں بہہ رہی تھی۔

ندی کا پانی گدلا تھا۔ کیونکہ بارشوں کا موسم تھا اس لئے ہر طرف سے پانی بہہ بہہ کر ندی میں آتا تھا۔ فضل داو ندی میں اتر گیا۔ ندی کی گہرائی اس کے گلے تک یعنی کندھوں تک تھی۔ چونکہ یہ پہاڑی ندی تھی اس لئے اس کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ فضل داو نے اپنے آپ کو ندی کے حوالے کر دیا اور اپنے آپ کو پانی سے اوپر رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

میں اس کے باقی سفر کی تفصیلات نہیں سناؤں گا۔ صرف یہ سنا تا ہوں کہ ندی اسے خطرے کے علاقے سے بہت دور لے گئی اور جب صبح طلوع ہوئی تو وہ ایسے علاقے میں پہنچ چکا تھا جو ناگلوں کے علاقے سے بالکل ہی مختلف تھا۔ وہ بڑا ہی جان لیوا اور کٹھن سفر طے کر کے مجھ تک پہنچا تھا۔

حوالدار فضل داو پر جو بتی، وہ اس نے سنا تو دی لیکن اس کا سانس پھول گیا۔ میں نے شروع کیا تھا۔ میں نے کچھ زندہ مثالیں دے کر واضح کیا تھا کہ انسان میں آدم خوری شروع سے چلی آرہی ہے اور اب تک انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اس کی تازہ مثال چین کے جنوبی علاقے میں دیکھنے میں آئی ہے۔ یہ تفصیلات ایک بار پھر پڑھ لیں (شمارہ اگست 1995ء)۔ یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں تھی کہ ہندوستان اور برما کی سرحد پر ایک علاقے میں ناگے قائل رہتے تھے جو انسان کا گوشت کھا لیتے تھے۔

فضل داو لیٹ گیا تھا اور اس کا رنگ کچھ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے چکر آنے لگے ہیں۔ میں نے اس کے لئے دودھ منگوایا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ اس نے تھوڑا سا دودھ پیا اور چھوڑ دیا۔ وہ پھر لیٹ گیا۔

”یہ گاڑی بہت دیر سے پہنچے گی“ — فضل داو نے کہا۔ اس کی نظریں چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا — ”نہ یار نہ..... چاچے کو دیکھو..... چادر ٹھیک طرح باندھ..... پاگل ہو گیا ہے حرا!“

اس کے یہ الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں۔ میں نے اس کے ماتھے پر پھر سینے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا جسم تپ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ بخار بہت تیز ہو گیا ہے اور یہ بخار اس کے دماغ کو چڑ گیا ہے..... وہ پہلے تو صاف الفاظ میں اوٹ پٹا نک باتیں کرتا تھا پھر اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرایا لیکن فوج میں کچھ باتیں سیکھ لی تھیں۔ میرے جھونپڑے کے باہر ہر وقت دو آدمی موجود رہتے تھے۔ میں

طرح عام سا اور غریب سا آدمی سمجھتا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتا اور سمجھ بھی سکتا تھا۔ اس نے فضل داؤ کی نبض دیکھی اور ماتھے پر ہاتھ رکھا اور مجھ سے پوچھا کہ اسے کس طرح بخار چڑھا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ میرے خیال کے مطابق یہ لیبرائیں کیونکہ لیبرائیں اتنی زیادہ سردی لگتی ہے کہ تین چار کھل بھی اس سردی کو روک نہیں سکتے اور اسے ابکیاں بھی نہیں آئیں..... بوڑھے بری نے کہا کہ اس کے زخموں سے پٹی اتار دو۔

میں نے فضل داؤ کی ٹانگ اور بازو سے پٹیاں کھول دیں۔ زخموں کی حالت دیکھ کر میں تو کانپ گیا۔ زخموں میں پیپ پڑی ہوئی تھی اور ان کے ارد گرد سرخی آگئی تھی۔ بوڑھے بری نے کہا کہ یہ ہے بخار کی اصل وجہ اس نے وانگ سے اپنی زبان میں کچھ کہا اور مجھے اردو میں یہ کہہ کر وانگ کے ساتھ کمرے سے نکل گیا کہ اس کے زخم دوائی سے صاف کر دو، ہم ابھی آتے ہیں۔

میں نے فرسٹ ایڈ بکس میں سے مرہم پٹی والے سلمان میں رکھی ہوئی تین چار بوتلیں کھول کر سونگھا۔ ایک میں سے مجھے سپرٹ کی ہلکی ہلکی بو آئی۔ میں نے یہ روٹی پر ڈال کر فضل داؤ کے زخم صاف کرنے شروع کئے۔ وہ درد سے ترپنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ ذرا دل مضبوط کرے۔ وہ فوجی جوان تھا اس لئے اس نے برداشت کیا۔

کوئی نصف گھنٹہ بعد وانگ اور بوڑھا بری آگئے۔ وہ اپنے ساتھ دو قسم کے پودوں کے پتے لائے تھے۔ ایک قسم کے پتے زیادہ چوڑے تھے اور دوسرے لمبوترے اور کچھ کم چوڑے تھے۔ بوڑھا بری باورچی خانے میں چلا گیا۔ اس نے آگ جلا کر پانی گرم ہونے کے لئے رکھا اور ایک قسم کے پتے اس پانی میں صاف کر کے فضل داؤ کے پاس آ بیٹھا۔ اس نے پتے زخموں پر اس طرح رکھے کہ زخم پوری طرح ڈھک گئے۔ ان پتوں پر ایک اور تہہ پتوں کی رکھ دی اور مجھے کہا کہ اب پٹیاں باندھ دوں۔ میں نے پٹیاں باندھ دیں۔

بوڑھا بری دوسری قسم کے پتے اُبلتے ہوئے پانی میں ڈال آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک گھنٹہ انہیں اُبلانا ہے۔

اندازاً ایک گھنٹہ بعد اس نے پانی چولے سے اتارا اور باہر کھلی ہوا میں رکھ دیا۔ خاصی دیر بعد اس نے وانگ سے کچھ کہا۔ وانگ باہر نکلا اور جب وہ واپس آیا تو اس کے

نے انہیں بلایا اور کہا کہ ایک پیالے میں پانی لے آئیں اور دو چھوٹے چھوٹے کپڑے بھی لیتے آئیں۔

پانی اور کپڑے آگئے تو میں نے ایک کپڑا بھگو کر فضل داؤ کے ماتھے پر رکھا اور ان آدمیوں سے کہا کہ وہ اسی طرح باری باری فضل داؤ کے ماتھے پر پانی کی پٹیاں رکھتے رہیں۔

برما کے جنگلوں کی انتہائی خطرناک بیماری لیبرائیں تھا۔ وہ جنگل چھروں کو ہی پالتے تھے جن میں کچھ چھربڑے ہی زہریلے تھے۔ میں تو یہی سمجھا کہ فضل داؤ کو لیبرائیں ہو گیا ہے لیکن علامات لیبرائے والی نہیں تھیں۔ نہ اس نے سردی محسوس کی نہ اسے ابکیاں آئیں۔ وجہ جو کچھ بھی تھی، بخار بہت ہی تیز تھا۔ میرے پاس جاپانیوں کا فرسٹ ایڈ بکس موجود تھا جس میں مرہم پٹی کے سلمان کے علاوہ کچھ اور دوائیاں بھی ملیں۔ یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ کون سی دوائی کس مرض کے لئے ہے کیونکہ ان پر جو کچھ لکھا تھا وہ جاپانی زبان میں تھا۔ میں نے وانگ کو بلا بھیجا اور خود فرسٹ ایڈ بکس کھول کر دوائیاں دیکھنے لگا۔ ایک شیشی پر جو لیبل لگا ہوا تھا اس پر جاپانی زبان چھپی ہوئی تھی لیکن لیبل پر چھری تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دوائی لیبرائیں کی ہے۔

وانگ آیا تو میں نے اسے فضل داؤ کی حالت بتائی۔ وانگ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو فضل داؤ نے اس کی طرف دیکھا۔
”گھاڑی میں کتنی دیر ہے؟“ — فضل داؤ نے کہا — ”بارش نے گاڑی کو روک لیا ہے۔“

”دیکھا وانگ!“ — میں نے کہا — ”بخار اتنا تیز ہے کہ یہ دماغ کو چڑھ گیا ہے اور یہ بے معنی باتیں کر رہا ہے۔“

”یہ ٹھنڈی پٹیاں رکھتے رہو“ — وانگ نے کہا — ”میں ابھی آتا ہوں۔“
میں نے وانگ کے آنے تک اس شیشی میں سے ایک گولی نکالی جس پر چھری تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ گولی فضل کے منہ میں ڈالی اور اس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر ذرا سا ہلایا اور پانی پلا دیا۔

چند روز منٹ گزرے ہوں گے کہ وانگ ایک بوڑھے بری کو ساتھ لے آیا۔ میں اس بری کو جانتا تھا لیکن اسے کبھی اہمیت نہیں دی تھی کیونکہ اسے میں دوسرے بریوں کی

ہاتھ میں ایک پیالی تھی۔ اس میں ابلے ہوئے پتوں کا پانی تھا جو اس نے دوسری پیالی میں ڈالا اور اس طرح دونوں پیالیوں میں پانی پھینٹ کر ٹھنڈا کیا اور پھر یہ پانی فضل وا کو اٹھا کر پلا دیا گیا۔ فضل وا کا چہرہ بتا رہا تھا کہ پانی بہت ہی کڑوا ہے۔

بوڑھے بری نے مجھے کہا کہ تین گھنٹوں کا اندازہ رکھ کر اسے ایک پیالی اس پانی کی اور پلا دینا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کی پٹیاں کل اسی وقت کھلیں گی۔ میں نے بوڑھے بری اور وانگ سے پوچھا کہ ان پتوں کا کیا اثر ہو گا۔ بری نے بتایا کہ ان پتوں کا اپنا ایک اثر تو ہے لیکن اس پانی میں اس نے تھوڑی سی ہلدی بھی ڈالی تھی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ ہلدی زخموں کے لئے بہت اچھی ہوتی ہے۔ وانگ نے بتایا کہ ان پتوں کا پانی اس کی پیپ اندر ہی اندر خشک کر دے گا اور بخار تھوڑی دیر بعد اُتر جائے گا۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ فضل وا کا بڑبڑانا کم ہو گیا تھا اور کچھ دیر بعد ختم ہو گیا۔ اسے سکون سا محسوس ہونے لگا جو ہم نے اس طرح محسوس کیا کہ اس کی بے چینی ختم ہو گئی تھی۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں جاری رکھی گئیں۔

بوڑھا بری اور وانگ میرے پاس ڈیڑھ دو گھنٹے موجود رہے اور سورج غروب ہو گیا۔ اس وقت وہ اٹھے اور چلے گئے۔ پانی کی پٹیاں روک دی گئی تھیں۔ بوڑھے بری نے کہا تھا کہ اسے ویسے شمد دے دینا لیکن دودھ میں نہ دینا کیونکہ زخموں کی صورت میں دودھ پس پیدا کرتا ہے۔

فضل وا نے کھانا ٹھیک طرح کھا لیا لیکن وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا یا شاید اسے تیز بخار کا اثر تھا کہ اس کی شکستگی اور شکستہ کلائی بالکل ہی ماند پڑ گئی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ زخموں میں درد بہت کم ہو گیا ہے۔ میں نے کھانے کے بعد اسے پانی کی ایک پیالی اور پلا دی تھی۔

مجھے ایک خطرہ نظر آنے لگا۔ یہ خطرہ گینگرین (Gangrene) کا تھا۔ اگر زخم کی مرہم پٹی نہ ہو اور یہ پرانا ہو کر خراب ہو جائے تو اس میں ایک زہر پیدا ہو جاتا ہے جو جسم میں پھیلتا اور زخمی کی جان ہی لے لیتا ہے۔ گینگرین عموماً ان جنگلوں میں پیدا ہوتی ہے جن میں نمی زیادہ ہوتی ہے مثلاً "بنگل کے جنگل اور برما کے جنگل اور ایسے ہی جنگل جن میں اپنی نمی کے علاوہ سمندر کی ہوا کے ذریعے بھی نمی آتی ہے۔ اگر بازو یا ٹانگ کے زخم میں گینگرین پیدا ہو جائے اور زخمی کو ہسپتال پہنچا دیا جائے تو اس کا ایک ہی علاج کرتے ہیں

کہ متاثرہ بازو یا ٹانگ کاٹ کر جسم سے الگ کر دیتے ہیں۔

میرے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا کہ فضل وا کے زخموں میں گینگرین آگئی تو اس کا لازمی نتیجہ موت ہو گا۔ بوڑھے بری نے زخموں پر پتے تو بند ہوا دیئے تھے لیکن مجھے ان پر بھروسہ نہیں تھا۔ دیہات میں لوگ ایسے ہی ٹونگے کیا کرتے ہیں اور زخم خراب ہو جاتے ہیں۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں فضل وا کو کسی ہسپتال میں نہیں لے جاسکتا تھا۔ میں نے ایک علاج اور کیا تھا کہ جب فضل وا کے زخموں کی پہلی مرہم پٹی کی تھی تو دو شیشیوں میں سے ایک ایک گولی اسے کھلا دی تھی۔ یہ شیشیاں مرہم پٹی کے سامان میں رکھی ہوئی تھیں اس لئے مجھے خیال آیا کہ یہ گولیاں زخموں پر اچھا اثر کریں گی۔ اب میں نے اسے ایک ایک گولی اور کھلا دی۔

اب وہ ہوش و حواس کی باتیں نارٹل طریقے سے کر رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اور میری سنتے سنتے سو گیا۔ اس سے مجھے یہ اطمینان ہوا کہ وہ اب زخموں میں درد محسوس نہیں کر رہا۔

○

اگلی صبح وہ ٹھیک حالت میں اٹھا، باہر گیا اور تھوڑا گھوم پھر کر واپس آیا اور ہم نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ اس نے بتایا کہ اب زخموں میں درد اتنا سہی رہ گیا ہے جسے وہ آسانی سے برداشت کر سکتا ہے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بولنے کے انداز میں افسردگی اور کچھ باہوسی سی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ امید افزا اور حوصلہ بڑھانے والی باتیں کیں لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا اور اس کی افسردگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار تھا ہی نہیں اور اگر تھا تو بہت ہی کم تھا۔

وہ باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ذرا پرے ہٹ کر لیٹ گیا۔ اس کی نظریں چھت پر لگی ہوئی تھیں اور چہرے کا تاثر بتاتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں کھو گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے آرام ہی کرنے دوں لیکن میں اس وقت چونکا جب اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ میں بڑی تیزی سے سرک کر اس کے قریب ہو گیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اگر آج کی زبان میں بات کروں تو میں کہوں گا کہ اُس پر ڈیپریشن طاری ہو گئی تھی۔ اُس وقت میں ڈیپریشن کے لفظ سے واقف ہی نہیں تھا۔ میرے بار بار پوچھنے پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اللہ مجھے سزا دے رہا ہے“ — اس نے ہاری ہوئی سی آواز میں کہا — ”میں نے یہیں کتوں کی موت مرنا ہے۔“

”بھائی فضل دادا“ — میں نے کہا — ”تم تو میرا حوصلہ بھی توڑ رہے ہو۔ تم فوجی ہو، حوالدار ہو اور تم اتنے دلیر اور بہادر ہو کہ ناگموں کے جال میں سے لڑ کر نکلے ہو لیکن اب تم نے تو ہمت کا دامن ہی چھوڑ دیا ہے۔ کیا مجھے اپنے عزیز رشتہ دار یاد نہیں آتے ہوں گے؟ لیکن میں نے دل کو سمجھا رکھا ہے کہ جب اللہ کو منظور ہو گا، ہم اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔“

”میں خالی ہاتھ چار مسلح آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں“ — اُس نے کہا — ”درندوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ تمہیں ابھی تک صبح پتہ نہیں چلا کہ میں کتنا زیادہ دلیر اور جرأت والا ہوں لیکن میرے بھائی! میں خدائی طاقت کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا..... مجھے خدا کی طرف سے بڑی سخت سزا مل رہی ہے۔ میں جس گلائڈر میں یہاں آیا تھا وہ گر کر تباہ ہو گیا اور میں موت سے بچ نکلا۔ پھر چلانیوں نے گھیر کر آگ برسائی تو میں پھر موت کے منہ سے نکل آیا اور پھر ننگے آدم خوروں سے بھی بچ نکلا۔ یہ خدائی اشارے ہیں جو میں نے سمجھ لئے ہیں۔ میں نے بڑی بری موت مرنا ہے جس کی ایک نشانی یہ ہے کہ میرے زخموں میں پس پڑ گئی ہے اور زخموں کا زہر میرے جسم میں پھیل رہا ہے۔“

”اگر ایسا ہوتا تو تمہارا بخار کم نہ ہوتا“ — میں نے اس کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے کہا — ”صاف پتہ چل رہا ہے کہ تم بہتر ہو رہے ہو۔“

”میں ویسے ہی نہیں کہہ رہا کہ اللہ مجھے سزا دے رہا ہے“ — اُس نے کہا — ”میں نے ایک ایسا گناہ کیا ہے جو خدا کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

میرے دماغ میں یہی ایک بات آتی تھی کہ فضل دادا کے دماغ پر کل کے اتنے تیز بخار کا اثر ہے اور اسی اثر کے تحت یہ اتنا زیادہ افسردہ اور کم حوصلہ ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اپنی یہ تشخیص بتائی بھی لیکن اُس نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”تم کسی پیر کے مرید تو ضرور رہی ہو گے!“ — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

”بالکل نہیں!“ — میں نے کہا — ”میں صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پیر مانتا ہوں۔“

”میں دوسرے پیروں کی بات کر رہا ہوں یا را!“ — فضل دادا نے کہا — ”یہ جو گندی نشین ہوتے ہیں، ان میں سے تم نے کسی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کے مرید بن گئے ہو گے۔“

میں نے اسے پرانا واقعہ سنایا کہ میں نے اور میرے ایک دوست نے اپنے علاقے کے ایک مشہور اور مقبول پیر کو ننگا کر کے درخت کے ساتھ باندھا اور اسے مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اس کی ہمیں کوئی غیبی سزا نہیں ملی۔

”پھر تم اس جنگل میں مرو گے“ — فضل دادا نے کہا — ”کیا یہ سزا نہیں کہ تمہارا اتنا اچھا کاروبار رنگون میں تباہ ہو گیا ہے اور اب تمہیں اس جنگل سے نکلنے کا راستہ ہی نہیں مل رہا۔“

میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ میری رنگون میں دکان تھی۔ ابھی اسے یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں فوجی ہوں اور میں کس ادارے سے اپنے مورچوں سے بھاگ آیا تھا۔

”تم ناؤ نہ مانو، تم پیر کے بددعاوائے ہوئے ہو“ — فضل دادا نے کہا۔

”بھائی فضل دادا“ — میں نے کہا — ”میں نے یہاں ایک اثڑوہا مارا ہے، ایک شیر مارا ہے، چلانیوں کی ایک پوری سیکشن یہاں آگئی تھی۔ میں نے پوری سیکشن کو اکیلے ختم کر دیا تھا اور اب تمہیں موت کے منہ سے نکال کر اور ایک مگرچھ کو گولی مار کر یہاں لے آیا ہوں..... میں بلکہ میری روح محسوس کرتی ہے کہ میرے سر پر اللہ کا ہاتھ ہے۔“

”تم جو جی چاہے کہو“ — فضل دادا نے کہا — ”میں مانتا ہوں کہ مجھے سزا مل رہی ہے۔“

”تم گناہ کیا کر بیٹھے تھے بھائی!“ — میں نے پوچھا — ”وہ گناہ ہی مجھے بتا دو۔“

”میں نے اپنے پیر کا دل دکھایا ہے“ — فضل دادا نے کہا — ”پہلے تو میں خوش رہا کہ میں نے جو کیا ٹھیک کیا ہے لیکن اس جنگل میں آکر جو مجھ پر گزری اور گزر رہی ہے، اس سے میں سمجھ گیا کہ مجھے پیر کی بددعا مار رہی ہے۔“

میرے کہنے پر اس نے اپنا یہ گناہ سنایا۔ یہ میں اپنے الفاظ میں پیش کروں گا۔ اس سے پہلے ایک بات کہوں گا، وہ یہ ہے کہ میں ایک ایسی دنیا میں بیٹھا ہوا تھا، جو آج سوچتا ہوں تو خواب و خیال کی دنیا لگتی ہے۔ وہاں کے لوگ اجنبی، ان کی زبان اجنبی اور وہ جنگل

لگا ہوا تھا۔

جعنڈا افضل داو نے اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ پورا جلوس پیر صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا۔ آگے آگے دونوں میر لٹی ڈھول بجاتے جا رہے تھے۔ پیر کا گھر دوسرے گاؤں میں تھا جس کا فاصلہ تقریباً "تین میل تھا۔ یہ جلوس پیدل جا رہا تھا۔ دو تین چنگیروں میں بتائے، پھل فروٹ اور مٹھائی بھی ساتھ تھی۔

پیر صاحب کو پہلے سے اطلاع کر دی گئی تھی کہ ان کا ایک مرید شکرانے کے لئے حاضری دینے آ رہا ہے۔ یہ جلوس پیر کے دروازے پر پہنچا تو انہیں کہا گیا کہ پیر و سنگیر اپنے کمرے میں بیٹھے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ افضل داو نے اس کمرے میں جا کر وہ جھنڈا جس پر کلمہ طیبہ لکھا تھا پیر کے قدموں پر رکھ دیا۔ پھر اس کے پاؤں پر سجدہ کیا۔ چنگیریں پیش کیں اور کچھ نذرانہ نقد پیش کیا۔ پیر نے اسے حوالداری کی ترقی کی مبارک دی اور دعا کی اور پیشین گوئی کی کہ تمہیں ابھی اور ترقی ملے گی۔ جلوس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے ان سب نے پیر کے پاؤں پر ہاتھار گزا اور یہ جلوس ڈھول بجاتا واپس آ گیا۔

ہمارے علاقے میں جب کسی کا بیٹا لڑکھن سے نکل کر جوانی میں داخل ہوتا تھا تو ماں باپ اسے پیر کا مرید بنانے کے لئے اسی طرح ڈھول بجاتے ایک جلوس کو ساتھ لے کر پیر کے حضور حاضری دیتے تھے۔ وہ جب واپس آتے تو لوگ انہیں مبارک دیتے تھے کہ ان کے لڑکے نے پیر کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔

اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ تقریباً "چار سال گزر گئے، افضل داو کا کوئی ایک بچہ پیدا نہ ہوا۔ لڑکی کے سرال والے یہ توقع رکھا کرتے ہیں کہ ایک سال بعد پہلا بچہ پیدا ہو جانا چاہئے۔ بعض سرال والے ایک سال کی مزید مہلت دے دیا کرتے ہیں۔ پھر بھی کوئی آثار نظر نہ آئیں تو لڑکی کو شکی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ بیروں کے پاس جا پہنچنے اور اپنا یہ مسئلہ پیش کرتے ہیں۔ پیر جو کچھ کرتے ہیں اس کی طرف سے یہ لوگ اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ افضل داو کی شادی کو تو چار سال ہوئے کو آئے تھے۔ اسے کس طرح معاف کیا جاسکتا تھا؟

افضل داو کو فیملی کو اڑٹل گیا تھا اور اس کی بیوی اس کے ساتھ تھی۔ اس کے دوست اور دیگر ساتھی پوچھتے رہتے تھے کہ بچی بچہ ہوا یا نہیں۔ افضل داو اب یہ کہتے ہوئے شرما رہا تھا کہ کوئی بچہ نہیں ہوا۔ اسے وہ اپنی مردانگی پر بہت بڑی چوٹ سمجھتا تھا۔ وہ

ایسا جو دنیا بھر کے جنگلوں سے نرالا اور خطرناک تھا۔ ایک بات اور کہوں گا، وہ یہ کہ میں نے کہا ہے کہ وہ لوگ اجنبی تھے لیکن ان میں مسلمان بھی تھے۔ ان کے ساتھ کبھی اٹھنا بیٹھنا بولنا چلانا ہوتا تھا تو ایسے لگتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں بلکہ ہمارا آپس میں کوئی روحانی تعلق ہے۔ وہ تعلق کوئی راز نہیں تھا بلکہ بالکل صاف ہے کہ یہ اسلام کا تعلق اور رشتہ تھا۔

میں نے یہ بات اس لئے کہی ہے کہ میں اپنے وطن سے دور دور از ایک کھنے جنگل میں بیٹھا تھا جہاں کی ہر چیز میرے لئے نئی و نرالی تھی لیکن افضل داو جب اپنی کہانی سنا رہا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں واپس اپنے دیس میں اور کچھ میں آ گیا ہوں۔ میں آپ کو کچھ دیر کے لئے برما کے جنگلوں سے واپس اپنے دیس میں لے آتا ہوں جہاں پیروں کی سکرانی ہے اور کسی نہ کسی پیر کا مرید ہوتا یوں سمجھا جاتا ہے جیسے نعوذ باللہ خدا مل گیا ہو۔ افضل داو جس علاقے کا رہنے والا تھا وہاں دیہات میں کسی کو کوئی دکھ درد ہوتا خواہ کوئی جسمانی بیماری ہی ہوتی، لوگ اللہ کو پکارنے سے پہلے پیر کے دروازے پر جا پہنچتے تھے اور فی الواقع سجدے کرتے تھے۔ میرے اپنے علاقے کی یہی حالت تھی۔ اب بھی پیری مریدی اسی جوش سے چل رہی ہے۔ افضل داو کی کہانی کوئی نئی واردات نہیں لیکن ذرا سافرق یہ ہے کہ میری طرح افضل داو بھی اپنے پیر کے خلاف باغی ہو گیا تھا۔ اب وہ مصیبت میں گرفتار ہوا تو اس کے دل پر یہ وہم بیٹھ گیا کہ اسے اپنے پیر کی بددعا لگی ہے۔

یہ وقوعہ یوں ہوا کہ سات آٹھ سال پہلے افضل داو کی شادی اپنے گاؤں میں ہی ہوئی۔ اس وقت وہ نایک تھا۔ وہ اپنے علاقے کے ایک بڑے مرتبے کے پیر کا مرید تھا۔ اس کا سارا خاندان اس پیر کو برحق اور برگزیدہ مانتا تھا۔ ایک سال بعد افضل داو حوالدار ہو گیا۔ عقیدہ ختمندی کے اظہار کا ایک دلچسپ طریقہ بھی آپ کو سنا دیتا ہوں۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں افضل داو کی مثال سنا کر یہ طریقہ واضح کر دیتا ہوں۔

افضل داو جب حوالدار ہوا تو اس نے اس ترقی کو پیر کا خاص کرم اور خاص نوازش سمجھا۔ وہ چھٹی آیا اور اگلے روز دو میرا شیروں کو ساتھ لیا جو ڈھول لائے تھے۔ اس کے اپنے خاندان کا ہر فرد ساتھ تھا اور کچھ رشتے دار بھی ساتھ ہو گئے۔ افضل داو سبز کپڑے کا ایک جھنڈا بنا کر ساتھ لایا تھا۔ اس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ یہ جھنڈا ایک بانس کے ساتھ

انگریزوں کا زمانہ تھا۔ اس کا پلاٹون کمانڈر ایک انگریز لیفٹیننٹ تھا۔ کسی طرح اسے پتہ چل گیا کہ فضل داد کا یہ مسئلہ ہے۔ اس انگریز نے اسے اور اس کی بیوی کو سی ایم ایچ فوجی ہسپتال کے ایک ڈاکٹر کے پاس معائنے کے لئے بھیج دیا۔ وہ ڈاکٹر بھی انگریز تھا۔ اس نے دونوں کا معائنہ کیا اور کچھ ٹسٹ بھی کئے اور دونوں کے متعلق یہ رپورٹ دی کہ دونوں میں کوئی نقص نہیں۔ اس نے دونوں کو دو ایٹیاں بھی دیں لیکن پانچ چھ مہینے دو ایٹیاں استعمال کرنے کے بعد بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

فضل داد نے ایک بار چھٹی کے دوران راولپنڈی کی ایک لیڈی ڈاکٹر سے بھی اپنی بیوی کا معائنہ کرایا اور اس لیڈی ڈاکٹر کے کہنے پر فضل داد نے اپنا بھی چیک اپ کروایا اور جو ٹسٹ ڈاکٹر نے کیا وہ بھی کروایا۔ اس لیڈی ڈاکٹر اور ڈاکٹر نے بھی یہی رپورٹ لکھی کہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں، بچے پیدا کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں اور کوئی رکاوٹ نہیں۔ انہوں نے بھی جو دو ایٹیاں لکھ کر دیں وہ ان دونوں میاں بیوی نے کھائیں لیکن نتیجہ صفر رہا۔

فضل داد اور اس کی بیوی کی مائیں بہت ہی پریشان تھیں۔ دونوں مائیں باقاعدگی سے پیر کے ہاں جا کر اس کے آگے ماتھے رگڑ رہی تھیں اور نذرانے بھی پیش کر رہی تھیں۔ پیر نے حسب معمول تعویذ بھی دیئے اور جو چکر وہ ہر کسی کے ساتھ چلایا کرتا تھا، وہ سب آزما دیکھے لیکن فضل داد بے اولاد رہا۔

فضل داد کی ماں نے اور اس کے بعد اس کے باپ نے بھی اسے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس کی بیوی نے بچہ پیدا کرنا ہوتا تو اب تک پیدا ہو چکا ہوتا۔ اب یہ بات بچی ہو گئی ہے کہ یہ لڑکی بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں اور اسکا صرف یہ علاج ہے کہ فضل داد دوسری شادی کرے۔ یہ بیوی رہنا چاہتی ہے تو رہے ورنہ اسے طلاق دے دی جائے۔

فضل داد نے مجھے سنایا کہ وہ اس بیوی کو کسی قیمت پر طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی اپنی اس بد نصیبی پر روتی تھی۔ فضل داد نے اسے اپنا یہ فیصلہ سنایا تھا کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گا نہ ہی اسے طلاق دے گا..... فضل داد کے اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ وہ عام خاندانوں کی طرح بیوی کو اپنی زر خرید لوہڑی نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس کے دل میں بیوی کی محبت رچ بس گئی تھی۔ اس لئے نہیں کہ بیوی خاص طور پر خوبصورت تھی بلکہ فضل داد اسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اور یہی اسے اچھی لگتی تھی اس بیوی

کی عادتیں اور فطرت اس کے حسن سے زیادہ اچھی اور خوبصورت تھیں۔ فضل داد اس چھٹی کے دوران اپنے پیر کے پاس گیا۔ بیوی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں نے پیر کے قدموں پر سجدہ کر کے اور آنسو بہا کر عرض کی کہ انہیں ایک بچہ عنایت فرمادیں۔

پیر نے کہا کہ اسے ایک شک ہو گیا ہے۔ یہ جنت کی انتقامی کارروائی ہے۔ یہ کالکی کسی ایسی جگہ غلاظت پھینک چکی ہے جو ان جنت کا ڈیرہ تھا یا اس سے کوئی بد پرہیزی یا کسی بزرگ کی بے ادبی ہو گئی ہے۔ پیر نے کہا کہ وہ اصل وجہ معلوم کرنا چاہتا ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ یہ کالکی اس کے پاس اسی بیٹھے۔ پیر نے یہ بھی کہا کہ اس کی یا فضل داد کی ماں یا دونوں مائیں ساتھ آسکتی ہیں لیکن دونوں باہر بیٹھیں گی۔ فضل داد اس پیر کا مرید تھا اور دل و جان سے اسے پہنچ والا ماننا تھا۔ اس نے بیوی کو ساتھ واپس لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور پیر کے آستانے سے واپس آ کر اپنی ماں اور اپنی ساس کو بتایا کہ پیر صاحب نے یہ حکم دیا ہے۔

یہ پیر ضعیف العمر تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ریشہ آ گیا تھا۔ پیر کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا بال بچے دار تھا اور دوسرے کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال ہو گئی تھی اور وہ کتوں اور باز کے شکار کا علوی اور شوقین تھا۔ فضل داد بیوی کو اپنے گھر چھوڑ کر واپس اپنی یونٹ میں چلا گیا۔ اسے بذریعہ خطوط اطلاعیں ملتی رہیں کہ اس کی بیوی کو پیر کے ہاں باقاعدہ لے جایا جا رہا ہے اور پیر صاحب خود کوئی روحانی عمل کر رہے ہیں اور تعویذ بھی دے رہے ہیں۔

ابھی جنگ عظیم شروع نہیں ہوئی تھی اس لئے لمبی چھٹی مل جاتی تھی۔ جنگ کا خطرہ صاف نظر آرہا تھا۔ فضل داد کو ڈیرہ مہینے کی چھٹی مل گئی۔ یہ اس کا سال میں ایک بار حق بنتا تھا۔ فضل داد گھر آیا اور اپنی بیوی کو پہلے سے زیادہ پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ فضل داد نے اسے ہسلانے کے لئے کہا کہ اللہ کو منظور ہوا تو مراد پوری ہو جائے گی اور اس نے یہ بھی کہا کہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں لیکن بیوی نے جب بات کی تو پتہ چلا کہ بیوی کو ایک اور ہی پریشانی لگ گئی ہے۔

بیوی نے فضل داد کو یہ پریشانی سنائی۔ پیر خود تو ضعیف العمر تھا اور اس کے جسم میں سوائے ریشہ کے کچھ بھی نہیں رہا تھا لیکن اس کا چھوٹا بیٹا جو ان تھا اور وہ عورتوں کا شکاری تھا۔ اپنے باپ کی مریدنیوں پر نظر رکھتا اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیتا

تھا۔ اس کی یہ کثرت سب جانتے تھے لیکن کبھی کسی عورت یا جوان لڑکی کی طرف سے یہ شکایت نہیں ملی تھی کہ اس نوجوان لڑکے نے اس پر دست درازی کی ہو۔ یہ بھی سب جانتے تھے کہ جو لڑکی اس پیر زادے کے جال میں آتی ہے وہ خوشی محسوس کرتی ہے کہ پیر کا بیٹا اس پر مہربان ہو گیا ہے۔ وہ کبھت ویسے بھی بڑا خوب رو اور بڑے گھٹھے ہوئے جسم کا جوان تھا۔ فضل داد کی بیوی نے بتایا کہ یہ لڑکا اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ فضل داد کی بیوی بھی دیہاتن تھی لیکن اس کی زندگی میں پہلا اور آخری جو مرد داخل ہوا وہ فضل داد تھا۔ اس کے دل میں فضل داد کی محبت موجزن تھی۔ وہ تو فضل داد کی پوجا کرنے کو بھی جبرا نہیں سمجھتی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ فضل داد نے اپنے ماں باپ کو ناراض کر کے فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ نہ دوسری شادی کرے گا اور نہ بیوی کو طلاق دے گا اور ساری عمر بے اولاد گزار دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ فضل داد کی بیوی کے دل میں پیر کے بیٹے کی نفرت پیدا ہو گئی۔

بیوی نے فضل داد کو بتایا کہ چار پانچ مرتبہ یہ لڑکا اسے کھیتوں میں راستے میں آکر روک چکا ہے اور اپنے غلیظ ارادے کا اظہار بھی اس نے کیا ہے۔ فضل داد کی بیوی نے اسے آخر یہ بھی کہا کہ وہ اپنے باپ کی پیری اور عزت کو خراب نہ کرے لیکن ایک روز اس خوب رو نوجوان نے فضل داد کی بیوی کو فصل کی اوٹ میں بازو سے پکڑ لیا اور اسے فصل میں گھینے لگا۔ اس غیرت مند بیوی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اس کے ساتھ ہی اس کے پیٹ میں ایسی لات ماری کہ وہ اس لڑکی کو چھوڑ کر دو ہرا ہو گیا۔ ایک دو دنوں بعد پیر زادے نے فضل داد کی بیوی کو دھمکی دی کہ وہ اسے اغوا کر و اگر چکلے میں بٹھا دے گا۔ میں اُس دور کی بات کر رہا ہوں جب لوگوں کے اپنے بھی کچھ کردار ہوا کرتے تھے۔

فضل داد کا علاقہ، خصوصاً "دیہاتی علاقہ" غیرت مندی میں مشہور تھا۔ غیرت مندی تو ہر کسی میں تھی لیکن اس علاقے کے دیہات میں غیرت پر خون خرابے اور قتل ہو جایا کرتے تھے۔ فضل داد نے اپنی بیوی سے یہ باتیں سنیں تو اس کا خون اس طرح ابل پڑا کہ غیرت مریدی پر غالب آگئی۔ فضل داد نے مجھے سنایا کہ پیر تو اس لڑکے کا باپ تھا اور پیری کی ساری کرامات باپ کے ہاتھ میں تھیں۔ بیٹا تو بدکار اور بد معاش تھا۔

فضل داد کا ایک چچا زاد بھائی تھا جس کے ساتھ اس کا تعلق صرف رشتہ داری والا ہی نہیں تھا بلکہ ان میں بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ لوگ معمولی قسم کے کسان نہیں بلکہ خوش

حال زمیندار تھے۔ کسی کی محتاجی نہیں تھی بلکہ محتاجوں کو دیا کرتے تھے۔ فضل داد نے اپنے اس چچا زاد بھائی کو اپنی بیوی کی بات سنائی۔ چچا زاد بھائی طبیعت کا کچھ زیادہ ہی گرم اور تیز تھا۔ اس نے کہا کہ اس پیر زادے کا پتہ ہی کاٹ دیتے ہیں۔ فضل داد نے اسے بتایا کہ اس کے اپنے دل میں بھی یہی ارادہ ہے۔ ان دونوں نے قتل کے طریقوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ غور اس پر کیا جا رہا تھا کہ یہ لڑکا مارا بھی جائے اور قاتل کا کچھ کھرا کھوج نہ ملے۔ سوچ سوچ کر انہوں نے یہ سکیم بنائی کہ فضل داد کی بیوی پیر زادے سے ملے اور اسے رات کو کہیں بلائے اور وہاں پیر زادے کا معاملہ صاف کر دیا جائے۔

○

فضل داد اور اس کے چچا زاد بھائی نے فضل داد کی بیوی کو اس سکیم سے آگاہ کیا۔ بیوی بھی کسی گئے گزرے خاندان کی بیٹی نہیں تھی۔ وہ تین گھرو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور اس کا باپ گاؤں میں رعب داب رکھتا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پیر کے ہاتھ میں کوئی طاقت نہیں۔ اگر ہوتی تو اتنے عرصے میں اس لڑکی کی گود ہری ہو چکی ہوتی۔ پیر کا گھر تقریباً "تین میل دور گاؤں میں تھا۔ پیر کا یہ آوارہ بیٹا باز اپنے ہاتھ پر بٹھائے شکار کے ہمانے اوھر آ نکلتا تھا۔ فضل داد کی بیوی خوبصورت لڑکی تھی۔ پیر زادہ اسی کے پیچھے آیا کرتا تھا۔ تین دنوں بعد فضل داد کی بیوی کا پیر زادے سے آمناسامنا ہو گیا۔ سکیم کے مطابق یہ لڑکی باہر کسی نہ کسی بہانے نکل جایا کرتی تھی۔ آخر اسے پیر زادہ مل گیا اور اس نے فضل داد کی بیوی کے ساتھ اپنے مطلب اور نیت کی باتیں شروع کر دیں۔ لڑکی نے شرم اور جھجک کی اداکاری کی اور کہا کہ اس نے کبھی کسی غیر مرد کے ساتھ ایسا تعلق نہیں رکھا۔ وہ بڑی استادی سے اداکاری کرتی رہی اور اس طرح رضامندی کا اظہار کیا کہ پیر زادہ رات کے وقت فلاں جگہ آ جائے اور وہ وہاں پہنچ جائے گی۔

پیر کے بیٹے نے یہ بھی نہ سوچا کہ فضل داد چھٹی آیا ہوا ہے اور اس کی بیوی کاراٹ کے وقت باہر نکلتا ممکن نہیں ہو گا۔ اس کے دماغ پر بدی کا بھوت سوار تھا۔ اُس نے اسی جگہ آنے کے لئے کہہ دیا جو اسے اس لڑکی نے بتائی تھی۔ یہ جگہ دراصل فضل داد اور اس کے چچا زاد بھائی نے منتخب کی تھی۔ یہ جگہ ایک برساتی نالے کا بلند کنارہ تھا جہاں کھڈ تھے اور سر نکڈے بھی۔ اس برساتی نالے کو اس علاقے میں کس کہا جاتا ہے۔ وہاں سے

یہ نالہ مڑتا تھا اس لئے وہاں پانی گھرا تھا۔ انہوں نے ایک خاص سکیم کے تحت اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

رات کو جب گھروالے سو گئے تو فضل داو نے اپنی بیوی کو گھر سے روانہ کر دیا۔ کچھ دیر بعد فضل داو اپنے چچا زاد بھائی کو ساتھ لے کر دوسرے راستے سے اس طرف چلا گیا۔ فضل داو کے ہاتھ میں تقریباً "ایک گز لمبی رستی تھی جو دراصل چارپائی کی اودائن کا ٹکڑا تھا۔

یہ دونوں چکر کاٹ کر اس جگہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے کیونکہ وہاں کھڈ بھی تھی اور سرکنڈے بھی۔

انہیں صاف نظر آ رہا تھا کہ پیر زادہ وہاں ٹھل رہا تھا اور چند منٹوں بعد فضل داو کی بیوی پہنچ گئی۔ پیر زادے نے لپک کر لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ فضل داو کو معلوم تھا کہ ایسا ہی ہو گا لیکن اس نے جب اپنی بیوی کو ایک غیر مرد کے بازوؤں میں دیکھا تو اس کا دماغ جو پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ بالکل ہی ماؤف ہو گیا اور اس پر پاگل پن سوار ہو گیا۔ اس نے چند قدم کا جو فاصلہ تھا شکار پر حملہ کرنے والے شیر کی طرح ایک لمحے میں طے کیا اور پیشتر اس کے کہ پیر کے اس بد معاش بیٹے کو پتہ چلنا کہ پیچھے سے کون آیا ہے۔ رستی اس کے گلے میں پڑ چکی تھی۔

پیر کے بیٹے نے فضل داو کی بیوی کو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے رستی کو پکڑنا چاہا لیکن رستی بڑا سخت پھندہ بن چکی تھی اور فضل داو کے چچا زاد بھائی نے پیر زادے کو اس طرح آگے سے جکڑ لیا تھا کہ اس کے بازو بھی گرفت میں آ گئے تھے۔ فضل داو نے رستی کو ٹل دے دے کر اس کا پھندہ اتنا تنگ کر دیا کہ اس لڑکے کی سانس رک گئی۔ ادھر فضل داو کے چچا زاد بھائی نے اسے اپنی طرف زور زور سے جھٹکے دے کر کھینچنا شروع کر دیا۔ عقب سے فضل داو رستی کھینچ رہا تھا۔

پیر زادے کا ترہنہ ختم ہو گیا۔ فضل داو نے اس کی نبض پر انگلی رکھی تو نبض کو خاموش پایا۔ پیر زادہ مر چکا تھا۔

دونوں نے پیر زادے کو اسی طرح اٹھا کر اوپر سے نیچے پانی میں پھینک دیا اور فضل داو اپنی بیوی اور چچا زاد بھائی کو ساتھ لے کر وہاں سے چل پڑا۔ دیرمات میں لوگ شام کا

کھانا کھاتے ہی سو جاتے ہیں اور اس کے بعد یوں پتہ چلتا ہے جیسے اس گاؤں میں کوئی زندہ انسان ہے ہی نہیں۔ تینوں بڑے آرام سے اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔

اگلی صبح اس علاقے میں بھونچال آگیا۔ ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ پیر داغیر کا چھوٹا بیٹا قتل ہو گیا ہے اور اس کی لاش کس میں پانی میں پڑی ہے۔ جسے دیکھو وہ اسی طرف دوڑا جا رہا تھا جہاں لاش پڑی ہوئی تھی۔

فضل داو صبح جاگا تو اسے پہلا خیال یہ آیا کہ وہ ساری جگہ کچی مٹی والی ہے جس پر اس کے اور اس کے چچا زاد بھائی کے کھڑے موجود ہوں گے اُس کے دل پر خوف بیٹھ گیا۔ اس کے گھر کے افراد بھی موقع واردات کی طرف جا رہے تھے۔ فضل داو اور اس کی بیوی بھی چل پڑے۔

وہاں تو ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ زیادہ تر لوگ پہلے اوپر کنارے پر جاتے اور وہاں سے دیکھ کر نیچے کس میں اترتے تھے۔ فضل داو کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس کے اور اس کے چچا زاد بھائی اور اس کی بیوی کے کھڑے لوگوں کے قدموں کے نیچے ختم ہو چکے ہیں۔

پولیس آگئی تھی۔ تھانیدار نے لاش پانی سے نکلوا کر پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی۔ ابھی یہ کسی کو بھی پتہ نہیں چلا تھا کہ پیر زادے کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ خبر پھیلتی چلی گئی کہ جسم پر زخم یا چوٹ کا کوئی نشان نہیں۔ یہ تو شام کے وقت تھانے سے خبر نکلی تھی کہ پیر زادے کا گلارہ رستی سے گھونٹا گیا تھا۔

یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ مقتول کو فضل داو نے قتل کیا ہے۔ پیر کے سامنے فضل داو اور اس جیسے تمام لوگوں کی حیثیت مریدوں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھی۔ فضل داو کی یا اس کے خاندان کی پیر کے ساتھ کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ پورا خاندان اس پیر کا مرید تھا۔ فضل داو نے مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ اسے ایسا کوئی ڈر نہیں تھا کہ قتل کا شک اس پر کیا جائے گا لیکن اس کے دل پر یہ خوف بیٹھ گیا کہ پیر پہنچ والا ہے اور اس کے ہاتھ میں جتات بھی ہیں۔ یہ جتات یا پیر صاحب کی اپنی روح معلوم کرے گی کہ اس کے بیٹے کو فضل داو نے قتل کیا ہے۔ دن پر دن گزرتے چلے گئے اور قاتل کا کوئی سراغ نہ ملا..... میں یہ بات آپ سب کو بتاتا ہوں کہ دیہاتی

علاقے کی اپنی ایک الگ تھلک سیاست ہوتی ہے۔ علاقے کا تھانیدار، بڑا پیر، مختلف نمبردار اور دیگر سرکاری لوگ یعنی ذیلدار وغیرہ اس سیاست کے کردار ہوتے ہیں۔ یہ جو پیر تھا اس کی سیاست اسی طرح چل رہی تھی۔ اس علاقے کا ایک بہت بڑا زمیندار تھا جس کے ساتھ پیر کی کچھ چپقلش چل رہی تھی۔ اس دور میں ہندو اور سکھ بھی برسات میں آباد تھے۔ فضل داد کے گاؤں میں ایک ہندو ساہوکار رہتا تھا جس کی آرمٹ وسیع پیانے پر چلتی تھی اور وہ لوگوں کو سود پر قرضے بھی دیتا تھا۔ اس کی اس پیر کے ساتھ کچھ دشمنی تھی۔ پیر نے تھانے میں اس کے اور مسلمان زمیندار کے خلاف شک لکھوا دیا۔ تھانیدار نے ان کی طرف رخ کر لیا۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ اس علاقے میں جو رجسٹرڈ غنڈے اور دیگر جرائم پیشہ لوگ تھے ان کی شامت آگئی۔ تھانے میں ان پر بے پناہ تشدد کیا جاتا تھا لیکن کوئی بھی اقبالی نہ ہو رہا تھا۔ فضل داد کو پوری تسلی ہو گئی کہ اب تو وہ بالکل بھی نہیں پکڑا جائے گا۔ فضل داد نے مجھے اپنی اس وقت کی ذہنی کیفیت سنائی وہ اس طرح تھی کہ جب اسے خیال آتا کہ اس نے ایک برگزیدہ پیر کے بیٹے کو قتل کر دیا ہے تو اس کا جسم اندر سے کھوکھلا اور کمزور ہو جاتا اور یہ خوف اس کے دل پر بیٹھ جاتا کہ پیر کی بددعا اسے لگے گی اور اس کے جنت اس سے بدلہ لیں گے، لیکن اس کے سامنے جب اپنی غیرت آجاتی تو اسے اپنی بیوی کی باتیں یاد آتیں کہ اس پیر زادے نے اس کی بیوی کے ساتھ کیا کیا حرکتیں کی تھیں تو اس کا دل مضبوط ہو جاتا اور وہ اپنے آپ سے کہتا کہ اس نے جو کیا ٹھیک کیا ہے۔

میں یہ واضح کر دوں کہ فضل داد کے علاقے میں اور میرے علاقے میں بھی غیرت پر کسی کو قتل کر دینا یوں سمجھا جاتا تھا جیسے ایک مکھی مار دی گئی ہو۔ ایسے قتل پر اگر کوئی پکڑا جاتا تھا تو وہ نعرے لگاتا ہوا چٹائی چڑھتا تھا۔ اس کے گھر والے نعرے سب کو سناتے تھے کہ ہمارے بیٹے نے غیرت میں آکر دشمن کو قتل کیا ہے۔ آج کل ان علاقوں کا کلچر اور خیالات کچھ بدل گئے ہیں۔

جب تفتیش عام لوگوں کی سطح سے اوپر چلی گئی، یعنی جب یہ اتنے بڑے دولت مند تاجر اور ساہوکار اور ایک بہت بڑے زمیندار کی سطح پر پہنچ گئی تو فضل داد مطمئن ہو گیا۔ اس نے اپنا دل مضبوط کرنے کی نیت سے اپنی بیوی اور اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ یہ

بات کی کہ پیر کی بددعا ضرور لگے گی۔ چچا زاد بھائی اور بیوی نے متفقہ طور پر اسے کہا کہ جنت ہوتے تو اب تک انتقام لے چکے ہوتے اور پیر کی بددعا لگتی ہوتی تو اس میں دیر نہ لگتی۔ بیوی نے یہ بھی کہا کہ اس پیر کے ہاتھ میں ذرا سی بھی طاقت نہیں۔ اگر ہوتی تو اس کا ایک بچہ پیدا ہو چکا ہوتا۔

○

قتل والا معاملہ گول ہوتا نظر آ رہا تھا۔ تفتیش ان لوگوں میں چلی گئی تھی جن کے پاس دولت تھی لیکن فضل داد کا اصل مسئلہ جوں کا توں موجود تھا۔ وہ یہ تھا کہ وہ بھی اور اس کی بیوی بھی جسمانی لحاظ سے بالکل ٹھیک تھے لیکن اولاد نہیں ہو رہی تھی۔ اس مسئلے کو مزید پیچیدہ فضل داد کی ماں بنا رہی تھی جو اس پر زور دیتی تھی کہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کر لو اور اس بیوی کو طلاق دے دو اور اگر سوتن کو قبول کرے تو بے شک تمہارے ساتھ رہے۔ یہ ایسی صورت حال تھی جسے فضل داد قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اب اپنے دوستوں کے مشورے سے مختلف عاملوں اور جوہتیوں وغیرہ کی طرف رخ کر لیا۔ جس کسی نے اسے کسی عامل یا شاہ یا ایسے ہی کسی آدمی کا پتہ دیا تو وہ اس کے ہاں جا پہنچا۔ اس کی چھٹی پندرہ سولہ دن رہ گئی تھی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ اس کا یہ مسئلہ انہی پندرہ سولہ دنوں میں حل ہو جائے۔ تین چار دنوں میں وہ دو مختلف عاملوں کے پاس گیا۔ دونوں اس کے گاؤں سے دور رہتے تھے۔ ایک تو عام قسم کا عامل تھا جس کی باتوں سے بھی فضل داد مایوس ہو گیا اور اس کے پاس پھر کبھی نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرا عامل شاہ جی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے پاس فضل داد گیا تو اس شاہ نے اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ نماز روزہ کرتے ہو یا نہیں۔ فضل داد نے صاف بتا دیا کہ وہ نماز پڑھتا ہی نہیں۔ شاہ نے اسے کہا کہ دینے والا صرف اللہ ہے پہلے اس کی عبادت کرو اور ہر نماز کے بعد دعا بھی کرو۔ شاہ نے اسے ایک وظیفہ بھی بتا دیا اور کہا کہ یہ وظیفہ بھی عبادت میں شامل ہے اور اس کے بعد اللہ سے دعا مانگتی ہے کہ مراد پوری ہو جائے۔

فضل داد نے اسی روز نماز شروع کر دی اور وظیفہ بھی پڑھنے لگا۔ اس نے مجھے سنایا کہ جب اس نے تین چار وقت نماز باقاعدگی سے پڑھی اور وظیفہ بھی باقاعدگی سے کیا تو وہ اپنے آپ میں کچھ ایسا سکون محسوس کرنے لگا جیسے اس کا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس نے اپنی بیوی سے بھی کہا کہ وہ بھی نماز پڑھا کرے۔ بیوی نے بھی باقاعدہ نمازیں پڑھنا

شروع کر دیں۔

اس سے آگے فضل داد کی کمائی سنی تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ اللہ کی عبادت کا کرشمہ تھا۔ فضل داد کو بچہ تو نہ ملا لیکن وہ ایک ایسے آدمی کے پاس پہنچ گیا جس نے نشاندہی کر دی کہ اس کا بچہ کیوں پیدا نہیں ہو تا۔ دو یا تین دن میاں بیوی نے باقاعدہ نمازیں پڑھیں تو ایک آدمی نے فضل داد کو بتایا کہ ڈیڑھ دو میل دور ہندوؤں کی ایک ساوہمی ہے جہاں آج کل ایک جو تہی پنڈت آیا ہوا ہے وہ صحیح بات بتا دیتا ہے۔ اس آدمی نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جائے۔

ڈیڑھ دو میل تو کچھ فاصلہ ہی نہ تھا، فضل داد اپنی بیوی کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ وہاں پرانے زمانے کا ایک مکان بنا ہوا تھا جس کے ساتھ ساوہمی بھی تھی۔ وہیں مرگھٹ بھی تھا جہاں ہندو اپنے مڑے جلایا کرتے تھے۔ پنڈت فضل داد کو مل گیا۔ اس کے پاس چار پانچ آدمی اور ایک دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ سب لوگ چلے گئے تو فضل داد اپنی بیوی کے ساتھ پنڈت کے سامنے جا بیٹھا اور تھوڑے سے پیسے اس کے آگے رکھ کر اور ہاتھ جوڑ کر اپنا مسئلہ بیان کیا۔ پھر یہ کہا کہ پنڈت جی مہاراج جو خدمت کہیں گے وہ کرے گا۔

فضل داد کی کمائی آگے سنانے سے پہلے میں اپنی ایک رائے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کچھ زیادہ تعلیم یافتہ لوگ یا نئی تہذیب کے لوگ کہیں کہ نہیں، یہ بات غلط ہے میں اسے غلط نہیں سمجھتا۔ روحانی علم کا وجود ہے اور اس کے حامل بھی موجود ہیں۔ یہ جو جگہ جگہ عامل، نجومی، جو تہی اور شاہ جی بیٹھے ملتے ہیں یہ سب فریب کاری اور دھوکہ دہی کے بغیر کچھ نہیں جانتے۔ ایسے بزرگ اور صوفی بندے موجود ہیں جو روحانی عملیات سے مشکلیں آسان کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کالے جادو کا بھی وجود ہے جو ہزار ہا سال پرانا ہے۔ ہمارے ملک میں اور خاص کر فضل داد کے علاقے اور میرے علاقے میں دشمن ایک دوسرے پر کالا جادو چلا دیتے ہیں اور میں نے ذاتی طور پر کالے جادو کے مارے ہوئے لوگ دیکھے ہیں۔ میں ایسے واقعات سنا کر بات لمبی نہیں کروں گا، صرف یہ کہوں گا کہ کالا جادو چلانے والے عامل موجود ہیں اور وہ اچھی خاصی رقیں لے کر دوسروں کا برا غرق کر سکتے ہیں۔ ایسے عامل ہر جگہ نہیں ملتے۔ چونکہ یہ شیطانی عمل ہے اور قرآن پاک میں بھی اسے شیطانی عمل کہا گیا ہے اس لئے آپ کالے جادو کے کسی بھی عامل کو دیکھیں تو اس

کے چہرے پر نخوت اور کراہت صاف نظر آئے گی۔ ان کی آنکھیں لال سرخ ہوتی ہیں اور ان کے جسموں سے بدبو اٹھتی ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے اور یہ ہے بھی حقیقت کہ یہ عامل کئی کئی دن بلکہ ایک ایک مہینہ نہاتے ہی نہیں کیونکہ ان کا جسم جس قدر بٹاکا ہو گا ان کا عمل اسی قدر کامیاب رہے گا۔ اس شیطانی عمل کے لئے ہندوستان کے پنڈت، جوگی، یوگی اور سنیاہی ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ دوسرے مسلکوں کی کتابوں میں کالے جادو کو ہندوستان کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

اس پنڈت نے جس کے پاس فضل داد اپنی بیوی کو لے گیا تھا اپنا کچھ حساب کتاب نکالا، سلیٹ پر خانے اور گول دائرے بنائے اور ایسے ہی کچھ پراسرار عمل کئے پھر اس نے فضل داد کی بیوی کا چہرہ اپنے سامنے کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس سے چار پانچ باتیں پوچھیں، پھر اس نے فضل داد کے چہرے اور آنکھوں کا بڑی غور سے معائنہ کیا۔ ”بچہ کیسے پیدا ہو گا؟“ — پنڈت جو تہی نے کہا — ”تم دونوں پر جادو چلا ہوا ہے اور اس کی بندش لگی ہوئی ہے۔“

فضل داد فوراً مان گیا۔ اس نے ڈاکٹروں سے اپنا اور بیوی کا معائنہ کروایا تھا اور رپورٹ ٹھیک ٹھاک ملی تھی کہ دونوں اولاد پیدا کرنے کے قابل ہیں۔

”پھر اس کا توڑ کر دیں پنڈت جی مہاراج!“ — فضل داد نے منت سماجت کی اور کہا — ”آپ کی پوری خدمت کروں گا۔“ یہ پنڈت کوئی اچھا اور دیانتدار آدمی تھا وہ چاہتا تو فضل داد کو چکر دے کر اس سے منہ مانگے پیسے ہوڑ سکتا تھا۔ لیکن اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اسے جب تک یہ پتہ نہ چلے کہ جادو کس طریقے سے کیا گیا ہے، وہ اس کا توڑ نہیں کر سکتا، اس نے کہا کہ یہ معلوم کرنا اس کے بس میں نہیں البتہ وہ یہ نشاندہی کر سکتا ہے کہ یہ عامل کون ہے اور کس طرف رہتا ہے۔ اگر یہ پتہ چل بھی گیا تو ہم کیا کر سکیں گے؟“ — فضل داد نے پوچھا۔

”دو طریقے ہیں“ — پنڈت نے کہا — ”ایک یہ ہے کہ اسے زیادہ پیسوں کا لالچ دو اور اپنا کام کرواؤ۔ کالا جادو کرنے والوں کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا اور نہ وہ کسی کے ساتھ دفاتر کرتے ہیں۔ ایک طریقہ اور بھی ہے۔ اگر تم میں ہمت ہے تو یہ آزماؤ۔ اس کے گھر دو تین آدمی جادو ہٹاؤ اور اسے دھمکیاں دے کر کہو کہ یہ جادو اتار دے ورنہ اس سے پورا انتقام لیا جائے گا۔“

”نہیں پنڈت جی!“ — فضل داو نے کہا — ”اس طرح وہ ہم پر اپنے جادو سے کوئی خطرناک وار کر دے گا۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا بھائی!“ — پنڈت نے کہا — ”یہ جادو اتنا آسان نہیں کہ فوراً ہو جائے اور اپنا اثر دکھا دے۔ یہ بددوق تو نہیں کہ اس میں گولی ڈال کر گھوڑا دبا دو تو گولی فوراً چل جائے گی۔ اس کے پاس جادو اور بہتری یہی ہے کہ اسے کوئی خطرناک دھمکی دے۔“

ایسی ہی کچھ اور باتیں کر کے پنڈت نے فضل داو کا دل مضبوط کر دیا پھر کوئی اپنا عمل اور حساب کر کے اس کا لے عمل والے کی نشاندہی کی۔ اس نے بتایا کہ یہاں سے اڑھائی تین میل دور چھوٹا سا ایک گاؤں ہے، وہ عامل وہاں رہتا ہے۔ اس نے کچھ اور نشانیاں بھی بتائیں۔ ہو سکتا ہے پنڈت نے اپنے علم اور عمل کے زور سے اس کا لے عامل کا آتا پتہ معلوم کر لیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پنڈت کو معلوم ہو کہ اس علاقے میں وہی ایک آدمی کالا جادو کرنے والا ہے۔ بہر حال پنڈت نے فضل داو کو اس کارروائی پر تیار کر لیا کہ وہ اس جادوگر کو دھمکیاں دے اور اس سے اپنا کام نکلوائے۔

فضل داو نے اپنی ماں کو بتایا اور اپنے باپ کو بھی۔ اس کی ماں نے تو کوئی خاص بات نہ کہی البتہ اس کا باپ فضل داو کو الگ لے گیا اور اسے بتایا کہ ایسی بات ہے تو یہ فضل داو کی خالہ کی کارستانی ہے۔ باپ نے اسے بتایا کہ اس کی خالہ اپنی بیٹی فضل داو کو دینا چاہتی تھی لیکن باپ بھی نہیں مانتا تھا اور فضل داو بھی۔ تب فضل داو کو یاد آیا کہ اس کی خالہ اس پر ڈورے ڈالتی رہی ہے اور یہ بھی یاد آیا کہ اس کی خالہ بڑی چالاک اور مکار عورت ہے۔ باپ نے فضل داو کو بتایا کہ اسے عاملوں وغیرہ کے پاس جاتے اکثر دیکھا گیا ہے اور اب یاد آتا ہے کہ وہ اس گاؤں بھی گئی ہے جس کی نشاندہی پنڈت نے کی ہے۔ یہ چکر یقیناً خالہ نے چلایا ہے۔

میں اس بات کو طول نہیں دینا چاہتا۔ ہمارے ہاں لوگ اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ آج کل آپ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہوں گے کہ ایک لڑکی کا رشتہ مانگنے گئے اور لڑکی والوں نے انکار کر دیا تو رشتہ مانگنے والوں نے لڑکی کے منہ پر تیزاب پھینک دیا یا گولی چلا کر مار ہی ڈالا۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں، اس وقت بعض لوگ خصوصاً ”عورتیں“ اس قسم کی کارروائیاں کیا کرتی تھیں۔